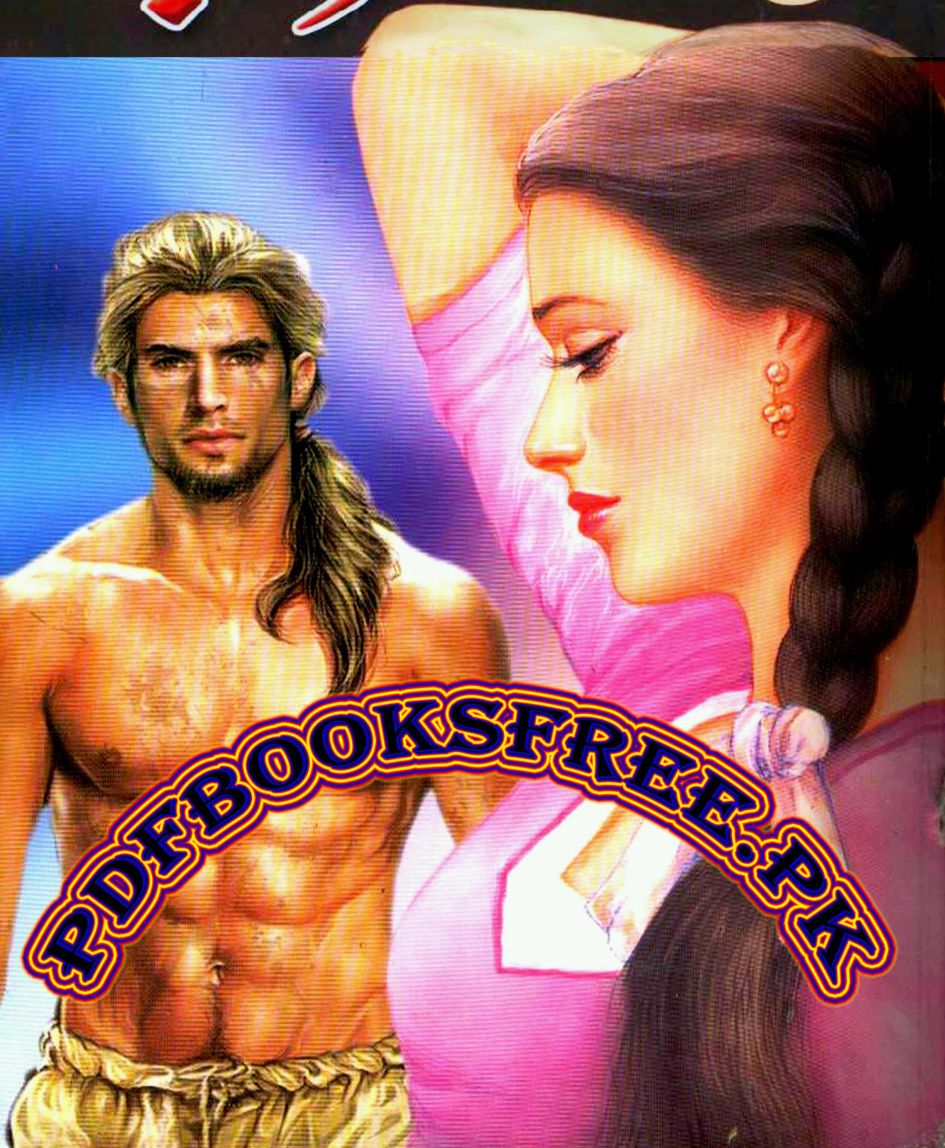
ایک نوجوان کے بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں کی تہلکہ خیز کہانی

سراب

راوی: شہباز ملک

تحریر: کاشف زبیر

4

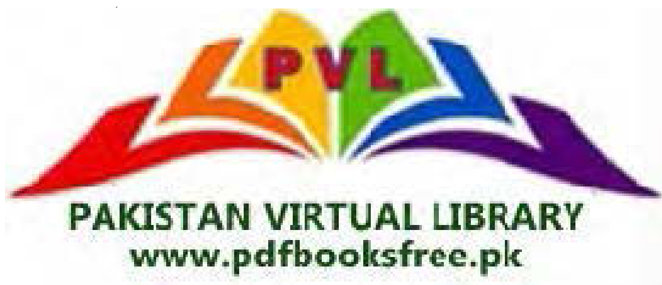


ایک نوجوان کے بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں کی ایک تہلکہ خیز کہانی

سراب

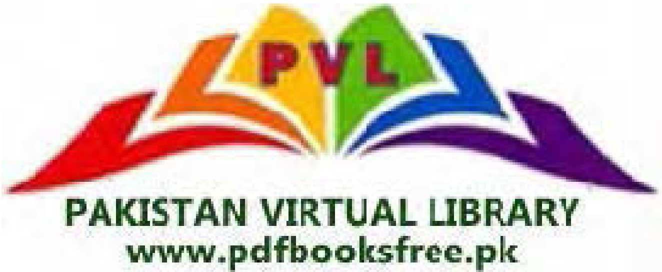
چوتھا حصہ

کاشف زبیر



علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔عزیز مارکیٹ،اردو بازار، لاہور۔فون:37247414

بار اشاعت ———— اول
مطبع ———— یوانیڈمی پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ ———— عاطف رحمٰن۔ لاہور
قیمت ———— 200 روپے
بیرون ملک ———— 10 برطانوی پونڈ
15 امریکی ڈالر



ISBN 978-969-517-320-6

Stokist:(U.K)
Azhar Enterprises
315, Dickenson Road
Longsight, Manchester, M13 ONR
Tel: 0044 (0) 161 224 6331

اسٹاکسٹ
علی بک سٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور

کیبن میں ناصر فکر مند سا موجود تھا۔ سونیا کو صحیح سلامت دیکھ کر اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔ میں نے بیڈ ہیرے کو بل لانے کا اشارہ کیا اور ناصر سے کہا۔ "ناصر! ابھی میرا فتح خان سے ٹکراؤ ہوا ہے، ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا ہے۔"

"فتح خان" ناصر بھونچکا رہ گیا تھا۔ "وہ یہاں کہاں سے آ گیا اور اب کہاں ہے؟"

"پتا نہیں وہ کہاں سے آ گیا؟ فی الحال واش روم میں بے ہوش پڑا ہے۔"

"تم دونوں یہاں سے جاؤ۔" ناصر نے سوچ کر کہا۔ "میں رکتا ہوں۔ یہاں کے معاملات دیکھ لوں گا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" میں نے کہا۔

اس دوران میں سونیا بالکل خاموشی سے اپنی نشست پر بیٹھی رہی تھی اور اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ اسے ارد گرد سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ "سونیا چلو، ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔"

"اسے کیا ہوا ہے؟" ناصر نے غور سے اسے دیکھا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے ناصر کو آنکھ سے اشارہ کیا۔ "اس کے پستول کی گولیاں کہاں ہیں؟"

ناصر نے سمجھ لیا تھا۔ اس نے خاموشی سے جیب سے گولیاں اور ان کا پیک (ڈبا) نکال کر مجھے دے دیا۔ وہ ایک بار پھر فکر مند نظر آنے لگا تھا۔ اس نے جان لیا تھا کہ سونیا کی طرف سے کوئی غلط حرکت ہوئی ہے تبھی مجھے سونیا کے پستول کے خالی ہونے کا علم ہوا تھا۔

"تم کہاں جاؤ گے، راستوں کا پتا نہیں ہے۔"

"میں نکل جاؤں گا۔ سفیر اور صوفہ کہیں اور منتقل ہو گئے ہیں۔ بیگ سے رابطہ کر کے میں بھی وہیں چلا جاؤں گا۔" میں نے جواب دیا۔ "تمہارا موبائل میرے پاس ہے۔ تم یہ میرا موبائل رکھ لو۔ اس میں اپنی سم لگا لینا۔"

"ٹھیک ہے اب تم جاؤ، میں بعد میں رابطہ کروں گا۔"

"رابطہ کر لینا، پہلے کی طرح غائب مت ہو جانا۔"

ناصر نے ایک نظر سونیا کو دیکھا۔ "اب تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

میں نے اپنا نقاب درست کر لیا تھا۔ سونیا کے سر پر بھی اس کے اپر کا ہڈ تھا۔ "سونیا چلو میرے ساتھ۔"

"جی شہباز بھائی!" وہ آہستہ سے بولی۔

میں اور سونیا باہر آئے۔ مجھے نہیں معلوم کہ فتح خان کس کے ساتھ آیا تھا لیکن مجھے ہال یا ریستوران کے نچلے حصے میں کوئی مشتبہ شخص نظر نہیں آیا تھا۔ اس کا مطلب تھا، فتح خان اتفاقاً آیا تھا۔ مجھے ناصر کی فکر تھی۔ فتح خان دریافت ہونے کے بعد ایک ہنگامہ مچ جاتا اور ناصر پھنس جاتا۔ "سونیا! ابھی ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔ میں تم سے بعد میں پوچھوں گا۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "میں صرف اتنا بتا دوں، مجھے تمہاری اس حرکت سے شدید صدمہ ہوا ہے۔"

"میں سوری کرتی ہوں۔"

میں نے بائیک اسٹارٹ کی اور وہ پیچھے بیٹھ گئی۔ میں نے کوئی دو کلومیٹر کے بعد ایک اور کیفے دیکھ کر بائیک روک دی۔ ہم اندر آئے۔ یہاں فیملی کیبن تو نہیں تھے البتہ دور کے گوشوں میں چھوٹی میزیں تھیں۔ ہم ایسی ہی ایک میز پر آ گئے۔ میں نے سب سے پہلے بیگ کو کال کی۔ "شہباز صاحب کیسے ہیں؟"

"فائن...... بیگ صاحب! ہم اس وقت ایک کیفے میں بیٹھے ہیں۔ آپ ہمیں لانے کے لئے کسی کو بھیجیں۔"

بیگ نے مجھ سے پتا لے کر کہا۔ "میرا آدمی آدھے گھنٹے میں آ جائے گا۔"

"آپ لوگ ہوشیار ہو جائیں، فتح خان لاہور میں ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے میرا اس سے ٹکراؤ ہوا ہے۔"

"اوہ، کس جگہ؟"

میں نے اسے جگہ کے بارے میں بتایا۔ "وہ اب بھی وہاں بے ہوش پڑا ہوگا۔ ممکن ہے پولیس بھی آ چکی ہو۔"

"میں دیکھتا ہوں۔" بیگ نے فون بند کر دیا۔

اب میں سونیا کی طرف متوجہ ہوا جو بدستور ساکت اور پہلے والے موڈ میں تھی۔ میں نے گہری سانس لی۔ "سونیا! میں تم سے نہیں پوچھوں گا کہ تم نے ایسا کرنے کی کوشش کیوں کی۔ میں جانتا ہوں، یہ ہمارا قصور ہے۔ ہم تمہارے اندر کی کیفیت کو نہ سمجھ سکے اور تمہیں یقین نہ دلا سکے کہ وسیم اور شکیل کے بعد اب ہم تمہارے ہیں۔"

"ایسی بات نہیں ہے شہباز بھائی!" وہ بولی۔

"ایسی ہی بات ہے، میں نے خود تمہارے نارمل ردِعمل کو تمہارے اعصاب کی مضبوطی سمجھا اور یہ بھول گیا کہ کوئی عورت اپنے پیاروں کے بچھڑنے پر نارمل نہیں رہ سکتی، چاہے وہ کتنے ہی مضبوط اعصاب کی کیوں نہ ہو، میں شرمندہ ہوں تم سے۔"

"ایسی بات نہ کریں۔" پہلی بار سونیا کے انداز میں تبدیلی آئی اور پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ "آپ سب تو بہت اچھے ہیں، نہ جانے کیوں میں بہت زیادہ تنہائی محسوس کرنے لگی تھی۔ میں باہر سے خود کو جتنا سنبھالنے کی کوشش کرتی، اندر سے اتنا ہی بکھرتی جاتی تھی۔ میرے اندر کا خلا بہت بڑا ہو گیا تھا۔ میں اس دنیا میں بہت اکیلی تھی۔ شہباز بھائی میں اس تنہائی سے ڈر گئی تھی۔"

"اس لئے تم نے یہ کام کرنے کی کوشش کی؟" میں نے دانستہ خودکشی کے لفظ سے گریز کیا۔

اس نے سر ہلایا اور پھر چونک کر پوچھا۔ ”پستول میں سے گولیاں کس نے نکالی تھیں؟“

”یہ ناصر کا کارنامہ ہے۔ درحقیقت اس نے تمہاری اندرونی کیفیت کو محسوس کیا تھا اور اس نے مجھ سے کہا بھی تھا لیکن میں نے ماننے سے انکار کر دیا۔“

”ناصر نے......“ وہ حیرت سے بولی۔

میں نے سر ہلایا اور آہستہ سے بولا۔ ”اسے تمہاری بہت فکر ہے۔“

”اسے میری فکر کیوں ہے؟“ سونیا کا لہجہ تیز ہوا تھا۔

”یہ میں نہیں جانتا لیکن اس کا تجزیہ درست تھا۔ تمہارے پستول سے اس نے گولیاں بھی اسی وجہ سے نکال لی تھیں کہ اسے تمہاری طرف سے ایسی کسی حرکت کی توقع تھی۔“

”وہ......“ سونیا نے دانت پیس کر کچھ کہنا چاہا کہ ویٹر آنے کی وجہ سے اسے چپ ہونا پڑا تھا۔

”دو کافی لے آؤ۔“ میں نے اس سے کہا۔ ویٹر کے جانے کے بعد سونیا کی طرف دیکھا۔ ”ممکن ہے تمہیں کسی وجہ سے اس پر غصہ آتا ہو لیکن وہ پُرخلوص شخص ہے، ہمارے لئے بے غرضی سے کام کر رہا ہے۔ اپنا کام چھوڑ کر ہمارے لئے خطروں میں کودتا پھر رہا ہے حالانکہ وہ مار دھاڑ والا شخص نہیں ہے۔“

”یہ تو ہے۔“ سونیا قائل ہوئی تھی۔

”میں اس کا شکر گزار ہوں۔ اس نے بروقت تمہارے بارے میں نشاندہی کی۔ سونیا، وعدہ کرو، اب تم دوبارہ ایسی کوئی حرکت نہیں کرو گی۔“

”شہباز بھائی، میں نے جان بوجھ کر نہیں کی تھی۔“

”میں سمجھ رہا ہوں......لیکن جب تم نے یہ فیصلہ کیا تو تم نے دوسرے پہلوؤں پر غور کیا تھا؟“

”کن پہلوؤں پر؟“

”تم مجھے وسیم کی جگہ سمجھتی ہو۔ اگر وسیم ہوتا تو کیا تم تب بھی خودکشی کی کوشش کرتیں؟“

اس سوال پر وہ بے حد شرمندہ نظر آنے لگی تھی۔ خاصی دیر بعد اس نے کہا۔ ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“

”دوسرے خودکشی ہمیشہ بزدل لوگ کرتے ہیں اور میرا خیال ہے تم ہرگز بھی بزدل نہیں ہو۔“

”جی بھائی، پتا نہیں، میں نے ایسا کیوں کیا؟“

”اس کی وجہ بزدلی نہیں، تمہاری اندر کی کیفیت ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ہمارے معاشرے میں......دنیا کے تمام ہی معاشروں اور مذاہب میں لوگوں کے مرنے کے بعد رسومات ہوتی ہیں، لواحقین ان کا سوگ اپنے اپنے انداز میں مناتے ہیں۔ اس سے ان کے اندر کی فرسٹریشن دور ہو جاتی ہے، تم نے اور ہم نے اپنے پیاروں کا ایسا سوگ نہیں منایا شاید اس لئے تمہارے اندر دکھ کا خلا بھر نہیں سکا۔ ہم کل سب مل کر مرحومین کے لئے دعا کریں گے۔ ان کے ایصالِ ثواب کے لئے قرآن پڑھیں گے۔“

”سچ بھائی!“ سونیا خوش ہو گئی تھی۔ ”مجھے اکثر خیال آتا تھا ہم نے وسیم بھائی کے لئے کچھ نہیں کیا۔ شکیل کے لئے پھر بھی اس کے گھر والوں نے بہت کچھ کر لیا ہوگا۔“

”سونیا، یہ سب میرے ذہن میں بھی تھا لیکن ہمیں سکون سے بیٹھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اب ان شاء اللہ

کل ہم ایک جگہ ہوں گے تو یہ کام کریں گے۔''

ویٹر کافی لے آیا تھا۔ سونیا نے کافی بنائی۔''سونیا، اب تم ہمارے وجود کا ایک حصہ ہو، جیسے ہم اپنے معاملے طے کرتے ہیں اور فیصلے کرتے ہیں، ایسا تم بھی کرو۔ تمہارا فیصلہ ہمیں قبول ہوگا۔ جیسے تم ہمارے فیصلے قبول کرتی ہو۔ تم ہر معاملے میں دخل دے سکتی ہو۔''

''شکریہ بھائی!'' اس نے آہستہ سے کہا۔''مجھے افسوس ہے، میں نے بھی آپ کے رویے کو نہیں سمجھا۔ اب آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔''

''شکوے شکایت اپنوں میں ہی ہوتے ہیں۔''

کافی ختم کرکے میں نے بل منگوایا۔ میرا خیال تھا بیک کا آدمی آنے والا ہوگا۔ میرا اندازہ درست نکلا تھا۔ چند لمحے بعد عبداللہ اندر آیا تھا۔ اس نے ایک نظر ہال میں دوڑائی اور سیدھا ہماری طرف آیا تھا۔

''کیسے ہیں سر؟''

''یہ سوال تو ہمیں کرنا چاہئے۔'' میں ہنسا۔

''فائن سر......چلیں؟'' اس نے پوچھا۔

ہم اٹھ کر نیچے آئے۔ بائیک میں نے کیفے کے سامنے چھوڑ دی تھی۔ عبداللہ ایک سیاہ وین میں آیا تھا، اس کے سامنے والے حصے میں دو افراد بیٹھے تھے۔ ہم پچھلی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ ایک شخص عقبی حصے میں بھی تھا گویا عبداللہ تین محافظوں کے ساتھ آیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔''پہلے ہم اس ریستوران جائیں گے جہاں آپ نے فتح خان کو چھوڑا تھا۔''

''اس صورت میں بہتر ہوگا تمہارا آدمی اس بائیک کو بھی ساتھ لے کر چلے۔'' میں نے بائیک کی طرف اشارہ کیا۔''یہ ہماری نہیں ہے اور اس کا مالک بھی ریستوران میں ہوگا۔''

عبداللہ نے عقبی حصے میں بیٹھے شخص کو بائیک پر آنے کے لئے کہا۔ وہ اتر گیا۔''جناب، اس شخص سے رابطے کا کوئی ذریعہ ہے؟'' عبداللہ نے مجھ سے پوچھا۔

''اس کے پاس موبائل ہے لیکن چارج نہیں ہے۔'' میں نے بتایا۔''ویسے بھی وہ جگہ چند منٹ کی ڈرائیو پر ہے۔''

ہم روانہ ہوئے اور کچھ دیر میں ہم اس ریستوران کے سامنے تھے۔ عبداللہ نے سر پر اونی ٹوپی لے رکھی تھی اور گلے میں مفلر اس طرح لیا تھا کہ نصف چہرہ چھپ گیا تھا۔ وہ اپنے ایک ساتھی کے ساتھ اندر گیا تھا۔ میں نے اسے ناصر کا بتایا تھا اور وہ اس سے مل چکا تھا۔ دس منٹ بعد اس کی واپسی ہوئی تھی۔''اندر نہ تو فتح خان ہے اس کا ایک ساتھی اسے لے کر جا چکا ہے اور نہ ہی ناصر ہے۔''

''ممکن ہے ناصر اس کے پیچھے گیا ہو۔'' میں نے کہا اور اس کے نمبر پر رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر جواب نہیں ملا۔ ہم واپسی کے لئے روانہ ہوگئے۔ ناصر کی بائیک بھی لے لی تھی۔ ناصر مجھ سے خود رابطہ کرسکتا تھا۔ ہم پون گھنٹے بعد ایک تین منزلہ عمارت کے احاطے میں داخل ہوئے تھے۔ یہ عمارت نہر کے ساتھ تھی۔ احاطے میں چند گاڑیاں تھیں۔ وین ان کے ساتھ رک گئی۔ عمارت پرانے انداز کی جھروکوں والی تھی۔

"راجا صاحب بھی یہاں پر ہیں۔" میں نے پوچھا۔

اس نے سر ہلایا۔ "جی سر، وہ بھی یہیں ہیں۔"

راجا ہمارا منتظر تھا۔ عبداللہ مجھے اور سونیا کو سیدھا اس کے پاس لے گیا تھا۔ "کیا حال ہیں برخوردار!" میرے اور سونیا کے سلام کا جواب دے کر اس نے پوچھا۔ "ہنگامے تمہارے آس پاس رہتے ہیں۔"

"جی یہ ہنگاموں کی کرم نوازی ہے۔" میں نے انکساری سے کہا۔

"بیٹی، تم کچھ تھکی ہوئی لگ رہی ہو جا کر آرام کرو۔" راجا عمر دراز نے سونیا سے نرم لہجے میں کہا۔

"جی۔" سونیا کہہ کر کھڑی ہوگئی۔ "اور ایک ملازم کے ساتھ باہر چلی گئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ راجا اسے یہاں سے ٹالنا چاہ رہا ہے۔ اس کے جاتے ہی راجا میری طرف متوجہ ہوا۔ "برخوردار! فتح خان کا یہاں آنا اچھی بات نہیں ہے۔"

"فتح خان، میرا تعاقب کرتا آیا ہے۔"

"یہ بھی ہے لیکن اصل میں اسے ڈیوڈ شا نے بلایا ہوگا۔ وہ بہرصورت میرا خاتمہ چاہتا ہے۔ پچھلی ناکام کوشش کے بعد وہ فتح خان کو بلانے پر مجبور ہوا ہوگا۔"

"آپ کا کیا ارادہ ہے۔ راجا صاحب!" میں نے اسے کریدا۔

"پہلے میں آرام سے جانا چاہتا تھا لیکن اب معاملات کو تیزی سے نمٹانا ہوگا، ہمیں......"

راجا صاحب کی بات موبائل کی بیل کی وجہ سے ادھوری رہ گئی تھی۔ میں نے کال ریسیو کی۔ "میں ناصر بات کر رہا ہوں۔" دوسری طرف سے آواز آئی۔ "میں ایک نجی اسپتال کے پاس ہوں، فتح خان کو اس کا ساتھی یہاں لایا ہے۔"

"اوہ......اسپتال کہاں ہے؟"

"ملتان روڈ پر ہی ہے۔" اس نے بتایا۔

"ایک منٹ!" میں نے اسے ہولڈ کرا کے راجا عمر دراز سے کہا۔ "فتح خان کا سراغ مل گیا ہے۔ ناصر نے اس کا تعاقب کیا تھا۔ وہ اس وقت اسپتال میں ہے۔"

"کہاں پر؟" بیگ تیزی سے پاس آیا، میں نے موبائل اسے دے دیا۔ اس نے ناصر سے پتا سمجھا اور موبائل مجھے واپس کرتے ہوئے تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔ راجا عمر دراز کے پاس ایک اسٹائلش جدید قسم کی انگیٹھی میں لکڑی کا کوئلہ سلگ رہا تھا۔ اسے کسی اچھی لکڑی سے بنایا گیا تھا کیونکہ اس میں سے دھوئیں کے بجائے خوشبو اٹھ رہی تھی۔

"یہ شخص ہاتھ آ گیا تو میں سمجھوں گا، میں نے بازی جیت لی ہے۔" راجا عمر دراز نے کسی قدر جوش سے کہا۔

"آپ کچھ کہہ رہے تھے؟" میں نے اسے یاد دلایا۔

"ہاں، کل شام سفیر اور مونا دبئی جا رہے ہیں اور کل رات کو تم بھارتی سرحد کی طرف روانہ ہو جاؤ گے، صبح سے پہلے تم بھارت میں ہو گے۔"

"اتنی جلدی؟"

"اب مناسب یہی ہے، ہم جتنی دیر لاہور میں قیام کریں گے، خطرات بڑھتے جائیں گے۔"

"راجا صاحب، بھارت ہی کیوں؟"

"اس کی کئی ایک وجوہات ہیں۔ اوّل تو ہمیں بھارت میں جانا ہے، ڈیوڈ شا بھی جلد یا بدیر وہاں کا رخ کرے گا۔ دوسرے تم صرف بھارت جا سکتے ہو۔ کسی اور ملک میں جانے کے لئے جعلی پاسپورٹ بنوانا پڑے گا اور آج کل اس کے پکڑے جانے کا امکان بہت زیادہ ہوتا ہے۔"

"اس کا تعلق پُراسرار وادی سے ہے۔"

"بالکل...... کیا تم وہ کہانی بھول گئے ہو جو میں نے تمہیں سنائی تھی؟"

"راجا صاحب، وہ ایک ادھوری کہانی تھی۔"

"اسے میں کل صبح مکمل کروں گا۔ تب تم جان جاؤ گے کہ میرا بھارت جانے کا مقصد کیا ہے؟"

مجھے حکیم قادس کا خیال آیا۔ میں نے راجا کو اس کے بارے میں بتایا۔ "یہ اسے چھڑانے کا اچھا موقع ہے۔"

"تم اس کی فکر مت کرو۔" راجا نے خلافِ توقع خشک لہجے میں کہا۔ "شاید تم بھی تھک گئے ہو آرام کرو۔"

میرا خیال تھا راجا عمر دراز حکیم قادس کے بارے میں جان کر بے تاب ہو جائے گا مگر اس کا ردِعمل بالکل الٹ تھا جیسے اسے حکیم قادس کی قطعی پروانہ ہو۔ میں ایک خادم کے ہمراہ دوسری منزل پر آیا جہاں چار عدد کمرے ہمارے لئے مخصوص تھے اور سب سفیر کے کمرے میں جمع تھے۔ مونا اور سونیا رونے دھونے سے فارغ ہو کر خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔

"شکر ہے تیری صورت بھی نظر آئی ورنہ تُو تو ایسے غائب ہوا تھا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔"

"اب تُو غائب ہونے والا ہے بھوتنی کے...... مع اس چڑیل کے۔ ابھی مجھے راجا عمر دراز نے اطلاع دی ہے، تم دونوں کی دبئ جانے کے لئے نشستیں بک ہیں اور امکان ہے ہم بھی کل بھارت میں ہوں گے۔ رات بارہ بجے سے پہلے۔" میں نے اطلاع دی۔

"شوبی...... یہ راجا تمہیں بھارت کیوں لے جا رہا ہے؟" مونا نے سوال کیا۔

میں نے منہ پر انگلی رکھ کر اشارہ کیا۔ "راجا صاحب کا خیال ہے یہاں میرے لئے خطرات بڑھ رہے ہیں اس لئے مجھے کچھ عرصے کے لئے بھارت چلے جانا چاہئے۔"

"خطرہ تو بھارت میں بھی ہے اگر پکڑے گئے تو۔" سفیر نے کہا۔ "ویسے بھی بھارتی حکام پاکستانی قیدیوں کو جیل میں ڈال کر بھول جانے کے عادی ہوتے ہیں۔"

"نہیں، راجا بھیج رہا ہے تو اس نے کوئی نہ کوئی راستہ نکالا ہوگا۔" سونیا بولی۔ "شہباز بھائی، میں آپ کے ساتھ جاؤں گی نا؟"

"بالکل! تمہارے بغیر میں کہیں نہیں جا سکتا۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"یہ سب چھوڑ...... یہ بتا کہ تجھ پر کیا گزری...... اور تُو نے کتنے کارنامے انجام دیئے؟"

"بالکل تفصیل سے...... میں کافی کا کہتی ہوں۔" مونا بولی، اس نے انٹرکام پر کافی کا آرڈر دیا۔ میں نے ان کو گزشتہ دو دن کی رُوداد سنائی۔ اس دوران میں کافی آئی۔ ہم نے کافی پی۔ اس کے باوجود ایک گھنٹے بعد مجھے جماہیاں آنے لگی تھیں۔ مونا اور سفیر کے سوالات نے داستان کو طویل کر دیا تھا خاص طور سے وہ اس لڑکی کے بارے میں جاننے کے لئے بے چین تھے، جس نے گھر سے فرار کی کوشش کی تھی۔

"مجھے کیا پتا؟" میں نے خفگی سے کہا۔ "میں دوبارہ اس کی طرف نہیں گیا تھا۔"

"ناصر سے پوچھتا یار!"

"اس کے پاس بھی اتنا فارغ وقت نہیں ہے۔" میں نے اس امید میں ناصر کا نمبر ملایا کہ شاید اس نے موبائل چارج کر لیا ہو اور خوش قسمتی سے کال مل گئی۔ مگر بیل جاتی رہی، اس نے کال ریسیو نہیں کی۔ مجھے فتح خان کے بارے میں سخت تجسس ہو رہا تھا۔ میں نے بیگ سے رابطہ کیا۔ "بیگ صاحب، فتح خان ہاتھ آیا؟"

بیگ کے پاس مایوس کن اطلاع تھی۔ "نہیں اسپتال میں نہ ناصر ہے اور نہ ہی فتح خان ہے۔"

"ناصر نے ایک پی سی او سے کال کی تھی۔ ابھی رات کے بارہ بجے ہیں۔ اتنی سردی میں دکانیں اور پی سی اوز بھی جلدی بند ہو جاتے ہیں۔ ممکن ہے اسے کال کرنے کا کوئی ذریعہ نہ ملا ہو یا وہ ایک بار پھر فتح خان کے تعاقب میں ہو۔ اس وجہ سے کال ریسیو نہیں کر پا رہا ہو۔ عبداللہ سے بولیں، اسی علاقے میں آس پاس رہے۔ اسے ناصر کا نمبر دے دیں۔ اس کے موبائل پر بیل جا رہی ہے لیکن وہ ریسیو نہیں کر رہا ہے۔ عبداللہ کوشش کرتا رہے۔"

"میرے پاس ناصر کا ایک نمبر ہے۔" بیگ نے نمبر بتایا۔

"یہی ہے۔" عبداللہ اسی پر کوشش کرے اور اسے ناصر مل جائے تو اسے یہاں لے آئے۔"

"کیا یہ غیر محتاط اقدام نہیں ہوگا؟" اس نے پوچھا۔

"ناصر کو آپ سفیر کی طرح سمجھیں۔ وہ مکمل طور پر با اعتماد شخص ہے۔ صحافی ہے اور ہمارے دشمنوں سے بڑی اچھی طرح واقف ہے۔ یہ میں اپنی ذمے داری پر کہہ رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، میں عبداللہ سے کہہ دیتا ہوں۔ وہ اسے یہاں لے آئے گا۔"

سونیا غور سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ "کیا بات ہے شہباز بھائی، آپ اس پر زیادہ ہی اعتماد نہیں کر رہے ہیں؟"

"اس نے خود کو اس اعتماد کا اہل ثابت کیا ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "سونیا، وہ پُر خلوص آدمی ہے۔"

میرے الفاظ پر سونیا نے چونک کر مجھے دیکھا تھا پھر سر جھکا لیا۔ مونا نے میری طرف دیکھا۔ "شوبی، کل ہم وسیم بھائی اور شکیل کے لئے فاتحہ اور ایصالِ ثواب کریں گے، صبح ناشتے کے بعد۔"

"کیوں نہیں۔" میں کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "اب نیند آ رہی ہے، میں سوؤں گا۔"

میں اپنے کمرے میں آیا۔ سفیر آتے ہوئے میرے کپڑے اور دوسری چیزیں ایک بیگ میں ڈال کر لے آیا تھا۔ میں نے رات کا لباس پہنا۔ منہ ہاتھ دھو کر دانت صاف کئے اور سونے کے لئے لیٹ گیا۔ موبائل میں

نے پاس رکھ لیا تھا، اس کا چارج خاصا کم ہو گیا تھا اس لئے اسے چارجر پر لگا دیا۔ تھکن کے باوجود مجھے جلدی نیند نہیں آئی تھی۔ ایک طرف میں اپنے دشمنوں سے نمٹنے کے لئے اقدامات کر رہا تھا، دوسری طرف راجا عمر دراز مجھے اپنے ساتھ بھارت لے جانے پر مُصر تھا۔ اس نے ڈیوڈ شا اور حکیم قادس کو بھی نظر انداز کر دیا تھا جن کے بارے میں پتا تھا کہ وہ کہاں ہیں اور دوسری طرف وہ فتح خان کے پیچھے اپنی فوج دوڑا رہا تھا۔ اکثر اوقات راجا عمر دراز کے اقدامات میری سمجھ میں نہیں آتے تھے یعنی وہ مجھے پوری بات نہیں بتاتا تھا اور نہ ہی اس نے کبھی اپنی پالیسی واضح کرنے کی کوشش کی کہ وہ آخر ان لوگوں سے نمٹنے کے لئے کیا کرنا چاہتا ہے؟

صبح نو بجے مجھے دروازے پر دستک نے بیدار کیا۔ ''یس!'' میں نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔

بیگ اندر آیا۔ ''آپ کو راجا صاحب نے یاد کیا ہے۔''

''میں نصف گھنٹے میں آتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ واش روم میں ایک تیز شاور لے کر میں نے کپڑے بدلے اور باہر آیا۔ راجا عمر دراز چھت پر دھوپ میں کرسی پر دراز میرا منتظر تھا۔ ''آؤ شہباز! میں نے ناشتے کے لئے کہہ دیا ہے۔ تم ناشتا کرلو، پھر بات کرتے ہیں۔''

''راجا صاحب، فتح خان کا پتا چلا؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ ایک بار پھر ہاتھ سے نکل گیا ہے البتہ ناصر زخمی حالت میں مل گیا تھا، اسے یہاں لے آئے تھے۔''

''زیادہ زخمی تھا؟'' میں نے تشویش سے پوچھا۔

''نہیں، اس صورت میں اسپتال لے جاتے۔ معمولی زخم تھے، اب ٹھیک ہے۔ سو رہا ہے۔''

''شکر ہے۔'' میں نے گہرا سانس لیا۔ ''راجا صاحب معذرت کے ساتھ۔ آپ کی گزشتہ رات کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ آپ فتح خان کو پکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن ڈیوڈ شا اور اس کے قبضے میں موجود حکیم قادس کو آپ نے نظر انداز کر دیا ہے جبکہ آپ جانتے ہیں وہ کہاں ہے؟''

''اس کی بعض وجوہات ہیں۔'' راجا عمر دراز نے مبہم انداز میں کہا۔ ''چند دن پہلے میری فون پر حکیم قادس سے بات ہوئی تھی اس کے بعد میں نے فیصلہ کیا ہے کہ فی الحال اسے آزاد نہیں کرانا۔''

میں نے غور کیا۔ ''کیا وہ آپ کے لئے جاسوسی کرے گا؟''

''نہیں، اس میں اتنی صلاحیت نہیں ہے۔ دوسرے وہ قید میں ہے۔ اس سے بات ڈیوڈ شا نے کرائی تھی۔'' راجا عمر دراز نے کہا۔

''اس کے باوجود اسے ڈیوڈ شا کی تحویل میں رکھنا چاہتے ہیں؟''

''ہاں اور اس کی کیا وجہ ہے، یہ میں ابھی نہیں بتا سکتا۔''

اس اثنا میں ناشتا آ گیا۔ سفیر، مونا اور سونیا ابھی تک سو رہے تھے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر راجا عمر دراز کے ساتھ چائے نوش کرتے ہوئے میں نے آج رات ہونے والے سفر پر بات کی۔ ''تمام معاملات طے پا گئے ہیں۔ تم ایک سکھ کے گیٹ اَپ میں سرحد پار جاؤ گے۔ تمام انتظامات مکمل ہو چکے ہیں۔ تم سات آٹھ بجے نکلو گے اور نصف رات کے قریب سرحد پار کر جاؤ گے۔ صبح روشنی سے پہلے تم سڑک کے راستے جالندھر تک جاؤ گے۔

وہاں سے تمہارے لئے آسام جانے کا بندوبست ہوگا۔"

"آسام!" میں چونکا۔

وہ مسکرایا۔"ہاں آسام، جہاں میں نے پُراسرار وادی کی طرف سفر کا آغاز کیا تھا۔"

"اور آپ کہہ رہے تھے کہ آپ کا اس طرف جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے؟"

"بالکل۔ بلکہ میں ڈیوڈ شا کو روکنے کے لئے جارہا ہوں۔ اس کی کہانی بھی لمبی ہے، یہ بات تمہیں وہیں جاکر پتا چلے گی۔"

میں نے سر ہلایا۔"آپ نے کہا تھا اپنے سفر کا بقیہ حصہ آج سنائیں گے۔"

"ہاں ارادہ تو یہی تھا لیکن فی الحال ایک مسئلہ سامنے آیا ہے اور میں اس میں الجھا ہوں۔ یعنی فتح خان، عبداللہ نے اس کا تعاقب کیا تھا لیکن وہ سنت نگر نامی کسی آبادی میں اس کا سراغ کھو بیٹھا تھا۔ وہ اب اسے تلاش کررہا ہے، کچھ تمہارے دوست ناصر کا مسئلہ بھی تھا اسے طبی امداد دینا تھی۔"

میں نے راجا عمر دراز کو جامی شاہ، شاہ نواز، ڈیوڈ شا اور راشد فاروقی کے آپس میں تعلقات کے بارے میں بتایا تھا۔"فی الحال جامی شاہ ہمارا دشمن نہیں رہا ہے، میں نے راشد کے لڑکے اور شاہ نواز کے گرگے کو اس کے حوالے کرکے ایک طرح سے اپنا زیر بار کرلیا ہے۔"

"یہ اتنے ہی احسان شناس ہوتے ہیں جتنا سانپ ہوسکتا ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے جامی شاہ کے آدمی ابھی ہماری راہ میں نہیں ہیں جبکہ شاہ نواز بھی اپنی پوزیشن مستحکم کرنے میں لگا ہے۔ ہمیں اصل خطرہ فتح خان اور ڈیوڈ شا سے ہے۔"

"امید ہے آج یہ زہریلا سانپ بھی قابو میں آجائے گا۔"

"ایک بار پھر معذرت کے ساتھ۔ مجھے یہ کام بے حد مشکل لگ رہا ہے۔ فتح خان کو جہاں تک میں نے دیکھا ہے، وہ بے حد شاطر اور قسمت کا دھنی انسان ہے۔ کل رات میں نے اسے بے ہوش کردیا تھا لیکن ایسی جگہ جہاں سے میں اسے لے جا بھی نہیں سکتا تھا۔ کتنی ہی بار وہ میرے قبضے میں آنے کے بعد نکل گیا۔"

"میرے آدمی اسے سرگرمی سے تلاش کررہے ہیں۔ مجھے یقین ہے وہ ہمیشہ مجھ سے نہیں بچے گا۔ کبھی نہ کبھی میرے قابو میں آئے گا۔"

"فرض کرلیں وہ آپ کے قابو میں آجاتا ہے تو آپ اسے کیا سزا دیں گے۔"

"میں نہیں، میرے علاقے کا جرگہ اسے سزا دے گا۔ اس کے تمام جرائم مع ثبوت جرگے کے سامنے پیش کئے جائیں گے۔ جرگہ اس کے جرائم دیکھ کر اسے سزا دے گا۔"

چائے نوشی کے بعد راجا عمر دراز رخصت ہوگیا۔ میں نیچے آیا۔ ایک ملازم نے ناصر کے کمرے تک میری رہنمائی کی۔ وہ جاگ رہا تھا اور سر کی پٹی پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ اپنے لمبے بالوں اور ہلکی داڑھی کے ساتھ وہ ستر کی دہائی کا کوئی ہپی لگ رہا تھا۔ دائیں آنکھ کے نیچے سے گال سوجا ہوا تھا۔"یہ حال کس نے کیا؟"

"تمہارے فتح خان نے۔" وہ منہ بنا کر بولا۔"میں ان کی گاڑی کی ڈکی میں تھا اور بدقسمتی سے عین موقعے پر موبائل بول اٹھا۔ عبداللہ کی کال تھی، میں نے آدھی بیل پر ریسیو کرلی تھی مگر بدبخت فتح خان نے سن لی

اور کار روک کر مجھے ڈکی سے برآمد کرلیا۔اس کے بعد جو ہوا وہ جناب کو نظر آرہا ہے۔"

"ہاں،اور بچت کیسے ہوئی؟"

"میں نے کال کاٹی نہیں تھی اور بلند آواز سے واویلا کرتے ہوئے عبداللہ کو محل وقوع سے آگاہ کردیا۔ خوش قسمتی سے وہ پاس ہی تھا،دومنٹ میں آگیا۔تیسرا منٹ ہوتا تو میں مارا جاتا۔وہ بھاگے اور عبداللہ ان کے پیچھے گیا تھا۔اس طرح جان بچ گئی۔ظالم نے سر پر پستول کی نال ماری تھی شکر ہے گولی نہیں ماری۔"

"اب کیسا ہے؟"

"سر سے زیادہ پیٹ میں درد ہو رہا ہے،مارے بھوک کے۔"

میں اسے اوپر اپنے کمرے میں لایا۔باقی سب بھی جاگ گئے تھے۔میں نے ناشتے کا کہہ دیا۔سفیر نے ناصر کا حال چال دریافت کیا۔سونیا چپ رہی تھی۔البتہ وہ دزدیدہ نظروں سے ناصر کو دیکھ رہی تھی۔ناشتا آیا،ان سب نے مل کر ناشتا کیا،اس دوران میں،مَیں نے ناصر کو راجا عمر دراز کے پلان سے آگاہ کیا۔اس نے انڈے پراٹھے پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔"آج کل سرحد پر سختی ہے۔مطلب یہ کہ غیر قانونی کام کرنے والوں کے سوا کسی کو آنے جانے کی اجازت نہیں،دراصل جب سے دونوں طرف کے بھولے جاسوس غلطی سے سرحد پار کر کے جانے لگے ہیں،دونوں طرف سے سختی ہوگئی ہے۔"

"راجا نے کوئی بندوبست کیا ہے۔مجھ پر سکھ کا گیٹ اَپ کیا جائے گا۔"

مونا نے ناشتا چھوڑا اور ہنسنا شروع کردیا۔"اللہ،شوبی تم سکھ بن کر کیسے لگو گے؟"

"سکھ بن کر نہیں،اس کے گیٹ اَپ میں۔"میں نے تصحیح کی۔"ویسے امید ہے ہینڈسم ہی لگوں گا۔"

"اب نہ جانے کب ہم ایک دوسرے سے ملیں۔"مونا افسردہ ہوگئی تھی اور اس سے پہلے کہ وہ رو کر ماحول افسردہ کرتی،میں نے اسے ڈانٹا"خبردار جو آنسو بہائے۔کیا ہم ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہے ہیں؟"

"میرا تو ابھی سے دل بیٹھا جا رہا ہے۔"مونا بولی۔

"فکر مت کرو،دبئی جاکر دل خود بخود کھڑا ہو جائے گا۔"سفیر نے اسے تسلی دی۔"سنا ہے دبئی دنیا کا سب سے خوبصورت شہر بن گیا ہے۔"

مونا اور سفیر اس دین میں جا رہے تھے جو گزشتہ رات ہمیں لائی تھی۔جانے سے پہلے سفیر میرے سینے سے لگا تو میرا دل چاہا اسے یونہی دبوچے رکھوں۔میرا یار،جس سے میں نے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی تھی جو میرا دایاں بازو تھا۔اس سے جدا ہونے کو دل نہیں چاہ رہا تھا،پھر مونا مجھ سے چمٹ کر اس طرح روئی کہ میری آنکھیں بھی نم ہوگئی تھیں۔میں اسے چپ کراتا رہا۔

"شوبی!ہم جلد آجائیں گے۔"اس نے کہا۔"پھر ہم ایک جگہ رہیں گے۔"

"ان شاءاللہ!"میں نے اس کے آنسو صاف کیے۔"سفیر اس کا خیال رکھنا۔"

"کہنے کی ضرورت ہے۔"اس نے دانت نکالے۔"یہ تو تم اس سے کہو،مجھے خیال رکھنے کا موقع دے۔"

مونا جھینپ گئی تھی پھر اس نے خونخوار نظروں سے سفیر کی طرف دیکھا۔"تم چلو تو دبئی!"

ان کے جانے کے بعد میں اور سونیا اندر آئے تو ہمارے دل بوجھل اور اداس تھے۔بیگ کا فون آیا۔

''شہباز صاحب، میں نے راجا صاحب سے کہہ دیا ہے۔ دو افراد ہونے سے اب روانگی کل یا پرسوں ہوگی۔''

''یہ تو اچھی بات ہے۔''

''اچھی بات نہیں ہے۔ مرشد علی خود یہاں آ گیا ہے۔ شاید اسے فتح خان نے اطلاع دی ہے اور وہ سرکاری حکام پر دباؤ ڈال رہا ہے کہ آپ کو گرفتار کیا جائے۔ گزشتہ چند روز میں ہونے والی قتل و غارت اور ہنگامہ آرائی کا ملبہ بھی آپ پر ڈالنے کی تیاری کی جا رہی ہے۔''

''مرشد علی کب آیا؟''

''گزشتہ رات یا شاید صبح کے وقت آیا ہے اور پرل کانٹی نینٹل میں ٹھہرا ہے۔ وہیں سرکاری حکام سے مل رہا ہے۔''

''یہ تشویش ناک خبر تھی۔ مرشد علی کی آمد سے میرے دشمنوں کی تکون مکمل ہو گئی تھی۔ اس کی آمد سے پولیس میرے خلاف متحرک ہو سکتی تھی کیونکہ مرشد علی سیاست دان تھا اور صوبائی حکومت پر اثر و رسوخ رکھتا تھا۔ اس سے میری نقل و حرکت محدود ہو سکتی تھی۔ اس کے باوجود مجھے خوشی تھی کہ مجھے ابھی یہاں کچھ دن رکنے کا موقع ملے گا۔ میں سوچنے لگا، اس موقع سے فائدہ اٹھاؤں جب دشمن میرے لئے کوئی رعایت دینے کو تیار نہیں تھا تو میں بھی ان کی ٹانگ کھینچ سکتا تھا۔ سفیر نے روانگی سے پہلے مجھے ائیر پورٹ سے کال کی تھی۔ ''یار میرا جانے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا۔''

''بکواس نہ کر۔ تو ایسی باتیں کرے گا تو مونا تو بالکل ہمت ہار دے گی۔ خود کو مضبوط کر یار! اسے بھی حوصلہ دے۔ تم دونوں کو اور ہمیں اس آزمائش سے گزرنا ہی ہوگا۔''

''آزمائش تو تیرے لئے ہے۔ ہم سکون سے جا کر بیٹھ جائیں گے۔''

''تم دونوں میرے لئے دعا کرو گے۔''

''شوبی، ہم عملی طور پر کچھ کرنا چاہتے ہیں۔''

''وہ بھی کرو گے لیکن ابھی نہیں، ابھی تم دونوں کا جانا ہی بہتر ہے۔''

مونا نے بات کی اور روتی رہی۔ آخر ان کی فلائٹ کا وقت قریب آیا تو انہوں نے رابطہ ختم کیا۔ میں اپنے کمرے میں تھا اور سونیا اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ ایک خادم نے بتایا کہ راجا اور بیگ عمارت میں نہیں وہ کہیں باہر گئے تھے۔ میں نے جامی شاہ کے نمبر پر رابطہ کیا۔

''کیا حال ہیں جامی شاہ، لڑکے مل گئے؟''

''ہاں۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''بولو کیا کہنا چاہتے ہو۔''

''کچھ نہیں۔'' میں ہنسا۔ ''ہاں ایک خبر ہے۔ شاہ نواز کا سب سے بڑا حمایتی مرشد علی بذات خود اسے سپورٹ کرنے کے لئے یہاں آ گیا ہے اور پی سی میں رکا ہے۔''

''میں جانتا ہوں، لیکن یہ غلط ہے۔ وہ شاہ نواز کی مدد کے لئے نہیں تمہارے لئے آیا ہے۔''

بھولے بادشاہ! میرے لئے اسے خود آنے کی کیا ضرورت تھی، میں تو اندھا تیر ہوں اور اندھے تیر سے سب دور رہنا پسند کرتے ہیں۔ جب مرشد علی کے لے پالک کتے پوری سرگرمی سے میرا تعاقب کر رہے ہیں تو

اور کار روک کر مجھے ڈکی سے برآمد کرلیا۔اس کے بعد جو ہوا وہ جناب کو نظر آرہا ہے۔''

''ہاں،اور بچت کیسے ہوئی؟''

''میں نے کال کاٹی نہیں تھی اور بلند آواز سے واویلا کرتے ہوئے عبداللہ کو محل وقوع سے آگاہ کردیا۔ خوش قسمتی سے وہ پاس ہی تھا،دو منٹ میں آ گیا۔تیسرا منٹ ہوتا تو میں مارا جاتا۔وہ بھاگے اور عبداللہ ان کے پیچھے گیا تھا۔اس طرح جان بچ گئی۔ظالم نے سر پر پستول کی نال ماری تھی شکر ہے گولی نہیں ماری۔''

''اب کیسا ہے؟''

''سر سے زیادہ پیٹ میں درد ہو رہا ہے،مارے بھوک کے۔''

میں اسے اوپر اپنے کمرے میں لایا۔باقی سب بھی جاگ گئے تھے۔میں نے ناشتے کا کہہ دیا۔سفیر نے ناصر کا حال چال دریافت کیا۔سونیا چپ رہی تھی۔البتہ وہ دزدیدہ نظروں سے ناصر کو دیکھ رہی تھی۔ناشتا آیا،ان سب نے مل کر ناشتا کیا،اس دوران میں،مَیں نے ناصر کو راجا عمر دراز کے پلان سے آگاہ کیا۔اس نے انڈے پراٹھے پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔''آج کل سرحد پر سختی ہے۔مطلب یہ کہ غیر قانونی کام کرنے والوں کے سوا کسی کو آنے جانے کی اجازت نہیں،دراصل جب سے دونوں طرف کے بھولے جاسوس غلطی سے سرحد پار کر کے جانے لگے ہیں،دونوں طرف سے سختی ہوگئی ہے۔''

''راجا نے کوئی بندوبست کیا ہے۔مجھ پر سکھ کا گیٹ اَپ کیا جائے گا۔''

مونا نے ناشتا چھوڑا اور ہنسنا شروع کردیا۔''اللہ،شوبی تم سکھ بن کر کیسے لگو گے؟''

''سکھ بن کر نہیں،اس کے گیٹ اَپ میں۔''میں نے تصحیح کی۔''ویسے امید ہے ہینڈسم ہی لگوں گا۔''

''اب نہ جانے کب ہم ایک دوسرے سے ملیں۔''مونا افسردہ ہوگئی تھی اور اس سے پہلے کہ وہ رو کر ماحول افسردہ کرتی،میں نے اسے ڈانٹا۔''خبردار جو آنسو بہائے۔کیا ہم ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہے ہیں؟''

''میرا تو ابھی سے دل بیٹھا جا رہا ہے۔''مونا بولی۔

''فکر مت کرو،دبئی جا کر دل خود بخود کھڑا ہو جائے گا۔''سفیر نے اسے تسلی دی۔''سنا ہے دبئی دنیا کا سب سے خوبصورت شہر بن گیا ہے۔''

مونا اور سفیر اس وین میں جا رہے تھے جو گزشتہ رات ہمیں لائی تھی۔جانے سے پہلے سفیر میرے سینے سے لگا تو میرا دل چاہا اسے یونہی دبوچے رکھوں۔میرا یار،جس سے میں نے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی تھی جو میرا دایاں بازو تھا۔اس سے جدا ہونے کو دل نہیں چاہ رہا تھا،پھر مونا مجھ سے چمٹ کر اس طرح روئی کہ میری آنکھیں بھی نم ہوگئی تھیں۔میں اسے چپ کراتا رہا۔

''شوبی!ہم جلد آ جائیں گے۔''اس نے کہا۔''پھر ہم ایک جگہ رہیں گے۔''

''ان شاءاللہ!''میں نے اس کے آنسو صاف کئے۔''سفیر اس کا خیال رکھنا۔''

''کہنے کی ضرورت ہے۔''اس نے دانت نکالے۔''یہ تو تم اس سے کہو،مجھے خیال رکھنے کا موقع دے۔''

مونا جھینپ گئی تھی پھر اس نے خونخوار نظروں سے سفیر کی طرف دیکھا۔''تم چلو تو دبئی!''

ان کے جانے کے بعد میں اور سونیا اندر آئے تو ہمارے دل بوجھل اور اداس تھے۔بیگ کا فون آیا۔

''شہباز صاحب، میں نے راجا صاحب سے کہہ دیا ہے۔ دو افراد ہونے سے اب روانگی کل یا پرسوں ہوگی۔''

''یہ تو اچھی بات ہے۔''

''اچھی بات نہیں ہے۔ مرشد علی خود یہاں آ گیا ہے۔ شاید اسے فتح خان نے اطلاع دی ہے اور وہ سرکاری حکام پر دباؤ ڈال رہا ہے کہ آپ کو گرفتار کیا جائے۔ گزشتہ چند روز میں ہونے والی قتل و غارت اور ہنگامہ آرائی کا ملبہ بھی آپ پر ڈالنے کی تیاری کی جا رہی ہے۔''

''مرشد علی کب آیا؟''

''گزشتہ رات یا شاید صبح کے وقت آیا ہے اور پرل کانٹی نینٹل میں ٹھہرا ہے۔ وہیں سرکاری حکام سے مل رہا ہے۔''

''یہ تشویش ناک خبر تھی۔ مرشد علی کی آمد سے میرے دشمنوں کی تکون مکمل ہو گئی تھی۔ اس کی آمد سے پولیس میرے خلاف متحرک ہو سکتی تھی کیونکہ مرشد علی سیاست دان تھا اور صوبائی حکومت پر اثر و رسوخ رکھتا تھا۔ اس سے میری نقل و حرکت محدود ہو سکتی تھی۔ اس کے باوجود مجھے خوشی تھی کہ مجھے ابھی یہاں کچھ دن رکنے کا موقع ملے گا۔ میں سوچنے لگا، اس موقع سے فائدہ اٹھاؤں جب دشمن میرے لئے کوئی رعایت دینے کو تیار نہیں تھا تو میں بھی ان کی ٹانگ کھینچ سکتا تھا۔ سفیر نے روانگی سے پہلے مجھے ائیر پورٹ سے کال کی تھی۔ ''یار میرا جانے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا۔''

''بکواس نہ کر۔ تو ایسی باتیں کرے گا تُو مونا تو بالکل ہمت ہار دے گی۔ خود کو مضبوط کر یار! اسے بھی حوصلہ دے۔ تم دونوں کو اور ہمیں اس آزمائش سے گزرنا ہی ہوگا۔''

''آزمائش تو تیرے لئے ہے۔ ہم سکون سے جا کر بیٹھ جائیں گے۔''

''تم دونوں میرے لئے دعا کرو گے۔''

''شوبی، ہم عملی طور پر کچھ کرنا چاہتے ہیں۔''

''وہ بھی کرو گے لیکن ابھی نہیں، ابھی تم دونوں کا جانا ہی بہتر ہے۔''

مونا نے بات کی اور روتی رہی۔ آخر ان کی فلائٹ کا وقت قریب آیا تو انہوں نے رابطہ ختم کیا۔ میں اپنے کمرے میں تھا اور سونیا اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ ایک خادم نے بتایا کہ راجا اور بیگ عمارت میں نہیں وہ کہیں باہر گئے تھے۔ میں نے جامی شاہ کے نمبر پر رابطہ کیا۔

''کیا حال ہیں جامی شاہ، لڑکے مل گئے؟''

''ہاں۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''بولو کیا کہنا چاہتے ہو۔''

''کچھ نہیں۔'' میں ہنسا۔ ''ہاں ایک خبر ہے۔ شاہ نواز کا سب سے بڑا حمایتی مرشد علی بذات خود اسے سپورٹ کرنے کے لئے یہاں آ گیا ہے اور پی سی میں رکا ہے۔''

''میں جانتا ہوں، لیکن یہ غلط ہے۔ وہ شاہ نواز کی مدد کے لئے نہیں تمہارے لئے آیا ہے۔''

بھولے بادشاہ! میرے لئے اسے خود آنے کی کیا ضرورت تھی، میں تو اندھا تیر ہوں اور اندھے تیر سے سب دور رہنا پسند کرتے ہیں۔ جب مرشد علی کے لے پالک کتے پوری سرگرمی سے میرا تعاقب کر رہے ہیں تو

اسے آنے کی کیا ضرورت تھی، ویسے بھی میرے پیچھے تمہارے کتنے آدمی مارے گئے ہیں؟''

''شہباز!'' وہ غرایا۔ ''تمہیں ان سب کا حساب دینا ہوگا۔''

''او کے، لیکن اس کے لئے خود آنا۔ ان بے چاروں کو کیوں مرواتے ہو۔ جیسے مرشد علی تم جیسے لوگوں کو آگے کر دیتا ہے۔'' میں نے کہا اور کال کاٹ دی۔ اس کے بعد ناصر سے رابطہ کیا۔

''ہم ائیر پورٹ سے نکل رہے ہیں، طیارہ پرواز کر گیا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''ابھی تصویر کے سلسلے میں جا رہے ہیں۔''

''ناصر، میرے لئے ایک سادہ نیا موبائل لے کر بھیج دینا۔ جس کی بیٹری زیادہ چلتی ہو۔ تمہارے موبائل کی بیٹری مری ہوئی ہے۔ بار بار چارج کرنا پڑتا ہے۔''

''او کے، اگر میں نہ آسکا تو عبداللہ کے ہاتھ بھیج دوں گا۔'' اس نے کہا۔ ''ممکن ہے آج مجھے کام ہو۔''

'''ناصر، مرشد علی کے بارے میں جاننے کی کوشش کرو۔ تم صحافی ہو اس کور میں اُس کے پاس جا سکتے ہو۔''

''میں کوشش کروں گا۔ ویسے ابھی میرے موبائل پر اطلاع آئی ہے۔ جامی شاہ کے جی ٹی روڈ والے اڈے کی طرف سے فائرنگ کی زبردست آوازیں آ رہی ہیں اور پولیس اس طرف جانے سے گریز کر رہی ہے۔''

''اس کا مطلب ہے جامی شاہ اور شاہ نواز کے گروپوں میں ٹھن گئی ہے۔''

''امکان یہی ہے۔''

ناصر سے بات کر کے میں نے موجودہ صورتِ حال پر غور کیا۔ ڈیوڈ شا ایک زرعی تجربہ گاہ کے چکر میں تھا اور وہ وہاں شاید حکیم قادس کی دواؤں کو چیک کرانا چاہتا تھا اس کے بعد بقول راجا عمر دراز کے وہ بھارت کا رخ کرتا۔ فتح خان اس کے لئے کام کر رہا تھا۔ اسے بلانے کا مقصد یہی ہو سکتا تھا کہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو اس کے ساتھ الجھایا جائے اور اس کی آڑ میں ڈیوڈ شا سکون سے اپنا مقصد حاصل کر لے۔ دوسری طرف مرشد علی تھا، مجھے کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ میرے لئے دوڑا آیا تھا۔ وہ ہر قیمت پر مجھے اور میرے ساتھیوں کو اپنے قبضے میں دیکھنا چاہتا تھا تاکہ ہم سے من مانی شرائط منوا کر اپنے انتقام کی تسکین کر سکے۔ ان میں ڈیوڈ شا زیادہ خطرناک تھا۔ اس نے کتنی ذہانت سے مجھے اور میرے ساتھیوں کو استعمال کیا۔ وہ تو خدا کو راجا عمر دراز کی زندگی منظور تھی اس لئے بچت ہوگئی۔

البتہ ڈیوڈ شا کی طرف سے ایک اطمینان تھا۔ وہ محض کام سے کام رکھنے والا آدمی تھا اور ذاتی انتقام کے چکر میں نہیں پڑتا تھا۔ وہ اپنا مقصد حاصل کر کے یہاں سے چلا جاتا، اس کے مقابلے میں مرشد علی کو یہیں رہنا تھا اور اس کے اندر وہ وحشی اَنا پوری طرح توانا تھی جو جاگیرداری نظام کا خاصہ ہوتی ہے۔ وہ کبھی مجھ سے سمجھوتا نہیں کرتا اور جب اسے موقع ملتا وہ مجھے مار کر اپنے انتقام کی تسکین کر لیتا۔ میری وجہ سے اس کا بھائی معذور ہو کر بستر پر بے بس پڑا تھا۔ آخری اطلاعات کے مطابق دبئی اور لندن میں بھی اس کا علاج ناکام رہا تھا اور وہ واپس لوٹ آیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ موبائل فون کی بیل بجی۔ کوئی انجانا نمبر تھا۔ میں نے کال ریسیو کی۔

''شہباز ملک!'' کسی نے قدرے بھاری اور بارعب آواز میں کہا۔

''ہاں۔''میں نے الجھن کے ساتھ کہا۔

''میں مرشد بات کر رہا ہوں۔''

مجھے جھٹکا سا لگا تھا۔ میں جس شیطان کے بارے میں سوچ رہا تھا، اس کا اچانک فون آ جائے گا میں نے سوچا بھی نہیں تھا لیکن میں نے جلد خود پر قابو پالیا اور سپاٹ لہجے میں بولا۔''کہو مرشد...... تمہارے پاس صرف ایک منٹ ہے اس کے بعد میں کال کاٹ دوں گا۔''

''فکر مت کرو، میں تمہاری جگہ کا سراغ......''

''کام کی بات کرو۔''میں نے اس کی بات کاٹی۔

''شہباز، میں تم سے سمجھوتا کرنا چاہتا ہوں۔''

''حیرت ہے، تم جیسا شخص سمجھوتے کی بات کر رہا ہے۔ مجھ سے اور میرے ساتھیوں سے انتقام نہیں لو گے؟''میں نے طنز کیا۔''ویسے یہ تمہاری سرشت نہیں ہے۔''

''مجبوری ہے، اس جھگڑے کی وجہ سے میری سیاسی ساکھ کو نقصان ہوا ہے۔ مخالف پارٹی اسے اچھال رہی ہے۔''اس نے وجہ بیان کی۔

''اس لئے تم مجھ سے صلح چاہتے ہو۔ تم میرے لئے کیا کرو گے؟''

''میں سارے مقدمات واپس لے لوں گا اور تمہارے تمام نقصان کی تلافی کر دوں گا۔''

''اور اس کے بعد ایک دن نامعلوم قاتل خاموشی سے ہمیں قتل کر جائیں گے۔''

''نہیں، ایسا نہیں ہوگا۔ میں ضمانت دیتا ہوں۔ اس صلح کو مستقل کرنے کے لئے میرے پاس ایک تجویز ہے اگر تم مانو تو؟''

''تمہاری تجویز میں بعد میں سنوں گا۔''میں نے کہا اور کال کاٹ کر موبائل آف کر دیا۔ ایک منٹ پورا ہو گیا تھا۔ مرشد علی سے یہ سوال کرنا بے کار تھا کہ اس نے میرا نمبر کہاں سے تلاش کیا۔ کہیں نہ کہیں سے بات لیک ہوئی تھی۔ عمارت میں لینڈ لائن فون اور ایک وائرلیس فون بھی تھا، میں نے وائرلیس فون سے عبداللہ سے رابطہ کیا۔''مرشد علی نے میرا یہ موبائل نمبر تلاش کر لیا ہے۔ اب مجھے اس پر کال مت کرنا بلکہ میرے لئے ایک کنکشن اور لیتے آنا۔''

''جی اچھا!''اس نے کہا۔

میں نے ناصر اور بیگ کو بھی اطلاع کر دی۔ میں فون کر کے واپس آیا تو سونیا کمرے میں تھی۔''شہباز بھائی، ہم کب جائیں گے؟''

''فی الحال نہیں، تمہارے لئے پلان تبدیل ہوگا، اب دو تین دن لگیں گے۔''

''سفیر اور مونا کی فلائٹ چلی گئی؟''

''ہاں، اسے تو ایک گھنٹا ہونے والا ہے۔ دو گھنٹے میں وہ دبئی پہنچ جائیں گے۔''

''بھائی، میں آپ کو کنگ فو کے کچھ داؤ سکھاؤں؟''اس نے پیش کش کی۔ میں خود بور ہو رہا تھا، حد سے زیادہ بھاگ دوڑ کے بعد جب کچھ دیر کے لئے کہیں سستانے کا موقع ملتا تھا تو کچھ دیر بعد ہی بوریت شروع ہو

جاتی تھی میں نے آمادگی ظاہر کی۔ تیسری منزل پر ایک وسیع ہال تھا جس کے فرش پر دبیز قالین تھا۔ یہ جگہ غا
سونے کے لئے مخصوص تھی۔ میں اور سونیا لباس بدل کر اوپر آئے۔ اس نے مجھے عملی جدوجہد کے لئے چند دا
سکھائے یعنی مجھے کسی سخت جان حریف سے واسطہ پڑ جائے تو میں اسے کس طرح بے بس اور ناکارہ کر سکتا تھا۔
مجھے حیرت ہوئی، ان میں سے ہر داؤ مہلک تھا۔ سونیا مجھے تفصیل سے بتاتی بھی رہی تھی۔ کنگ فو کے داؤ توازن
اور جارحیت کے اصول پر ہوتے ہیں، ان میں سے ایک اصول بھی ترک کیا جائے تو داؤ بے کار ہو جاتا ہے۔
جوڈو کراٹے میں مخالف کی جسمانی طاقت اور حرکت سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے لیکن کنگ فو میں زیادہ تر اپنی توانائی
اور مخالف کے حملے کے جواب میں مؤثر حملے سے اسے زیر کیا جاتا ہے۔

"آپ کسی بھی داؤ میں طاقت یا رفتار کم کر کے اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکتے۔" سونیا نے کہا۔ "کراٹے
اور جوڈو کا فن ایسا ہے جیسے آپ ایک تالاب میں تیرتے درخت کے تنوں پر پاؤں رکھتے ہوئے دوسری طرف ج
رہے ہیں لیکن کنگ فو میں آپ تالاب کو مگرمچھوں پر پاؤں رکھ کر کراس کر رہے ہیں۔ اس میں ناکامی کا مطلب
موت بھی ہو سکتا ہے۔"

"یعنی اس میں کوئی ریگولیٹر نہیں ہے۔ داؤ اپنے پورے اسکیل کے مطابق کرنا ہوگا۔"

"ریگولیٹر بھی ہوتا ہے لیکن وہ ماسٹرز کے لئے ہے۔ اس کے لئے بے پناہ مہارت اور چابک دستی چاہئے
ہم جیسے لوگ اسے استعمال نہیں کر سکتے ہیں۔"

ایک گھنٹے کی ان مشقوں نے مجھے پسینے پسینے کر دیا تھا۔ یہ بے حد سخت اور مشکل کام تھا۔ حالانکہ اوپر کے
حصے میں سردی خاصی زیادہ تھی۔ ہم نیچے آئے۔ میں نے سونیا سے مقابلہ نہیں کیا تھا کیونکہ اس کھیل میں دوستانہ
مقابلے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ غسل کر کے میں نے لباس بدلا۔ نو بجے ہم نے ڈائننگ ہال میں کھانا کھایا۔ عبداللہ
گیا تھا۔ کھانے کے بعد میں اس سے ملا۔ اس نے ایک عدد موبائل دیا۔ یہ نوکیا کا گیارہ سو ماڈل تھا۔ عبداللہ نے
بتایا۔ "اس کا اسٹینڈ بائی ٹائم آٹھ دن ہے اور چار گھنٹے سے زیادہ بات کی جا سکتی ہے اور یہ رہیں آپ کے لئے چار
عدد سم!" اس نے موبائل اور سم مجھے دیں۔ ان کے ساتھ پانچ سو والے چھ عدد کارڈز بھی تھے۔

"اب آپ کو فوری طور پر سم بدلنے میں کوئی مشکل نہیں ہوگی۔"

میں نے پہلے موبائل آن کر کے اپنے اہم نمبر نئے موبائل اور نئی سم میں فیڈ کئے۔ اس کے بعد پرانی سم
نکال کر رکھ لی۔ عبداللہ نے ایک چھوٹا سا موبائل اور نکالا۔ "یہ سونیا بی بی کے لئے ہے۔ یہ بھی ناصر صاحب نے
بھیجا ہے۔"

"تصویروں والے معاملے کا کیا ہوا؟" میں نے یہ موبائل بھی لے لیا۔

"ہم نے پرنٹر سے دو سو سے زیادہ پرنٹ نکلوا لئے تھے۔ ناصر اب اسے کالا باؤ کو دینے گیا ہے۔"

"یہ کالا باؤ کون ہے؟"

"جیب کتروں اور چوروں کا بادشاہ ہے۔ میں نے دیکھا نہیں لیکن سنا ہے۔"

"ناصر کے پاس میرے نمبرز ہیں۔"

عبداللہ نے سر ہلایا۔ "اس نے سارے نمبر اپنے موبائل میں فیڈ کر لئے تھے۔"

"مرشد علی نے میرے نمبر کا پتا کیسے چلایا ہوگا۔"

"اب یہ زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔ موبائل کمپنیوں کے پاس ایسی ڈیوائسز آ گئی ہیں جو آواز سے آدمی کو پہچان جاتی ہیں۔ کسی نمبر پر شک ہو تو اس پر یہ ڈیوائسز لگا دی جاتی ہیں اور اگر مطلوبہ آدمی بات کرتا ہے تو اس کی آواز شناخت کر لیتی ہیں۔"

"یعنی اب موبائل فون خطرناک ہو گیا ہے۔"

"سب سے خطرناک بات یہ ہے کہ آپ کو پتا ہی نہیں چلتا ہے کہ آپ پکڑے جا چکے ہیں۔"

"اس کا حل یہی ہے کہ سمز بدل بدل کر استعمال کرتے رہیں۔"

"بالکل اور ایک سم دو تین بار سے زیادہ استعمال نہ کی جائے۔"

"عبداللہ، قصور روڈ پر ایک زرعی تجربہ گاہ ہے۔ اس کے بارے میں معلوم کرنا ہے۔"

"کیا جناب! حکم کریں۔"

"وہاں پر کتنے افراد ہیں اور حفاظتی انتظامات کیا ہیں؟"

"میں کل تک معلوم کر لوں گا۔" وہ مستعدی سے بولا۔

"دوسرے مجھے شاہ نواز نامی شخص کے بارے میں مکمل معلومات درکار ہیں۔"

"جامی شاہ کا سابق دست راست!" عبداللہ بولا۔ "میں کوشش کروں گا۔"

شاید اسے اس معاملے میں بیگ کی طرف سے کوئی ہدایت نہیں ملی تھی یا را جانے یہ بات صرف مجھ سے کہی تھی کہ اسے فی الحال ڈیوڈ شا اور حکیم قادس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ممکن ہے اس میں راجا کا کوئی پلان ہو اور میرے مداخلت کرنے سے معاملہ خراب ہو۔ اس لئے عبداللہ سے کہنے کے باوجود میں نے فیصلہ کیا تھا اس معاملے میں کوئی عملی کارروائی نہیں کرنی ہے۔ البتہ مرشد علی کو جھٹکا دینے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ رات بارہ بجے کے قریب ناصر کا فون آیا۔ "مرشد علی! پی سی کے کمرا نمبر چار سو چودہ میں مقیم ہے۔ اس کے آس پاس کے دو کمرے بھی اس کے محافظوں کے پاس ہیں۔"

"معلومات کیسے ملیں؟"

"پی سی میں بھی تعلقات ہیں، وہی کام آتے ہیں لیکن سکیورٹی بہت سخت ہے، اسلحہ لے کر اندر جانا ناممکن ہے۔ بہر حال اسے چھوڑیں، میں نے آج ایک عجیب سی شے دیکھی ہے۔ میں نے جس امپورٹر سے یہ موبائل لئے ہیں اس کے پاس موبائلز سے متعلق اور بھی آلات ہیں، اس نے مجھے ایک آلہ دکھایا تھا۔ اس کا کہنا ہے اس موبائل نما آلے سے کسی بھی موبائل پر کال کرو تو یہ اس کی فریکوئنسی نوٹ کر لیتا ہے پھر اس موبائل سے کال کی جائے یا اس پر کال آئے تو یہ کال ریسیو کر لیتا ہے اور آپ سب سن سکتے ہیں۔"

"حیرت انگیز!" میں نے کہا۔ "تمہیں کیسے دکھا دیا۔"

"یہاں بھی تعلقات ہیں۔ میں نے قیمت پوچھی تو کہنے لگا کسی اور کے لئے تین لاکھ سے کم نہیں ہوگی لیکن مجھے اڑھائی لاکھ میں دے گا۔"

"آلہ درست ہے یا وہ شخص دعویٰ کر رہا ہے۔"

''نہیں یار، اس نے عملی طور پر مظاہرہ کر کے دکھایا تھا، ایک وقت میں یہ بارہ مختلف موبائلز فریکوئنسی اپنی میموری میں رکھ سکتا ہے۔''

''تو اسے بک کرالو، میں ندیم سے کہتا ہوں۔ میں نے اپنا سارا بینک بیلنس اس کے پاس ٹرانسفر کر دیا تھا۔ کل یا پرسوں تک رقم مل جائے گی۔''

''میں ابھی بول دیتا ہوں۔ آلہ تو وہ کل ہی مجھے دے دے گا۔ رقم اسے بے شک بعد میں بھی دے دی جائے۔ اچھا یہ بتاؤ، سونیا کو موبائل دے دیا ہے؟''

''ہاں، لیکن یہ نہیں بتایا ہے کہ تُو نے دیا ہے ورنہ وہ لینے سے انکار کر دیتی۔''

ناصر چپ ہو گیا تھا۔ ''اچھا یار۔ اب صبح ملیں گے۔''

''ناصر، تُو اس سے جتنی جلدی ممکن ہو وہ آلہ لے لے۔''

''میں صبح اس کا دفتر کھلتے ہی اس کے پاس چلا جاؤں گا۔''

میں اوپر آیا تو سونیا جاگ رہی تھی۔ میں نے اس کے دروازے پر دستک دی۔ ''آ جاؤ۔'' وہ اندر سے بولی۔

میں اندر آ گیا۔ ''کیا بات ہے نیند نہیں آ رہی۔''

''آپ بھی تو نہیں سوئے۔''

''میں کچھ چکروں میں پھنسا تھا۔'' میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''ابھی ایک کام اور کرنا ہے اس کے بعد جا کر سوؤں گا۔'' میں ندیم کو کال ملانے لگا۔ مگر بیل جاتی رہی اس نے ریسیو نہیں کیا۔

''شاید ندیم موبائل کی بیل آف کر کے سو رہا ہے۔'' میں نے کوشش ترک کر دی۔

''ندیم بھائی! میں نے وسیم بھائی اور شکیل سے ان کا بہت تذکرہ سنا ہے۔ وہ ہنس مکھ آدمی ہیں۔''

''جب خود موڈ میں ہو ورنہ موڈ خراب ہو تو ظالم قسم کا ابا جان بن جاتا ہے۔ میں، مونا اور سفیر اس سے بے تکلف بھی ہیں اور ڈرتے بھی ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ ہمیشہ ساتھ نبھانے والا دوست ہے آپ کو گالیاں دے گا مگر کبھی اکیلا نہیں چھوڑے گا۔''

''آپ مجھے ڈرا رہے ہیں۔ ابھی کیوں ان کو کال کر رہے ہیں؟''

''مجھے رقم کی ضرورت تھی اور میرا سارا بینک بیلنس اس کے پاس ہے۔ اس نے عقل مندی کی کہ میرے اکاؤنٹس کی بیشتر رقم اپنے اکاؤنٹ میں ڈال لی تھی۔ بعد میں میرے اکاؤنٹ سیل کر دیئے گئے تھے۔''

''آپ کو کتنی رقم چاہئے؟''

''تین لاکھ!'' میں نے کہا۔ ''اگرچہ راجا اور اس کے آدمی میری تمام ضرورتیں پوری کر رہے ہیں لیکن اتنی بڑی رقم ان سے مانگتے ہوئے مجھے شرم آ رہی ہے۔''

''مجھ سے لیتے ہوئے تو شرم نہیں آئے گی نا؟''

''تم سے...... تمہارے پاس کہاں سے آئی رقم؟''

سونیا مسکرائی۔ ''آپ کو معلوم نہیں ہے۔ میں بہت دولت مند ہوں۔ وسیم بھائی کا تمام اثاثہ میرے اور ان

کے مشترکہ اکاؤنٹس میں ہے۔ انہوں نے درجن سے بھی زیادہ اکاؤنٹس کھول رکھے تھے اور ان سب کی سائن شدہ چیک بکس میرے پاس ہیں۔ تین عدد لاکرز میں ڈالرز اور دوسری غیر ملکی کرنسیاں محفوظ ہیں، ان کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔"

"یعنی تم لوگوں نے جو چند سالوں میں کمایا، وہ سب اسی طرح محفوظ ہے؟"

"جی شہباز بھائی، ہمارا اصول تھا جگہیں خریدنے میں پیسا ضائع نہیں کرتے۔ کسی کے توسط سے جگہ کرائے پر لے لیا کرتے تھے۔ اسلحہ اور گاڑیاں ہماری اپنی ہوتی تھیں۔ اس وقت بھی شہر میں دو ٹھکانے ہیں جو محفوظ ہیں۔ ان کا عادل کو بھی نہیں پتا تھا صرف میں اور وسیم بھائی ان کے بارے میں جانتے تھے۔ ایک کشمی چوک کے پاس فلیٹ ہے۔ دوسری قصور روڈ پر ایک کوٹھی ہے۔ ان کا سال بھر کا پیشگی کرایہ دیا جا چکا ہے۔ قصور روڈ والی کوٹھی پر ایک چوکیدار اور ایک عدد جیپ بھی موجود ہے۔"

میں حیران رہ گیا تھا۔ "مجھے نہیں معلوم تھا تم اتنی صاحب دولت اور جائیداد ہو لیکن بظاہر تو تمہارے پاس کچھ نہیں ہے۔"

"ہاں، بظاہر کچھ نہیں ہے۔" اس نے سر ہلایا۔ "سب کچھ قصور روڈ والی کوٹھی میں ہے۔ وہاں نقد رقم بھی ہے۔ میرا خیال ہے دس لاکھ سے اوپر کیش ہوگا۔"

"چوکیدار کی نیت خراب ہو جائے تو؟"

"اسے معلوم ہی نہیں ہے۔ ساری کوٹھی کی چابیاں اس کے پاس ہیں۔ اسے آنے والے دو سال کی تنخواہ مع انکریمنٹ کے دی جا چکی ہے۔ وہ ہر مہینے چیک جا کر اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرا دیتا ہے۔ اسے بتا دیا ہے جب تک اس کی تنخواہ جاری ہے اس نے ڈیوٹی انجام دینی ہے، اس کے بعد وہ بے شک کہیں چلا جائے، دوسری صورت میں اسے ملک کے کسی بھی کونے سے ڈھونڈ کر سزا دی جائے گی۔"

"اس کا مطلب ہے وہ اپنی ڈیوٹی پر ہوگا۔"

"بالکل۔!" وہ یقین سے بولی۔ "کل صبح ہم چلیں گے۔ آپ کو جتنی رقم کی ضرورت ہوگی، لے لیجئے گا۔"

"ارے نہیں سونی! میں ندیم سے منگوا لوں گا۔"

"اب آپ مجھ سے غیریت برت رہے ہیں۔ جب میں آپ لوگوں کا ایک فرد بن چکی ہوں، تو کیا میری دولت آپ کے لئے نہیں ہے۔ کیا میں آپ کی کسی شے پر حق جتاؤں گی تو آپ مجھے انکار کر دیں گے۔"

"نہیں۔" میں نے لاجواب ہوتے ہوئے کہا۔

"تب پھر مجھے کیوں منع کر رہے ہیں؟ بس میں نے کہہ دیا، ہم کل چلیں گے۔ آپ خود کو وسیم بھائی کی جگہ کہتے ہیں، ان کو رقم کی ضرورت ہوتی تو کہاں جاتے؟"

"بس...... بابا! تم نے تو مجھے شرمندگی میں شرابور کر دیا ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم کل صبح چلیں گے۔"

"شہباز بھائی! کیا ہم ان لوگوں سے الگ نہیں رہ سکتے۔ اس قسم کے باادب، باملاحظہ ماحول میں میرا دم گھٹتا ہے۔"

"حیرت ہے، تم ایسے ہی ماحول میں رہتی تھیں؟"

"نہیں، وہاں سب ایک دوسرے سے بے تکلف اور ہنسنے بولنے والے لوگ تھے۔ یہاں تو کسی کے چہرے پر مسکراہٹ تک نہیں آتی۔"

"لیکن ہم یہاں محفوظ ہیں، تم جانتی ہو میرے سارے دشمن جمع ہو چکے ہیں، پولیس بھی میری تلاش میں ہے، ایسے میں ان مخلص لوگوں کا دم غنیمت ہے۔"

"اسی وجہ سے میں برداشت کر رہی ہوں۔" وہ بولی۔

کچھ دیر سونیا سے بات کر کے اور اسے تسلی دے کر میں اپنے کمرے میں سونے کے لئے چلا آیا۔ ٹیبل کلاک میں، میں نے صبح سات بجے کا الارم لگایا اور سو گیا۔ الارم نے مجھے سات بجے بیدار کر دیا تھا۔ میں نے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔ سونیا کو جگایا اور کچن میں ناشتے کا آرڈر دیا، اس کے بعد میں نے کپڑے بدلے پھر عبداللہ کو کال کی۔ "یار، قصور روڈ کی طرف جانا ہے۔"

"خیریت جناب؟" وہ بولا۔

"ہاں، سونیا کی ایک کوٹھی ہے، وہاں سے کچھ سامان لینا ہے۔"

"واپس بھی آنا ہے؟"

"فی الحال اس کے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتے۔" میں نے کہا۔ "مجھے ایک گاڑی چاہیے۔"

"میں حاضر ہو جاؤں گا جناب! کب تک چلنا ہے؟"

"ایک گھنٹے بعد۔" میں نے جواب دیا تھا۔

ناشتا میں نے اپنے کمرے میں منگوایا تھا۔ سونیا تیار ہو کر وہیں آ گئی۔ ہم نے ناشتا کیا۔ ناشتا کر کے ہم نیچے آئے۔ راجا عمر دراز اپنے کمرے میں تھا اور بیگ غائب تھا۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ وہ بہت شکی مزاج شخص تھا۔ سوالات کر کر کے ناطقہ بند کر دیتا۔ عبداللہ بھی آ گیا۔ "میں تیار ہوں جناب!"

"چلو پھر......" میں نے کہا۔ احاطے میں مٹسوبشی لانسر کھڑی تھی۔ عبداللہ نے اس کا انتخاب کیا تھا۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آیا، میں نے اس کے برابر والی سیٹ سنبھالی اور سونیا پیچھے چلی گئی۔ عمارت سے باہر آتے ہی میں نے ناصر کو کال کی۔ اس نے پانچویں بیل پر فون پر ریسیو کیا اور جھنجلائی آواز میں بولا۔ "یار، ابھی صبح چار بجے سویا تھا۔"

"اٹھ جاؤ صحافی کے گھوڑے! ہم تمہیں لینے آ رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "تم اس وقت کہاں ہو؟"

"صحافت کا گھوڑا!" اس نے تصحیح کی۔ "اس وقت میں روزنامہ جنگ و جدل کے دفتر میں ایک مہینے پرانے شماروں پر محو استراحت ہوں۔"

"پتا عبداللہ کو سمجھا دو اور دوبارہ سو نا مت۔" میں نے موبائل عبداللہ کی طرف بڑھایا، اس نے ناصر سے پتہ سمجھ کر موبائل میرے حوالے کر دیا۔ "بس تیار ہو جاؤ۔" میں نے کہہ کر کال بند کر دی۔

"وہ جگہ ذرا دور ہے سر!" عبداللہ بولا۔ "تقریباً پون گھنٹا لگے گا، دھند بھی ہے۔"

سردیوں میں جب تک اوپری پنجاب میں بارش نہ ہو، دھند چھائی رہتی ہے اور بعض اوقات تو یہ دھند اتنی

شدید ہو جاتی ہے کہ دن میں لوگ روشنیاں جلا کر کام کرتے ہیں اور گاڑیاں ہیڈ لائٹس جلائے بغیر سفر نہیں کر سکتیں۔ ان دنوں بھی دھند تھی لیکن زیادہ شدید نہیں تھی۔ پندرہ بیس فٹ تک کا منظر واضح تھا، اس کے بعد کا منظر دھندلانا شروع ہو جاتا تھا۔ گاڑی جیسی بڑی شے کا ہیولا چالیس پچاس فٹ کی دوری سے نظر آ رہا تھا اس لئے حادثے کا امکان کم تھا پھر بھی رفتار ایک حد میں رکھنا لازمی تھا۔ عبداللہ کے اندازے کے مطابق ہم پون گھنٹے میں جنگ وجدل کے دفتر پہنچ گئے۔ دفتر سے بھی جنگ وجدل کے آثار نمایاں تھے، جس عمارت کی دوسری منزل پر اخبار کا دفتر تھا، وہ کسی جنگ کی باقیات میں سے لگ رہی تھی۔ ناصر بغلوں میں ہاتھ دیئے ہمارا منتظر تھا اور میری صورت دیکھتے ہی عقبی دروازہ کھول کر اندر دھندا دھند اندر گھس گیا اور پھر اس کی گڑبڑائی ہوئی آواز آئی۔ ''تم...... سوری، میں نے دیکھا نہیں۔''

سونیا نے اسے غصے سے دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں۔ مزید بے عزتی کے خوف سے ناصر بھی دم سادھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے چند منٹ بعد مجھ سے کہا۔ ''اتنی صبح سویرے عنایت کی وجہ؟''

''آج ہم شاہی موڈ میں ہیں، تمہیں ڈھائی لاکھ روپے کا دیدار کرانا چاہتے ہیں۔'' میں نے مغلِ اعظم اسٹائل میں کہا۔ وہ سمجھ گیا۔

''بندوبست کر لیا...... یعنی تم کیش اٹھانا چاہتے ہو؟''

''ہاں تم عبداللہ کے ساتھ جاؤ گے اور وہ ڈیوائس لے کر فوراً واپس آنا۔''

''میری بائیک وہیں کھڑی ہے۔'' اس نے بتایا۔

''تب بائیک لے کر آ جانا۔''

کوٹھی زیادہ دور نہیں تھی۔ راوی کراس کر کے ہم قصور جانے والی سڑک پر آئے تو دائیں جانب ہائی وے کے ساتھ ایک چھوٹی سی کوٹھی نظر آئی۔ اس قسم کی کوٹھیاں اس علاقے میں جا بجا نظر آ رہی تھیں۔ یہ بھی ان میں سے ایک تھی۔ عبداللہ نے سونیا کے اشارے پر کار اس طرف موڑ دی۔ تیس گز کا ناپختہ لیکن ہموار راستہ تھا اس کے بعد کوٹھی تھی جس کے چار طرف سفیدے کے بلند و بالا درخت تھے۔ ہارن کے جواب میں ایک معمر چہرے نے بغلی دروازے سے جھانکا۔ سونیا اتر کر اس کی طرف بڑھی۔ وہ اسے دیکھتے ہی باہر نکل آیا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا وہ سونیا کے قدموں میں بچھ جائے گا۔ میں اور باقی بھی نیچے اتر آئے۔

''بی بی، آپ...... صاحب کہاں ہیں۔ عادل صاحب کیسے ہیں؟''

''میں بعد میں بتاؤں گی سعادت خان!'' سونیا بولی۔ ''دروازہ کھولو۔''

سعادت خان تقریباً پچاس برس کا پٹھان تھا۔ سر کے بال کھچڑی ہو رہے تھے لیکن جسمانی طور پر تنومند تھا۔ اس نے سر پر ہاتھ مارا ''معاف کرنا بی بی! ہم بوڑھا ہو گیا ہے۔''

اس نے جلدی سے اندر جا کر گیٹ کھولا۔ عبداللہ گاڑی اندر لے گیا تھا۔ طویل ڈرائیو وے کے ساتھ خوب صورت لان تھا۔ سردی کی شدت سے پودے، پھولوں سے محروم اور مرجھائے ہوئے تھے لیکن صاف لگ رہا تھا، بہار میں یہ باغ قابلِ دید ہوتا ہوگا۔ کوٹھی کی چابیاں سعادت خان کے پاس تھیں، اس نے آ کر دروازہ کھولا۔ ہم اندر آئے۔ سونیا نے سعادت خان سے کہا۔ ''نشست گاہ کا آتش دان جلاؤ۔''

عبداللہ، میں اور ناصر نشست گاہ میں آ گئے تھے جبکہ سونیا اندر چلی گئی تھی۔ سعادت خان نے آتش دان میں لکڑی کا کوئلہ بھرا ہوا تھا اس نے بوتل سے مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی۔ لکڑی کا کوئلہ دھواں کم دیتا ہے اور جلدی آگ پکڑ لیتا ہے۔ یہ کام کر کے سعادت خان نے ہم سے پوچھا۔ ''صاحب! چائے، کافی، گرین ٹی...... کیا بنائے؟''

''سب بنالاؤ۔'' ناصر ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔ ''اور کھانے کو کچھ ہو تو وہ بھی لے آؤ۔''

''صاحب! اس میں تھوڑا ٹائم لگے گا۔ بی بی لوگ عرصے سے ادھر نہیں آیا اس لئے باورچی خانہ خالی ہے۔ میں ابھی سامان لاتا ہے۔''

''ایسا کرو، چائے بنالو۔'' میں نے اسے کہا اور وہ چلا گیا۔

''سونیا کہاں ہے؟'' ناصر نے پوچھا۔

''اندر کہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا

یہ دو منزلہ کوٹھی تھی اور سونیا کے مطابق یہ بھی کرائے پر لی تھی۔ چند منٹ بعد سونیا آئی اور ایک لفافہ میرے حوالے کیا۔ ''اس میں تین لاکھ روپے ہیں شہباز بھائی!''

''شکریہ سونیا۔'' میں نے کہا اور لفافے کو ناصر کے حوالے کر دیا۔ ''اب روانہ ہو جاؤ چائے پی کر۔''

''اور ناشتا۔'' اس نے فریادی لہجے میں کہا۔

''راستے میں کر لینا۔'' سونیا بولی۔ ''بلکہ واپسی میں دوپہر کے لئے بھی کچھ لیتے آنا۔''

ناصر چونکا۔ ''کیا تم لوگوں کا رکنے کا پروگرام ہے؟''

''لمبا نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ممکن ہے شام تک چلے جائیں۔''

چائے آئی۔ عبداللہ اور ناصر چائے پی کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد سونیا نے مجھے کوٹھی دکھائی، سعادت خان واپس گیٹ کی طرف چلا گیا تھا۔ کوٹھی کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ فرض شناسی سے کوٹھی کی دیکھ بھال کرتا رہا تھا۔ پھر سونیا مجھے ایک کمرے میں لائی۔ یہ وسیم کا بیڈ روم تھا۔ سونیا نے الماری کھولی اور اس کے اندر ہاتھ ڈال کر نہ جانے کیا دبایا۔ الماری کے عقب سے ایک خانہ سرک گیا تھا جو اس کے پیچھے تھا جس میں تختے لگا کر اسے بھی الماری کی سی صورت دے دی گئی تھی۔ ایک خانے میں کرنسی نوٹوں کی خاصی گڈیاں تھیں۔ نچلے حصے میں ایک چرمی بیگ تھا۔ سونیا نے چرمی بیگ نکال کر خانہ اور پھر الماری بند کر دی۔ اس نے میز پر رکھ کر بیگ کھولا۔ اندر سے درجن بھر سے زیادہ چیک بکس، دو عدد اے ٹی ایم کارڈز، دو عدد کریڈٹ کارڈز نکلے، یہ گولڈن کارڈز تھے جن سے لامحدود خریداری کی جا سکتی تھی۔ تین عدد لاکرز کی چابیاں اور دو گڈیوں میں ڈالرز اور پاؤنڈز تھے۔ سونیا نے چابیاں دکھائیں۔ ''یہ تینوں لاکرز، ایک ہی بنک میں ہیں۔ مجھے صحیح سے نہیں معلوم کہ وسیم بھائی نے یہاں کیا کیا رکھا تھا لیکن میرے پاس ان کا اجازت نامہ ہے، میں لاکرز کھول سکتی ہوں۔''

''فی الحال اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

''شہباز بھائی! ہم سرحد پار جا رہے ہیں اس لئے ہمیں یہ کرنسی رکھنی چاہئے۔'' اس نے ڈالرز اور پاؤنڈز کی طرف اشارہ کیا۔ یہ سو سو کے نوٹوں والی گڈیاں تھیں دونوں گڈیوں میں دس ہزار ڈالرز اور اتنے ہی پاؤنڈز

تھے، میں نے سر ہلایا۔ ''رکھ لو، شاید ضرورت پڑ جائے۔''

سچی بات ہے، مجھے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ ٹھیک ہے، سونیا میری ذمے داری تھی لیکن اس کی دولت سے فائدہ اٹھانا مجھے مناسب نہیں لگا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''اس کوٹھی کا معاہدہ کہاں ہے؟''

وہ الماری سے ایک فائل لائی۔ اس کے مطابق کوٹھی دو سال کے لئے کرائے پر لی گئی تھی اور یہ مدت ختم ہونے میں ابھی دو مہینے باقی تھے۔ میں نے اسے مشورہ دیا۔ ''معاہدے کو ری نیو کرالو۔ کم سے کم ایک سال کے لئے، اس طرح ہمارے پاس ایک پناہ گاہ تو ہوگی۔''

''میں ابھی ایجنٹ کو کال کرتی ہوں۔''

''دوسرے چوکیدار کی تنخواہ کا معلوم کر کے اسے بھی سال بھر کے لئے چیک دے دو۔''

سونیا دونوں کاموں میں لگ گئی۔ اس سے پہلے اسٹیٹ ایجنٹ کو کال کی جس کے توسط سے کرائے پر لی گئی تھی۔ مالک مکان گزشتہ دس سال سے یو کے میں تھے اور یہ کوٹھی صرف تفریح کے لئے تھی اس لئے اپنی غیر موجودگی میں اسے مستقل کرائے پر دے دیا تھا۔ اس کے بعد سونیا مذکورہ بینکوں کو کال کرنے لگی جہاں اس کے اکاؤنٹس تھے اور سارے لاکھوں کے اکاؤنٹس تھے اس لئے این آئی سی نمبر بتانے پر اسے فون پر اس کا بیلنس بتا دیا گیا تھا۔ وہ ایک رف کاغذ پر لکھتی رہی تھی، اس کام سے فارغ ہو کر اس نے ٹوٹل کیا تو یہ رقم کروڑوں کے فگرز میں تھی۔ سونیا نے ایک اکاؤنٹ منتخب کیا اور اس کے بارہ عدد چیک کاٹ کر ان پر رقم اور تاریخ کے ساتھ اپنے سائن کر دیئے تھے۔

''میں نے سعادت خان کی تنخواہ میں ہزار روپے کا اضافہ کر دیا ہے۔'' وہ بولی پھر اس نے ایک چیک اور کاٹا۔ یہ پچیس ہزار کا تھا۔ ''اس رقم سے وہ کوٹھی کے اخراجات پورے کرتا ہے جیسے بلوں کی ادائیگی اور چھوٹے موٹے اخراجات۔''

سونیا اسے چیک اور ہدایات دینے چلی گئی تھی۔ میں کوٹھی کے عقبی باغ میں نکل آیا جہاں سنگترے اور لیچی کے درخت تھے، بیشتر سنگترے اتارے جا چکے تھے۔ چند ایک باقی تھے جو ابھی پوری طرح پکے نہیں تھے۔ اس جگہ وسعت اور سکون کا احساس تھا۔ کچھ دیر چہل قدمی کے بعد میں اندر آیا۔ سونیا سعادت خان کو چیک دے کر آ چکی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا۔

''آیئے، میں آپ کو ایک چیز اور دکھاتی ہوں۔'' وہ مجھے اسٹور روم نما ایک کمرے میں لائی جہاں فالتو اشیاء رکھی تھیں، ایک پیٹی سرکا کر اس کے نیچے رکھے تختے کو اٹھانے سے ایک خفیہ خانہ ظاہر ہوا، اس میں لکڑی کی طویل پیٹی تھی۔ یہ تین بائی ڈیڑھ فٹ کی تھی۔ سونیا نے جھک کر اس کا ایک طرف کا کنڈا پکڑا۔

''شہباز بھائی، اسے میرے ساتھ اٹھایئے۔ وزنی ہے۔'' اس نے کہا۔

''تم ایک طرف ہو جاؤ۔'' میں نے کہا اور جھک کر دونوں طرف کے کنڈے پکڑ کر بکس کھینچا۔ یہ واقعی خاصا وزنی تھا۔ جیسے تیسے میں نے اسے نکالا اور ہانپتے ہوئے بولا۔ ''کیا اس میں لوہا بھرا ہوا ہے؟''

''ایسا ہی سمجھئے۔'' وہ بولی۔ اس نے ایک مختصر سی چابی سے پیٹی کا لاک کھولا اور اس کا ڈھکن اٹھایا۔ اندر ہر قسم کا آتشیں اسلحہ بھرا ہوا تھا۔ دو عدد ایم سولہ رائفلیں، ایک شاٹ گن تھی، ایک ٹرپل ٹو رائفل اور ایک بارہ بور

رائفل تھی۔ اس کے علاوہ مختصری یوزی مشین گن، ماؤزر پستول اور دو عدد اعشاریہ پیالیس کے پستول اور ان کا ڈھیر سارا ایمونیشن تھا۔

"یہ تو پورا اسلحہ خانہ ہے۔" میں نے کہا۔

"اس کی مدد سے ہم پوری فوج کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔"

"لیکن فی الحال اس کی ابھی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے بکس بند کر دیا اور اسے خانے کے اندر ڈال دیا۔ "سونیا، میرا خیال ہے ہمیں شام تک واپس چلے جانا چاہئے۔"

"کیوں شہباز بھائی!"

"کیونکہ یہ ایک پناہ گاہ ہے اگر ہم نے بلا وجہ یہاں قیام کیا تو عین ممکن ہے یہ دشمن کی نظر میں آ جائے اس لئے اسے صرف ہنگامی ضرورت کے لئے محدود رکھو۔ ابھی ہمارے پاس ایک محفوظ ٹھکانہ ہے۔"

"جیسے آپ کی مرضی بھائی!" اس نے بے دلی سے کہا۔

"لگتا ہے تم یہاں رہنا چاہتی ہو۔" میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں شہباز بھائی، ایک سال پہلے میں اور وسیم بھائی یہاں ایک مہینہ رکے تھے۔ ہمارے ساتھ عادل بھی تھا اور ہم نے بہت انجوائے کیا تھا۔"

"او کے، اس صورت میں ہم ایک دن یہاں رک جاتے ہیں، تمہاری خوشی کے لئے۔ صبح سویرے نکل جائیں گے۔" میں نے اس کو خوش کرنے کے لئے کہا، وہ کھل اٹھی تھی۔

"تھینک یو شہباز بھائی!"

"اور اس کے بدلے مجھے کیا ملے گا؟"

"جو آپ بولیں۔"

"ایک زبردست ساڈنر!"

"میں ابھی سعادت کو بھیج کر بکرے کی ران منگواتی ہوں، آج آپ کو اسٹیم روسٹ کھلاؤں گی۔" اس نے کہا اور باہر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی، میں سمجھا کہ سونیا ہو گی لیکن آنے والا ناصر تھا۔ اس نے ایک پورٹیبل ٹیپ ریکارڈر کے سائز کا آلہ ایک شاپر میں اٹھا رکھا تھا۔

"تم جلدی آ گئے۔"

"ہاں، میں نے سوچا جب میری نیند خراب ہوئی ہے تو اسے کیوں سونے دوں۔ ڈھائی لاکھ کے لئے وہ بستر سے دوڑا آیا تھا۔ میں نے دکان کھلوا کر اس سے آلہ لیا۔ اسے موبائل چیکر کہتے ہیں۔" ناصر نے تھیلے سے گتے کا ڈبا نکالا۔ اس پر سیلوفین لپٹا تھا۔ اسے کھول کر ناصر نے اندر سے اصل آلہ نکالا جو آج کل کے ذرا جدید اور بڑی اسکرین والے موبائل سیٹ کے برابر تھا۔ اسے بہ آسانی جیب میں رکھا جا سکتا تھا۔ میں نے اٹھا کر اس کا معائنہ کیا، اس میں کلر ایل سی ڈی اسکرین تھی اور نارمل موبائل کے مقابلے میں زیادہ بٹن تھے۔ ناصر مجھے استعمال کا طریقہ سکھانے لگا۔ اس کے ساتھ ایک بک بھی تھی۔

"چھوڑ یار، میں دیکھ لوں گا۔" میں نے ناصر سے کہا۔ "اس کا چارجر کہاں ہے؟"

ناصر نے چارجر بھی نکال کر دیا۔ "اسے دو دن بعد چارج کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔"
میں نے اسکرین پر دیکھا۔ "ابھی یہ فل چارج ہے۔"
"ہاں، احتیاط سے استعمال کرنا ہوگا۔ ذرا نازک مشین ہے۔ گرنے اور جھٹکوں سے بچانا ہوگا۔ دکان والے نے کہا ہے، اسے کسی ساکت جگہ رکھ دیں اور صرف ضرورت کے وقت اٹھائیں۔"
"یہاں سگنل نہیں ہیں۔ کیا اس میں سم ڈالنی پڑتی ہے؟"
"بالکل ورنہ کال کیسے کرو گے؟" ناصر بولا۔ "میں نے ایک کنکشن لے کر اس میں سم لگادی ہے۔"
"اس کا مطلب ہے سگنل کے لئے ہمیں شہر کی طرف جانا پڑے گا۔"
"ہاں، میں لنچ لے آیا ہوں، فرائی مچھلی اور نان ہیں۔"
"رات کے لئے سونیا اسٹیم بروسٹ بنا رہی ہے۔"
"دیکھتے ہیں خاتون کے ہاتھ میں کتنا ذائقہ ہے؟" وہ خوش ہو گیا۔
ہم باہر آئے، نشست گاہ میں آتش دان کی وجہ سے ذرا سکون تھا، ہم نے وہیں کھانا کھایا۔ پھر سونیا نے کافی کے بجائے چائے بنا کر دی۔ اس کا کہنا تھا، کھانے کے بعد کافی صحت کے لئے مضر ہوتی ہے۔ بعد میں اس نے تسلیم کیا کہ اس کا دل چائے پینے کو چاہ رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "سونی مجھے جیپ کی چابی دو۔ رننگ کنڈیشن میں ہے نا؟"
"جی بھائی، سعادت خان اس کی دیکھ بھال کرتا رہتا ہے۔" اس نے بتایا۔ "آپ کہاں جا رہے ہیں؟"
"میں اور ناصر ذرا دور تک جائیں گے، تم نے چلنا ہے تو چلو۔"
"نہیں، مجھے رات کے ڈنر کی تیاری کرنی ہے۔" سونیا بولی اور اندر سے مجھے چابی لا کر دی۔
جیپ فورڈ کمپنی کی تھی اور ملٹری ماڈل کا سویلین روپ تھا۔ مضبوط اور طاقتور۔ اس کے اندر آٹو میٹک سسٹم تھا اور انجن بہترین حالت میں تھا۔ سعادت خان واقعی اس کی دیکھ بھال کرتا رہتا تھا۔ پہلے ہی سلف میں جیپ اسٹارٹ ہو گئی۔ ناصر بولا۔ "میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ سونیا اتنی دولت مند ہو گی۔"
"وسیم نے پیسا بہت کمایا..... مگر اسے اپنے ہی دھوکا دے گئے۔ اس نے جس پر بھروسا کیا، اسی نے اس کی جڑ کاٹی۔" میں نے گہرا سانس لے کر کہا۔
سعادت خان باہر گیا ہوا تھا اس لئے سونیا نے خود آ کر گیٹ کھولا اور بند کیا۔ مجھے اس کے اکیلے ہونے کی فکر ہوئی تو اس نے کہا۔ "میں کمزور نہیں ہوں، اب میرے ساتھ آپ کی طاقت ہے اور سعادت خان بھی کچھ دیر میں آ جائے گا۔"
"پھر بھی خیال رکھنا۔ اپنا پستول اپنے پاس رکھ لو اور کوٹھی کے دروازے کھڑکیاں اندر سے بند رکھنا۔"
وہ ہنسی۔ "آپ تو بالکل وسیم بھائی کی طرح ہدایت دے رہے ہیں۔"
"سارے بھائی بہنوں کے لئے ایسے ہی فکر مند رہتے ہیں۔"
دن میں دھند غائب ہو گئی تھی، ہم واپس لاہور کی طرف آئے، ایک ڈیڑھ کلومیٹر کے بعد ناصر نے کہا۔

''سگنل آ گئے ہیں، جیپ روک لو۔''

میں نے سڑک سے اتار کر ذرا دور درختوں تلے جیپ روک لی۔ میرے اور ناصر کے پاس مختلف کمپنیو کی سمز تھیں اور دونوں میں سگنل آ گئے تھے۔ میں نے موبائل چیکر نکالا۔ اس میں سگنل تھے۔ میرے پاس مرشدؔ کا وہ نمبر محفوظ تھا جس سے اس نے مجھے کال کی تھی۔ میں نے موبائل چیکر سے نمبر ملایا۔ چند بیل کے بعد مرشدؔ کی آواز آئی۔ ''کون ہے۔''

''شہباز بات کر رہا ہوں، تم کس شرط پر میرے ساتھ صلح چاہتے ہو؟''

''شہباز، یہ بات آمنے سامنے بیٹھ کر کرنے کی ہے۔'' وہ مکارانہ لہجے میں بولا۔

''اسے بھول جاؤ، جلدی بولو، میرے پاس وقت کم ہے۔''

''نادر علی لندن سے واپس آ گیا ہے۔ ڈاکٹروں نے اسے جواب دے دیا ہے۔ اب وہ ساری عمر بستر وہیل چیئر پر رہے گا۔''

''اسے قدرت کی طرف سے سزا ملی ہے کوئی دوسرا اس معاملے میں کیا کر سکتا ہے۔ اس نے میرے سات اور میرے ساتھیوں کے ساتھ جو کرنے کی کوشش کی اس کے بعد مجھے اس کے بارے میں کوئی افسوس بھی نہیں ہے۔''

''تم نے ٹھیک کہا، اسے اس کے کئے کی سزا ملی ہے۔'' مرشد علی نے تسلیم کر کے مجھے حیران کر دیا۔

''پر اب تم کیا چاہتے ہو؟''

''شہباز تم صلح اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ عام زندگی کی طرف واپسی چاہتے ہو اور میں بھی اس جھگڑے سے جان چھڑانا چاہتا ہوں لیکن مجھ پر خاندان کے لوگوں کا دباؤ ہے۔ وہ بہر صورت انتقام لینا چاہتے ہیں۔''

''اور تم ان کے آگے مجبور ہو؟'' میں نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔ ''پھر صلح کی بات کیوں کر رہے ہو؟''

''شہباز، میں دل سے صلح چاہتا ہوں اور میں نے اسے پائیدار بنانے کے لئے ایک تجویز سوچی ہے: دونوں......''

''مختصر بات کرو، میں ایک منٹ بعد کال کاٹ دوں گا۔'' میں نے اسے خبردار کیا۔

''تمہاری ساتھی لڑکی، کیا نام ہے اس کا؟'' اس نے تجاہل عارفانہ سے کہا۔ ''ہاں مونا، میں چاہتا ہوں نادر سے اس کی شادی......''

''مرشد!'' میں نے دہاڑ کر کہا تھا۔ ''آئندہ تُو نے مونا کا نام لیا تو......'' میں نے غصے سے کال کاٹ دی۔ اس کی بات سمجھ کر میرا دماغ اُڑ گیا تھا۔ میرے چلانے سے ناصر گھبرا گیا تھا۔

''کیا ہوا......اس نے کیا کہا؟''

جواب میں، مَیں نے مرشد اور اس کے سارے خاندان کو ایک سے ایک گالیاں دی تھیں جو عام حالات میں کبھی میری زبان پر نہیں آ سکتی تھیں۔ ''کتے کا بچہ! مونا کا نام لے رہا تھا۔''

''چھوڑ یار! یہ ایسے ہی غلیظ فطرت لوگ ہوتے ہیں۔ ان کے منہ مت لگ اور نہ ہی ان کی باتوں پر توجہ د کر، سمجھ لے کتا بھونک رہا ہے۔''

میں نے ناصر کو مرشد علی کی تجویز کے بارے میں بتایا۔ ''وہ ذلیل شخص اس طرح انتقام لینے کی سوچ رہا ہے۔ اوّل تو یہ ناممکن ہے، اتنا ہی ناممکن، جتنا سورج کا مغرب سے نکلنا اور اگر سوچا بھی جائے تو مونا کے ساتھ وہاں کیا سلوک ہوسکتا ہے۔''

''میں ان لوگوں کی ذہنیت اچھی طرح سمجھتا ہوں۔'' ناصر بولا۔ ''عورت ان کے لئے رشتے سے قطع نظر محض ایک کھلونا ہے۔''

''میں اسے قتل کر دوں گا۔ اس نے مونا کا......''

''یار، تُو بے کار کی بات کر رہا ہے، کام کر۔'' ناصر نے مجھے یاد دلایا تو نے میں نے اپنے اشتعال پر قابو پایا، جب میرا دماغ کسی قدر ٹھنڈا ہوا تو میں نے موبائل چیکر پر اس نمبر کو فریکوئنسی میں شامل کر لیا۔ سارا پروسیس مکمل ہونے کے بعد اسکرین پر اوکے کا اشارہ آیا۔ اب مرشد علی کے موبائل کی فریکوئنسی اس چیکر میں آ چکی تھی، جب بھی اس نمبر پر کوئی کال آتی یا اس سے کہیں کال کی جاتی تو یہ خود بخود اسے کیچ کر کے خبردار کرتا اور ہم اس پر ہونے والی گفتگو سن سکتے تھے۔ کتاب میں گفتگو سننے اور اسے ریکارڈ کرنے کا طریقہ بھی درج تھا۔

''یار، یہ تو بہت کام کی شے ہے۔''

ناصر نے سر ہلایا۔ ''نائن الیون کے بعد نیٹ ورک اسپائی کے شعبے میں بے انتہا ترقی ہوئی ہے۔ دنیا کے سب سے بڑے دہشت گرد ملک نے اپنے مخالفوں سے نمٹنے کے لئے اس شعبے میں ایسی اختراعات کی ہیں جن کے بارے میں عام آدمی سوچ بھی نہیں سکتا۔ انٹرنیٹ، ای میلو اور موبائل سروس کی نگرانی کے لئے ایسی ڈیوائسز وجود میں آ چکی ہیں جو الفاظ پکڑتی ہیں۔ مثال کے طور پر اگر لفظ مسلمان کو مارک کر دیا جائے تو دنیا بھر میں جہاں کہیں بھی ای میلو میں لفظ مسلمان آئے گا یا موبائل پر یہ لفظ بولا جائے گا ویسے ہی ان کو پتا چل جائے گا۔ ایسے پھندے ساری دنیا میں پھیلا دیئے گئے۔ یہ ایجاد بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ میرے الیکٹرانکس ڈیلر دوست نے اسے جاپان سے منگوایا ہے۔''

''بے شک یہ ذرا مہنگی چیز ہے مگر اس سے جو کام لیا جا سکتا ہے، اس لحاظ سے یہ کوئی قیمت نہیں ہے۔''

''تم نے ٹھیک کہا۔'' ناصر نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔

اچانک موبائل چیکر نے خبردار کرنے والی آواز نکالی۔ اسکرین پر مرشد علی کا نمبر آ رہا تھا لیکن یہ اس کی کال نہیں تھی، کیونکہ اس آلے سے کی جانے والی کال کا کہیں نمبر نہیں آتا ہے اور نہ ہی اس پر کوئی کال آ سکتی ہے، اس سے صرف کال کی جا سکتی ہے یا دوسروں کی کال سنی جا سکتی ہے۔ مرشد علی کسی کو کال کر رہا تھا یا اسے کوئی کال کر رہا تھا۔ میں نے ایک بٹن دبایا تو مرشد علی کی آواز آنے لگی، میں نے فوراً ریکارڈ کا بٹن بھی دبا دیا تھا۔

''آج رات میں تمہارے پرستان میں آؤں گا۔'' مرشد علی نے کسی سے کہا۔

''سر آنکھوں پر پیر و مرشد!'' کوئی خوشامدانہ لہجے میں بولا۔ ''میں تو کب سے تڑپ رہا تھا، کبھی تو آپ میرے غریب خانے کو عزت بخشیں۔''

''سنا ہے تُو نے دنیا جہاں کے منتخب ہیرے رکھے ہوئے ہیں؟''

''یہ تو ان کی اور میری خوش نصیبی ہوگی کہ پیر و مرشد کی نظرِ کرم ان پر پڑ جائے۔ پر آپ کیوں زحمت کر

رہے ہیں۔ میں البم بھجوا دیتا ہوں۔ آپ جو بھی انتخاب کریں گے وہ سرکار کی بارگاہ میں پہنچا دیا جائے گا۔"
دوسرے شخص نے چرب زبانی کا مظاہرہ کیا تھا لیکن وہ نہیں چاہتا تھا کہ مرشد علی اس کے پاس آئے مگر مرشد علی نے اس کے انکار کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ "نواز ے! جو بات اصلی جیتی جاگتی تصویروں میں ہے، وہ بات البم کی بے جان تصویروں میں کہاں ہوگی۔ ہم بچشم خود ان کو ملاحظہ کر کے منتخب کرنا چاہتے ہیں۔"
"جیسی سرکار کی مرضی!" نواز ے نامی شخص نے بدترین خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ اس کا نام یقیناً نواز تھا۔
"ابھی تیرے پاس کتنی لڑکیاں ہیں؟" مرشد علی کے لہجے سے بیک وقت رال اور ہوس ٹپک رہی تھی۔
"سو سے زیادہ ہیں سرکار!"
"بس تو ان سب کو ہماری آمد سے پہلے جمع کر لے۔"
"سب کو۔" نواز پریشان ہو گیا۔ "سرکار کوئی تیس لڑکیاں دور دراز کے گاہکوں کے پاس ہیں، ان کو بلوانا بھی چاہوں تو اتنی جلدی یہ کام ممکن نہیں ہے۔"
"اچھا... کل تک بلوا لے۔ میں دو دن رکوں گا۔" مرشد علی نے اس کا یہ حربہ بھی ناکام بنا دیا۔
"سرکار، اس طرح تو کاروبار..."
"نواز ے!" یک دم مرشد نے جلالی لہجہ بنا کر کہا۔ "تیری نیت ابھی سے بدلی بدلی لگ رہی ہے۔ یاد رکھ جامی شاہ ابھی موجود ہے اور میرے ایک اشارے پر دم ہلاتا میرے پاس دوڑا چلا آئے گا۔"
نواز کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ یقیناً جامی شاہ کا باغی شاہ نواز تھا لیکن مرشد علی اسے تحقیر آمیز انداز میں صرف نواز ے کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔ وہ فوری طور پر مرشد علی کی خوشامد درآمد پر اتر آیا تھا اور اسے یقین دلانے لگا تھا کہ اس کے حکم کی حرف بہ حرف تعمیل ہوگی۔ وہ کسی نہ کسی طرح مرشد علی کو ٹھنڈا کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ کال ختم ہونے کے بعد میں نے شاہ نواز کا نمبر بھی موبائل جیکر کی فریکوئنسی میں شامل کر لیا تھا۔
"یار، واقعی کمال کا آلہ ہے۔" میں نے مسرت سے کہا۔
"مرشد اور شاہ نواز اب سے پارٹنر ہیں۔" ناصر نے غور کیا۔ "مجھے لگ رہا ہے۔ مرشد علی کی نیت اس بے حساب کمائی والے بزنس پر خراب ہو رہی ہے اور وہ شاہ نواز کو محض اپنا ایک کارندہ بنانا چاہتا ہے۔"
"شاید!" میں نے کہا اور اس بار جامی شاہ کو کال کرنے لگا۔ وہ جلد لائن پر تھا۔
"میں شہباز بات کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم نے ان دونوں لڑکوں کا کیا، کیا؟"
"کل کے اخبارات میں دیکھ لینا۔" اس نے بے پروائی سے کہا تو میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔
"تم نے ان کو مار دیا؟" میں نے کسی قدر سخت لہجے میں کہا۔
"کام کی بات کرو ورنہ میں فون بند کر رہا ہوں۔"
"کل شام تمہارے جی ٹی روڈ والے ڈیرے پر کیا ہوا تھا؟ سنا ہے شاہ نواز کے آدمیوں نے وہاں قبضہ کر لیا ہے۔ تمہارے تین اہم ترین ساتھی مارے گئے ہیں۔" یہ خبر مجھے ناصر نے دی تھی۔
"جلد شاہ نواز اس کا خمیازہ دیکھے گا۔" اس نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔
"جامی شاہ، میں نے پہلے بھی کہا تھا، نہ جانے کیوں مجھے تم سے ہمدردی سی ہو رہی ہے، تمہارے لئے

ایک کام کی اطلاع اور ہے تمہارا سابقہ سرپرست مرشد علی اب شاہ نواز کی سرپرستی کر رہا ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"لیکن تم یہ نہیں جانتے کہ مرشد علی آج رات اس پرستان کا دورہ کرے گا جو کبھی تمہارا ہوا کرتا تھا اور اب اس پر شاہ نواز کا قبضہ ہے۔"

"یہ میں واقعی نہیں جانتا۔" اس نے اعتراف کیا۔

"دوسرے مرشد علی کی اپنی نیت بھی درست نہیں ہے اور وہ شاہ نواز کے توسط سے اس سارے بزنس پر قابض ہونا چاہتا ہے۔"

"میں اسے بھی دیکھ لوں گا۔" جامی شاہ غرایا۔ "ویسے یہ بتاؤ، تمہیں مجھ سے کیا ہمدردی ہو رہی ہے جو تم مجھے میرے دشمنوں کے بارے میں اطلاعات دے رہے ہو؟"

"مجھے تم سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ تم سب میرے دشمن ہو۔ بس تم اس وقت کمزور ہو اس لئے میری توجہ کے مستحق ہو۔"

"اس بہانے تم ہمیں آپس میں لڑا رہے ہو؟" اس نے شک سے پوچھا۔

"تم کچھ بھی سوچنے کے لئے آزاد ہو۔" میں ہنسا اور کال ختم کر دی۔

ناصر غور سے سن رہا تھا اس نے کہا۔ "یہ جو تم چکر چلا رہے ہو اس کا فائدہ؟"

"یہی فائدہ کیا کم ہے کہ میرے دشمن آپس میں لڑ رہے ہیں۔ ان میں سے کسی کا بھی نقصان ہو، میرا ہی فائدہ ہے۔" میں نے موبائل چینجر کو اس کے کیس میں رکھ دیا۔

"یار، مجھے یاد پڑ رہا ہے شاہ نواز کا پرستان یعنی کال گرلز ہوٹل اسی سڑک پر کہیں ہے۔" ناصر بولا۔

"تم نے کہا تھا تجھے اس کا محل وقوع پتا ہے۔"

"میں نے اپنے ایک صحافی واقف کار سے سنا تھا۔ وہ اس جگہ کی سیر کر چکا ہے۔" ناصر نے بائیں آنکھ دبائی۔ "میں اس سے معلوم کرتا ہوں۔"

اس نے اپنے موبائل پر صحافی واقف کار سے رابطہ کیا اور اسی لمحے موبائل چینجر سے وارننگ ٹون سنائی دی۔ میں اسے کیس سے نکال کر جلدی سے جیپ سے نیچے اتر گیا۔ اس بار شاہ نواز کا نمبر تھا۔ میں نے بٹن دبا لیا۔ ایک نامانوس آواز سنائی دی۔ "شاہ جی ــــ زرینہ ــــ کر رہی ہے۔" اس نے ناقابل بیان لفظ استعمال کیا تھا۔

"کس کے پاس ہے؟" شاہ نواز نے پوچھا۔

"فضل الٰہی کے پاس ہے۔ کل اس نے اسے کاٹ بھی کھایا۔"

"پھر کیا مسئلہ ہے۔ اسے ایسی عورت پسند ہے، جو آسانی سے قابو میں نہ آئے۔"

اس پر اس شخص نے نہایت شرمناک الفاظ میں بتایا کہ زرینہ فضل الٰہی نامی شخص کی کن خواہشات کو پورا کرنے سے انکار کر رہی ہے۔ شاہ نواز بولا۔ "اسے کہو، ہتھیار استعمال کرے مگر اسے زیادہ گہرے زخم نہ آئیں اور سنو، ادھر ادھر سے تین تجربہ کار عورتیں لے آؤ۔ وہ حرامی مرشد آ رہا ہے اسٹاک کا معائنہ کرنے، پر خیال رہے بالکل گئی گزری نہ ہوں اور سکھا پڑھا کر لانا۔"

''جی شاہ جی! تسی بے فکر رہو۔''

شاہنواز نے کال ختم کی تھی کہ مرشد علی کسی کو کال کرنے لگا۔ اس کے اوّلین جملے سے واضح ہو گیا کہ اس نے نادر علی کو کال کی تھی۔ ''کیا حال ہیں تیرے؟''

''بھائی جی! بستر پر پڑا ہوں۔'' اس کی تلخ سی آواز آئی۔ ''وہ سب عیش کر رہے ہیں۔'' نادر نے گالی دی۔

''آپ بھی کچھ نہیں کر رہے۔ ایک بار وہ قابو آیا تو اسے تصویر کے پیچھے چھوڑ دیا۔''

''وہ تمہاری حماقت تھی۔ بہرحال وہ بھی عیش نہیں کر رہے۔ میرے آدمیوں سے بھاگتے چھپتے پھر رہے ہیں۔ میں نے ان پر سکون حرام کر دیا ہے۔''

''بھائی جی! میں ان کے سر چاہتا ہوں۔ اس لڑکی کو چاہتا ہوں۔ آپ نے تجویز رکھی اس کے سامنے۔''

''ہاں، پر اس نے انکار کر دیا۔''

''مجھے پہلے ہی پتا تھا یہ سیدھی طرح ماننے والے لوگ نہیں ہیں۔ آپ ان کے خلاف پوری طاقت استعمال کریں، مجھے ہر صورت میں وہ لڑکی چاہئے۔''

''صبر کر نادر، ہر خواہش اتنی جلدی پوری نہ ہوتی، اگر تُو اس وقت جلد بازی نہ کرتا تو یہ آج کیفر کردار کو پہنچ چکے ہوتے اور تیرا انتقام پورا ہو جاتا۔''

''میں کچھ نہیں جانتا بھائی جی! اگر میرا انتقام پورا نہ ہوا تو میں خودکشی کر لوں گا۔''

''ان شاء اللہ!'' میں نے دل میں کہا لیکن مرشد علی گھبرا گیا تھا۔ ''اوئے پاگل! پریشان کیوں ہوتا ہے۔ تیرا دل بہلانے کے لئے ایسی چیزیں لاؤں گا کہ تُو اسے بھول جائے گا۔''

''کبھی نہیں بھائی جی! اور اب ان چیزوں سے میرا دل نہیں بہلتا، مجھے کچھ اور چاہئے۔''

''تھوڑا صبر کر۔''

''کیوں صبر کروں۔ آخر ہم میں اور عام آدمی میں یہی تو فرق ہے، میں جو چاہوں کر سکتا ہوں تو کیوں نہ کروں؟'' مفلوج ہونے کے باوجود اپنی حیثیت اور اختیارات کا تکبر اس کے لہجے میں بول رہا تھا۔

''پر آدمی تو ہیں اس لئے کہیں نہ کہیں مجبور ہو جاتے ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے آپ کچھ نہیں کر سکتے۔ اس لئے مجھے ہی کچھ کرنا ہو گا۔''

''کیا کرو گے تم؟''

''شہباز اور سفیر ہمارے ہاتھ نہیں آئے، پر ان کے گھر والے تو ہیں۔''

''نادر!'' مرشد علی کا لہجہ سخت تھا۔ ''تم ایسی کوئی حرکت نہیں کرو گے۔ شہباز کے دو بھائی آرمی آفیسرز ہیں اور سفیر بھی کسی معمولی خاندان کا نہیں ہے۔ ہمارے لئے اس وقت سیاسی حالات اچھے نہیں ہیں۔ چند مہینے میں سٹی گورنمنٹ کے الیکشن ہونے والے ہیں۔ ابھی ہم کوئی مسئلہ برداشت نہیں کر سکتے۔''

''آپ کو سیاست کی پڑی ہے اور میں اندر ہی اندر کڑھتا ہوں۔ میرے اندر ایک آگ جل رہی ہے۔''

''نادر، خدا کے لئے...... تم اس وقت بستر تک محدود ہو، تمہیں اندازہ نہیں ہے میری مشکلات کس قدر بڑھ گئی ہیں۔ خیر، جب تم عملی طور پر کام کرتے تھے تب بھی میرے لئے سوائے مشکلات میں اضافے کے اور

کال لیا۔''

نادر علی نے فون بند کر دیا۔ یہ آلہ میرے لئے نعمت غیر متوقع ثابت ہو رہا تھا۔ اس کی وجہ سے مجھے بیش بہا معلومات حاصل ہو رہی تھیں۔ میرا اندازہ تھا مرشد علی پھر نادر علی سے رابطہ کرے گا اور یہ اندازہ درست ثابت ہوا مگر اس نے نادر سے نہیں بلکہ کسی سکندر بخش سے رابطہ کیا تھا۔

''سکندر بخش! ہم بول رہے ہیں۔'' اس بار مرشد علی نے مخصوص لہجہ اختیار کیا تھا۔

''سرکار شاہ صاحب! حکم سرکار...... حکم!'' سکندر مریدانہ لہجے میں بولا۔

''نادر پاگل ہو رہا ہے۔ اس کی طرف سے آنے والے کسی حکم کو ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''سمجھ گیا سرکار شاہ صاحب!''

''خاک سمجھے ہو...... اسے انکار نہیں کرنا ہے لیکن وہ کوئی خاص حکم دے تو اس پر عمل بھی نہیں کرنا ہے، اسے ٹالتے رہنا ہے۔''

''اب بالکل سمجھ گیا سرکار شاہ صاحب!''

''اسے شراب اور لڑکیاں بھیج دو۔'' مرشد علی نے بے غیرتی سے کہا لیکن نہیں، یہ تو میرے لئے بے غیرتی کی بات تھی ورنہ مرشد کے لئے یہ معمول کی بات تھی۔ حکم دے کر مرشد نے رابطہ ختم کر دیا۔ اس دوران میں ناصر بھی بات کر کے گاڑی سے نکل آیا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔

''کیا ہوا برخوردار! کچھ معلوم ہوا؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''اس سڑک پر ساتویں میل پر دائیں جانب سرخ حویلی کی دو منزلہ عمارت ہے۔ وہی شاہ نواز کا اڈا ہے۔ اسے پری محل بھی کہتے ہیں۔''

''پری محل۔'' میں ہنسا۔ ''کیا مناسب نام رکھا ہے۔''

''اوہ بھائی، واپس نہیں چلنا۔ کچھ دیر میں اندھیرا ہو جائے گا اور اس کے بعد سردی کا مت پوچھنا۔''

''یار، واپس تو جانا ہے لیکن وہاں پر موبائل سگنل نہیں آ رہے ہیں اس لئے یہاں رکنا بھی ضروری ہے۔ ابھی مرشد اور دوسرے افراد سے خاصی معلومات ملی ہیں۔'' میں نے اسے مرشد، نادر اور شاہ نواز کی اپنے گھر گئے ہونے والی گفتگو سنائی۔ اگرچہ یہ آلہ ناصر ہی لایا تھا اور وہ اس سے واقف تھا اس کے باوجود وہ حیران ہوا تھا۔

''یار، کمال کی چیز ہے۔''

''مرشد علی اس طرف آ رہا ہے۔'' میں نے اسے بتایا۔ ''پری محل کی طرف۔ کیا خیال ہے، پری محل کا ایک چکر نہ لگا لیا جائے؟ سونیا کی کوٹھی سے چند کلومیٹر آگے ہوگا۔''

ناصر نے میری تجویز سے اتفاق کیا۔ ''یار، تم سم تبدیل کر لو۔ اس علاقے میں ایک ہی موبائل کمپنی کی سروس کام کرتی ہے۔''

''میرے پاس اسی کی سم ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''عبداللہ نے تمہاری بھیجی سمز مجھے دی تھیں۔'' میں نے ان سے سمز نکالیں اور اپنے موبائل پر سم بدلی۔ ہم روانہ ہوئے۔ میں موبائل اسکرین پر سگنل دیکھ رہا تھا۔ واقعی سونیا کی کوٹھی تک سگنل موجود تھے۔ اس بار جیپ ناصر ڈرائیو کر رہا تھا اور میں اس سم میں اہم نمبر محفوظ کر رہا تھا۔

چار بج رہے تھے اور شام ہو چکی تھی۔ میں نے ناصر سے کہا۔

''ذرا کوٹھی پر رکنا۔ ایک عدد کافی پی کر سونیا کو اطلاع دے کر چلتے ہیں، وہ پریشان نہ ہو۔''

''جیسے تمہاری مرضی۔'' ناصر نے جیپ کوٹھی کی طرف جاتے کچے راستے پر گھما دی تھی۔ ناصر سے میرا تعلق کچھ ہی عرصے کا تھا لیکن مجھے لگتا تھا ہم برسوں سے ساتھ رہتے آئے ہیں۔ سفیر جیسی بات تو نہیں تھی مگر وہ اس جگہ میرا ہمدم، ہمراز بن گیا تھا اور سب سے بڑی بات تھی، وہ کسی طرح بھی مجبور نہیں تھا کہ میرا ساتھ دیتا اور خطرناک لوگوں کا سامنا کرتا۔ اس کے باوجود اس نے کسی مرحلے پر کمزوری یا پیٹھ نہیں دکھائی تھی، ایک بار ہمیں یقینی موت کے منہ سے نکال لایا تھا۔ ''کیا سوچ رہے ہو؟'' ناصر نے ہارن بجایا تو میں چونکا تھا۔

''کچھ نہیں یار!'' میں نیچے اترا۔ ہارن کی آواز پر سونیا بھی باہر آ گئی تھی۔ اس نے کپڑے بدل لئے اور شلوار سوٹ کے ساتھ گلابی رنگ کا سوئٹر پہن رکھا تھا۔

''سونیا ہم کچھ دیر کے لئے آگے جا رہے ہیں، اگر دیر ہو تو پریشان مت ہونا۔''

''کہاں جا رہے ہیں شہباز بھائی؟''

میں نے اسے پری محل اور وہاں مرشد علی کی آمد کے بارے میں بتایا۔ مجھے خفت ہوئی تھی اس لئے میں نے وہاں ہونے والے دھندوں کے بارے میں اشارتاً بتایا۔ وہ پریشان ہو گئی۔ ''یہ سارا کھلا علاقہ ہے آپ ان کی نظر میں آ سکتے ہیں۔''

''ہم دور سے نگرانی کریں گے اور خاص طور سے پری محل کے پاس بھی نہیں جائیں گے۔'' ناصر نے حلفیہ بیان دینے کے انداز میں کہا۔

''میری بلا سے تم کہیں بھی جاؤ۔ میں شہباز بھائی کے لئے فکرمند ہوں۔'' سونیا بولی۔

''یعنی اپنی کوئی حیثیت نہیں ہے؟'' ناصر نے افسردگی سے کہا اور واپس جا کر جیپ میں بیٹھ گیا۔

''سونیا! تمہیں اس طرح نہیں کہنا چاہئے۔''

''سوری بھائی!'' سونیا پشیمان ہو گئی تھی۔ ''نہ جانے کیوں مجھے اس پر غصہ آ جاتا ہے اور میں ضبط کے باوجود بول جاتی ہوں۔''

''ممکن ہے وہ تمہیں اچھا نہیں لگتا ہو لیکن وہ مخلص شخص ہے۔''

''میں سمجھتی ہوں، میں نے کبھی اس پر شک نہیں کیا ہے۔''

''اس وقت تم نے اس کے ساتھ بہت ہی زیادتی کر دی ہے۔''

''میں اس سے سوری کہہ لیتی ہوں۔'' سونیا جیپ کی طرف بڑھی اور میں اندر آ گیا۔ میں نے کچن میں کافی کا پانی رکھا، جب تک پانی کھولتا سونیا غصے سے اندر آئی تھی۔ اس نے چند برتن پٹخے۔

''خیریت، کیا اس نے معذرت قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے؟''

''جی نہیں۔ وہ موبائل پر کسی لڑکی سے بات کر رہا تھا، اس نے میری بات سنی ہی نہیں۔''

''موبائل پر۔'' میں ہنسا۔ ''اس کے موبائل پر یہاں سگنل ہی نہیں آتے۔''

''دیکھا۔'' سونیا اچھل پڑی۔ ''وہ کس طرح بدلہ لے رہا ہے، چھچھورا شخص!''

''اچھا غصہ تھوک دو۔ تم نے زیادتی کی، اس نے بدلہ لے لیا، بات برابر ہو گئی۔''

''جی نہیں، میں اسے معاف نہیں کروں گی۔'' اس نے تلملا کر کہا۔

''او کے، کافی پیو گی؟''

اس نے انکار کیا تو میں نے اپنے اور ناصر کے لئے کافی نکالی۔ وہ جیپ میں بیٹھا اپنی دراز زلفوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔ میں نے اسے مگ تھمایا۔ ''باز آ جاؤ...... کیوں اپنی ہڈیوں کی سکائی کرانا چاہتے ہو۔''

''ہم بھی صحافی ہیں۔ دیکھ کر چوٹ لگاتے ہیں۔'' اس نے سگریٹ کا کش لیا۔

''ناصر، مجھے سونیا سے ڈر لگتا ہے۔ وہ ایک بار اپنی زندگی ختم کرنے کی کوشش کر چکی ہے۔''

''میں اسے زندگی کی طرف لانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مجھ پر اعتبار کرو! میں کھیل نہیں رہا ہوں۔''

''میں جانتا ہوں ورنہ خود تجھے اب تک سیدھا کر چکا ہوتا۔''

کافی پی کر مگ دینے ناصر گیا تھا اور واپسی پر خوش خوش آیا۔ ''صلح ہو گئی ہے۔ رات کے کھانے کی دعوت بھی ملی ہے۔''

''اتنی جلدی!'' میں نے غور سے اسے دیکھا۔

''بس یار، اپنی بات ہے۔'' اس نے جیکٹ کے کالر کھڑے کئے، اس میں فخر سے زیادہ سردی کا دخل تھا۔

مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے ناصر سے رکنے کو کہا اور اندر گیا۔ ''سونیا! کوئی دوربین ہے؟''

''بالکل ہے بھائی!'' اس نے ایپرن سے ہاتھ صاف کئے اور میرے ساتھ اپنے بیڈ روم میں آئی۔ اس نے الماری سے ایک چھوٹا سا باکس نکالا اور اس میں سے چوکور ساخت کی جدید ترین دوربین نکالی۔ ''اس میں نائٹ وژن بھی ہے اور بارہ سو میٹر کے فاصلے پر کھڑے انسان کو واضح دیکھا جا سکتا ہے۔ جدید ترین نائٹ امیجر ہے۔''

وہ مجھے دوربین کا استعمال سکھانے لگی۔ جدید ہونے کے باوجود اس کا سسٹم بے حد سادہ تھا۔ میں آسانی سے سمجھ گیا۔

☆======☆======☆

دوربین کو اس کے کیس میں رکھ کر باہر آیا۔ ناصر ڈرائیونگ کر رہا تھا جبکہ میں نے موبائل چیکر میں وہ سم لگائی جو اس علاقے میں کام کر رہی تھی اور اس سے بلاوجہ جامی شاہ، مرشد علی اور شاہ نواز کے موبائل پر کالز کیں تاکہ ان کی فریکوئنسیاں چیکر میں آ جائیں، مجھے خدشہ تھا کہ سم بدلنے سے کہیں فریکوئنسیاں نہ کھو جائیں۔ اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ فوراً ہی شاہ نواز کی کال آئی۔ وہ کسی منور نامی شخص سے بات کر رہا تھا اور اس سے بیس لاکھ روپے کا مطالبہ کر رہا تھا۔ منور ٹال مٹول کر رہا تھا۔ ''شاہ نواز! ابھی میرے پاس گنجائش نہیں ہے، میں چند مہینے بعد دوں گا۔''

''یہ میں ایک سال سے سن رہا ہوں اور مجھے بے خبر مت سمجھنا۔ ابھی تم نے اس فلمی اداکارہ کو تیس لاکھ کی کوٹھی لے کر دی ہے۔''

منور کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ اس نے خاصی دیر کے بعد کہا۔ ''تمہیں کس نے بتایا؟''

شاہ نواز نے قہقہہ لگایا تھا۔''میرا نام شاہ نواز ہے۔کل میرے بندے آئیں گے۔بیس لاکھ کا بندوبست کر کے رکھنا اور شکر کرو، میں نے ایک سال کا سود نہیں مانگا۔''

میں نے منور نامی آدمی کا نمبر بھی محفوظ کر لیا اور اسے کال کر کے بات کئے بغیر لائن کاٹ دی۔اس کی موبائل فریکوئنسی بھی میرے پاس آ گئی تھی۔اس میں ایک درجن فریکوئنسیاں محفوظ کرنے اور ان کو چیک کرنے کی گنجائش تھی۔ہم دس منٹ میں مطلوبہ حویلی کے پاس تھے۔یہ سڑک سے کوئی دو سو گز کے فاصلے پر تھی اور خاصے بڑے رقبے پر پھیلی تھی، اس کے اردگرد تاحدِ نگاہ کھیت تھے۔البتہ دوسری طرف جھاڑ جھنکاڑ پر مشتمل جنگل تھا جسے پنجابی میں جھنگر بھی کہتے ہیں۔ناصر نے جیپ روکی نہیں اس کے بجائے اس نے خاصے آگے جا کر جیپ کچے میں اتار لی اور جھنگر کی طرف لانے لگا۔اس نے ایک جگہ چند درختوں کے درمیان جیپ اس طرح روکی کہ اس کا سڑک سے نظر آنا ناممکن تھا۔''جاسوسی کے لئے اچھی جگہ ہے، ہم کسی کو نظر نہیں آئیں گے۔''

''یہاں سے حویلی بھی نظر نہیں آ رہی۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔

''یہ درخت کس لئے ہے۔'' ناصر نے جیپ کے نزدیک موجود پیپل کے کوئی تیس چالیس فٹ اونچے درخت کی طرف اشارہ کیا۔''جناب، دوربین لے کر اوپر چڑھ جائیں، میں نیچے پہرہ دیتا ہوں۔''

''مجھے درختوں پر چڑھنے کا تجربہ نہیں ہے۔''

''بندے کو سوائے سیڑھیوں کے اور کسی شے پر چڑھنے کا تجربہ نہیں ہے۔'' اس نے صاف انکار کر دیا۔

مجبوراً مجھے ہی چڑھنا پڑا تھا۔سپاٹ تلے والے جوتوں کی وجہ سے یہ کام خاصا مشکل ثابت ہوا لیکن میں کسی نہ کسی طرح تیس فٹ کی اونچائی پر جا پہنچا جہاں سے مجھے پری محل صاف نظر آ رہا تھا۔دوربین میں نے جیکٹ کے اندر ڈال لی تھی۔ایک عدد دو شاخے پر خود کو اچھی طرح جما کر میں نے دوربین نکالی اور اسے نارمل موڈ پر رکھتے ہوئے لینس درست کرنے لگا۔دوربین میں ایک رینج فائینڈر بھی لگا تھا جو مطلوبہ منظر سے فاصلہ بتاتا تھا۔اسکرین پر چار سو سینتیس کے ہندسے آ رہے تھے یعنی پری محل اس جگہ سے کوئی چار سو سینتیس میٹرز کے فاصلے پر تھا۔لینس درست ہوتے ہی محل یوں دکھائی دینے لگا جیسے چند فٹ کے فاصلے پر ہو۔یہ خاصی وسیع و عریض عمارت تھی۔اس کی تین منزلیں تھیں۔جبکہ بظاہر دو منزلہ لگتی تھی۔اس بلندی سے عمارت واضح نظر آ رہی تھی، اس کے سامنے پختہ کار پارکنگ میں نصف درجن گاڑیاں کھڑی تھیں۔احاطے میں تین چار مسلح افراد بھی ٹہلتے نظر آ رہے تھے۔اچانک میری توجہ حویلی کے مین گیٹ پر رکنے والی ایک اسٹیشن ویگن کی طرف گئی۔یہ خاصا پرانا ماڈل ہے لیکن اب بھی سڑکوں پر نظر آتا ہے۔بڑی فیملی کے لئے خاصی موزوں گاڑی ہے۔

مجھے خیال آیا کہ شاید ویگن میں مرشد علی آیا ہے لیکن میں نے یہ خیال مسترد کر دیا، اس جیسا شخص اس گاڑی میں سفر نہیں کر سکتا تھا۔ویگن اندر گئی اور پارکنگ کے لئے مخصوص جگہ رکی۔اس کا سرکنے والا دروازہ کھلا تو اندر سے خاصی تعداد میں عورتیں اور لڑکیاں اتریں جنہوں نے زرق برق لباس پہن رکھے تھے۔میں نے گننے کی ناکام کوشش کی اور وہ اتنی دیر میں اندر چلی گئی تھیں۔ان کی تعداد دس سے کم نہیں تھی۔ان کو دیکھ کر مجھے شاہ نواز کی گفتگو کا خیال آیا جو اس نے اپنے کسی گرگے سے کی تھی۔اس نے ہنگامی طور پر کرائے کی لڑکیاں لانے کو کہا تھا تاکہ مرشد علی کو حاضری پوری دکھا سکے۔اس کا مطلب تھا مرشد علی ابھی تک نہیں آیا تھا۔

''اوہ بھائی، میں بور ہو رہا ہوں۔'' نیچے سے ناصر نے فریاد کی۔
''میں کیا کر سکتا ہوں۔ نیچے والی جگہ تم نے خود منتخب کی تھی۔'' میں نے دوربین لگائے لگائے کہا۔
''پریاں نظر آ رہی ہیں؟''
''اس موسم میں...... سارے کھڑکیاں دروازے بند ہیں۔'' میں نے مطلع کیا۔
''تب تم کیا دیکھ رہے ہو؟''
''میں مرشد علی کا انتظار کر رہا ہوں۔''
''انتظار کرنے کے بجائے اس سے کال کر کے کیوں معلوم نہیں کر لیتے؟''
ظاہر ہے ناصر نے محض مذاق میں کہا تھا لیکن اس سے مجھے ایک نیا خیال سوجھا۔ میں نے مرشد علی کو ایک دوسرے موبائل سے کال کی۔ یہ ناصر کا موبائل تھا۔ ''ہیلو!'' مرشد علی نے اپنے مخصوص رعونت بھرے انداز میں کہا۔ ''کون ہے؟''
''مرشد، کیا حال ہیں تمہارے؟''
''شہباز!'' وہ چونکا۔ ''اب کیا بات ہے۔ کیا تم نے میری پیشکش کے بارے......''
''میں اس پر لعنت بھیجتا ہوں۔ میں نے کسی اور مقصد سے فون کیا تھا۔''
''مرشد کی کسی شے پر لعنت بھیجنے والا ابھی تک پیدا نہیں ہوا۔'' اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ''اور کسی نے ایسی گستاخی کی تو زیادہ دیر زندہ......''
''مرشد علی، تم یہ باتیں اسے بتانا جو نہیں جانتا ہو اور تمہارے اس پیری مریدی کے چمکتے ڈھونگ سے متاثر ہو، میں تمہیں تمہارے کپڑوں بلکہ اس سے بھی اندر سے جانتا ہوں۔ مجھے پتا ہے تمہارے گورے جسم میں کتنی کالک بھری ہے۔ اس لئے صرف کام کی بات کرو۔''
''کیسی کام کی بات؟''
''مبارک ہو۔ بالآخر تم نے اس دھندے میں بھی قدم رکھ دیا جو میرے خیال سے تمہارا خاندانی پیشہ ہونا چاہئے۔''
''کیا...... کس دھندے کی بات کر رہے ہو؟'' اس کے انداز میں پریشانی آ گئی تھی۔
''دلالی کا، عورتوں کی دلالی کا...... مجھے یہ بھی معلوم ہے تم نے جامی شاہ کے آدمی کو توڑ لیا ہے۔ شاہ نواز ہے اس کا نام اور آج کل دونوں کے درمیان خونریز تصادم کی تیاری کی جا رہی ہے۔''
''اور کیا جانتے ہو تم؟'' مرشد علی کا لہجہ سپاٹ ہو گیا تھا جب کہ مجھے یقین ہے اندر سے وہ دہل گیا ہوگا؟
''وہ بھی جو تم نہیں جانتے۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔
''میں کیا نہیں جانتا؟''
''یہی کہ شاہ نواز تمہیں ڈبل کراس کر رہا ہے۔ وہ کسی صورت یہ دھندا تمہارے حوالے نہیں کرے گا۔ اس کی اصل کال گرلز گاہکوں کے پاس ہیں اور اس نے ان کی جگہ دو نمبر عورتیں منگوالی ہیں، غالباً تمہارے سامنے نفری پوری کر کے دکھانے کے لئے۔''

اس بار وہ اپنے لہجے کی پریشانی نہیں چھپا سکا تھا۔ ''تم یہ سب کیسے جانتے ہو؟''

''بے کار کا سوال ہے۔'' میں ہنسا۔

''اچھا یہ بتا دو کہ تم مجھے یہ سب کیوں بتا رہے ہو؟''

''اس پر بھی خود غور کرو۔''

''اگر یہ بات درست ہے تو شاہ نواز کی لاش میرے کتے کھائیں گے۔''

''اسے تر نوالہ مت سمجھو۔ اس صوبے کے بیشتر سرکاری حکام اور سیاست دان اس کے گاہک ہیں، ان میں سے جانے کتنے اس کے ہاتھوں بلیک میل ہو رہے ہوں گے۔ اس کی طاقت کم نہیں ہے۔ وہ جامی شاہ جیسے شخص سے ٹکرا رہا ہے۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔

''جامی شاہ!'' مرشد علی حقارت سے بولا۔ ''وہ گھٹیا بدمعاش!''

''جس کی خدمات تم جیسے بڑے بدمعاش حاصل کرتے ہیں۔'' میں نے قہقہہ لگایا۔ ''مرشد علی اس میں اور تم میں صرف چھوٹے بڑے کا فرق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تم بدمعاش بڑے ہو اور گھٹیا بھی۔''

''بکواس بند کرو۔'' وہ حلق پھاڑ کر چلایا اور کال کاٹ دی۔

ناصر کسی نہ کسی طرح ایک نچلی شاخ پر آ گیا تھا۔ ''تم کس سے چھیڑ چھاڑ کر رہے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''مرشد علی سے۔'' میں ہنسا۔ ''ابھی اور تماشا دکھاتا ہوں۔''

اس بار میں نے شاہ نواز کا نمبر ملایا۔ ''شاہ نواز، میں شہباز ملک بول رہا ہوں۔''

''تم!'' وہ چلایا اور گالیاں دینے لگا۔ ''فیروز اور ثاقب کی لاشیں ملی ہیں۔ جامی شاہ نے بتایا ہے انہیں تم نے اس کے حوالے کیا تھا۔''

''ہاں، یہ درست ہے۔ اس میں کتے کی طرح چلانے کی کیا بات ہے؟''

''فیروز ایک اعلیٰ سرکاری افسر کا بیٹا ہے۔ کل تک پولیس تمہارے اور جامی شاہ کے خلاف حرکت میں آ جائے گی۔''

''آج سے کیوں نہیں۔'' میں ہنسا۔ ''اور لگتا ہے تمہارے اس باپ نے تمہیں صحیح طریقے سے لتاڑا ہے۔ میرا اشارہ راشد فاروقی کی طرف ہے۔ بہر حال میں نے تمہیں تمہارے ایک اور باپ کے بارے میں اطلاع دینے کے لئے فون کیا ہے۔ وہ تمہارا نیا نویلا باپ مرشد علی ہے۔''

''بکو مت۔'' وہ غرایا۔

میں نے اس کی غراہٹ پر توجہ دیئے بغیر بات جاری رکھی۔ ''مرشد علی کو تم پر شک ہو گیا ہے۔ بلکہ شک کیا یقین ہو گیا ہے، تم اسے ڈبل کراس کر رہے ہو اور وہ اب جامی شاہ سے بات کر رہا ہے۔''

''بکواس کرتے ہو تم۔'' وہ پھر غرایا لیکن اس بار اس کے لہجے میں تفکر تھا۔

''اس کا مطلب سمجھ رہے ہو نا، تمہاری چھٹی، راشد فاروقی بھی مرشد علی کا آدمی ہے۔''

''آخر تم یہ سب کیوں بتا رہے ہو؟'' اس بار وہ انسانوں کے لہجے میں بولا۔

''اسے بھول جاؤ، میں نے جو بتایا ہے اس کی تصدیق کر لو۔'' میں نے کہا اور کال کاٹ دی۔

ناصر نے پھر کہا۔ ''یہ تم کیا کر رہے ہو؟''

''دیکھتے رہو۔'' میں نے کہا اور اس بار جامی شاہ کا نمبر ملایا۔ وہ نمبر بند تھا، میں نے پھر اس لینڈ لائن کا نمبر ملایا جو مجھے ناصر نے فراہم کیا تھا۔ ''مجھے جامی شاہ سے بات کرنی ہے، فوراً۔''

''تم کون ہو؟''

''شہباز...... اس سے کہو فوراً لائن پر آئے ورنہ اس کا بہت زیادہ نقصان ہوگا۔''

ایک طویل خاموشی کے بعد مجھے ایک موبائل نمبر دیا گیا۔ ''اس پر رابطہ کرو۔''

میں نے نمبر ملایا۔ ''جامی شاہ تم کہاں ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''کیا بات ہے، تم بار بار کیوں مجھے تنگ کر رہے ہو؟'' اس کے لہجے میں بے زاری تھی۔

''حالانکہ میں تمہارے کام آیا، تم نے ان دونوں لڑکوں کو مار دیا۔ کیا یہ کھلی جنگ کا چیلنج نہیں ہے۔''

''اس سے تمہیں کوئی غرض نہیں ہونی چاہئے۔ میں اپنے معاملات خود طے کرتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے جامی شاہ! تمہارے لئے میرے پاس ایک اور اطلاع ہے۔ آج رات مرشد علی اور شاہ نواز پری محل میں مل رہے ہیں۔ مرشد علی اس کاروبار کو اپنے قبضے میں لینا چاہتا ہے۔''

''اطلاع کا شکریہ اور کچھ؟''

''صرف اتنا کہ کل جب مرشد علی یہاں سے جائے گا تو تمہاری حیثیت ایک مردہ آدمی کی سی ہوگی۔''

''میں نے موبائل بند کر کے جیکٹ میں رکھا تو ناصر بولا۔ ''تم واقعی بی جمالو کا کردار ادا کر رہے ہو۔''

''ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے۔'' میں نے اپنے پرس سے فیروز کی سم نکالی۔ یہ اس کی جیب سے نکلی تھی، اسے ناصر کے موبائل میں لگا کر آن کیا اور فیروز کے باپ راشد کا نمبر نکالا۔ موبائل چیکر پر یہ نمبر ملایا۔ چند بار گھنٹی بجنے کے بعد اس نے کال ریسیو کی۔

''یس!'' اس کی آواز نزلہ زدہ تھی یا بھرائی ہوئی تھی، میں کہہ نہیں سکتا۔

''مسٹر فاروقی، مجھے افسوس ہے۔''

''ہاں...... لیکن تم کون ہو؟'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔

''اپنا ہمدرد سمجھ لو مگر افسوس کہ میں اپنا نام پتا نہیں بتا سکتا۔''

''پھر کس لئے کال کی ہے؟''

''میں چاہتا ہوں تمہارے بیٹے کا قاتل گرفتار ہو جائے اور میں جانتا ہوں وہ کہاں ملے گا۔''

''کہاں ملے گا؟'' وہ یک لخت اپنی افسری بھول کر جذباتی ہو گیا۔ ''میں اس حرام زادے کا لہو پی جاؤں گا، اس کے سارے خاندان کو نیست و نابود کر دوں گا۔''

''مسٹر فاروقی، تم ایسا نہیں کر سکتے۔ وہ ایک طاقتور غنڈا ہے۔ اس کی گردن تمہارے ہاتھوں کی پہنچ میں ہونے کے باوجود موٹی اور مضبوط ہے۔''

''میں...... میں اسے......'' غصے کی شدت سے اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

''آہستہ، مجھے ڈر ہے تمہیں ہارٹ اٹیک نہ ہو جائے۔'' میں نے چمکار کر کہا۔ ''جامی شاہ معمولی شخص نہیں

ہے۔"

"وہ کتا......" راشد فاروقی بولا اور اس نے جامی شاہ کو فحش ترین گالیاں دیں۔ ایسی گالیاں جن کا تصور اکیس گریڈ کے افسر کے منہ سے نہیں کیا جا سکتا تھا۔ "میں اس کے پورے خاندان کو بیچ چوراہے پر کتے کی موت ماروں گا۔"

"مسٹر فاروقی، تم غصے میں ہو اور یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔"

"میں اسے جہنم رسید کرنا چاہتا ہوں اور جہنم میں جائیں تمہارے طریقے۔ اس کی گولیوں سے چھلنی لاش دیکھ کر مجھے سکون ملے گا۔ فیروز میرا ایک ہی لڑکا تھا۔" اس کی آواز بھرانے لگی تھی۔

"میں تمہیں آج رات کسی وقت بتا سکوں گا کہ جامی شاہ کہاں ہے؟" میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

تاریکی چھا رہی تھی اور جہاں ناصر تھا، وہاں اچھا خاصا اندھیرا ہو گیا تھا اس لئے میں اس کے تاثرات تو نہیں دیکھ سکا تھا لیکن آواز سے وہ حیران لگا تھا۔ "شہباز، تمہارے سر میں دماغ یا......"

"اسے چھوڑو، یہ بتاؤ کام کیسا کیا ہے؟"

"میں تو چکرا گیا ہوں۔ تم نے سازش کرنے میں اسٹار پلس کے ڈراموں کی ساس بہوؤں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ کچھ ایسا جال بُن دیا ہے کہ یہ سب اس میں کچھ نہ کچھ پھنسیں گے۔"

"سوائے مرشد علی کے۔ وہ مجھے اچھی طرح جانتا ہے اور اگر اس نے شاہ نواز سے کھل کر بات کر لی تو بھانڈا پھوٹ جائے گا۔"

"تمہارا کیا خیال ہے، جامی شاہ اس کے خلاف کچھ کرنے کی ہمت رکھتا ہے؟"

"مرشد علی اس کے مقابلے میں بہت بڑا بدمعاش ہے۔ ایسا بدمعاش جس نے خود پر نیکی اور روحانیت کا لبادہ چڑھا رکھا ہے۔ کوئی اسے بدمعاش کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا لیکن جامی شاہ کی اس وقت جان پر بنی ہے، اس کا برسوں کا اقتدار خطرے میں ہے۔ اسے بچانے کے لئے وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ کہتے ہیں جب بلی پر بن آتی ہے تو وہ کتے پر حملہ کرنے سے نہیں گریز کرتی۔"

"اس کا مطلب ہے تم مرشد علی کو کتا قرار دے رہے ہو۔"

"نہیں، انسان چاہے دشمن ہی کیوں نہ ہو، اسے جانور سے نہیں ملایا جا سکتا۔ میں نے صرف مثال دی تھی۔ میرے کہنے کا مطلب ہے جامی شاہ کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا۔"

"وہ تو جب کرے گا تب کرے گا، ابھی ہم یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

"جو کرنا تھا کر چکے ہیں، اب جھک مار رہے ہیں۔" میں ہنسا اور اس کے پاس سے گزرتا نیچے اتر گیا تھا۔

"مجھے بھی اتارو۔" ناصر چلایا۔

"خود آ جاؤ۔" میں نے جواب دیا۔ "ورنہ چھلانگ لگا دو، میں کیچ کر لوں گا۔"

ناصر بھناتا ہوا نیچے آیا۔ "اور اگر ڈراپ ہو گیا تو؟"

"یہ تو ہے، ہم پاکستانی اتنے کیچ پکڑتے نہیں ہیں، جتنے چھوڑ دیتے ہیں۔"

''آہ، تم نے کیا یاد دلا دیا۔ شاہدرہ کے کھلے میدان ہوتے تھے، مئی جون کی چلچلاتی دھوپ ہوتی تھی اور ہم ہوتے تھے۔ خاص طور سے سنڈے کے دن دیوانہ وار کرکٹ ہوتی تھی۔ کوئی لڑکا صرف اس صورت میں میدان سے جاتا تھا جب اس کے گھر سے کوئی بری خبر آتی تھی یا اس کا باپ آ جاتا تھا۔''

''مجھے کرکٹ صرف دیکھنے کی حد تک پسند ہے، خاص طور سے جب پاکستان، انڈیا کا میچ ہو تو میں اور سارا دفتر کام روک کر ٹی وی کے آگے بیٹھ جاتے تھے۔ میں تھا، منیجر طاہر تھا، ایک لڑکی نبیلہ تھی جس میں طاہر دلچسپی لیتا تھا لیکن وہ خود دفتر کے دوسرے لڑکے سلیم میں دلچسپی رکھتی تھی، چوکیدار خان تھا۔'' میں نے سرد آہ بھری۔ ''کیا دور تھا اور اب...... پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں۔''

''چلنے کی کرو۔ ورنہ پوچھنے والی صحیح سے پوچھے گی۔''

ناصر نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور خاصی آگے جا کر گاڑی سڑک پر چڑھائی۔ دس منٹ بعد ہم واپس کوٹھی میں آ چکے تھے۔ یہاں بجلی تھی۔ پانی بورنگ سے نکالا جاتا تھا اور گیس کے لئے سلنڈر استعمال کیا جاتا تھا گویا تمام جدید شہری سہولیات تھیں۔ سعادت خان گیٹ کے پاس اپنے مختصر سے کمرے میں انگیٹھی جلائے بیٹھا تھا۔ کھلا علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں سردی کی شدت زیادہ ہی محسوس کی جا رہی تھی۔ سونیا کچن میں تھی اس نے مجھے دیکھ کر کہا۔ ''آپ نے دیر کر دی، مجھے فکر ہونے لگی تھی۔''

''ہاں دیر تو ہوئی ہے لیکن آج کام بھی زبردست ہوا ہے۔''

''اچھا کیا کام ہوا ہے؟'' اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

''یہ میں کھانے کے بعد بتاؤں گا۔'' میں نے کمرے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، دس منٹ میں کھانا میز پر ہوگا۔''

میں منہ ہاتھ دھو کر آیا تو ناصر کچن میں سونیا کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ سونیا سلاد کاٹ رہی تھی۔ ہم نے کھانا کچن میں کھانے کا فیصلہ کیا۔ وہاں بھی ایک چھوٹی سی میز تھی۔ سونیا نے دو عدد مسلم رانیں روسٹ کی تھیں۔ جب ان کو مائیکرو ویو سے نکالا تو ان سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ ساتھ میں سلاد، ٹماٹر، پیاز اور کھیرے کے کٹے ٹکڑے تھے۔ یہ مغربی انداز کا ڈنر تھا۔ رانیں ایک ٹرے میں سجا کر رکھی تھیں۔ ہم چھریوں سے ٹکڑے کاٹ کر اپنی پلیٹوں میں رکھے اور چھری کانٹے سے ان کو کھانے لگے۔ سونیا نے واقعی لاجواب روسٹ بنایا تھا۔ ناصر نے کھاتے ہوئے کہا۔ ''مزہ آ گیا خاتون!''

''روسٹ بہترین ہے۔'' میں نے تائید کی۔

''سچ!'' سونیا خوش ہو گئی تھی۔ ''سچ مچ اچھا ہے یا آپ دونوں دل رکھنے کے لئے میری تعریف کر رہے ہیں؟''

''میں پیٹ کے معاملے میں کبھی جھوٹی تعریف نہیں کرتا۔'' ناصر نے جواب دیا۔

''اور میری تعریف کی سچائی کا اندازہ تم آخر میں خالی ڈش سے کر سکتی ہو۔''

واقعی، آخر میں صرف ران کی ہڈیاں باقی بچی تھیں۔ کھانا کھا کر میں کمرے میں آیا۔ منہ ہاتھ دھو کر میں نے کپڑے بدلنے کا سوچا تب مجھے خیال آیا۔ یہاں میرا کوئی لباس نہیں تھا۔ میں نے سونیا سے کہا، وہ بولی۔

"آپ وسیم بھائی کے کپڑے پہن لیں۔ ان کا اور آپ کا ناپ تقریباً ایک ہے۔"

میں نے الماری دیکھی، اس میں وسیم کے بے شمار سوٹ تھے۔ شلوار قمیص، پینٹ شرٹس، مکمل سفاری سوٹ اور اسپورٹس سوٹ، وغیرہ وغیرہ۔ ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ وسیم کا لباس کے معاملے ذوق اعلیٰ تھا۔ کپڑے دیکھ کر اس کا خیال آیا تو میں سرد آہ بھر کر رہ گیا۔ آدمی دنیا سے گزر جاتا ہے لیکن اس کی چیزیں یہیں رہ جاتی ہیں۔ میں نے موسم اور مہم کی مناسبت سے ایک سیاہ اونی ٹراؤزر اور نیوی بلیو جرسی لی تھی، اوپر پہننے کے لئے میری سیاہ چرمی جیکٹ تھی۔ الماری کے نچلے حصے میں جوتوں کی مکمل رینج تھی۔ میں نے ایک کریپ سول والا جاگر منتخب کیا۔ جو کسی قدر کھلا تھا لیکن موٹا سوتی موزہ لینے کے بعد جو کر میرے پیروں میں فٹ ہو گیا تھا۔ الماری سے باریک سوتی اور ریشم کے دستانے بھی ملے تھے۔ میں نے سوتی دستانے لے لئے اس سے میرے بائیں کمزور ہاتھ کو سپورٹ بھی ملتی۔ میں تیار ہو کر باہر آیا تو سونیا اور ناصر چونکے تھے۔ ناصر نے کہا۔ "کہاں کی تیاری ہے؟"

"پری محل کی۔" میں نے دستانے اتار کر جیب میں رکھ لئے۔

"پری محل!" سونیا نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"میں نے سونیا کو تفصیل سے بتایا، اس دوران میں اس نے برتن دھوئے، چائے بنائی اور ہم نے پی بھی لی۔ آخر میں اس نے نفی میں سر ہلایا۔" میں آپ کو نہیں جانے دوں گی۔"

"میں حملہ کرنے نہیں جا رہا، میں صرف جائزہ لوں گا۔"

"شہباز بھائی! آپ اکیلے ہیں، کسی مصیبت میں پھنس گئے تو......"

"مصیبت گھر بیٹھے بھی آجاتی ہے۔" میں نے کہا۔ "اور مجھے دشمن سے مقابلہ کرنے کے لئے باہر نکلنا ہے۔"

"یار عبداللہ اور اس کے آدمیوں کو نہ بلوالیں؟" ناصر نے تجویز پیش کی۔

"میں راجا یا اس کے کسی آدمی کو اس میں شامل نہیں کرنا چاہتا۔ اس کا خیال ہے مجھے مقامی معاملات میں پڑنے کے بجائے سرحد پار چلے جانا چاہئے۔"

"درست کہا ہے اس نے۔" ناصر بولا۔ "تم بلاوجہ اس معاملے میں الجھ رہے ہو۔"

"بلاوجہ!" میں نے برہمی سے کہا۔ "وہ سب میرے خون کے پیاسے ہیں، موقع ملے تو ایک منٹ سے پہلے مجھے اور میرے ساتھیوں کو مار دیں۔ میں ان کے خلاف کچھ نہ کروں تو حماقت ہوگی۔ میں اپنے دشمنوں کو کھلی چھوٹ کیوں دوں؟"

"خفا مت ہو بھائی! سوال یہ ہے کہ عملی طور پر تم کیا کر سکو گے۔"

"اس عمارت پر حملہ یا اس میں گھسنا بہت مشکل ہے۔" سونیا بولی۔

"میرا اس میں گھسنے کا کوئی ارادہ بھی نہیں ہے۔ عمارت کے چاروں طرف دس فٹ اونچی چار دیواری۔ اور اس پر خاردار تار ہے۔ ممکن ہے اس میں کرنٹ بھی دوڑ رہا ہو۔"

"پھر تُو کس لئے جا رہا ہے؟"

"یار! ابھی شام کو ہم کس لئے گئے تھے۔ ہمیں کتنی بیش قیمت معلومات ملی ہیں۔"

''وہ تو گھر بیٹھے بھی مل سکتی تھیں۔''
''تم لوگ نہیں سمجھو گے۔ ممکن ہے کوئی ایسی بات پتا چلے جو میرے لئے کارآمد اور میرے دشمنوں کے لئے نقصان دہ ہو۔'' میں نے سمجھانے کی کوشش کی۔
''او کے، پھر ہم بھی چلیں گے۔'' سونیا بولی۔
''ہم!'' ناصر نے مرے ہوئے انداز میں کہا۔''سونیا بی بی! اس سردی کے عالم میں میرا باہر جانے کا قطعی کوئی ارادہ نہیں ہے۔''
''تم مت جاؤ، لیکن میں شہباز بھائی کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔'' سونیا تنک کر بولی۔
''نہیں، تم دونوں میں سے کوئی میرے ساتھ نہیں جائے گا۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔''ناصر، تم مجھے پری محل سے کچھ فاصلے پر اتار کر واپس آ ؤ گے اور میری کال کا انتظار کرو گے۔''
''میرا موبائل تمہارے پاس ہے۔'' اس نے یاد دلایا۔
میں نے اس کا موبائل اسے دیا اور اپنے پاس موبائل چیکر رکھا تھا۔ کیونکہ اس پر کال نہیں آتی تھی اس لئے بیل بجنے کا مسئلہ بھی نہیں تھا۔''اگر ہمیں کسی وجہ سے تم سے رابطہ کرنا پڑا تو......؟'' ناصر بولا۔
''مجبوری ہے اس کمپنی کی دو ہی سمز ہیں، ایک تمہارے پاس ہے دوسری میرے پاس ہے۔'' میں نے شانے اچکائے۔''تم فکر مت کرو، میں کال کرتا رہوں گا۔''
ہم باہر آئے تو سعادت خان اتنی رات گئے ہمارے باہر جانے پر کچھ حیران نظر آیا تھا لیکن اس نے کچھ کہا نہیں۔ چپ چاپ گیٹ کھول دیا۔ میں نے اسلحہ خانہ سے ایک عدد سیون ایم ایم رائفل نکال لی تھی۔ مار اور نشانے کی درستگی کے لحاظ سے یہ بے مثال رائفل تھی اور تقریباً ہزار گز تک مار کرتی ہے۔ دو عدد پستول میرے پاس تھے۔''میں بھی تمہارے پاس رکوں گا۔'' ناصر نے کہا۔
''نہیں، تمہیں صرف زبان اور قلم چلانا آتا ہے۔ اس لئے تمہارا ساتھ ہونا بے کار ہے۔ اکیلے میں خود کو زیادہ بہتر طریقے سے چھپا سکوں گا۔''
بادل ناخواستہ اس نے سر ہلایا۔''اگر تم نے ایک گھنٹے تک کال نہیں کی تو میں چلا آؤں گا۔''
''جیسے ہی پری محل کی روشنیاں نمودار ہوئیں میں نے ناصر سے جیپ روکنے کو کہا اور نیچے اتر کر بولا۔ ''اب تم آرام سے جاؤ اور خبردار، بغیر بلائے مت آنا۔ سونیا کو بھی سمجھا دینا اور اگر میں نہ آؤں تو سونیا کو لے کر فوری طور پر واپس راجا عمر دراز کے پاس چلے جانا۔''
''تمہارے ارادے مشکوک لگ رہے ہیں۔'' ناصر نے کہا۔
''میرے ارادے نیک ہیں۔'' میں نے اسے تسلی دی۔''لیکن آگے تقدیر نے کیا لکھا ہے۔ بہرحال میں بیل کو قطعی آفر نہیں کروں گا۔''
ناصر واپس چلا گیا۔ مجھے معلوم تھا اس نے میری بات کا یقین نہیں کیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں درختوں اور نیچی جھاڑیوں کے اس جھنڈ کی طرف جانے لگا، جہاں شام کے وقت میں نے ایک درخت سے پری محل کا نظارہ کیا تھا۔ میری پشت پر ایک بیگ بندھا تھا جس میں دوربین، اسلحے کے اضافی میگزین اور بعض

ضروری اشیاء تھیں۔ ان میں دو عدد ٹارچیں بھی تھیں۔ میں نے ایک ٹارچ نکال کر اسے محدود روشنی والے موڈ پر کیا اور اس کی مدد سے راستہ تلاش کرنے لگا۔ آج رات دھند نہیں تھی لیکن کہر اگر رہا تھا اور اس کی وجہ سے دور کے منظر ذرا دھندلا رہے تھے۔ اگر کوئی پری محل سے اس طرف دیکھ رہا تھا تو مجھے امید تھی کہ اسے ٹارچ کی محدود روشنی نظر نہیں آئے گی۔ سردی کی شدت میں شام کے مقابلے میں اضافہ ہوا تھا لیکن میں سر سے پاؤں تک گرم چیزوں میں ملفوف تھا۔ سر پر میں نے سیاہ رنگ کی اونی ٹوپی پہن رکھی تھی جسے وقت پڑنے پر کھینچ کر نقاب کی طرح چہرے پر کیا جاسکتا تھا۔ اس میں آنکھوں کی جگہ سوراخ تھے۔ ابھی تک موبائل چیکر نے کوئی اور کال نہیں پکڑی تھی حالانکہ شام سے اب تک پانچ گھنٹے گزر چکے تھے۔ میں نے اسے چیک کیا، وہ درست طور پر کام کر رہا تھا۔ مزید اطمینان کے لئے میں نے ناصر کو ایک کال بھی کر لی۔

''میں واپس آ گیا ہوں۔''

''اور میں اس درخت کے پاس ہوں جہاں شام ہم چڑھے تھے۔ اب بھی اسی پر آشیانہ ہوگا۔'' میں نے کہا اور خدا حافظ کہہ کر کال کاٹ دی۔ دن کی روشنی کے مقابلے میں رات کے وقت درخت پر چڑھنا دشوار بھی تھا اور پُر خطر بھی۔ نہ جانے کس شاخ پر سانپ یا اسی قبیل کا کوئی کیڑا بیٹھا ہو اور موقع پاتے ہی مجھے ڈس لے۔ مگر اوپر تو جانا تھا۔ اس پورے جھنڈ میں یہی درخت سب سے اونچا اور مضبوط لکڑی کا تھا۔ میں شام کے وقت بھی آرام سے اس کی شاخوں پر براجمان رہا تھا۔ جیسے تیسے میں اوپر دوشاخے تک پہنچا اور اس دوران میں کسی سانپ نے مجھے نہیں کاٹا سوائے چند چیونٹیوں کے۔ جن پر غلطی سے میرا ہاتھ پڑ گیا تھا۔ اوپر میں نے ٹارچ سے اچھی طرح معائنہ کیا۔ میرا مسکن محفوظ تھا البتہ چند پرندوں نے اس پر سخت احتجاج کیا۔ میں نے ان کے خوابِ شیریں میں خلل ڈالا تھا۔ بہرحال جب میں نے ٹارچ بجھائی تو وہ بھی اپنے بیڈ رومز میں لوٹ گئے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ان میں کوئی کوا نہیں تھا ورنہ اس نے ابھی اپنی برادری کو جمع کر لینا تھا۔

بیگ سے دوربین نکالی، رائفل اور بیگ دونوں ایک شاخ سے لٹکا دیئے تھے۔ فاصلے سے پری محل رات کی تاریکی میں یوں لگ رہا تھا جیسے روشنیوں کا محل ہو۔ میں نے دوربین سے معائنہ کیا۔ سخت سردی کے باوجود احاطے میں مجھے نصف درجن کے قریب مسلح افراد سامنے اور عمارت کے دائیں بائیں ٹہلتے نظر آئے تھے۔ پارکنگ کے لئے مخصوص جگہ پر اب چودہ پندرہ گاڑیاں کھڑی تھیں اور ان میں ایک مرسیڈیز تھی جبکہ اس کے دائیں بائیں دو عدد ڈبل کیبن ٹویوٹا ہائی اکس کھڑی تھیں۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ کیا مرشد علی آ گیا تھا؟ اس کی تصدیق میں موبائل کی مدد سے کر سکتا تھا لیکن میں نے مرشد علی کے بجائے شاہ نواز کا نمبر ملایا۔ اس نے کال ریسیو کی۔

''کون ہے؟''

''تمہارا ہمدرد!''

''شہباز!'' وہ بولا۔ ''تم نے مجھے بے وقوف بنایا۔''

''تمہیں بچانے کی کوشش کی تھی لیکن اب تو مرشد علی تمہارے پاس ہے اور شاید اس نے تمہیں مطمئن کر دیا ہے۔''

''اس نے مجھے حقیقت بتا دی ہے۔ اس کا کاروبار پر قبضہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ وہ صرف میرا

ہا ہے۔"

"پارٹنر؟" میں طنزیہ انداز میں ہنسا۔"مرشد جیسے لوگ پارٹنرشپ کے قائل نہیں ہوتے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کچھ عرصے بعد تم نوکر بھی نہیں رہو گے مارے جاؤ گے یا غائب کر دیئے جاؤ گے۔"

"بکتے ہو۔" وہ بولا۔ اسی لمحے اس کے نزدیک سے کسی مخمور عورت کی ہنسی کی آواز آئی اور اس نے نشے سے لڑکھڑاتی آواز میں شاہ نواز سے ایک ایسی فرمائش کی کہ جسے سن کر مجھے اس سردی کے موسم میں اور کھلی فضا میں ہونے کے باوجود پسینہ آ گیا تھا۔

"دفع ہو......" جواب میں شاہ نواز نے اسے اتنی ہی فحش گالی دی تھی پھر مجھ سے بولا۔ "شہباز، تم بلاوجہ مرشد علی سے لڑانے کی کوشش کر رہے ہو۔"

"میں تمہیں اس سے بچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔تم سے میری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ مجھے نقصان مرشد علی نے دیا ہے یا جامی شاہ نے۔"

"اب مجھے فون مت کرنا۔" وہ بولا۔"ویسے تم کون سا نمبر استعمال کرتے ہو، جو اسکرین پر نہیں آتا؟"

میں آہستہ سے ہنسا اور رابطہ کاٹ دیا۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے جامی شاہ کا نمبر ملایا۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔"جامی شاہ، میں شہباز بات کر رہا ہوں۔"

"بولو۔" اس نے مختصراً کہا۔

"مرشد علی اور شاہ نواز اس وقت پری محل میں ہیں۔کل کے دن کو تم اپنے اقتدار کا آخری دن بھی سمجھ سکتے ہو۔"

"وہ دن کبھی نہیں آئے گا۔" جامی شاہ سلطان راہی مرحوم کے اسٹائل میں دہاڑا۔

"اچھا!" میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔"غالباً تم عملی طور پر کچھ کرنے کے بجائے اس طرح دھاڑ کر بچ جاؤ گے مگر مٹی کے شیر، شکاری ایک ہی گولی میں تمہیں ٹھنڈا کر دیں گے۔ اس لئے دہاڑنے سے کام نہیں چلے گا عملی طور پر کچھ کرو۔" میں نے کہتے ہوئے کال کاٹ دی۔

چند لمحے بعد موبائل پر وارننگ ٹون سنائی دی اور جامی شاہ کا نمبر آنے لگا۔ میں نے گفتگو سننے والا بٹن دبایا۔"اوئے سب کو بلا لے۔" جامی شاہ مخصوص انداز میں کہہ رہا تھا۔"سب کو فلی لوڈ ڈ ہونا چاہیے۔ راکٹ اور دستی بم بھی رکھ لینا۔"

"استاد، خیریت ہے؟"

"اوئے ماں کے......" جامی شاہ اس وقت پنجابی فلمی موڈ میں تھا اور اتنی اونچی آواز میں بول رہا تھا کہ اس کی آواز بغیر موبائل کے بھی اس کے گرگے تک جا رہی تھی۔ میں نے بغلیں بجائیں۔ بظاہر لگ رہا تھا کہ جامی شاہ نے مرشد علی اور شاہ نواز کی ایسی کم تیسی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اگلے دس منٹ میں اس نے مزید دو افراد کو کال کی اور ان کو لاؤ لشکر کے ساتھ آنے کا حکم دیا۔اس کے بعد میں دوربین سے پری محل کا جائزہ لینے لگا۔ خاص طور سے میں حفاظتی انتظامات کا جائزہ لے رہا تھا۔تقریباً ایک گھنٹے میں حویلی کا اس طرف والا سارا حصہ اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔تقریباً تمام ہی کھڑکیاں بند تھیں اور ان پر دبیز پردے تھے۔ظاہر ہے وہاں جس قسم کی سرگرمیاں ہوتی ہیں اس

کے لئے ایسے دبیز ہی پردے مناسب تھے۔ عمارت کے سامنے والے حصے میں مرکزی داخلی دروازے کے ساتھ دائیں اور بائیں دو عدد دروازے تھے۔ چاردیواری پر خاردار تار تھی۔ مرکزی گیٹ پر دو گارڈز تھے اور اندر احاطے میں چار گارڈز تھے جبکہ دو گارڈز عمارت کی چھت پر تھے۔ میرا خیال تھا کہ کم سے کم ایک اور گارڈ ضرور ہوگا۔ یعنی کل ملا کر نو افراد باہر تھے اور اتنے ہی بلکہ اس سے زیادہ مسلح افراد کی اندر موجودگی عین ممکن تھی۔ یعنی بیس سے لے کر پچیس مسلح افراد کی موجودگی عین ممکن تھی۔ اس کے علاوہ ہر قسم کے اسلحے کی موجودگی بھی ممکن تھی جسے ایک آدمی چلا سکے۔

اگر جامی شاہ کا ارادہ اس طرف آنے کا تھا تو اسے اب تک اپنے لاؤلشکر کے ساتھ کوچ کر لینا چاہئے تھا۔ میں نے اس کا نمبر ملایا جو مصروف تھا۔ اس کے بعد میں پندرہ منٹ کوشش کرتا رہا۔ اس دوران میں، میں نے ایک بار ناصر کو کال کر کے اپنی خیریت کی اطلاع دی۔ آخر پندرہ منٹ بعد مجھے جامی شاہ سے بات کرنے کا موقع ملا۔ ''اب کیا ہے؟'' اس نے غرا کر کہا۔

''جامی شاہ، اگر تم نے پری محل جانے کا فیصلہ کر لیا ہے تو اپنے آدمیوں کو تیار کر لو۔ اندر کم سے کم تیس مسلح افراد موجود ہیں۔ ان میں سے دس باہر ہیں۔''

''اطلاع کا شکریہ، ویسے تم سے کس نے کہا کہ میں پری محل جانا چاہ رہا ہوں؟''

''بس، مجھے خیال آیا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''جامی شاہ! میرا مشورہ ہے جو کام کرنا مکمل طور پر کرنا، آدھا ادھورا کام خود تمہارے گلے پڑ جائے گا۔''

''مشورے کا بھی شکریہ!'' اس نے زہریلے لہجے میں کہا تھا اور رابطہ ختم کر دیا۔ میں مسکرایا، جامی شاہ سے گفتگو کے دوران گاڑی کے انجن کی آواز مسلسل آ رہی تھی یعنی وہ سفر میں تھا۔ میں نے وقت گزاری کے لئے ایک چیونگم منہ میں ڈالی۔ سردی نے منہ سن کر دیا تھا۔ میں اس کی ورزش کرنا چاہتا تھا ساتھ ہی پری محل کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ جیسے جیسے رات گزر رہی تھی، اندر جلنے والی روشنیوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے مرشد علی سے رابطہ کیا۔ اس بار وہ اسکرین پر نمبر نہ دیکھ کر سمجھ گیا تھا۔

''کیا بات ہے، اس وقت کیوں کال کی ہے؟'' اس کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ وہ مخمور ہے۔

''مرشد علی میں نے تمہاری تجویز پر غور کیا تھا اور اس پر عمل کرنا ممکن نہیں ہے، دوسری بات یہ ہے کہ سفیر اور مونا شادی کر کے اس ملک سے جا چکے ہیں۔'' میں نے صاف جھوٹ بولا۔

''وہ کہیں بھی چلے جائیں میری پہنچ سے دور نہیں جا سکتے۔'' اس نے سکون سے کہا۔

''بہرحال، اب صلح اور جھگڑے کو ختم کرنے کے لئے تمہارے پاس کوئی اور تجویز ہے تو وہ پیش کرو۔''

''شہباز ملک، مجھے تم سے صلح کرنے یا فساد کو ختم کرنے کی کوئی مجبوری نہیں ہے، یہ تو میری مہربانی تھی جو میں نے ایک تجویز پیش کی۔ اگر تم اسی طرح دربدر مارے مارے پھرنا چاہتے ہو تو مجھے تو پروا نہیں ہے، کبھی نہ کبھی تم میرے ہاتھ آ ؤ گے اور اس وقت پچھتاؤ گے۔''

''مرشد علی میں پہلے بھی کئی بار تمہارے ہاتھ آ چکا ہوں تب تم نے میرا کیا بگاڑا تھا۔ بات یہ ہے کہ قدرت کے آگے تم بھی اتنے ہی بے بس ہو جتنا کہ میں۔ اور میں بھی صرف اپنی شرافت سے مجبور ہوں ورنہ میں تمہاری

ہاں اگر آؤں تو جلد تمہیں سوائے قبر کے کہیں پناہ نہ ملے۔ اسے بھی مہربانی سمجھنا۔''

وہ زور سے ہنسا تھا۔ ''بہت لاف گزاف کر رہے ہو تم...... بہر حال وقت آنے پر پتا چل جائے گا۔''

مجھے بلندی سے شہر کی جانب سے تیز روشنیاں حرکت کرتی محسوس ہوئی تھیں۔ ''مرشد علی میرا خیال ہے وہ قریب آ گیا ہے۔''

میں نے موبائل آف کر دیا اور دوربین سنبھال لی۔ فوکس کرنے پر مجھے کم سے کم نصف درجن بڑی گاڑیوں کا ایک قافلہ نظر آیا تھا جو بڑی تیز رفتاری سے اس طرف آ رہا تھا۔ اس کی رفتار اتنی تیز تھی کہ ایک منٹ کے اندر وہ بالکل پاس آ چکا تھا۔ پری محل کی طرف جانے والے راستے پر گھوم کر گاڑیاں یکے بعد دیگرے اس طرف بڑھیں۔ سب سے آگے والی گاڑی گیٹ سے کوئی بیس پچیس گز کے فاصلے پر رکی۔ خطرہ محسوس کر کے وہاں گارڈز نے رائفلیں تان لی تھیں۔ اسی لمحے گاڑی کا سن روف کھلا اور اس میں سے ایک شخص راکٹ لانچر سنبھالتا نمودار ہوا۔ راکٹ لانچر دیکھتے ہی گارڈز دہشت زدہ ہو کر بھاگے مگر ان کو گیٹ میں گھسنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ راکٹ آ کر گیٹ سے ٹکرایا اور گیٹ کے ساتھ دونوں گارڈز کے پرخچے بھی اڑ گئے تھے۔ دھما کا اتنا شدید تھا کہ میں درخت پر ہل گیا تھا۔

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آنے والے اتنے جارحانہ انداز میں آئیں گے۔ گیٹ کے تباہ ہوتے ہی راکٹ والی گاڑی تیزی سے اندر داخل ہوئی، اس کے پیچھے یکے بعد دیگرے باقی پانچ گاڑیاں بھی اندر گئیں اور اندر جاتے ہی ان سے شدید فائرنگ شروع ہو گئی تھی، ایسا لگ رہا تھا وہ پری محل میں موجود کسی بھی فرد کو زندہ نہ چھوڑنے کا تہیہ کر کے آئے تھے۔ اندر موجود محافظوں نے بھاگنے اور واجبی سے مقابلے کی کوشش کی مگر وہ دونوں ناکام رہے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے سامنے والے حصے میں موجود چاروں محافظ بھی مارے گئے۔ مسلسل اور شدید فائرنگ کا اصل نشانہ عمارت کی کھڑکیاں اور دروازے تھے۔ ایک منٹ سے بھی کم وقت میں وہ چھلنی ہو کر رہ گئے۔ پٹوں میں سوراخ ہی سوراخ ہو گئے تھے۔ دیواریں داغ داغ تھیں اور کھڑکیوں کے شیشے کرچی کرچی ہو گئے تھے۔ اندر موجود افراد کا جانے کا کیا حشر ہوا تھا۔

اور عین اسی لمحے جب چھ گاڑیوں میں سوار تقریباً پینتیس سے چالیس افراد اندر جانے کے لئے پیش قدمی کر رہے تھے، مجھے عمارت کی چھت پر نقل و حرکت کا احساس ہوا۔ اس کے ساتھ ہی یک لخت عمارت کی تمام بتیاں بجھ گئیں اور احاطے کی دیواروں پر نصب تیز روشنیاں جل اٹھیں حالانکہ اس سے پہلے صرف معمولی بتیاں جل رہی تھیں لیکن یہ اسپاٹ لائٹس کی طرح تیز اور چکا چوند کرنے والی روشنیاں پھینک رہی تھیں۔ حملہ آور چونکے تھے۔ اس سے پہلے وہ کوئی حرکت کرتے، چھت پر موجود افراد نے نیچے کچھ ڈبے نما چیزیں اچھالنا شروع کر دیں۔ وہ احاطے میں ہر طرف ان کو پھینک رہے تھے۔ میں نے ایک گرنے والی شے پر دوربین فوکس کی۔ اس سے ہلکی سی سنسناتی دھواں نما کوئی شے خارج ہو رہی تھی مگر یہ دھواں پھیل نہیں رہا تھا بلکہ فضا میں تحلیل ہو رہا تھا۔ میں نے اس ڈبے کے قریب ایک بھاری بھرکم لمبے بالوں اور گھنی داڑھی والے شخص کو ناک دبا کر پیچھے ہٹتے دیکھا تھا۔ ڈبے سے کوئی گیس خارج ہو رہی تھی۔

اس لمحے جب دو درجن سے زیادہ گیس والے گرینیڈ احاطے میں گر کر فضا کو آلودہ کر رہے تھے اور اندر

آنے والے سانس لینے کے لئے جدوجہد کر رہے تھے، عمارت کی اوپری منزل کی کھڑکیوں سے مشین گنوں کی نالیں برآمد ہوئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے آنے والوں پر موت برسنے لگی تھی۔ جوابی فائرنگ بھی اتنی ہی شدید تھی جتنی کہ حملہ آوروں نے کی تھی مگران کا نشانہ کل چھ سات افراد بنے تھے اور اب آنے والے تین درجن سے زیادہ افراد برستی گولیوں میں پناہ لینے کے لئے گاڑیوں میں گھسنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر ایل ایم جی کے مقابلے میں یہ گاڑیاں بھی ان کو پناہ دینے سے قاصر تھیں۔ جو گولی ٹھوس کنکریٹ کی ایک فٹ موٹی دیوار میں سوراخ کر کے گزر جاتی ہے، اس کے لئے چند ملی میٹر موٹی فولادی چادر کیا حیثیت رکھتی ہے۔ لہٰذا گولیاں چھتوں اور باڈی میں سوراخ کرتی گاڑی کے اندر موجود لوگوں کو بھی چھلنی کر رہی تھیں۔ مجھے ان کی چیخیں تو نہیں سنائی دے رہی تھیں لیکن میں نے کئی افراد کو گولیاں کھا کر گرتے دیکھا تھا۔ آنے والوں پر چھ ایل ایم جی موت برسا رہی تھیں۔

میرے خیالوں میں بھی نہیں تھا کہ اتنے جارحانہ حملے کا اتنا ہی جارحانہ جواب ملے گا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ پری محل کے لوگ اس حملے کے لئے مکمل طور پر تیار تھے۔ انہوں نے ابتدائی حملے کو برداشت کر کے جوابی کارروائی شروع کر دی تھی۔ وہ سب کے سب اندر آ گئے تھے اور جوابی حملے کی زد میں تھے۔ چند ایک نے جواب دینے کی کوشش کی مگر گیس نے انہیں بے بس کر دیا تھا۔ وہاں چند افراد ایسے بھی زمین پر پڑے تھے جن کو بظاہر گولی نہیں لگی تھی مگر وہ گرے ہوئے تھے یہ شاید اس گیس کا اثر تھا۔ بھاری مشین گنوں کی بے پناہ فائرنگ کے مقابلے میں کہیں جائے پناہ نہ تھی، اس کے باوجود کچھ افراد پسپا ہو کر بھاگے تھے۔ مگران کو گیٹ سے باہر نکلنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ عقب سے مشین گن سے باڑھ ماری گئی اور وہ باہر نکلنے سے پہلے ہی ڈھیر ہو گئے تھے۔

ایک منٹ سے بھی کم عرصے میں احاطے میں گھسنے والے حملہ آور مارے جا چکے تھے یا شدید زخمی تھے یا گیس کے زیر اثر کسی قابل نہیں رہے تھے۔ میں دم بخود یہ سب دیکھ رہا تھا۔ یہ سب کیا تھا۔ پری محل والوں نے اتنا بھرپور دفاع کیسے تیار کیا تھا۔ کیا ان کو پہلے سے علم تھا کہ ان پر حملہ ہونے والا ہے تبھی انہوں نے بے سرعت سے خود کو منظم کیا اور آنے والوں کی ایسی کم تیسی کر دی تھی مگران کے علم میں یہ سب کیسے آیا۔ یہ تو میرا کم تھا۔ میرے اکسانے پر ابھی دو گھنٹے پہلے جامی شاہ نے اپنے ساتھیوں کو جمع کر کے پری محل کا رخ کیا تھا۔ آخر شاہ نواز کو کیسے علم ہوا؟

اس سوال کا جواب ڈرا دینے والا تھا۔ ان لوگوں کو میرے توسط سے علم ہوا تھا جب مجھے ان کے بارے میں سب پتا ہو سکتا تھا تو وہ مجھ سے کہیں زیادہ بہتر وسائل رکھتے تھے۔ میں ایک معمولی سے موبائل نما آلے کی مدد سے ان سے کھیل سکتا تو جوابی بازی کے لئے ان کے پاس کہیں بہتر آلات کی موجودگی عین ممکن تھی۔ میں خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ میں ان کو بے وقوف بنا رہا ہوں اور درحقیقت میں خود بے وقوف بن رہا تھا۔ انہوں نے مجھے استعمال کیا اور اپنے سب سے بڑے کانٹے جامی شاہ سے مع اس کے ساتھیوں کے ایک بار میں ہی نجات حاصل کر لی اور میں نہایت کامیابی سے استعمال ہوا۔

میں نے اپنا سر جھٹکا۔ ضروری نہیں تھا، یہ سب ایسے ہی ہوا ہو۔ میں نے سوچا، حملے کی ناکامی کے اور بھی اسباب ہو سکتے تھے۔ جاسوسی کے کھیل میں برقی آلات کی شمولیت اگرچہ بہت زیادہ ہو گئی تھی مگر اب بھی اس میدان میں انسان کی اہمیت برقرار تھی۔ جامی شاہ کی صفوں میں شاہ نواز اور مرشد علی کے جاسوسوں کی موجودگی

قرین قیاس تھی۔ ادھر جامی شاہ نے روانگی کا بگل بجایا اور ادھر جاسوس نے اپنے آقاؤں کے کان میں پھونک دیا کہ دشمن کا رخ کس طرف ہے اور شاہ نواز نے جامی شاہ کی آمد سے پہلے اس کے استقبال کی تیاری مکمل کر لی۔ نتیجہ میرے سامنے تھا۔

مگر اس دلیل نے مجھے خود اندر سے قائل نہیں کیا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔
اچانک موبائل چیکر نے وارننگ ٹون دی۔ میں نے دیکھا، مرشد علی کا نمبر آ رہا تھا۔ میں نے بٹن دبایا اور مرشد علی کی آواز آئی۔ ''آپ نے جیسا کہا تھا، ویسا ہی ہوا جناب عالی!''

دوسری آواز نے مجھے چونکا دیا تھا۔ وہ ڈیوڈ شا تھا جو خاصے صاف ستھرے لہجے میں اردو بول رہا تھا۔
''گڈ! تم لوگوں نے گیم پلان پر اچھی طرح عمل کیا...... لیکن کامیابی اصل میں شہباز کی وجہ سے ملی ہے۔ شہباز ملک، میری آواز سن رہے ہو نا!''

میرے وجود میں سنسنی کی یخ بستہ لہر دوڑ گئی تھی۔ میرے بدترین خدشات درست ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔ ان لوگوں نے سچ مچ مجھے استعمال کیا تھا۔ ڈیوڈ شا کہہ رہا تھا۔ ''شہباز! تم ذہین شخص ہو لیکن اتنے بھی نہیں۔ میں تم سے زیادہ ذہین ہوں اس لئے میں کامیاب رہا۔ تم نے سوچا نہیں، جو کام تم کر رہے ہو، میں تم سے بہتر طور پر کر سکتا ہوں۔''

☆======☆======☆

اچانک خطرے کے احساس نے مجھے جھنجھوڑ دیا۔ میں نے موبائل چیکر جیب میں رکھا۔ بیگ اپنی پشت پر باندھا اور رائفل شانے پر ٹانگ کر تیزی سے درخت سے نیچے اترنے لگا۔ ڈیوڈ شا کی بک بک جاری تھی۔ ''اب تم سمجھ گئے ہو گے کہ میں نے یہ سب کیسے کیا۔ میں جانتا ہوں کہ اب تم کہاں ہو؟''
نیچے اترتے ہی میں سڑک کے متوازی چلنے لگا۔ فی الحال سڑک کی طرف جانا خطرناک ہو سکتا تھا۔ ڈیوڈ شا کے آخری الفاظ سنتے ہی میں نے موبائل چیکر آف کر دیا۔ یہ آلہ جس سے میں دشمن کی جاسوسی کر رہا تھا، اب وہی دشمن کو میرا پتا بتا رہا تھا۔ پھر میں جھاڑیوں کے درمیان بے تحاشا بھاگنے لگا تھا۔ ساتھ ساتھ میں خود کو سنا رہا تھا، کتنے آرام سے دشمن کے جال میں آن پھنسا تھا اور اس پر طرہ کہ خود کو تیس مار خان سمجھ رہا تھا۔ چاروں طرف بظاہر سناٹا اور ویرانی تھی لیکن اس ویرانی میں کہیں نہ کہیں کوئی چھپا تھا اور میری گھات میں تھا۔ اس کا پتا مجھے اس وقت چلا جب ایک درخت کے نیچے سے گزرتے ہوئے کوئی شے سنسناتی ہوئی آئی اور میرے گرد لپٹ گئی تھی۔ دشمن نے معنوی جال کے بعد سچ مچ کا جال استعمال کیا تھا اور اس نے مجھے جکڑ لیا تھا۔ میں تیز رفتاری میں تھا۔ سنبھل بھی نہیں سکا اور زمین پر گر کر کئی بار لڑھکا۔ اس دوران میں نے بے ساختہ جال سے نجات کی کوشش کی لیکن رہائی کے لئے جتنے ہاتھ پاؤں مارے، جال میں اتنا ہی الجھتا چلا گیا۔ یہ باریک نائلون کی ڈوریوں کا بنا جال تھا اور اس نے کچے دھاگوں کی طرح مجھے جکڑ لیا تھا۔ جال پھینکنے والا آس پاس تھا۔ اس نے اپنا کام مہارت سے کر لیا تھا لیکن ابھی میری گرفتاری کا مرحلہ باقی تھا۔ اس کے لئے اس کا سامنے آنا ضروری تھا۔ جال میں رائفل کا استعمال ناممکن نہیں تھا۔ یہ اور بات تھی کہ میں اسے کس پر استعمال کرتا۔ جال پھینکنے والا بہت چالاک تھا اس نے سامنے آنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اس کے بجائے اس نے ایک گول اور لمبی سی شے پھینکی جو میرے پاس آ کر گری۔ اس

سے سنسناتی آواز آرہی تھی اور میں نے چند لمحے بعد ایک عجیب سی بو محسوس کی۔ میں نے بے ساختہ چلا کر گالی دی تھی اور اس شے سے دور جانے کی کوشش کی جو یقیناً گیس گرینیڈ تھا اور اس سے وہی مہلک گیس نکل رہی تھی جس نے ذرا دیر پہلے جامی شاہ کے آدمیوں کو بے بس کر کے رکھ دیا تھا۔ جال کے ڈھیر میں میری گیس گرینیڈ سے دور جانے کی کوشش ناکام رہی تھی اور میں چند فٹ بھی نہیں سرک سکا تھا۔ گیس بے حد سرعت سے پھیلی تھی اور اتنی ہی تیزی سے اس نے میرے حواس پر قبضہ کر لیا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں سُست ہوئے تھے اور ذہن میں خیالات گڈمڈ ہونے لگے تھے۔

اس لمحے میں نے محسوس کیا کوئی میرے پاس آرہا تھا۔ میں نے بمشکل سر اٹھایا۔ یہ دو افراد تھے۔ میں نے پستول ان کی طرف سیدھا کرنا چاہا لیکن میرے حواس جواب دے گئے اور یک لخت ہی بلیک آؤٹ ہو گیا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر یہ بلیک آؤٹ جاری رہا تھا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میرا دل بری طرح متلا رہا تھا اور مجھ میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ آنکھیں کھول کر دیکھوں۔ میرے چاروں طرف مکمل خاموشی تھی۔ رفتہ رفتہ میرے حواس قابو میں آنے لگے تھے۔ متلی والی کیفیت کسی قدر کم ہوئی تو میں نے آنکھیں کھولیں۔ چھت سفید اور ڈیزائن والی تھی، اس پر ایک جدید ساخت کا نیا پنکھا لٹک رہا تھا۔ میں نے سر گھما کر دیکھا۔ میں ایک کمرے میں تھا اور بستر پر پڑا تھا۔ یہ بات تو طے تھی کہ میں دشمن کی قید میں تھا۔ بائیں طرف سر گھماتے ہی مجھے تپائی اور اس پر رکھا پانی کا جگ نظر آیا تھا، میں جیسے پھر سے جی اٹھا تھا۔ میں نے تیزی سے اٹھ کر جگ اٹھایا اور بنا سوچے کہ اس میں زہر بھی ہو سکتا تھا، اسے لبوں سے لگا لیا پھر نصف جگ میرے معدے میں منتقل ہوا تو مجھے ذرا سکون ملا تھا۔ جگ رکھ کر میں نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ ''شہباز ملک! آج تم گدھوں کی طرح پھنسے ہو۔'' میں نے خود سے کہا۔

''درست کہا تم نے۔'' کمرے میں ڈیوڈ شا کی آواز گونجی تو میں اچھل پڑا تھا۔ میں نے متلاشی نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ پھر مجھے خیال آیا، آواز کسی پوشیدہ اسپیکر سے آرہی تھی۔ ''کیسے ہو تم؟''

''حیران ہوں کہ اب تک زندہ کیوں ہوں؟'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

''تم جانتے ہو، میں بلاوجہ کسی کو چاہے وہ دشمن ہی کیوں نہ ہو، مار ڈالنے کا قائل نہیں ہوں۔''

''سوال یہ ہے کہ وہ وجہ کیا ہے جس کے لئے تم نے مجھے اب تک زندہ رکھا ہے۔''

''وجہ بھی جلد تمہارے علم میں آجائے گی۔'' اس نے کہا۔ ''تمہیں تعجب نہیں کہ میں نے تمہیں کتنی آسانی سے پکڑ لیا۔''

میں نے بے زاری سے جواب دیا۔ ''جو بات مجھ سے کم عقل شخص کے ذہن میں آسکتی ہے تو وہ تمہارے جیسے عالی مرتبت کے ذہن میں کیوں نہیں آسکتی؟''

''کون سی بات؟''

''کمیونی کیشن پکڑنے والی ڈیوائس کی۔ سیدھی سی بات ہے تم نے مرشد علی کا اثر رسوخ استعمال کیا اور موبائل کمپنی کی مدد سے مجھے تلاش کر لیا۔ میں جس طرح جامی شاہ کو حویلی کی لائیو کوریج دے رہا تھا، اس سے یہ معلوم کرنا بھی دشوار نہیں تھا کہ میں کہاں پایا جاتا ہوں۔''

''صرف یہی نہیں......تمہاری مدد سے ایک بڑے مخالف سے چھٹکارا پالیا۔''

''جامی شاہ مارا گیا؟'' میں نے قلق سے کہا۔

''ایسے احمق کو مارا ہی جانا چاہئے جو اپنے دشمن کی فراہم کی ہوئی معلومات پر دوڑا آیا۔'' ڈیوڈ استہزائیہ لہجے میں بولا۔ ''مرشد علی اور شاہ نواز کا اب کوئی مخالف نہیں ہے۔''

''مبارک ہو!'' میں نے کہا۔ ''شکر ہے تم نے مجھے یا راجا عمر دراز کو ان لوگوں کی صف میں شامل نہیں کیا۔''

''راجا اور تم ان لوگوں سے مختلف ہو۔ مجھے اعتراف ہے، میں نے راجا عمر دراز جیسے شریف لوگ کم دیکھے ہیں۔ وہ قابلِ احترام حریف ہے۔''

''تبھی تم نے اسے مروانے کی کوشش کی؟''

ڈیوڈ شا ہنسا۔ ''قابل احترام ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اسے معاف کردوں، وہ میرے مقاصد کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔''

''ڈیوڈ شا، تم ایک احمقانہ مہم جوئی میں مبتلا ہو۔ مجھے یقین ہے، آخر میں تمہارے ہاتھ سوائے ناکامی کے اور کچھ نہیں آئے گا۔''

''یہ تمہارا خیال ہے۔ میرا خیال اس سے مختلف ہے۔''

''خیر چھوڑو، یہ بتاؤ کہ اب میرا کیا کرنا ہے، اچار ڈالنا ہے یا مجھے سالم مرشد علی کے کتوں کے سامنے ڈالنا ہے؟''

''تم مرشد علی نہیں بلکہ میری تحویل میں ہو اور میں بتا چکا ہوں، میں بلاوجہ کی قتل و غارت گری کے خلاف ہوں۔ ابھی تمہارے بارے میں فیصلہ نہیں ہوا ہے۔ جب بھی ہوا تمہیں پتا چل جائے گا۔''

ڈیوڈ شا سے گفتگو کے دوران اسپیکر کی مخصوص سرسراہٹ سنائی دے رہی تھیں اس کے جملے کے ساتھ ہی یہ سرسراہٹ بھی ختم ہوگئی۔ میں نے اسے آوازیں دیں لیکن اس کی جانب سے کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا، اس کے ایک طرف کھڑکی تھی، میں نے پردہ سرکا کر دیکھا، لوہے کی جالیوں کے عقب میں مجھے حویلی کا احاطہ نظر آیا۔ یہ شاید پچھلا حصہ تھا اور میں گراؤنڈ فلور کے کسی کمرے میں تھا۔ کھڑکی سے مخالف سمت میں ایک دروازہ تھا اور ایک دروازہ دائیں طرف تھا۔ میں نے پہلے بغلی دروازے کو چیک کیا جو باتھ روم ثابت ہوا تھا، اندر ایک بیسن اور فلش کے کچھ نہیں تھا۔ سامنے والا دروازہ باہر سے بند تھا۔ کمرے میں بستر کے ساتھ تپائی تھی جس پر جگ رکھا تھا۔ سامنے ڈریسنگ ٹیبل تھی۔ وقت گزاری کے لئے میں نے اس کی درازیں کھول کر دیکھنا شروع کیں اور لاحول پڑھ کر ان سب کو بند کر دیا۔ اندر عیش و عشرت سے متعلق سامان بھرا ہوا تھا۔ یہ کمرا بھی اسی مقصد کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ میرے جسم پر اب سوائے پتلون، جرسی اور جوتوں کے کچھ نہیں تھا۔ میرا بیگ اور جیکٹ مع ہتھیاروں کے غائب تھی۔ کمرا ہیٹنگ سسٹم نہ ہونے کی وجہ سے سرد تھا لیکن یہ سردی ناقابلِ برداشت نہیں تھی۔ میرے ہاتھ یا کمرے میں کہیں گھڑی نہیں تھی۔ البتہ کھڑکی کے باہر دھوپ سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ صبح کے دس گیارہ بج رہے ہیں۔ میں نے دروازہ پیٹا۔

"ارے کوئی ہے،دروازہ کھولو۔ میں بھوک سے مر رہا ہوں۔"

اس بار بھی کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ باہر مکمل سکوت تھا لیکن یہ سکوت اتنا مکمل تھا کہ مجھے مصنوعی لگ رہا تھا۔ میں نے جگ کا باقی پانی بھی پی لیا کیونکہ اس میں زہر بھی تھا تو اب تک مجھ پر اس کا اثر ہو جانا چاہئے تھا۔ میں ناصر اور سونیا کے بارے میں سوچ رہا تھا اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میں ان کو نہیں لایا ورنہ وہ بھی گرفتار ہو جاتے۔ مگر مجھے اب بھی فکر تھی، میں نے موبائل کا سونیا کی کوٹھی میں بھی بے دریغ استعمال کیا تھا اور وہ لوکیشن بھی ان کے علم میں آجاتی تو وہ وہاں بھی دھاوا بول دیتے۔ ممکن ہے ڈیوڈ شا نے کوٹھی دیکھ لی ہو لیکن سونیا اور ناصر ان کے لئے غیر اہم ہوں۔

میں سوچوں اور اندیشوں میں گم تھا کہ دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ میں چونکا، دروازہ پوری طرح کھلا اور ایک لڑکی نظر آئی جس نے ناشتے کی ٹرالی سنبھال رکھی تھی۔ وہ اندر آئی اور عقب میں دروازہ بند کر دیا، وہ بیس بائیس سال کی تھی۔ سبک نقوش اور شانوں پر لہراتے ریشمی بالوں کے ساتھ وہ کالج گرل لگ رہی تھی مگر پری محل میں ایسی حسین لڑکی کا صرف ایک ہی مقصد ہو سکتا تھا۔ بہر حال اس وقت وہ میرے لئے ناشتا لائی تھی۔

"سر! ناشتا!" اس نے ترنم آمیز لہجے میں کہا۔

"شکریہ! میں واش روم سے ہو آؤں۔" میں نے کہا۔

چند منٹ بعد میں باہر آیا تو وہ بدستور موجود تھی۔ اس نے نیلی اسکن فٹ جینز اور اوپر اسی طرح تنگ سی شرٹ پہن رکھی تھی۔ وہ متناسب جسامت رکھتی تھی۔ اس نے میرے لئے توس پر جام لگایا۔ چند اور توس مکھن لگے ہوئے تھے۔ ایک گلاس دودھ اور آخر میں چائے تھی، جسے گرم رکھنے کی خاطر تھرماس میں رکھا گیا تھا۔ ناشتا کر کے میں نے چائے لی۔ اس دوران میں وہ خاموشی سے قالین پر بیٹھی رہی تھی، کمرے میں بیٹھنے کے لئے اور کوئی جگہ ہی نہیں تھی۔ "باہر کا کیا حال ہے؟ لاشیں اور گاڑیوں کا ملبا کیا، کیا؟"

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ "لاشیں اور ملبا؟"

"کل رات یہاں چالیس پینتالیس افراد ہلاک ہوئے، ایک راکٹ داغا گیا اور سیکڑوں کے حساب سے گولیاں چلائی گئی تھیں، تمہیں کچھ نہیں پتا؟"

"نہیں، ہم سب عورتیں اور لڑکیاں کل شام سے تہہ خانے میں تھے، ہمیں نہیں معلوم باہر کیا ہوا ہے۔ ہمیں آج صبح نکالا گیا ہے۔"

"مرشد علی نامی شخص کل یہاں آیا تھا۔"

"مجھے نہیں معلوم، میں اپنے حصے میں رہتی ہوں اور مجھے بلا اجازت اس سے باہر جانے کی اجازت نہیں ہے۔"

"لہجے سے تم پڑھی لکھی لگتی ہو؟"

"میں نے گورنمنٹ کالج فار ویمن سے گریجویشن کیا ہے۔"

"اور اب یہاں ہو۔" میں نے غور سے اسے دیکھا۔

"یہاں سے کیا مطلب...... اگر یہاں نہیں ہوں تو پھر کہاں جاؤں؟" اس نے حیرت سے کہا۔

''تمہارا تعلق کسی شریف گھرانے سے نہیں ہے؟''

''وہ ہنسی۔''اوہ اچھا جی! اب بھی آپ مجھ سے کوئی اسٹوری سننا چاہتے ہیں۔ شریف گھرانے کی حسین لڑکی جسے حالات نے کوٹھے تک پہنچا دیا۔''

میں نے احمقوں کی طرح پوچھا۔''پھر حقیقت کیا ہے؟''

''میں طوائف بنت طوائف ہوں۔'' وہ بے تکلفی سے بولی۔''ہماری سات نسلوں میں سی باپ کا نام نہیں آتا، میری ماں نے بچپن سے مجھے ہاسٹل میں ڈال دیا تھا تاکہ میں اس مخصوص ماحول سے دور پرورش پاؤں اور مختلف نظر آؤں۔ اس لئے میں اب زیادہ کامیاب ہوں۔''

''تب تم شاہ نواز کے پاس کیا کر رہی ہو؟''

''میں کنٹریکٹ پر ہوں۔'' وہ بولی۔

''تمہارا حصہ کیا ہوتا ہے؟'' میں نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

''نصف اور جو تحفے ملتے ہیں، وہ سارے میرے ہوتے ہیں۔''

''یہ کام کس مد میں کر رہی ہو؟'' میں نے ناشتے کی ٹرالی کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ...... یہ تو یہاں کی سب عورتیں کرتی ہیں۔ ہم صرف تفریح کا سامان مہیا نہیں کرتے بلکہ اس محل کے سارے کام ہمارے سپرد ہیں۔ ہمارے گروپ ہیں جو مختلف کام کرتے ہیں۔ کھانا بنانے سے لے کر صفائی ستھرائی اور کپڑے دھونے تک۔ مہینے میں ایک ہفتے ہم کو چھٹی ملتی ہے اور اس دوران میں ہم ورزش کرتے ہیں اور ہمارا طبی معائنہ ہوتا ہے۔''

میں حیران تھا۔''یعنی تم لوگ اس کاروبار کو سائنسی انداز میں چلا رہے ہو؟''

''ہاں، اسی وجہ سے ہم کامیاب ہیں۔''

''اچھا، جب تم کسی گاہک کے ساتھ جاتی ہو تو تمہاری روٹین میں فرق نہیں آتا؟''

وہ ہنسی۔''سب سے پہلے کاروبار ہے اس کے لئے ہر چیز چھوڑی جا سکتی ہے۔ یہ سب تو فارغ اوقات میں ہوتا ہے۔ ہم یہاں کمانے کے لئے آئے ہیں۔''

''یعنی آج کل تم فارغ ہو؟''

''نہیں، مجھے تو پورے مہینے میں بمشکل دو تین دن چھٹی ملتی ہے لیکن ابھی دو دن سے تمام کام بند ہے۔''

یعنی جب سے یہ چکر چل رہا ہے، میں نے دل میں سوچا اور اس سے کہا۔''تم جانتی ہو اس جگہ کا مالک کون ہے؟''

''شاہ نواز صاحب۔'' اس نے سادگی سے جواب دیا، اس کا مطلب تھا، وہ جامی شاہ سے واقف نہیں تھی، ان عورتوں کو گزشتہ رات ہونے والی ہنگامہ آرائی کی خبر بھی نہیں تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔''جناب، کیا کل واقعی یہاں کوئی ہنگامہ ہوا ہے؟''

اس سے پہلے میں کوئی جواب دیتا، کمرے میں کسی کی کرخت آواز گونجی۔''نیلو، فضول بکواس نہ کر، اپنا کام

کر اور یہاں سے جا۔"

نیلو کا رنگ اُڑ گیا تھا، اسے خیال نہیں رہا تھا کہ یہاں کی آوازیں کہیں سنی جا رہی ہوں گی۔ اس کے بعد اسے چپ لگ گئی تھیں میری باتوں کے جواب میں وہ ہوں ہاں کرتی رہی تھی۔ جیسے ہی میں نے چائے پی، اس نے فافٹ ٹرالی سنبھالی اور یہ جا وہ جا۔ میں نے اس نادیدہ شخص سے کہا۔ "یار، بڑے ہی گھٹیا آدمی ہو، دومنٹ کے لئے میری تفریح برداشت نہیں ہوئی۔"

"بکومت۔ ابھی ہم ذرا مصروف ہیں، ورنہ تمہیں اچھی طرح تفریح کراتے۔"

"لاشیں سمیٹنے میں مصروف ہو، یہ بتاؤ کتنے آدمی مارے گئے؟"

"تمہارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بس شکر کرو کہ تم ان میں شامل نہیں ہے۔"

"لاشوں کا کیا، کیا ہے؟ پولیس کے سپرد کر دیں یا خود دفنا دیں۔ اتنی فائرنگ کے بعد پولیس کا متوجہ ہونا لازمی ہے۔"

"پولیس ہماری مرضی کے بغیر یہاں کا رخ نہیں کر سکتی۔" اس نے غرور سے کہا۔ "وہ ہمارے در کا کتا ہے۔"

"خوش فہمی ہے تمہاری۔ پولیس ایسا درندہ ہے جس کے سامنے جب تک کھانا ڈالتے رہو گے، وہ چپ رہے گا اور جہاں تم نے کھانا بند کیا تو پولیس مقابلے میں کتے کی طرح مارے جاؤ گے۔ آئے دن کے پولیس مقابلے اس کے گواہ ہیں اور تم نے کہا پولیس تمہاری مرضی کے بغیر اس طرف کا رخ نہیں کرے گی، اس کا مطلب ہے تم لوگوں نے بالا ہی بالا سب نمٹا دیا۔ لاشیں غالباً کسی ویران مقام پر دفنائی جا چکی ہوں گی اور گاڑیوں کے نمبرز والے پرزے نکال کر باقی ملبہ کسی کباڑیے کے گودام میں پہنچا دیا گیا ہوگا جو ایک دو دن میں پرزے پرزے ہو کر ہمیشہ کے لئے غائب ہو جائے گا۔ تمام نشانات اور خون کے دھبے، گولیوں کے خول اور در و دیوار سے ان کے نشانات مٹا دیئے جائیں گے۔"

میری طویل اور مدلل تقریر نے اسے چڑا دیا تھا۔ "اوئے چپ کر جا۔ میرے بھیجے نہ چاٹ۔"

اس نے اسپیکر بند کیا تو میں سمجھ گیا کہ اب وہ میری کسی بات کا جواب نہیں دے گا۔ البتہ اس کے کان ضرور میری طرف لگے ہوں گے۔ میں ہنسا تھا۔ ناشتے کے بعد میں ذرا تھکن محسوس کر رہا تھا اس لئے بستر پر دراز ہو گیا اور نہ جانے کب سو گیا۔ چائے اور دودھ میں یقیناً کوئی خواب آور دوا تھی ورنہ میرے اس طرح بے وقت سونے کی کوئی تک نہیں بنتی تھیں دوسری بار جب میری آنکھ کھلی تو میں اسی کمرے میں تھا۔ ایک ٹیوب لائٹ روشن تھی اور کھڑکی کے پردوں کے باہر روشنی محسوس نہیں ہو رہی تھی، میں نے انگڑائی لی اور اٹھ کر پردہ ہٹایا۔ سورج غروب ہو چکا تھا مگر احاطے میں جا بجا تیز روشنی والے بلب روشن تھے۔ میرا خیال تھا، میں آٹھ نو گھنٹے سوتا رہا تھا اور میرے پیٹ میں ایک بار پھر چوہا ریس جاری تھی۔ "ارے......کوئی ہے، میری فریاد سنو۔"

"کیا بات ہے شہباز ملک!" فوراً ہی مرشد علی کی تمسخرانہ آواز آئی تھی۔

"پیر صاحب!" میں نے بھی طنزیہ آواز میں کہا۔ "آپ کو دلال بننے پر مبارک ہو۔"

"بکواس مت کرو۔" وہ مشتعل ہو گیا تھا۔ "اپنی زبان قابو میں رکھو ورنہ میرے ایک اشارے پر یہ

تمہارے منہ سے کھینچ لی جائے گی۔"

"خوب، تم اتنے خودمختار کب سے ہو گئے۔" میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "زبان تو ایک طرف رہی، تم اپنے آقا سے اجازت لئے بغیر میرا ایک بال بھی نہیں توڑ سکتے۔"

"تم نے دیکھا، میں نے تمہاری سازش کس طرح ناکام بنائی۔" وہ سنبھل کر بولا۔

میں نے زوردار قہقہہ رسید کیا۔ "مرشد علی تم اتنے ذہین کب سے ہو گئے۔ مجھے پتا ہے یہ ساری ڈیوڈ شا کی پلاننگ تھی اور تم اس کے مہرے تھے۔ جہاں تک سازش کا تعلق ہے تو وہ میں نے کی تھی اور میں ناکام نہیں رہا، جامی شاہ اور اس کے ساتھی جہنم رسید ہوئے تو یہ بھی میری کامیابی ہے۔ اس کی جگہ شاہ نواز یا تمہارا دھڑن تختہ ہوتا تب بھی میری ہی کامیابی تھی۔"

"جلد تمہارے بقیہ ساتھی بھی یہاں ہوں گے۔"

"یہ تمہاری ایک اور غلط فہمی ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "میرے ساتھی تمہاری پہنچ سے دور جا چکے ہیں ورنہ میں اکیلا کیوں ہوتا؟"

"دبئی بھیج کر تم سمجھتے ہو کہ وہ میری پہنچ سے باہر ہیں؟" مرشد علی زہریلے لہجے میں بولا تھا۔

ایک لمحے کو میرا دل دھڑکنا بھول گیا تھا۔ مرشد علی نے یہ بات جان لی تھی کہ مونا اور سفیر دبئی گئے تھے۔

"کیوں سانپ سونگھ گیا۔" مرشد بولا۔

میں نے خود کو سنبھال لیا۔ "یہ معلوم کرنا کون سا مشکل کام ہے۔ ایک عام آدمی بھی فلائٹ سٹیٹس چیک کر سکتا ہے اور تم یہ نہ سمجھنا کہ میں نے ان کو صرف دبئی روانہ کیا ہے، وہاں بھی وہ محفوظ ہاتھوں میں ہیں ان کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔"

"تم راجا عمردراز پر زیادہ ہی اکڑ رہے ہو۔"

"یہ غلط ہے۔ ہمیں اصل بھروسا خدا کی ذات پر ہے۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "متعدد بار ایسا ہوا کہ ہم نے بے سروسامانی کی حالت میں تمہارے گرگوں کو شکست دی ہے۔ البتہ تم چوہے ہو، اپنے احمق مریدوں کے حصار میں رہتے ہو، کبھی اس سے باہر آ کر دیکھو۔"

"میں تم جیسے حقیر آدمی کے لئے خود آؤں؟" اس نے اپنی انا کو قائم رکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں تم بزدل ہو۔ چلو جسمانی طور پر نہ سہی، تم اتنے بڑے پیر بنتے ہو، مجھ پر اپنی روحانی قوتیں آزماؤ۔ مجھے نیست و نابود کر دو۔"

"وہ بھی کر دیں گے۔" اس نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

"مرشد علی یہ سب کارنامہ ڈیوڈ شا کا ہے۔ اس نے مجھے پکڑا ہے، تم میرے کسی ساتھی کو بھی نہیں پکڑ سکتے۔"

میرا مقصد مرشد علی کو اشتعال دلا کر اس سے معلوم کرنا تھا کہ سونیا یا ناصر میں سے تو کوئی ان کے قبضے میں نہیں ہے۔ میں کامیاب رہا تھا۔ اس نے تیز آواز میں کہا۔ "فکر مت کرو، وہ بھی جلد ہمارے قابو میں ہوں گے۔ تجھے اور تیرے یار کو میں اپنے کتوں کے آگے ڈالوں گا اور وہ لڑکی......"

اس کے بعد مرشد علی نے اپنے اندر کی غلاظت اگلنا شروع کر دی تھی۔ میں بے بس تھا اس کا منہ بھی نہیں توڑ سکتا تھا اس لئے خون کے گھونٹ پیتا رہا۔ میں نے صرف اتنا کہا۔ ''عورتوں کے بارے میں تمہارے خیالات سے لگتا ہے تمہارے خون میں کہیں نہ کہیں کھوٹ ہے اور تمہارے یہ الفاظ مجھ پر ادھار ہیں مرشد علی، میں کبھی نہ کبھی ان کو ضرور لوٹاؤں گا۔''

اس کے بعد میں نے خاموشی اختیار کر لی اور وہ بھی کچھ دیر تک بھونکنے کے بعد چپ کر گیا تھا۔ تقریباً ایک یا ڈیڑھ گھنٹے بعد دروازہ کھلا اور ایک نوعمر لڑکا اندر آیا۔ اس کی عمر سولہ سترہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ دبلی جسامت اور چھوٹے قد کی وجہ سے اپنی عمر سے اور بھی کم نظر آ رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

''چلیں جی، آپ کو بلایا ہے۔''

میں توقع کر رہا تھا کہ اس بار بھی کوئی لڑکی آئے گی لیکن اس لڑکے کو دیکھ کر میں چونکا تھا۔ یہ لوگ اطمینان سے ان دونوں کو میرے پاس بھیج رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا وہ بے خوف تھے۔ اگر میں لڑکی یا اس لڑکے کو قابو میں کر بھی لیتا تب بھی میں اس جگہ سے فرار نہیں ہو سکتا تھا۔ لڑکے نے عام سا لباس پہن رکھا تھا اور پیروں میں اسفنج کی چپل تھی۔ میں کھڑا ہو گیا اور اچانک لڑکے کا بازو پکڑ لیا۔

''اگر میں تمہارے ساتھ جانے کے بجائے تمہارا گلا دبا کر قتل کر دوں؟''

وہ ڈر گیا تھا۔ ''کیوں جی، میں نے کیا، کیا ہے؟''

''تم میرے دشمن کے ساتھ ہو۔''

''نہیں جی، میں تو معمولی سا ملازم ہوں۔ بھلے آپ مجھے مار دیں۔''

میں مسکرایا اور اس کا شانہ تھپکا۔ ''او نہیں یار، میں بھلا تجھے کیوں مارنے لگا۔ چل کہاں لے جانا ہے۔''

لڑکا مجھے لئے کمرے سے نکلا۔ یہ کمرا ایک راہ داری میں تھا اور دروازے کے باہر خاصی مضبوط قسم کی کنڈی لگی تھی۔ دروازے کو اس سے بند کیا جاتا تھا۔ راہ داری میں ایسے تین دروازے اور تھے یعنی کل چار کمرے تھے اس جگہ اور سب کے باہر ایسی ہی مضبوط کنڈی لگی تھی۔ شاید اس جگہ کو قید خانے کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ آخر یہاں ایسی لڑکیاں بھی تو آتی ہوں گی جو خود کو بازار کی جنس بنانے پر آمادہ نہ ہوں یا جن کا ضمیر بیدار ہو گیا ہو اور وہ اس گند میں مزید اترنے کے لئے تیار نہ ہوں۔ راہداری کے ایک طرف سپاٹ سی دیوار تھی تو دوسری طرف لوہے کی مضبوط جیل کی سلاخوں جیسا دروازہ تھا۔ اس کے باہر ایک مسلح شخص موجود تھا۔ جیسے ہی میں دروازے کے پاس آیا، مسلح شخص نے سلاخوں کے درمیان سے ایک جوڑا ہتھکڑیوں کا لڑکے کی طرف پھینک دیا۔

''یہ اس کے ہاتھ میں ڈال دے۔''

لڑکے نے ہتھکڑیاں اٹھا کر سہمی نظروں سے میری طرف دیکھا اور میں نے مسکرا کر دونوں ہاتھ اس کے سامنے کر دیئے اور اس نے میری دونوں کلائیوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں۔ یہ اہتمام ظاہر کر رہا تھا کہ مجھے کسی بڑی شخصیت کے حضور پیش کیا جا رہا تھا۔ چند لمحے بعد میں ایک عالی شان قسم کے بیڈ روم میں داخل ہوا تو وہاں ڈیوڈ شا ایک زرنگار گاؤن میں ملبوس شیمپئن کا جام تھامے آتش دان کے سامنے ایک ہینگنگ چیئر پر تشریف فرما تھا۔

"آؤ شہباز، بیٹھو" اس نے سامنے رکھی سادہ کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

مسلح شخص میرے ساتھ آیا تھا، میں کرسی پر بیٹھا تو ڈیوڈ شا نے اسے کمرے سے جانے کا اشارہ کیا اور گاؤن کی جیب سے ایک عدد پستول نکال کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ مسلح شخص باہر چلا گیا۔ ڈیوڈ شا کسی قدر صحت مند لگ رہا تھا۔ اس نے اپنی ایکس رے نما آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ اس کی نکیلی ناک سرخ ہو رہی تھی۔ "کیسے ہو تم؟" اس نے کہا۔

"تمہارے سامنے ہوں۔"

"ایمن یاد آتی ہے؟" اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔

"وہ مجھے کیوں یاد آنے لگی؟" میں نے الٹا سوال کیا۔

"تم اسے پسند نہیں کرتے ہو؟"

"ڈیوڈ شا، تمہاری عقل پر ماتم کرنے کو دل چاہتا ہے۔"

"عقل پر ماتم؟" اس نے نہ سمجھنے کے انداز میں کہا۔

"اردو کا ایک محاورہ ہے، ہمارے ہاں ماتم فوت شدہ چیز پر کیا جاتا ہے۔" میں نے وضاحت کی۔ "میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ میں دشمنوں سے چھپتا پھر رہا ہوں اور کیا میں کسی سے عشق لڑاؤں گا؟"

وہ مسکرایا۔ "عشق کہیں بھی ہو سکتا ہے، کسی وقت بھی ہو سکتا ہے۔ کیا تمہیں واقعی ایمن یاد نہیں آتی؟"

"میرا خیال ہے تم نے مجھے ایمن یا عشق و عاشقی کے موضوع پر بحث کرنے کے لئے نہیں بلایا ہے؟"

"درست ہے لیکن اصل موضوع کی طرف آنے سے پہلے ذرا دوسرے موضوعات پر بات کر لی جائے تو کیا حرج ہے۔"

میں نے اسے دیکھا۔ "تم شروع سے میری باتیں سن رہے تھے؟"

"تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میرا خیال ہے تم نے شروع میں مجھے چیک نہیں کیا تھا۔ شاید مرشد علی نے میری کالز کے بارے میں تمہیں کل کسی وقت بتایا تھا۔"

"تمہارا اندازہ درست ہے۔" اس نے ستائشی لہجے میں کہا۔ "تم نے یہ اندازہ کیسے لگایا؟"

"کچھ واقعات سے۔" میں نے گول مول سے انداز میں کہا۔

"شہباز ملک میں تمہاری قدر کرتا ہوں، کاش تم میرے ساتھ ہو جاؤ۔"

"اس کا فائدہ...... میں تمہارے کس کام آ سکتا ہوں؟"

"اسے چھوڑو...... تم صرف میرا ساتھ دینے پر آمادہ ہو جاؤ تو میں تمہیں اس مقام پر پہنچا سکتا ہوں جس کا تم نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا۔"

"میں نے کبھی اس مقام تک جانے کے بارے میں نہیں سوچا، جہاں تک جانے کے بارے میں کبھی سوچا نہ ہو۔"

اس نے میرے الفاظ پر غور کیا۔ ’’یعنی تم انکار کر رہے ہو؟‘‘

’’ڈیوڈ شا، تم ذہین آدمی ہو لیکن انسانوں کے بارے میں تمہاری ذہانت محدود ہے۔ تم میں شاید انسانوں کو پرکھنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ میرے لئے ایک انسان کی اہمیت ہر چیز سے بڑھ کر ہے اور تمہارے لئے انسان کی اہمیت سب سے آخر میں آتی ہے۔‘‘

’’ہاں، کیونکہ میں احمقانہ جذباتیت سے نجات حاصل کر چکا ہوں۔‘‘

’’ہمارے ہاں اسے انسانیت کہتے ہیں اور اس کے برخلاف کسی بھی نظریے کو حیوانیت ہی کہا جا سکتا ہے، ایک جانور کو بھی سب سے زیادہ فکر اپنے مفاد کی ہوتی ہے۔‘‘

اس کے چہرے پر ناگواری نمودار ہوئی۔ ’’میں نے تمہیں یہاں بحث کرنے کے لئے نہیں بلایا ہے۔‘‘

میں ہنسا۔ ’’ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ اصل موضوع کی طرف آنے سے پہلے ادھر اُدھر کے موضوعات پر بات کر لی جائے۔‘‘

’’تم سے بحث فضول ہے۔‘‘ اس نے کہا اور اپنی جیب سے ایک موبائل نما آلہ نکال کر اس کا بٹن دبایا۔

’’جارج سیمپل لینے کے لئے آ جاؤ۔‘‘

’’سیمپل......؟ کیا میرے ہاتھ سے متعلق!‘‘

اس نے سر ہلایا۔ ’’تمہارے نزدیک شاید اس چیز کی اہمیت نہ ہو لیکن درحقیقت یہ طبی دنیا کا معجزہ ہے، یہ درست ہے کہ بعض لوگوں کے ایسے گینگرین شدہ جسمانی حصے درست ہوئے جن کو ڈاکٹروں نے جواب دے دیا لیکن ان کی بحالی میں کسی دوا یا علاج کا عمل دخل نہیں تھا بلکہ یہ بہتری خود بخود آئی تھی جبکہ تمہارا ہاتھ ایک باقاعدہ پراسیس علاج کے ذریعے ٹھیک ہوا ہے۔‘‘

’’حکیم قادس تمہارے پاس ہے۔‘‘

’’ہاں، وہ ایک جینئس آدمی ہے۔ اس طریقہ علاج سے ہٹ کر بھی اس کے پاس حیرت انگیز چیزیں ہیں۔ مجھے تیس برس سے دمے کا مرض تھا اس نے صرف چار ہفتے میرا علاج کیا اور اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ جدید ترین ٹیسٹوں سے واضح ہے کہ اب مجھ میں اس مرض کا نام ونشان نہیں رہا ہے ورنہ پہلے سرما میرے لئے عذاب بن جاتا تھا اور اونچے مقامات پر جانے سے میری حالت خراب ہو جاتی تھی اور ابھی چند ہفتے پہلے میں اسکردو سے واپس آیا ہوں۔‘‘

اسی اثنا میں ایک سفید فام شخص ایک دیسی کے ساتھ اندر آیا۔ سفید فام یقیناً جارج تھا اور یہ ان گوروں میں سے نہیں تھا جن کو میں نے پہلے ڈیوڈ شا کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس نے لیب کوٹ پہن رکھا تھا جبکہ اس کا ساتھی ایک ٹرالی کھینچ کر لا رہا تھا جس پر مختلف آلات سجے ہوئے تھے۔ اس نے ڈیوڈ شا سے اجازت لی اور اپنا کام شروع کر دیا۔ سب سے پہلے اس نے میرا درجہ حرارت چیک کیا، بلڈ پریشر لیا، نبض کی رفتار چیک کی۔ اس کے بعد ایک آلے سے میری آنکھوں کی پتلیوں کا جائزہ لیا۔ آخر میں اس نے میرا بایاں ہاتھ تھام لیا۔

’’ڈیوڈ شا، اگر میں سیمپل دینے سے انکار کر دوں تو...... مجھے اس کا حق حاصل ہے۔‘‘

’’تم انکار نہیں کر سکتے۔‘‘ اس نے جواب دیا۔ جارج اور اس کے مددگار کے اندر آتے ہی اس نے پستول

ہاتھ میں لے لیا تھا اور پوری طرح چوکنا تھا۔

''جیل کے قیدی کو بھی حق......''

''بکواس مت کرو۔'' وہ غرایا۔''اب کوئی حرکت مت کرنا، جارج سیمپل لو۔''

جارج نے ایک لمبی اور باریک نوک والی سوئی کی سرنج اٹھائی۔ اس سے پہلے اس نے روئی پر دوا لگا کر میری ہتھیلی کی پشت صاف کی اور پھر مضبوطی سے ہاتھ کو کرسی کی ہتھی پر دباتے ہوئے سرنج کی سوئی گوشت میں اتار دی۔ مجھے معمولی سی تکلیف ہوئی تھی پھر اس نے سرنج کی سوئی باہر نکال لی جسے اس نے فوراً ائیر ٹائٹ قسم کے گلاس میں رکھ کر اسے بند کر دیا۔ اس کے بعد وہ اپنے مددگار سمیت رخصت ہو گیا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے ڈیوڈ شا کی طرف دیکھا۔''اس سیمپل کا کیا، کیا جائے گا؟''

''اس کا ایک مخصوص مشین میں تجزیہ کیا جائے گا۔ پچھلے تجربات سے واضح تھا کہ تمہارے ہاتھ کے خلیات کے درمیان میں ایک غیر فطری مادہ موجود ہے اور شاید اسی مادے نے تمہارے ناکارہ ہاتھ کو بچا لیا تھا۔''

''اب تم اس سیمپل کا تجزیہ کراؤ گے لیکن سوال یہ ہے کہ تم اس سے کیا حاصل کر سکو گے۔''

''یہ بعد کی بات ہے، ممکن ہے مجھے کچھ بھی نہ ملے۔ آج کے جدید اور سائنٹیفک دور میں بھی سائنسی ماہرین کا سترفی صد حصہ بے کار جاتا ہے۔'' وہ دوبارہ پُرسکون ہو کر بیٹھ گیا تھا اور اس نے پستول گود میں رکھ لیا تھا۔

''حکیم قاوس کہاں ہے، تم اسے میرا ہاتھ دکھا سکتے تھے۔ وہ ان سارے ماہرین سے بہتر طور پر بتا سکتا تھا۔''

''میں تمہاری بات سے متفق ہوں مگر وہ یہاں نہیں ہے۔ دو دن کے لئے کہیں گیا ہے، پرسوں واپس آ جائے گا تو اسے بھی تمہارا ہاتھ دکھا دیں گے۔''

''فتح خان کہاں ہے؟''

''اسی جگہ ہے کل کا دفاعی پلان اسی نے بنایا تھا اور کمانڈ بھی وہی کر رہا تھا۔''

''میرا بھی یہی اندازہ تھا کہ اس قسم کا پلان مرشد علی یا شاہ نواز جیسے لوگوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ میرا خیال فتح خان کے بجائے تمہاری طرف گیا تھا۔''

''میرا اس میں صرف اتنا حصہ تھا کہ میں نے گیس کے بم استعمال کرنے کا مشورہ دیا تھا، اس پر عمل درآمد اور باقی کام فتح خان نے کرایا تھا۔''

''ڈیوڈ شا ایک سوال ہے، اگر تم اس کا جواب دو۔''

''پوچھو۔'' اس نے خالی ہو جانے والا جام برابر میں تپائی پر رکھ دیا۔

''تمہارا بھائی اور کزن برٹ شا گیارہ سال پہلے شمالی علاقے میں لاپتا ہو گیا تھا۔ اس کے بعد فرض کر لیا گیا کہ وہ مر چکا ہے۔ تم اس کے بارے میں کیا سوچتے ہو؟''

''یہی کہ وہ مر چکا ہے۔'' اس نے بلا تامل کہا۔

''اور فرض کر لو...... وہ زندہ ہو تو؟''

''اس صورت میں بھی اسے مرنا پڑے گا۔'' ڈیوڈ شا کا لہجہ سرد ہو گیا تھا۔ ''ویسے تم نے اس کا ذکر کیوں کیا مسٹر شہباز ملک!''

''ایسے ہی، تم نے بیٹی کا ذکر کیا تھا، میں نے سوچا باپ کا ذکر کر دوں۔'' میں مسکرایا۔

''برٹ شا اصل میں تصویر کے لئے آیا تھا لیکن اس نے ایک کام اور بھی اپنے ذمے لے لیا تھا۔''

''ہیروں کی خریداری اور ان کی سوئٹزرلینڈ تک ترسیل۔''

''ہاں، مگر یہ سودا نہیں ہو سکا تھا۔''

''میں جانتا ہوں، برٹ شا نے ہیرے چھپا دیئے تھے اور اس کے بعد خود لاپتا ہو گیا تھا۔''

''تمہیں وہ جگہ یاد ہے۔''

''اچھی طرح، لیکن اگر تم یہ سوچ رہے ہو کہ میں ہیروں کے جائے دفن سے واقف ہوں تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔''

''اتنی سمجھ ہے؟'' اس نے ناگواری سے کہا۔ ''ہیرے تمہارے پاس ہوتے تو تمہاری یہ حالت نہ ہوتی۔''

''تب تم نے اس وادی کے بارے میں کیوں پوچھا؟''

''وہ سودا برٹ شا کے ذمے تھا، ہیروں کی ادائیگی ہو چکی تھی لیکن ہیرے پارٹی تک نہیں پہنچے۔ برٹ شا غائب ہو گیا تھا۔ اس کی جاگیر اور خطاب کا وارث ہونے کے ناتے پارٹی نے مجھ سے کہا کہ میں ہیرے لا کر دوں۔''

''ظاہر ہے جب تم زبردستی اس کے جانشین بن گئے تھے تو اس کے ذمے جو بھی معاملات تھے، وہ بھی پورے کرنا تمہاری ذمے داری ہے۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''پارٹی نے مجھ پر ذمے داری ڈالی ہے لیکن جزوی طور پر۔ بہرحال یہ ایک غیر قانونی سودا تھا اور سوئس قانون اس کی اس وقت تک توثیق نہیں کر سکتا ہے جب تک ہیرے اس کی سرزمین پر نہیں آ جاتے مگر ان معاملات میں آدمی مکمل طور پر انکار بھی نہیں کر سکتا ہے۔''

''جبکہ پارٹی بین الاقوامی ہو۔ یہ یہودی تو نہیں ہیں؟''

''ہاں، تم نے کیسے جانا؟''

''کیونکہ یہی قوم صحیح طریقے سے تم لوگوں کی رگیں دبا سکتی ہے۔'' میں ہنسا۔ ''بہرحال اس ساری گفتگو کا اصل مقصد بھی بتا دو۔''

''مجھے ہیروں کی تلاش کے سلسلے میں تمہاری مدد درکار ہے۔''

''میں کوئی مدد نہیں کر سکتا کیونکہ مجھے قطعی اندازہ نہیں ہے کہ برٹ شا نے ہیرے کہاں چھپائے تھے۔''

''ہم منطقی طریقہ استعمال کریں گے۔ مثلاً وادی کو دیکھ کر اندازہ لگانے کی کوشش کریں گے کہ ہیرے کہاں چھپائے جا سکتے ہیں۔ اس کا اندازہ تو برٹ شا کو بھی ہو گا کہ ہیرے لامحدود وقت کے لئے زمین میں

والے جا سکتے ہیں اس لئے اس نے کوئی ایسی جگہ منتخب کی ہوگی جسے برسوں بعد بھی کسی کی جانب سے چھیڑنے کا احتمال نہ ہو، پھر کچھ جدید آلات ہیں، ہم ان کی مدد بھی لیں گے۔"

"تمہاری باتوں سے لگ رہا ہے تم نے ہیروں کی تلاش کے سلسلے میں مجھے قائل کر لیا ہے۔" میں نے طنز سا طنز کیا۔

"شہباز ملک اگر تم مان جاؤ تو تمہارے تمام مسائل حل ہو سکتے ہیں۔" اس نے سرسراتے لہجے میں کہا۔

"مثلاً؟" میں نے لہجہ سپاٹ کر لیا تھا۔

"مرشد علی سے تمہارے سارے معاملات سیٹل ہو سکتے ہیں۔ وہ آئندہ کبھی تمہیں یا تمہارے ساتھیوں کو تنگ نہیں کرے گا۔"

"اس کی گارنٹی کون دے گا...... تم؟"

"ہاں، میں دوں گا۔"

"اور تم انتقال کر گئے تب؟"

"شہباز ملک! میری گارنٹی میرے مرنے کے بعد بھی جاری رہے گی۔" اس نے غرور سے کہا۔

"تم مجھے مرشد علی پر اعتماد کرنے کو کہہ رہے ہو، سوال یہ ہے کہ تم پر کیوں کر اعتماد کروں؟ جبکہ میں چھوٹے موٹے معاملات میں تمہاری وعدہ خلافیاں دیکھ چکا ہوں۔ وہ لڑکی یاد ہے، جسے فتح خان جبراً لے آیا تھا اور تم نے ماما عمر دراز سے اس بارے میں ایک وعدہ کیا تھا۔"

میں نے اسے آئینہ دکھایا تو اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی جھنجلاہٹ دباتے ہوئے کہا۔ "وہ اور بات تھی۔"

"کام نکل جانے کے بعد تم اس بات کو بھی اور قرار دے سکتے ہو۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"شہباز...... تم ان پریکٹیکل ہو رہے ہو۔" اس نے اس بار سکون سے کہا۔ "اپنی پوزیشن تو سمجھو، اس کے بعد میری آفر پر غور کرنا۔"

"مسٹر شا! مجھے اب سوچنے کے لئے زیادہ وقت نہیں لگتا۔ مجھے بروقت فیصلہ کرنا آ گیا ہے، اب یہ تم پر ہے تم مجھے کس طرح مطمئن کرتے ہو۔ اس کے بعد ہی میں ہاں یا نہ میں جواب دے سکتا ہوں۔"

"تم نہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔"

"میں نہ کرنا بھی نہیں چاہتا۔ ان ہیروں کی میری نظر میں کوئی وقعت نہیں ہے اور ان کے بدلے مجھے میری نارمل زندگی واپس مل جاتی ہے تو میں دل و جان سے تیار ہوں مگر میں تم پر یا مرشد علی پر اعتبار کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔"

"تو پھر گاڑی کیسے آگے بڑھے گی؟"

"یہ سوچنا تمہارا کام ہے۔" میں نے کہا۔

وہ فکر مند نظر آنے لگا تھا۔ مجھ پر آہستہ آہستہ واضح ہو رہا تھا کہ میری کیا افادیت ہے۔ اب یہ ہیروں والا معاملہ تھا۔ ڈیوڈ شا بظاہر اس ذمے داری سے عہدہ برآ ہونے کی بات کر رہا تھا لیکن مجھے ایک فی صد بھی یقین نہیں

تھا کہ وہ ہیرے اس پارٹی کے حوالے کر دے گا۔ سوچتے سوچتے اچانک ڈیوڈ شا نے اپنے موبائل نما آلے پر کہا۔
''اسے لے جاؤ۔''
''یعنی اب تم غور کرو گے؟'' میں نے کہا۔
اسی لمحے دروازہ کھلا مسلح شخص نوعمر لڑکے کے ساتھ اندر آیا اور میں ان دونوں کے ہمراہ اپنے زندان کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں جس حصے سے گزر کر ڈیوڈ شا کے کمرے تک آیا تھا، وہ شاید عورتوں کے لئے مخصوص تھا کیونکہ کمروں سے ان کے ہنسنے اور آپس میں باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ چند ایک کمروں کے دروازے کھلے تھے۔ ایک کمرے میں مجھے دو بنگالنیں نظر آئیں جو بنگالی میں بات کر رہی تھیں۔ ایک اور کمرے میں ایک گوری بے تکلفی سے نائٹی پہنے بستر پر اوندھے منہ لیٹی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ کمروں کے سامنے سے گزرتے ہوئے جھلکیاں دکھائی دے رہی تھیں، بعض جگہ جھلکیاں عبرت ناک تھیں تو بعض مقامات پر ہوش رُبا تھیں۔ ایک گیلری سے گزرتے ہوئے میں آخری دروازے کے پاس پہنچا تھا کہ اچانک دروازہ کھلا اور ایک عورت باہر آئی۔ میرے بڑھتے قدم رک گئے تھے۔ میں دنگ رہ گیا تھا۔ چند فٹ کے فاصلے سے کسی ابہام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ سو فی صد زہرہ تھی۔ زہرہ جو اللہ رکھا پہلوان کی بیوہ تھی اور جسے میں نے اسٹیشن ماسٹر خادم حسین کے پاس چھوڑا تھا اور خادم حسین مارا گیا تھا، وہی زہرہ پری محل میں موجود تھی۔

☆======☆======☆

وہ زہرہ ہی تھی، وہ زہرہ جسے میں خادم حسین کے سپرد کر کے آیا تھا اور پھر اخبار میں، مَیں نے خادم حسین کے مارے جانے کی خبر پڑھی تھی۔ مجھے ایک فیصد بھی شبہ نہیں تھا کہ یہ کام ان لوگوں کا ہے جو میرے اور زہرہ کے پیچھے شکاری کتوں کی طرح پڑے ہوئے تھے۔ وہ ہمارے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن تک آئے اور اس کے بعد یہ پتا چلانا مشکل نہیں تھا کہ ہم کس کے پاس مہمان ہوئے تھے۔ زہرہ نے تو مستقل اس گھر میں بسنے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر اس کی اور خادم حسین کی آرزوؤں کے غنچے بن کھلے مرجھا گئے تھے۔ جب میں نے اخبار میں خادم حسین کے قتل کی خبر پڑھی اور اس میں زہرہ کا کسی حوالے سے کوئی ذکر نہیں پایا تو میں نے سکون کا سانس لیا تھا کہ وہ بچ گئی۔ وہ ماری جاتی یا خادم حسین کو قتل کرنے والے اسے لے جاتے تو دونوں صورتوں میں خبر ضرور بنتی مگر زہرہ کو اس جگہ دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ میرا خیال اور سکون غلط تھا۔ زہرہ شکاریوں کے ہاتھ لگ گئی۔ رانا خاندان نہ سہی، شاہ نواز ان سے زیادہ خطرناک تھا۔ زہرہ یہاں کیا کر رہی تھی اس کا اندازہ مجھے اس کے حلیے سے ہو گیا تھا۔ اس نے بے حد باریک نائٹی پہن رکھی تھی جس کے نیچے کچھ نہیں تھا اور اس کے تمام جسمانی خطوط و پیچ و خم نمایاں تھے۔ مجھے لانے والے گارڈ نے گزرتے ہوئے زہرہ کو اتنی محویت سے دیکھا کہ اگر میں ایک ہاتھ سے اس کی رائفل چھین کر دوسرے ہاتھ سے اس کی گردن توڑ کر اسے جہنم رسید کر دیتا تو مرنے تک اسے قطعی علم نہ ہوتا، حالانکہ وہ جس جگہ رہتا تھا وہاں اس قسم کے نظارے عام سی بات تھی۔
زہرہ ان عام عورتوں اور لڑکیوں سے مختلف تھی جو یہاں موجود تھیں۔ اس کے چہرے پر پردہ نحوست نہیں تھی جو اس پیشے میں چہروں پر رچ بس جاتی تھی اس کے بجائے اس کے دلکش نقوش میں ایک غم ناک نرمی تھی۔ وہ نشے میں تھی اور اس کی بوجھل آنکھیں مزید کشش انگیز نظر آنے لگی تھیں۔ اس نے مجھے اور میرے ساتھ گزرتے

...الوں نگرانوں کو سرسری نظروں سے دیکھا تھا۔ میرا حلیہ خاصی حد تک بدل گیا تھا۔ لمبے بال جو گدی سے نیچے آ
...تے اور خشخشی داڑھی تھی، مجھے نہیں معلوم کہ اس نے مجھے پہچانا تھا یا نہیں۔ اس کے ہاتھ میں شراب کی نصف
...بل اور کمرے کے ادھ کھلے دروازے سے مجھے جہازی سائز کے بستر پر ایک عظیم الشان توند والا دھوتی پوش شخص
...نواب نظر آیا تھا۔ اگرچہ توند کے عقب میں اس کا چہرہ غائب تھا مگر اس کے ریلوے انجن کی سیٹی جیسے خراٹے
صاف سنائی دیئے۔ زہرہ نے دروازہ بند کیا اور خمار آلود چال کے ساتھ مخالف سمت میں جانے لگی۔ میں نے
اسے مڑ کر دیکھا تو میرے نگرانوں نے اسے محض مردانہ دلچسپی سمجھا ہوگا۔ چلتے چلتے زہرہ نے بوتل سے منہ لگا کر
گھونٹ لیا تھا جہاں تک مجھے معلوم تھا۔ جب تک وہ پہلوان اللہ رکھا کی بیوی رہی تب بھی عملاً طوائف ہونے کے
باوجود اس نے کبھی شراب نہیں پی تھی۔ میں اپنے قید خانے جانے والے راستے کی طرف مڑا تو زہرہ نظروں سے
اوجھل ہوئی تو مجھ سے زیادہ قلق ان دونوں کو ہوا تھا۔ چھوٹے نے بلبلا کر کہا۔ ”ہائے...... ہائے...... کی نار اے۔“

”تیری ماں دے برابر اے۔“ نگران نے اسے یاد دلایا۔

”پر ماں تے نئیں اے۔“ چھوٹو نے ڈھٹائی سے کہا۔

”بکواس نہ کر اسے بند کر۔“ نگران نے چھوٹے کو جھڑکا تھا۔

زہرہ سے اچانک ملاقات ایک جھٹکا تھی جس نے ذرا دیر کے لئے مجھے ذہنی طور پر منتشر کر دیا تھا مگر اپنے
...د خانے میں آنے کے بعد ذرا دیر کے لئے میں نے اسے ذہن سے جھٹک دیا۔ میں اپنے حالات پر غور کرنا
...چاہتا تھا۔ جو کہانی ایک معمولی سے واقعے سے شروع ہوئی۔ نادر علی اور اس کا بھائی مرشد علی اس سارے فساد کی جڑ
...مگر مسائل پھیلا رہے تھے۔ نت نئے نام سامنے آتے رہے تھے۔ فتح خان، ڈیوڈ شا اور اب شاہ نواز۔ اگرچہ
...سب ایک ہی سلسلے کی کڑی تھے لیکن سب انفرادی طور پر میرے لئے ایک سے بڑھ کر ایک خطرناک تھے۔ اس
...رما حویلی میں ہونے والے کاروبار پر اب مرشد علی کا قبضہ تھا۔ اس نے اور شاہ نواز نے مل کر جامی شاہ کو راستے
...سے ہٹا دیا تھا۔ میں مرشد علی کے قبضے میں ہوتا تو وہ بلاتکلف مجھے ادھیڑ کر رکھ دیتا میں اس کے لئے ایسا دشمن تھا
...جسے وہ اپنے ہاتھ سے عذاب ناک موت دینا پسند کرتا۔ میں اس کے بھائی کی معذوری کا ذمے دار تھا اگرچہ یہ سچ
...نہیں تھا مگر مرشد علی اس پر پورا یقین رکھتا تھا۔

اس کی وجہ مجبوری ڈیوڈ شا تھا، اس کا آقا، وہ مجھے زندہ رکھنا چاہتا تھا کیونکہ ایک تو اسے مجھ پر آزمائے
...جانے والے طریقہ علاج سے دلچسپی تھی، دوسرے وہ ان ہیروں کے چکر میں تھا جو برٹ شا نے ایک دور دراز
...مقام میں چھپا دیئے تھے۔ برٹ شا فتح خان کی قید میں تھا لیکن ڈیوڈ شا اس سے ناواقف تھا اور میرا اسے بتانے کا
...ارادہ بھی نہیں تھا جب تک میری جان پر نہ بن آئے۔ میں ڈیوڈ شا کو صاف انکار کر کے نہیں آیا تھا لیکن میں نے
...اس پر بھروسا کرنے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ مجھے سونیا اور ناصر کا خیال بھی تھا۔ اب تک ان کے بارے میں کوئی
...اطلاع نہیں تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ناصر نے حالات سمجھتے ہوئے سونیا کو اس جگہ سے ہٹا لیا تھا اور نہ جن جدید
...آلات کی مدد سے ان لوگوں نے میرا سراغ لگایا تھا اور ٹھیک اس درخت تک آ پہنچے تھے جس پر میرا آشیانہ تھا، وہ
...ان کی کوٹھی تک کیوں نہیں جا سکتے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ میں نے اپنے خاص موبائل کا
...استعمال زیادہ تر کوٹھی سے باہر کیا تھا اس وجہ سے وہ لوگ کوٹھی تک رسائی حاصل نہیں کر سکے تھے۔ بہر حال وجہ کچھ

بھی تھی، سونیا اور ناصر محفوظ تھے۔
وسیم اور شکیل اب باقی نہیں رہے تھے۔ راجا عمردراز اور اس کے آدمی میرے لئے بھاگ دوڑ کر رہ
ہوں گے مگر مجھے ان سے امید نہیں تھی۔ ان میں نہ تو وسیم اور شکیل جیسی صلاحیتیں تھیں اور نہ ہی ان کے پاس وسائل
تھے بلکہ وہ ڈیوڈ شا سے چھپتے پھر رہے تھے حالانکہ وہ غیر ملکی تھا اس کے باوجود مرشد علی اور فتح خان جیسے لوگ ا
کے سامنے پالتو کتے کی طرح دُم ہلانے پر مجبور تھے۔ مجھے مرشد علی کا خیال آیا کہ میری گرفتاری پر اس کا کیا رد عم
ہوگا۔ میں نے اس کی پیشکش اس کے منہ پر ماری تھی جو مونا کے حوالے سے تھی۔ ابھی میں اس کے بارے م
سوچ رہا تھا کہ قید خانے کا دروازہ کھلا اور مجھے مرشد علی کی صورت دکھائی دی۔ شیطان کا نام لیا اور وہ حاضر ہو گیا
مرشد علی اکیلا نہیں تھا اس کے ساتھ دو عدد مسلح گرگے بھی تھے جنہوں نے مختصر نال والی مشین گنیں اٹھا رکھی تھیں۔
''خوش آمدید پیر صاحب۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''افسوس کہ یہاں آپ کے شایانِ شان بیٹھنے
کوئی جگہ نہیں ہے۔''
''تم اس کی فکر مت کرو۔'' اس نے کہا اور چٹکی بجائی عقب سے ایک شخص شاہانہ انداز کی زرنگار کرسی ا
اور مرشد علی کے عقب میں رکھ دی۔ مرشد علی نے شہنشاہ اکبر کے آسن میں اپنی ریشمی قبا سمیٹتے ہوئے کرسی
تشریف رکھی۔ حسبِ معمول اس نے اپنی آنکھوں میں اچھا خاصا سرمہ لگا رکھا تھا۔ میں اس کے سامنے فرش پر نہ
بیٹھنا چاہتا تھا اس لئے دیوار سے پشت ٹکا کر کھڑا ہو گیا۔ ''تشریف آوری کی وجہ جان سکتا ہوں؟''
''شہباز میں تم سے دشمنی نہیں چاہتا۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔
''مرشد علی، اس بلاوجہ کی دشمنی کا آغاز تمہاری طرف سے ہوا تھا۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔ ''تمہار
بھائی نے اپنے طور پر ایک واقعے کو بنیاد بنا کر ہمارے خلاف کینہ پال لیا۔ میں نے اپنا ہاتھ آگے کیا، اس
میرے اس ہاتھ کو جسم سے جدا ہی کر دیا تھا۔ وہ تو خدا کو اس کی بچت منظور تھی۔''
''وہ ایک جذباتی نوجوان ہے۔'' مرشد علی سوچ میں گم انداز میں بولا۔ ''اسے بہرحال اپنے کئے کی
مل گئی۔''
''وہ اسے بھی میرے کھاتے میں ڈالتا ہے حالانکہ اس نے احمقانہ انداز میں تین مسلح افراد کے سا
پستول نکالنے کی کوشش کی تھی۔ یہ نتیجہ تو لازمی تھا اس کی قسمت کہ وہ مارے جانے سے بچ گیا۔''
ایک لمحے کے لئے مرشد علی کی آنکھوں میں شعلہ سا لپکا تھا مگر اس نے فوراً خود پر قابو پا لیا۔ ''شہباز م
میں یہاں پرانی باتیں دہرانے نہیں آیا ہوں۔''
''اگر تم وہ پیشکش دوبارہ لے کر آئے ہو تو میرا جواب وہی ہے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے کہ
تمہارے یا ڈیوڈ شا کے قبضے میں ہوں۔''
''وہ پیشکش بھی برقرار ہے۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن اس وقت میں کسی اور مقصد سے آیا ہوں۔''
''کہو۔'' میں نے کہا۔
''تم دونوں جاؤ۔'' مرشد علی نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ وہ بے چون و چرا کئے چلے گئے اور قید خا
دروازہ بند ہو گیا۔ وہاں بس میں اور مرشد علی رہ گئے تھے۔ میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"تم نے مجھ پر اعتماد کرلیا، اگر میں تمہاری گردن مروڑ دوں؟"

مرشد علی مسکرایا۔ "مجھے امید ہے تم کوئی ایسی حماقت نہیں کرو گے جس کے بعد تم چند منٹ سے زیادہ زندہ نہ رہ سکو۔"

میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ "تم درست کہہ رہے ہو، بہر حال کہو کیا کہتا ہے۔"

"شہباز، مجھے معلوم ہے سفیر اور مونا اس ملک سے جا چکے ہیں اور اب صرف تم باقی ہو، میں اس معاملے کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔"

"فی سبیل اللہ؟" میں نے طنز کیا۔ "تمہارے دل میں رحم آ گیا ہے۔"

"ایسی بات نہیں ہے۔ اگر میں ہاں کہوں تو یہ جھوٹ ہوگا۔ دراصل اس معاملے کا میری سیاسی ساکھ پر برا اثر پڑ رہا ہے۔"

"میں ہنسا۔ "تم سمجھتے ہو لوگ تمہارے کرتوتوں سے بے خبر ہیں۔ کالج کی طالبہ کی مرشد ہاؤس سے برآمدگی ابھی تک اخبارات کا موضوع ہے۔"

"تم بات تو سنو۔" اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"ضرور سناؤ لیکن مہربانی کر کے پھر کوئی ایسی تجویز پیش مت کرنا کہ میں عقل و ہوش گنوا کر تمہیں قتل کر دوں، بعد میں میرا بے شک کچھ بھی ہو۔"

"میری تجویز بہت سادہ سی ہے۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "سفیر اور مونا جا چکے ہیں، میں تمہارے اب تک ہونے والے تمام مالی نقصان کی تلافی کر دیتا ہوں۔ بیس تیس، پچاس لاکھ روپے جتنے تم کہو۔"

"اور اس کے بدلے مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"ابھی کچھ دیر پہلے تمہیں ڈیوڈ شا نے بلایا تھا۔"

"ہاں، تم اس بارے میں جاننا چاہتے ہو۔" میں مسکرایا۔ "ویسے یہ سن کر تمہیں تعجب ہوگا وہ بھی مجھے کچھ اسی قسم کی پیشکش کر رہا تھا۔"

"کیوں؟" مرشد علی کا لہجہ مضطرب تھا۔

"یہ تم اس سے معلوم کرلو۔"

مرشد علی نے گہرا سانس لیا۔ "شہباز ملک میں صاف بات کروں گا۔ مجھے وہ ہیرے درکار ہیں اس کے بدلے میں تمہیں معاف کرنے اور تم پر قائم سارے مقدمات ختم کرانے کے لئے تیار ہوں۔ تم اپنے ساتھیوں سمیت باہر جا سکتے ہو۔"

"جب تم دل سے دشمنی بھلانے کو تیار ہو تو ہم یہاں بھی رہ سکتے ہیں۔"

"نہیں، دشمنی میں ختم کر رہا ہوں نادر نہیں۔ وہ پاگل ہو رہا ہے۔ اب تک میں نے اسے قابو میں رکھا ہے۔"

"بعد میں اس نے بے قابو ہو کر میرے یا سفیر کے گھر والوں کو نقصان پہنچایا تو......"

"ایسا نہیں ہوگا، اگر تم میری بات مان جاتے ہو تو میں نادر علی کو قائل کر سکتا ہوں کہ تم تینوں میرے

آدمیوں سے مقابلے میں مارے گئے ہو۔''

''اس نے لاشیں دیکھنا چاہیں تو۔''

''تو میں دکھادوں گا۔'' وہ عیاری سے مسکرایا۔ ''لاشیں مسخ بھی ہو جاتی ہیں۔''

''گویا تم نے سب سوچ لیا ہے، فرض کرو میں مان جاتا ہوں اور تمہیں اس وادی تک لے جاتا ہوں جہاں پر ہیرے ہیں پھر کیا ہوگا!''

''صرف جگہ نہیں، مجھے ہیرے چاہئیں۔''

''وہ تو تمہارے باپ ڈیوڈ شا اور اس کے دست نار است فتح خان کو بھی چاہئیں۔'' میں نے دل میں کہا اور بولا۔ ''ہیروں کا علم مجھے ہوتا تو میں صبح سے شام تک اس ٹریول اینڈ ٹورسٹ ایجنسی میں سر کھپاتا۔ آرام سے یورپ امریکا یا آسٹریلیا میں بیٹھا ہوتا۔''

''تم ہیروں تک میری رہنمائی کرو گے اور جب مجھے ہیرے مل جائیں گے تو......''

''تم مجھے دودھ سے مکھی کی طرح نکال کر اپنے بھائی کے سامنے پھینک دو گے کہ وہ مجھے مسل دے۔ تمہیں ہیرے مل جائیں گے اور تمہارے بھائی کے جذبہ انتقام کی تسکین بھی ہو جائے گی۔''

اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوا تھا جیسے میں نے اس کے دل کی بات پکڑ لی ہو، پھر اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''ایسا نہیں ہوگا میں اپنا وعدہ پورا کروں گا۔''

''اس کی کیا ضمانت ہے کہ تم اپنے وعدے پر عمل کرو گے؟'' میں نے مزید طنز سے گریز کرتے ہوئے کہا۔ ''اپنی زبان کی بات مت کرنا اس پر میں اتنا ہی اعتماد کرسکتا ہوں جتنا کہ زہریلے سانپ پر۔ میں نے یہی بات ڈیوڈ شا سے بھی کی تھی۔''

''اسے بھول جاؤ۔ وہ کل یہاں سے چلا جائے گا۔'' مرشد علی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''اور اس کے بعد میں تمہارے رحم و کرم پر ہوں گا۔'' میں نے تلخی سے کہا۔

''مجھ پر اعتبار کرو، تمہیں یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔'' وہ بولا۔ اس نے اپنے ایک ہاتھ کو لبادے میں ہلکی سی حرکت دی اور فوراً ہی دروازہ کھلا اور اس کے محافظ اندر آ گئے۔ اس نے اپنے لباس میں کوئی سگنل دینے والا آلہ لگا رکھا تھا۔ اس نے محض بٹن دبایا اور اس کے محافظین سگنل ملتے ہی اندر آ گئے تھے۔ اسی وجہ سے وہ اتنے آرام سے میرے ساتھ اکیلا رہ گیا تھا عین ممکن تھا اس کے لباس میں کوئی پستول بھی ہوتا اور وہ میری طرف سے خطرہ محسوس کرتے ہی اسے نکال لیتا۔

''میں تم سے پھر ملوں گا۔'' وہ کھڑا ہو گیا اس کا کرسی بردار اندر آیا اور کرسی اٹھا کر لے گیا۔ مرشد علی بھی جانے کے لئے مڑا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا۔

''مرشد علی، یہ زیادتی ہے۔''

''کیسی زیادتی؟'' وہ مڑا۔

''میں پریوں کے محل میں ہوں اور ابھی تک کسی پری سے محروم ہوں۔''

''مرشد علی نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ ''میں نہیں سمجھتا کہ تم اس قسم کے آدمی ہو۔''

''کیوں کیا میں آدمی نہیں ہوں یا مرد نہیں ہوں؟ میرے اندر بھی جذبات ہیں۔'' میں نے سادگی سے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ آج رات کوئی لڑکی بھیج دی جائے گی۔'' وہ پھر جانے کے لئے مڑا۔

''اس معاملے میں، مَیں ذرا انتخاب پسند ہوں۔ اپنی پسند کا انتخاب خود کروں گا۔''

مرشد علی ہنسا۔ ''بڑے نخرے ہیں تمہارے۔ چلو ایسا ہی سہی۔''

''مرشد علی کمرے سے نکل گیا۔ میں نے زہرہ سے ملاقات کے لئے یہ چکر چلایا تھا اور میں یہ جاننے کے لئے بے چین تھا کہ وہ عیاشی کے اس اڈے تک کیسے آئی۔ مرشد علی نے میری بات مان کر مجھے موقع دیا تھا کہ میں زہرہ سے مل سکوں۔ عین ممکن ہے مرشد علی زہرہ کے بارے میں سرے سے جانتا ہی نہ ہو۔ اسے صرف اتنا معلوم ہو کہ میں پہلوان اللہ رکھا کے ڈیرے سے اس کی بیوی سمیت فرار ہو گیا تھا۔ اس کا نام زہرہ تھا، یہ غیر اہم بات تھی۔ زہرہ شاید رانا خاندان کے توسط سے یہاں تک آئی تھی۔ جب تک ان کا دل نہیں بھرا اسے اپنے پاس رکھا اور پھر بوڑھی ہو جانے والی گائے کی طرح قصائیوں کے حوالے کر دیا۔ اگرچہ زہرہ کے لئے لفظ بوڑھی گائے کسی طور مناسب نہیں تھا۔ یہ تو واضح تھا وہ پچھلے کچھ عرصے میں بے پناہ جسمانی استحصال کا شکار رہی تھی۔ اس کے باوجود اس کے حسن و شباب کی تازگی اور دلکشی و رعنائی میں کوئی خاص فرق نہیں آیا۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے اسے دیکھا تھا، وہ پہلے کے مقابلے میں جسمانی طور پر زیادہ فٹ نظر آ رہی تھی۔ یہاں پر عورتوں کو فٹ رکھنے کے تمام انتظامات تھے کیونکہ ان کا حسن اور خاص طور سے جسمانی حسن ہی ان لوگوں کا اثاثہ تھا۔ وہ اس اثاثے کو برقرار رکھنے بلکہ پہلے سے بہتر بنانے کی کوشش کرتے ہوں گے۔ اس میں کمی ان کو کسی طور بھی گوارا نہیں تھی۔ اس کے لئے ان کی صحت کا پورا خیال رکھا جاتا تھا۔ ڈاکٹر اور فزیوتھراپسٹ تھے، ایکسر سائز کے تمام لوازمات تھے۔ تہہ خانے میں سوئمنگ پول تھا، عورتوں کی خوراک کے معاملے میں وہ لوگ محتاط تھے۔ ان کو سادہ اور غذائیت سے بھرپور خوراک دی جاتی تھی۔ ڈاکٹرز ان کا باقاعدگی سے معائنہ کرتے تھے اور ان کے ماہانہ ٹیسٹ لئے جاتے تھے کہ ان کو کوئی خطرناک یا متعدی بیماری تو نہیں ہے۔ یہ سب مجھے بعد میں معلوم ہوا تھا۔

میرے پاس گھڑی یا کوئی اور شے نہیں تھی جو میں اس قید خانے میں وقت کا اندازہ لگا سکتا۔ اس میں بس ایک دروازہ اور اس کے اوپر ایک چھوٹا سا روشندان تھا۔ یہ روشن دان بھی ایک گیلری میں کھلتا تھا، اس لئے دن رات کا پتا نہیں چلتا تھا۔ فرش پر سادہ قالین تھا اور اس پر موٹا سا اسپرنگ میٹرس تھا۔ اس پر چادر، تکیہ اور ایک عدد کمبل تھا۔ حوائج ضروریہ کے لئے مجھے باہر لے جایا گیا تھا۔ جبکہ دن میں دو بار مجھے دروازے کے نیچے ایک درز سے کھانے کی ٹرے اور پانی کی پلاسٹک بوتل دی گئی تھی۔ کھانے میں ایک بار بریانی تھی اور ایک بار نان کے ساتھ سیخ کباب تھے۔ کھانا دونوں بار ٹھنڈا اور تکلف سے عاری تھا۔ اس لئے میں نے بس پیٹ بھرنے اور توانائی برقرار رکھنے کے لئے کھا لیا تھا۔ پانی کی بوتل اس ہدایت کے ساتھ دی گئی تھی کہ اسے احتیاط سے استعمال کروں کیونکہ مجھے صرف صبح اور رات باتھ روم کے لئے لے جایا جائے گا۔ شاید شام کے وقت مجھے چائے دی گئی تھی کیونکہ اس کے دو گھنٹے بعد کھانا آ گیا تھا۔ وقت گزارے کے لئے اور پریشان کن سوچوں سے بچنے کے لئے میں ایکسر سائز کرتا رہا تھا۔

رات کے کھانے کے کوئی دو گھنٹے بعد جب میں باتھ روم کے دورے سے واپس آیا تھا ایک کرخت صورت اور گھٹے ہوئے مردانہ جسم کی حامل عورت اندر آئی، اس کی صورت میں وہ تمام خباثت اور مکروہ پن موجود تھا جو ایک منجی ہوئی نائکہ کی صورت میں پایا جاتا ہے مگر اپنے انداز سے وہ نائکہ کم اور جیلر زیادہ لگ رہی تھی۔ اس نے اندر آ کر خالص تھانیداروں کے انداز میں میرا معائنہ کیا اور استہزائیہ انداز میں بولی۔

''مرد تو لگتا ہے پر تجھے قید میں کیا سوجھی عورت کی؟''

''سوچا مرنے سے پہلے اس شجر ممنوعہ کو بھی چکھ لوں۔'' میں نے بے پروائی سے جواب دیا۔

''ڈھاڈا بندہ ہے۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ اس کے لہجے میں پوٹھوہار کی جھلک تھی۔ اس کی بغل میں ایک سیاہ چپٹا سا بکس دبا تھا، میرا خیال تھا وہ البم ہوگی۔ ''کون سی لڑکی چاہیے؟''

''یہ میں دیکھے بغیر کیسے بتا سکتا ہوں۔''

اس نے بغل سے بکس نکال کر میری طرف بڑھایا۔ ''یہ لیپ ٹاپ ہے۔ اسے استعمال کرنا آتا ہے تجھے؟'' میں حیران رہ گیا، وہ ڈبا واقعی بے حد مختصر سا لیپ ٹاپ کمپیوٹر تھا جسے آج کل نوٹ بک کہا جانے لگا ہے۔ میں نے اس کا ہک دبا کر اسے کھولا، ایک طرف اسکرین تھی اور دوسری طرف کی بورڈ اور ماؤس تھا۔ ''ساری لڑکیوں کی اس میں تصویریں ہیں۔'' وہ بولی۔ ''کپڑوں والی بھی اور بغیر کپڑوں کے بھی، آرام سے دیکھ، میں آدھے گھنٹے بعد آؤں گی۔''

اس کے جانے کے بعد میں نے کمپیوٹر آن کیا۔ یہ لوگ اپنے اس مکروہ دھندے میں جدید ترین آلات سے کام لے رہے تھے۔ ایک البم میں کتنی تصویریں آ سکتی ہیں۔ سو ڈیڑھ سو، جبکہ اس نوٹ بک میں ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں تصاویر آ سکتی ہیں۔ ونڈو آن ہونے میں چند سیکنڈ لگے تھے۔ سامنے ڈیسک ٹاپ پر ایک فولڈ بنا تھا جس پر فوٹوز لکھا تھا۔ میں نے اسے کھولا، اس میں تقریباً سات آٹھ سو تصاویر تھیں، میں نے پہلی تصویر کھولی۔ یہ ایک کمسن تھائی لڑکی کی تصویر یا وہ کمسن لگ رہی تھی۔ پہلی لباس والی تصویر کے بعد اس کا لباس کم ہوتے ہوتے آخری تصویر میں بالکل ہی غائب ہو گیا تھا۔ تصویریں ایک سافٹ ویئر کے ذریعے کھل رہی تھیں۔ میں نے تصویریں خود بخود بدلنے والا بٹن دبا دیا جو چند سیکنڈ بعد تصویر تبدیل کر دیا کرتا تھا۔

پہلی تیس پینتیس لڑکیاں غیر ملکی تھیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ زہرہ کی تصویریں اس انبار میں کہاں تھیں۔ کیونکہ تصویروں پر صرف نمبر دیئے ہوئے تھے، کوئی نام نہیں تھا پھر مقامی لڑکیاں شروع ہوئیں۔ یہ تصویریں دیکھنا صبر آزما مرحلہ تھا۔ میں نیکی اور پارسائی کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ ایک انسان ہوں مگر یہ تصویریں دیکھ کر میرے جذبات میں ابال آنے کے بجائے مجھے گھن کا احساس ہو رہا تھا اور میں بہ مجبوری و کراہت یہ سب دیکھ رہا تھا۔ جسے انسانیت کی لاش کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ میری خواہش تھی کہ جلد از جلد زہرہ کی تصویر آئے اور یہ عذاب ختم ہو۔ خدا خدا کر کے اس کی پہلی تصویر آئی جس میں اس نے سلیقے سے کرتہ پاجامہ اور چنری کا دوپٹا لے رکھا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگلی تصاویر کیسی ہوں گی اس لئے میں نے اس اولین تصویر پر تصویروں کے سائیکل سسٹم کو روک دیا۔

اب مجھے اس ناگہانی جیلر عورت کا انتظار تھا، ایسا لگ رہا تھا یہاں وہ عورتوں کی انچارج تھی۔ چند منٹ

بعد وہ آ گئی۔ ''دیکھ لی کڑی؟''

میں نے لیپ ٹاپ اس کی طرف گھما دیا۔ ''مجھے یہ پسند آئی ہے۔''

اس نے غور سے دیکھا۔ ''یہ بک ہے۔ دو دن سے ساہیوال سے ایک چودھری صاحب آئے ہیں۔ آج رات بھی یہ ان کے پاس رہے گی۔''

''مجھے تو یہی پسند آئی ہے، جب فارغ ہو تو میرے پاس بھیج دینا۔''

وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی اور اس کے پان زدہ دانت نمایاں نظر آنے لگے تھے۔ ''لگتا ہے تجھے زیادہ ہی پسند آ گئی ہے یہ۔''

''تم جیسا سمجھ لو، اسے لا سکتی ہو تو ٹھیک ہے۔''

''لانا تو پڑے گا پیر بادشاہ کا جو حکم ہے۔'' وہ خود سے بات کرنے کے انداز میں بولی اور نوٹ بک لے کر کمرے سے نکل گئی۔ اس کے نوٹ بک لانے سے مجھے کوئی اور فائدہ ہوا ہو یا نہ ہو، وقت کا پتا چل گیا تھا رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ تو زہرہ کسی چودھری صاحب کے پاس تھی۔ مجھے وہ عظیم الجثہ توندوالا دھوتی پوش یاد آیا جو خوفناک آواز میں خراٹے لے رہا تھا۔ غالباً وہی ساہیوال کے چودھری صاحب تھے۔ مجھے افسوس ہوا، زہرہ پہلوان کے علاج کے لئے اس بدبودار دلدل میں اتری تھی اور اترتے ہوئے یہ بھول گئی تھی کہ دلدل میں ایک بار جا کر اس سے باہر نکلنا آسان نہیں ہوتا ہے۔ ساتھ ہی مجھے خوشی بھی ہوئی کہ بے شک اس جگہ ہی سہی وہ زندہ تو تھی ورنہ خادم حسین کے قتل کی خبر پڑھ کر مجھے اس کے بارے میں کوئی اچھی امید نہیں رہی تھی۔

میں بستر پر دراز ہو گیا تھا۔ زہرہ سے کل سے پہلے ملاقات ممکن نہیں تھی۔ مجھے اتنا اطمینان تھا کہ وہ مجھے اچانک نہیں ماریں گے۔ ڈیوڈ شا کے لئے میں پہلے بھی اہم تھا لیکن ہیروں کی وجہ سے اب مرشد علی بھی مجبور تھا کہ مجھے زندہ رکھے۔ یہ ہیرے ایک ایسی ہڈی بن گئے کہ کئی کتوں کی رال ان پر ٹپک رہی تھی۔ میں نے برسوں پہلے اس وادی سے زندہ سلامت نکل آنے کے بعد کبھی ان ہیروں کے بارے میں نہیں سوچا تھا جو آج میری سلامتی کے ضامن بن رہے تھے۔ گزشتہ کئی مہینے سے بے سکون اور پُر خوف زندگی گزارنے کے بعد آج میں دشمن کی قید میں ہونے کے باوجود کس قدر مطمئن تھا۔ میرے پیارے اس کی پہنچ سے دور تھے اور میں اس کے قبضے میں ہونے کے باوجود ابھی تک زندہ سلامت تھا۔ اس قادر مطلق نے چند بے جان پتھروں کو میرے لئے وجہ سلامتی بنا دیا جن میں اجزائے ترکیبی کے لحاظ سے کوئلے سے کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کوئلے جیسی بے وقعت شے جب زیرِ زمین اونچے درجۂ حرارت پر بے پناہ دباؤ برداشت کرتی ہے تو یہ ہیرے میں بدل جاتی ہے۔ زمین پر کوئلہ بے شمار اور بے حساب ہے لیکن اس میں سے ہیرا بننا کسی کسی کے مقدر میں ہوتا ہے۔ مجھے صبح آٹھ بجے اٹھایا گیا تھا اور منہ ہاتھ دھونے یا باتھ روم جانے کی اجازت دیئے بغیر لے جا کر ڈیوڈ شا کے سامنے پیش کر دیا تھا۔ اس نے بہترین قسم کا سوٹ زیب تن کر رکھا تھا اور بظاہر کہیں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔

''شہباز...... میں چند دن کے لئے جا رہا ہوں۔ اس دوران میں تم اچھی طرح سوچ لو۔ مجھے ہر قیمت پر وہ ہیرے درکار ہیں۔''

''میں بتا چکا ہوں مجھے ٹھوس ضمانت چاہئے۔ اس کے بعد میں ہیروں تک تمہاری رہنمائی کروں گا۔''

''اس پر آ کے بات کریں گے۔'' ڈیوڈ شا نے خشک لہجے میں کہا۔ ''میں نے تمہیں یہ کہنے کے لئے بلایا ہے کہ ہیروں کا ذکر کسی اور سے نہیں کرنا ہے۔''

میں مسکرایا۔ ''مثلاً کس سے؟''

''کسی سے بھی نہیں۔''

میں اس بار ہنسا۔ ''ڈیوڈ شا، تم مرشد علی کے آقا ہو لیکن لگتا ہے تم اس پر مکمل طور پر اعتماد نہیں کرتے ہو۔ ویسے بائی دی وے، تمہارے جانے کے بعد میں اس کے رحم و کرم پر ہوں گا اگر اس نے مجھ سے بہ زور کچھ منوانا چاہا تو میں اتنا ہی بے بس ہوں گا جتنا کہ تمہارے سامنے ہوں۔''

''تم بے فکر رہو، ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔ میری واپسی تک تم اسی جگہ اور صحیح سلامت رہو گے۔''

''تم اپنے بارے میں نہیں کہہ سکتے کہ زندہ سلامت یہاں واپس آ ؤ گے میرے بارے میں ایسا خدائی دعویٰ کیسے کر سکتے ہو؟''

''پلیز لیکچر مت شروع کر دیا کرو۔ میں نے عام معنوں میں کہا ہے۔'' وہ بیزاری سے بولا۔ ''یہ بتاؤ، راجا عمر دراز انڈیا کیوں جا رہا ہے؟''

اس نے اچانک سوال کر کے مجھے گڑبڑانا چاہا تھا مگر میں پُرسکون رہا۔ ''یہ بات تم اس سے پوچھو۔ میں اس بارے میں قطعی بے خبر ہوں۔''

اس نے غور سے دیکھا۔ ''میرا خیال ہے تم اس بارے میں کچھ نہ کچھ جانتے ہو۔''

''تم میری بات پر یقین نہیں کرنا چاہتے ہو تو تمہاری مرضی۔'' میں نے شانے اچکائے۔

ڈیوڈ شا میرے نزدیک آیا اور اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ ''شہباز، مرشد علی کی رسائی دبئی تک نہیں ہے لیکن میری ہے۔''

میرے اندر سرد سی لہر دوڑ گئی تھی۔ ''ڈیوڈ شا تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟''

''ہیروں کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہئے۔'' اس نے میرا سوال نظر انداز کر کے کہا۔ ''بس یہ بات یاد رکھنا کہ سفیر اور مونا میری دسترس سے باہر نہیں ہیں۔''

''تم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔'' میں نے کہا لیکن اپنے لہجے کا کھوکھلا پن خود مجھ پر واضح تھا۔

وہ ہنسا اور اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے چند تصویریں نکال کر میری طرف بڑھائیں۔ یہ ایک اپارٹمنٹ کا منظر تھا اس کی بالکونی اور کھڑکیوں میں مونا اور سفیر نظر آ رہے تھے۔ یہ چار تصویریں تھیں۔ ''یہ تصویریں ٹیلی لینس کیمرے کی مدد سے اتاری گئی ہیں۔ کیا یہ لینس کسی رائفل پر نہیں ہو سکتا تھا۔ ان میں سے کوئی بھی مارا جائے تو تمہارا کیا نقصان ہوگا اس کا حساب کتاب بھی کر لینا۔'' وہ یک دم پلٹا اور کمرے سے نکل گیا۔ میں تصویریں دیکھ رہا تھا۔ میرے ساتھ آنے والے دونوں نگرانوں میں سے ایک نے اچانک مجھ سے تصویریں چھین کر آتش دان میں ڈال دیں۔ ''یہ کیا کیا؟'' میں مشتعل ہو کر اس کی طرف بڑھا تھا۔ ''حرامزادے۔''

''خبردار......'' دوسرے نگران نے رائفل میری طرف کر لی تھی۔

میں نے رک کر اپنے اشتعال کو قابو میں کیا۔ ان سے الجھنے کا فائدہ نہیں، نقصان تھا۔ وہ مجھے گولی مار سکتے

ے اور رائفل کے بٹ سے میرا سر پھاڑ سکتے تھے۔ تصویروں کے بارے میں ڈیوڈ شا نے پہلے ہی ان کو سمجھا دیا ہو گا کہ اس کے جانے کے بعد کیا کرنا ہے۔ میں نے گہری سانس لی۔ ''میں نے ناشتا نہیں کیا ہے اور نہار منہ قتل کے موڈ میں نہیں ہوں۔ اس لئے مجھے لے چلو۔''

قید خانے میں جانے سے پہلے انہوں نے مجھے باتھ روم جانے کی اجازت دی۔ ناشتا کمرے میں میرا منتظر تھا۔ میں ناشتے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ ناٹا نما جیلر عورت آ گئی۔ ''چلو ملک صاحب۔''

''کہاں......اور کیوں؟''

''کل خود ہی تو لڑکی کی فرمائش کی تھی اور اب پوچھ رہے ہو کیوں؟''

''مجھے اس کے پاس جانا ہوگا؟''

''تو کیا وہ اس کباڑ خانے میں آئے گی۔''

''چلو اور اپنا نام تو بتا دو۔''

''شمشاد۔'' اس نے جواب دیا۔ نام بھی مردانہ تھا۔ ''ایک بات کا خیال رکھنا۔ فرار کا خیال بھی مت لانا، دو تین دروازوں سے آگے نہیں جا سکو گے اور باہر چار عدد خطرناک کتے ہیں، تمہیں روکیں گے نہیں چیر پھاڑ کر رکھ دیں گے۔''

''میں ڈر گیا۔'' میں نے اداکاری کی۔ ''ویسے میرا ارادہ فوت ہونے کا ہرگز نہیں ہے۔''

''بندہ بعض اوقات ارادہ نہ ہوتے ہوئے بھی فوت ہونے والی حرکت کر جاتا ہے۔''

''اگر تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے تو اپنے حفاظتی انتظامات پر تو ہوگا۔''

''تمہیں اس کے بارے میں ہی خبردار کر رہی ہوں۔ چنگے گبرو جوان ہو، کسی بے وقوفی میں مارے گئے تو مجھے بہت افسوس ہوگا۔''

''تشویش کا شکریہ۔'' میں نے رکھائی سے کہا۔ ''وہ لڑکی کہاں ہے؟''

''بس ہم آ گئے۔'' شمشاد نے ایک دروازے کے سامنے رکتے ہوئے کہا۔ ''مگر تمہیں یہاں سے باہر جانے کی اجازت نہیں ہوگی۔ ایک نگران باہر رہے گا۔''

یہ وہی شخص تھا جو میرے قید خانے کے باہر موجود تھا۔ میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ زہرہ ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ یہ ڈسکوری چینل تھا جس پر شیروں کے متعلق ایک ڈاکومنٹری فلم دکھائی جا رہی تھی۔ ''کون ہے؟'' اس نے بوجھل لہجے میں کہا۔ میں خاموشی سے دروازے کے پاس کھڑا رہا تھا۔ آخر اس نے سر گھما کر دیکھا اور مجھے دیکھ کر چونکی۔ ''تم......؟''

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ سمجھ گئی تھی۔ اس نے سنبھل کر بات بدل دی۔ ''تم......کون ہو؟''

میں آگے بڑھا۔ ''اس جگہ آنے والے لوگ کون ہوتے ہیں؟''

''تو تم بھی گاہک ہو۔'' اس نے بیزاری سے کہا۔ ''آج میری چھٹی کا دن ہے۔''

''میں نے تمہارا انتخاب کیا ہے، کیا تم انکار کر رہی ہو۔''

''نہیں، اوور ٹائم بھی ہوتا ہے۔'' وہ ہنسی۔ ''ہمیں یہاں انکار کرنے کے لئے نہیں رکھا گیا ہے۔''

''گڈ۔'' میں اس کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

''تم نے میرا ہی انتخاب کیوں کیا؟''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' میں نے شانے اچکائے۔ ''آدمی کسی کے بارے میں یقین سے کیسے کہہ سکتا ہے کہ وہ اسے کیوں اچھا لگ رہی یا رہا ہے۔''

''ہاں یہ تو ہے مگر تمہارا آنے کا وقت عجیب سا نہیں ہے۔ ہمارے گاہک عام طور سے شام کو یا رات کو آتے ہیں۔''

''اس بارے میں، مَیں کیا کہہ سکتا ہوں۔ لانے والے مجھے اس وقت لائے ہیں۔''

''لانے والے۔'' وہ چونکی۔

''میں قیدی ہوں یہاں، ممکن ہے کل تک مجھے گولی مار کر اس حویلی میں کہیں دفن کر دیا جائے، ممکن ہے یہ کام آج رات کر دیا جائے۔ اس وجہ سے مجھے صبح کے وقت یہاں لایا گیا ہے۔ ویسے تمہارا انتخاب میں نے کل رات کیا تھا اور مجھے بتایا گیا تھا کہ تم کسی چودھری کے لئے ریزرو ہو۔''

''وہ......'' زہرہ مسکرائی۔ ''بے چارہ بہت شریف اور سیدھا آدمی تھا۔ ایسے لوگ ہمیں کم ہی ملتے ہیں۔ اس نے مجھے انسان سمجھا تھا۔''

''حیرت ہے، یہ پیشہ اختیار کرنے کے بعد بھی تم لوگوں سے انسانیت کی توقع رکھتی ہو۔''

''ہاں کیونکہ میں بھی انسان ہوں۔''

''بی بی، تم ایک بے حد مہنگی شے ہو۔'' میں نے تلخی سے کہا۔ ''جب تم لوگوں سے منہ مانگی قیمت وصول کرتی ہو تو کیا تم ان کی خواہشات پوری کرنے سے انکار کر سکتی ہو؟''

''نہیں۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''پھر ان سے انسانیت کی توقع کیوں کرتی ہو؟''

''کیا تم مجھے درس دینے آئے ہو؟''

میں ہنسا۔ ''تم صبح سے دوسری فرد ہو جس نے میرے لیکچر سے بے زاری کا اظہار کیا ہے۔'' میں نے کہا اور ہاتھ کے اشارے سے اس کے کچھ لکھنے کو مانگا۔ وہ سمجھ گئی۔

''ہاں اس جگہ لیکچر کا کیا کام ہے۔ اپنا کام کرو اور جاؤ۔'' اس نے اٹھ کر ایک دراز سے کاغذ کا پیڈ اور پین نکال کر دیا۔ میں نے اس سے پین اور کاغذ لیا۔

''زہرہ تم یہاں کیسے آئیں؟'' میں نے لکھا اور منہ سے بولا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

''یہ لمبی کہانی ہے۔'' اس نے لکھا اور بولی۔ ''نام میں کیا رکھا ہے میں بس ایک عورت ہوں۔''

''لمبی نہ سہی تم مختصراً بتا سکتی ہو۔'' میں نے لکھا اور کہا۔ ''پھر بھی کوئی نام تو ہوگا۔''

''میں رانا کے آدمیوں کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔ تم سوچ سکتے ہو میرا کیا حشر ہوا ہوگا۔ بس یوں سمجھ لو کہ مجھے مرنے نہیں دیا تھا ورنہ کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی۔'' اس نے لکھا اور بولی۔ ''میرے ماں باپ نے زہرہ نگار رکھا تھا۔

اب یہاں سب روپ کہتے ہیں۔"

"مجھے تو اندیشہ تھا، تمہیں بھی خادم حسین کے ساتھ مار دیا گیا ہوگا۔" میں نے لکھا اور کہا۔"روپ واقعی تم پر جچتا ہے۔"

"وہ بے چارہ میری خاطر جان سے گیا اس نے ان لوگوں کو بتانے سے انکار کر دیا تھا کہ میں کہاں ہوں اور ان لوگوں نے اسے مار دیا۔ اس کی قربانی رائیگاں گئی تھی۔ انہوں نے فوراً مجھے تلاش کر لیا تھا۔ میں جن کے گھر میں تھی ان کو دھمکی دی تھی کہ میرے یا ان کے بارے میں پولیس کو بتایا تو وہ پھر آجائیں گے اور پورے خاندان کو ذبح کر جائیں گے۔"

"وہ غریب لوگ تھے ڈر گئے، تبھی تمہارے بارے میں اخبار میں کچھ نہیں آیا تھا۔ خادم حسین کے بارے میں، میں نے اخبار میں پڑھ لیا تھا۔"

اس بار زہرہ نے زبان سے کہا۔"میں چینج کر لوں، تمہیں کیسا لباس پسند ہے یا پسند نہیں ہے؟"

"اسی میں اچھی لگ رہی ہو۔" میں نے جواب دیا اور اسے ٹی وی کی آواز تیز کرنے کو کہا۔"یہ کیا بکواس لگا رکھی ہے کوئی راگ رنگ والا چینل لگاؤ۔"

اس نے وی چینل لگا دیا اور آواز تیز کر دی۔"میرے ہوتے ہوئے اس راگ رنگ کی کیا ضرورت ہے؟"

میں نے لکھا۔"کیا یہاں مائیک لگے ہیں۔"

"مجھے پکا نہیں پتا ہے لیکن شبہ ہے ان کمروں میں ہونے والی باتیں کہیں سنی جاتی ہیں۔"

مجھے فوراً ہی ایک اندیشہ لاحق ہو گیا تھا۔"یہاں کیمرے تو نہیں ہیں؟"

"میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

میں نے گہری سانس لی۔"اگر کیمرے تھے تو ان لوگوں نے دیکھ لیا ہوگا کہ ہم لکھ کر بات کر رہے ہیں، اس لئے جو ہوتا ہے وہ تو ہوگا۔"

"ان لوگوں نے تمہیں کیوں پکڑا ہے؟"

"یہ بھی لمبی داستان ہے۔ اسے مختصر یوں سمجھو کہ یہ وہی دشمن ہیں۔ رانا فیملی ان کی ایجنٹ تھی اور انہوں نے مجھے رانا کے حوالے کیا تھا جس نے مجھے پہلوان کے پاس رکھوا دیا تھا۔"

زہرہ چونکی تھی۔"سچ مچ۔" اس نے لکھا تو میں نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ اس نے اچانک پوچھا۔ "تمہیں رقص کرنا آتا ہے؟"

"معمولی سا۔" میں نے اس کا اشارہ دیکھ کر اقرار کیا۔

"آؤ میں تمہیں سکھاتی ہوں۔" اس نے ٹی وی بند کر کے سی ڈی پلیئر پر ایک سی ڈی لگائی اور اسپیکر کا والیوم ذرا اونچا کر دیا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ اپنی بانہیں میرے گلے کے گرد حائل کر دیں اور میرے کان میں سرگوشی کی۔"معاف کرنا، بات کرنے کو یہی ایک ترکیب سمجھ میں آئی ہے۔"

اس نے ریشمی گاؤن پہن رکھا تھا جو اس کے ریشمی وجود پر سرسرا رہا تھا۔ اس کا قد مجھ سے تین چار انچ کم

تھا اسے منہ میرے کان تک لانے کے لئے مجھ سے لگ کر اچکنا پڑتا تھا اور یہ خاصا صبر آزما مرحلہ ہوتا تھا۔
''کیا ہم شرافت سے بیٹھ کر بات نہیں کر سکتے؟'' میں نے اس کے کان میں جوابی سرگوشی کی۔
''اگر تمہاری کیمرے والی بات درست ہوئی تو ہم مشکوک ہو جائیں گے۔'' وہ بولی اور شرارت سے مسکرا دی۔ ''میں اتنی بری تو نہیں ہوں۔''
''ہاں...... مگر وہ...... میں...... خیر ایسے بھی ٹھیک ہے۔'' میں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ ''پہلے تم اپنی رُوداد سناؤ۔''
''کیا سناؤں۔ اپنی بے آبروئی کی داستان۔'' اس نے تلخی سے کہا۔ ''رانا خاندان کے کتے سارا دن مجھے برہنہ گاؤں میں گھماتے تھے اور رات کو یہی کتے مجھے جھنجھوڑتے تھے۔ تین دن تک میرے ساتھ یہی تماشا ہوا تھا پھر اس کی بھنک کسی اخبار کو مل گئی۔ اس کے بندے آئے تو مجھے فوراً وہاں سے غائب کر دیا گیا۔ رانا خاندان نے مجھے شکر گڑھ میں اپنے ڈیرے پر پہنچا دیا۔ یقین کرو ایک دن اور یہ رسوا کن تماشا جاری رہتا تو میں زندہ نہ رہتی مر جاتی۔''
''شکر گڑھ سے تم یہاں کیسے آئیں؟''
''شاہ نواز کچھ انڈین لڑکیوں کا سودا کر کے ان کو لا رہا تھا۔ راستے میں وہ رانا خاندان کے ڈیرے پر رکا تھا اور وہاں اس نے مجھے دیکھا تھا اور رانا خاندان سے میرا سودا بھی کر لیا۔''
''اس نے تمہیں خرید لیا؟''
''ہاں اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ بردہ فروشی کا یہ کاروبار آج بھی چھپ کر مگر زوروں سے جاری ہے۔ شاہ نواز نے میرے بدلے ان کو پانچ لاکھ روپے دیئے۔ جبکہ وہ ان تین انڈین لڑکیوں کو چار لاکھ میں خرید کر لا رہا تھا۔''
''وہ تمہارا پاسنگ بھی نہیں ہوں گی۔''
''تعریف کا شکریہ مگر یہ حسن میرے لئے وبال بن گیا ہے۔ میرا بس چلے تو اسے برباد کر دوں۔''
''قصور حسن کا نہیں ہے، لوگوں کی ذہنیت کا ہے۔''
''تم نے اپنے بارے میں نہیں بتایا۔''
''یہ میرے دشمن ہیں۔ شاہ نواز کا آقا مرشد علی میرے خون کا پیاسا ہے۔''
''مرشد علی...... یہ جگہ اب اس کی ہے؟'' وہ حیران ہوئی تھی۔
''ہاں اب مرشد علی جامی شاہ کی جگہ لے چکا ہے۔''
''تب اس نے تمہیں زندہ کیوں چھوڑا ہے؟''
''مرشد علی کا بھی ایک آقا ہے اور وہ اپنے مفادات کے لئے میری زندگی کا خواہاں ہے اصل بات یہ ہے کہ ابھی خدا کو میری زندگی منظور ہے۔''
''تم یہاں سے نکل نہیں سکتے۔ یہاں بہت سخت پہرا ہوتا ہے۔ حویلی کے باہر باغ میں ہر وقت رکھوالی کے کتے ہوتے ہیں۔ یہ کسی کو اندر آنے یا باہر جانے نہیں دیتے حد یہ کہ کتے شاہ نواز کو بھی نہیں پہچانتے۔ صرف

اس کے رکھوالے ہی ان کو قابو کر سکتے ہیں۔ چار دیواری اور باہر گیٹ پر چار پہریدار ہوتے ہیں۔''

''یہ سب مجھے معلوم ہے۔ بلکہ مجھے یہ بھی معلوم ہے دو دن پہلے یعنی پرسوں رات جامی شاہ نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ حویلی پر حملہ کیا تھا مگر اس حملے میں وہ خود مارا گیا۔ چالیس سے زیادہ لاشیں گری تھیں۔''

''پرسوں رات کو ہم سب کو تہہ خانے میں پہنچا دیا گیا تھا۔''

''یہ کام تم لوگوں کو بے خبر رکھنے کے لئے کیا گیا ہوگا۔ اب تک مارا ماری کے سارے آثار مٹا دیئے گئے ہوں گے اور ٹوٹے گیٹ کی مرمت بھی کی جا چکی ہوگی۔''

''گیٹ ٹوٹ گیا تھا۔''

''غائب ہو گیا تھا اس پر راکٹ مارا گیا تھا۔ حملہ اتنے زور و شور سے ہوا تھا کہ مجھے امید تھی شاہ نواز اور مرشد علی آج بچ نہیں پائیں گے مگر جیسے ہی وہ اندر آئے بازی الٹ گئی۔ شاہ نواز کے آدمیوں نے پہلے گیس کے بم مارے اور پھر ان پر مشین گنوں سے فائرنگ کی گئی۔ ان میں شاید ہی کوئی بچا ہو۔''

''شہباز جب ان لوگوں نے ہمیں تہہ خانے میں پہنچایا تھا تو وہاں میں نے ایک عجیب چیز دیکھی تھی، تہہ خانے کے نیچے ایک تہہ خانہ اور ہے۔''

میں چونکا۔ ''تم نے کیسے دیکھ لیا۔''

''سوئمنگ پول کے ایک طرف کچھ کمرے ہیں یہاں مساج اور دوسری تھراپیاں کی جاتی ہیں۔ وہاں ہمارے جانے پر پابندی نہیں ہے۔ میں تھکی ہوئی تھی اس لئے ایک کمرے کی طرف چلی گئی اور وہاں مساج والی میز پر لیٹ گئی۔ اسی لمحے باہر سے شور ہوا۔ کوئی کرخت لہجے میں عورتوں کو ان کمروں سے دور جانے کو کہہ رہا تھا پھر ان لوگوں نے گندی گالیاں دینا شروع کر دیں۔ میں ڈر گئی تھی، جلدی سے میز کے نیچے گھس گئی، چاروں طرف چادریں لٹک رہی تھیں، فوراً ہی دو آدمی اندر آ گئے انہوں نے اندر سے دروازہ بند کیا پھر ایک نے سوئچ بورڈ کے بٹنوں کو دبایا۔''

''تم دیکھ رہی تھیں؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے سر ہلایا۔ ''ہاں خوف پر تجسس غالب آ گیا تھا۔ میں لٹکتی چادر اٹھا کر دیکھ رہی تھی۔ جیسے ہی اس شخص نے بٹن دبائے ایک طرف دیوار میں خلا نمودار ہوا تھا۔ مجھے سیڑھیاں نیچے جاتی دکھائی دیں۔ وہ دونوں ان سے نیچے اتر گئے، میں کچھ دیر تو دبکی رہی تھی۔''

''پھر تم نے نیچے جانے کا فیصلہ کیا؟'' میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

''ہاں میرے پیٹ میں سخت مروڑ اٹھ رہی تھی۔ اصولاً تو مجھے فوراً وہاں سے نکل جانا چاہیے تھا لیکن اس کے بجائے میں نے سیڑھیوں کا رخ کیا۔ سیڑھیوں کے دونوں جانب دیوار تھی اور نیچے جہاں یہ ختم ہو رہی تھیں خلا دکھائی دے رہا تھا۔ میں ڈرتے ڈرتے سیڑھیاں اترنے لگی۔ سیڑھیاں کم سے کم بیس فٹ تک نیچے گئی تھیں۔ میں نے آخری سیڑھی پر قدم رکھا تو مجھے دروازے کے دوسری جانب ایک بڑا سا ہال دکھائی دیا تھا۔ کم سے کم بھی سو فٹ لمبا اور اتنا ہی چوڑا تھا اور اس میں لکڑی کی پیٹیاں رکھی تھیں۔ یہ پیٹیاں زمین سے کوئی دس بارہ فٹ تک اونچی تھیں۔ درمیان میں راستے تھے، مجھے ان دونوں کے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔'' ارے مشین گن

سنبھال، اس کا باکس اِدھر دے۔ یہ ڈبا بھی اٹھا۔ احتیاط سے، اس میں گیس کے بم ہیں، گر گیا تو دو منٹ میں اد
لمبے پڑے ہوں گے۔"

"ان پیٹیوں میں اسلحہ تھا؟" میں نے غور کیا۔

"ایسا ہی لگ رہا تھا۔" وہ بولی۔ "جیسے ہی وہ سیڑھیوں کی طرف آنے لگے میں اوپر لپکی اور جلدی سے م
کے نیچے گھس گئی، میں بال بال بچی تھی۔ کیونکہ جیسے ہی میں کمرے میں آئی وہ نیچے سیڑھیوں پر نمودار ہوئے تھے
خوش قسمتی سے ان کی ساری توجہ اٹھائے ہوئے سامان پر تھی ورنہ وہ میری ایک جھلک تو دیکھ ہی لیتے۔ میں
دھڑکتے دل کے ساتھ میز تلے لیٹی ہوئی تھی۔ انہوں نے مشین گنیں، ایمونیشن بکس اور بموں والے بکس میز
رکھے اور نیچے مزید سامان لینے چلے گئے تھے۔"

"تم نے میز کے نیچے سے نکل کر سامان کا معائنہ کیا ہوگا۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا؟" اس نے حیرت سے کہا۔ "ہاں ان کے جاتے ہی میں میز کے نیچے سے نکل آ
تھی۔ میز پر دو عدد ایل ایم جی اور ان کے ایمونیشن باکس رکھے تھے۔ ایک باکس الگ سے تھا جس میں گیس کے
بم تھے۔"

"تمہیں اسلحے کی پہچان ہے؟"

اس نے سر ہلایا۔ "میں پہلوان اللہ رکھا کی بیوی تھی، اس کے ڈیرے پر ہر قسم کا اسلحہ آتا تھا۔ مجھے پستول
اور رائفل بھی چلانی آتی ہے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے، یہ لوگ اسلحے کی تجارت بھی کرتے ہیں؟"

"اتنا اسلحہ ذاتی استعمال کے لئے کون رکھتا ہے؟" اس نے مجھ سے سوال کیا۔

"کوئی بھی نہیں۔ سوال یہ ہے کہ اسلحہ آتا کہاں سے ہے اور کہاں جاتا ہے۔"

"جہاں بنتا ہے وہاں سے آتا ہے اور جہاں اس کی مانگ ہے وہاں جاتا ہے۔" اس نے سادگی سے کہا۔

میں نے غور کیا اس جگہ سے بھارتی سرحد بیس بائیس میل کے فاصلے پر تھی ممکن ہے یہ اسلحہ بھارت سے
اسمگل ہو کر آتا تھا اور ملک میں سرگرم تخریبی تنظیموں اور دہشت گردوں کو مہیا کیا جاتا تھا جو اپنی سرگرمیوں سے اس
ملک کی جڑیں کھوکھلی کر رہے تھے۔ گویا شاہ نواز اور جامی شاہ محض عورتوں کے دلال نہیں تھے بلکہ اسلحے سے وطن
فروشی میں بھی ملوث تھے۔ یہ انکشاف ضرور تھا مگر غیر متوقع نہیں، ذاتی مفاد کے لئے یہ ہر کام کر سکتے تھے۔ میں
نے اس سے پوچھا۔ "زہرہ...... تم نے کبھی یہاں سے نکلنے کے بارے میں نہیں سوچا؟"

اس نے مجھے دیکھا۔ "اس طرح سے نہیں جس طرح سے تم سوچ رہے ہو۔ میں نے مرنے کے بارے
میں سوچا تھا یہاں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہر دوسرے تیسرے مہینے کوئی نہ کوئی عورت خود کشی کر لیتی ہے۔"

"اس کی لاش کا کیا کرتے ہیں یہ لوگ؟"

وہ تلخ انداز میں مسکرائی۔ "کیا کر سکتے ہیں۔ اسے خاموشی سے حویلی کے کسی گوشے میں دفنا دیا جاتا ہے۔
میرے آنے کے بعد سے تین عورتیں خود کشی کر چکی ہیں اور ایک کو ایک گاہک نے مار دیا تھا۔ ان سب کو حویلی میں
دفنا دیا گیا ہے۔"

''جسے گاہک نے مارا تھا اس گاہک کا کیا ہوا؟''

''اس سے بھاری ہرجانہ لے لیا گیا۔ وہ اونچی پارٹی تھی، اس کے خلاف کارروائی نہیں کی جاسکتی تھی اور پھر بھی اس کا جرم اتنا سنگین نہیں تھا۔ ایک طوائف کو ہی قتل کیا تھا کوئی انسان نہیں مارا تھا۔''

زہرہ شروع میں جتنی کول مائنڈ رہی تھی، آہستہ آہستہ اتنی ہی جذباتی ہوتی جا رہی تھی۔ وہ جبر کے ساتھ یہاں رہ رہی تھی۔ اس کے اندر جذبات تھے مگر وہ کس کے سامنے یہ جذبات ظاہر کرتی۔ ان گاہکوں کے سامنے جنہیں صرف اس کے حسن و شباب سے دلچسپی تھی اور وہ ان کی رام کہانی سننے نہیں آتے اور دوسرے ان کے نگران تھے جن کے سینے میں دل کی جگہ تجوریاں تھیں اور وہ ان عورتوں کو اپنی تجوریاں بھرنے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ وہ ان کے دکھ اور درد کو کہاں سے سمجھتے۔ زہرہ کو طویل عرصے بعد میری صورت میں ایک ہمدرد ملا تھا اس لئے وہ میرے سامنے جذباتی ہو رہی تھی۔ اس نے میرے شانے پر سر رکھ لیا تھا۔ اچانک مجھے نمی محسوس ہوئی تھی۔ میں نے اس کا سر اوپر کیا وہ رو رہی تھی۔ ''کاش کہ مجھے موت آجائے۔ اب اس دنیا میں میرے لئے کیا رکھا ہے۔''

''یہ تم سوچ رہی ہو، اس خالق نے تمہارے لئے کیا سوچا ہے یہ تمہیں نہیں معلوم اور بائی دی وے جب تم موت کی خواہاں ہو اور خودکشی پر بھی غور کر چکی ہو۔ تمہیں خیال نہیں آیا کہ حویلی کے نیچے اسلحے کا جو ذخیرہ ہے اسے اڑا دو۔''

''خیال آیا تھا مگر میں اتنی جانوں کا بار خود پر لے کر نہیں مرنا چاہتی تھی۔ یہاں تیس چالیس انسان نما درندے ہیں تو سو سے زیادہ وہ مظلوم اور بے بس عورتیں بھی ہیں جو پہلے ہی ظلم کا شکار ہیں، میں ان کو کیسے مار دیتی۔''

''تم نے تہہ خانہ کھولنے کا طریقہ دیکھا تھا؟''

''کسی حد تک۔ انہوں نے تین بٹن دبائے تھے۔ آخر کے دو بٹن مجھے یاد ہیں۔ پہلے بٹن کے بارے میں، میں یقین سے نہیں کہہ سکتی ہوں مگر ہم معلوم کر سکتے ہیں۔''

''زہرہ...... اگر تم راضی ہو تو ہم یہاں سے نکل سکتے ہیں۔''

''کیسے؟'' اس نے کہا۔

اس گفتگو کے دوران ہم نے کچھ زیادہ ہی رقص کر لیا تھا اور نصف گھنٹے سے زیادہ وقت گزر چکا تھا، میں نے ریکارڈ تبدیل کیا اور ایک پاپ میوزک کی سی ڈی لگا دی جس میں ایک گلوکار سماعت شکن آلات موسیقی کی مدد سے کسی نفسیاتی موضوع پر رونے کے انداز میں گا رہا تھا۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا اور زہرہ اندازِ محبوبی کے ساتھ اس کی چوڑی ہتھی پر آبیٹھی۔ اس کی آنکھوں میں خمار کے ڈورے کچھ اور گہرے ہو گئے تھے۔ وہ میری طرف جھکی تو میں نے گھبرا کر پوچھا۔ ''خیریت تو ہے؟''

''وہ ہنسی۔'' دل سچ مچ بے ایمان ہو رہا ہے۔''

''مہربانی کر کے اسے قابو میں رکھو۔ تم جانتی ہو، میں اس قسم کا آدمی نہیں ہوں، تم پہلے بھی بہت دیر تک میرے ساتھ رہ چکی ہو۔ پھر میری جان پر بنی ہے۔ میں ایسے دشمنوں کی قید میں ہوں جو مجبور نہ ہوں تو مجھے ہر ممکن اذیت دے کر مارنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہ کریں۔''

"یہ ضروری ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"اتنا بھی ضروری نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "تم ذرا سیدھی ہو کر بیٹھو اور میری بات غور سے سنو۔"

وہ بادلِ ناخواستہ سیدھی ہوئی اور کسی قدر خفگی سے کہا۔ "بولو۔"

"تم اس تہہ خانے تک مجھے لے جا سکتی ہو؟"

"یہ ناممکن ہے۔" اس نے کہا۔ "صبح چھ سے شام سات بجے تک وہاں عورتیں ہوتی ہیں اور ان کا مساج، تھراپی اور نگرانی کرنے والی عورتیں ہوتی ہیں۔ سات بجے کے بعد تہہ خانہ بند کر دیا جاتا ہے اور وہاں کسی کو جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔"

"وہاں کتنے پہریدار ہوتے ہیں؟"

"عام طور سے ایک ہی ہوتا ہے، اس کا نام قیصر ہے۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں اسے۔" وہ ہنسی۔

"اس جان پہچان کی وجہ؟"

"عاشق ہے مجھ پر۔" وہ بے باکی سے ہنسی۔ "مگر یہاں کا قانون ہے حویلی سے تعلق رکھنے والا کوئی فرد چاہے وہ شاہ نواز ہی کیوں نہ ہو، کسی عورت کے پاس نہیں جا سکتا۔ یہی اصول عورتوں کے لئے ہے۔ اگر کوئی مرد یا عورت اس قانون کی خلاف ورزی کرے تو اس کو عبرتناک سزا دی جاتی ہے۔"

"تمہارے سامنے کسی کو سزا ہوئی؟"

وہ لرز گئی تھی۔ "ہاں سزا سب کے سامنے دی جاتی ہے تاکہ پھر کوئی ایسی جرأت نہ کرے۔ اس پر کتے چھوڑ دیئے جاتے ہیں جو اس کو چیر پھاڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ وہ کوئی افغانی لڑکی تھی، ضدی اور اکھڑ۔ پہلے بھی اسے کئی بار سزا ہو چکی تھیں اس نے ایک ملازم کو پھنسا لیا۔ بلا کی خوبصورت تھیں اس لئے وہ بے چارہ انجام جانتے ہوئے بھی جھانسے میں آ گیا۔ ان دونوں کو رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا اور اگلے دن تمام عورتوں اور مردوں کو جمع کر کے ان کے سامنے ان پر کتے چھوڑ دیئے گئے۔ کتوں نے چند منٹ میں ان کو چیر پھاڑ کر مار ڈالا۔"

"اس کے باوجود قیصر تم میں دلچسپی لے رہا ہے۔"

"میں ایک اشارہ کر دوں تو کچے دھاگے سے بندھا چلا آئے۔"

میں سوچنے لگا تھا۔ دن میں یہ کام ممکن نہیں تھا، اوّل تو وہاں مردوں کو جانے کی اجازت نہیں تھی، صرف عورتیں جاتی تھیں، دوسرے مردوں کو جانے کی اجازت ہوتی تب بھی میں نہیں جا سکتا تھا۔ میں تو اس کمرے سے باہر نہیں جا سکتا تھا۔ یہاں پر بھی پہرا تھا مگر ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ہوتا ہے اور میں اس بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ "تم لوگوں کو رات کو اپنے کمروں سے نکلنے کی اجازت ہوتی ہے۔"

"ہم رات کو اوپر نیچے کی منزلوں میں کہیں بھی جا سکتے ہیں مگر تہہ خانے میں اور عمارت سے باہر جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔"

"تہہ خانے میں جانے والا راستہ کہاں ہے؟"

"اس جگہ سے کچھ ہی دور ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "لیکن تم جانے کا سوچ رہے ہو تو بتا دوں، قیصر خطرناک آدمی ہے، وہ خالی ہاتھ سے بھی دوسروں کو قابو کر لیتا ہے لیکن اس کے پاس ہتھیار بھی ہوتے ہیں، تم اس

کو ہٹائے بغیر تہہ خانے میں نہیں جا سکتے۔"
"اسے میں نہیں، تم راستے سے ہٹاؤ گی۔"
"میں کیسے......؟" وہ بولی۔"اوہ اچھا، وہ مجھ پر فریفتہ ہے لیکن ڈیوٹی کے وقت اسے سوائے موت کے فرشتے کے اور کوئی وہاں سے نہیں ہٹا سکتا ہے۔"
"عورت فرشتہ اجل سے بھی بڑھ کر ہوتی ہے۔ فرشتہ اجل تو جگہ اور وقت کا محتاج ہے لیکن عورت مرد کو وہاں لے جا سکتی ہے جہاں اس کی موت منتظر ہو۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔
زہرہ نے خوفزدہ نظروں سے مجھے دیکھا۔"تمہارا مطلب ہے میں اسے غافل کر دوں اور تم اسے مار ڈالو گے۔"
"ضروری نہیں ہے مگر راستے سے ہٹانے کے لئے اسے ناکارہ بنانا لازمی ہے۔ تبھی ہم تہہ خانے میں جا سکتے ہیں۔"
"وہاں جا کر کیا کرنا ہوگا؟"
"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ بس یہ سوچ لو، آج رات ہم نے تہہ خانے میں داخل ہونا ہے۔"
"صرف سوچنے سے کیا ہوگا ہے، مجھے تو یہ کام ناممکن لگ رہا ہے۔ ایسا نہ ہو تم اپنے ساتھ مجھے بھی مروا دو۔" وہ خوفزدہ لگ رہی تھی۔
"مجھے بھوک لگ رہی ہے۔" میں نے بات بدل دی۔
"کھانا ابھی ایک گھنٹے بعد آئے گا بلکہ مجھے جا کر لانا پڑے گا۔"
"تمہیں کیوں؟"
"دوسری عورتیں جا کر ڈائننگ ہال میں کھاتی ہیں اور جن کے ساتھ گاہک ہوں وہ اپنا اور ان کا کمرے میں لا کر کھاتی ہیں۔"
"یعنی دلبستگی کے ساتھ ملازماؤں والے کام بھی تم عورتوں کو کرنا پڑتے ہیں۔"
اس نے سر ہلایا۔"صفائی ستھرائی سے لے کر کھانا بنانے اور دوسرے سارے کام ہمیں ہی کرنا پڑتے ہیں اس طرح انہوں نے زیادہ ملازم رکھنے سے بھی نجات حاصل کر لی ہے۔"
"حویلی میں صرف انتہائی ضرورت کے لوگ ہیں۔ زیادہ تر تو محافظ ہوں گے اور یہ سب اعتماد کے لوگ ہوں گے۔ اصل مسئلہ دولت کا نہیں ہے وہ تو ان کے پاس بے حساب آ رہی ہے، ایک ایک عورت ان کو اتنا کما کر دے رہی ہے کہ یہ اس کے لئے نصف درجن ملازمین بھی رکھیں تو ان کو فرق نہ پڑے مگر یہ ان عورتوں سے اس لئے کام کراتے ہیں کہ ایک تو وہ جسمانی طور پر فٹ رہیں دوسرے ان کو سوچنے کا موقع نہ ملے اور تھوڑا بہت ان کے اندر جو غبار جمع ہوتا ہے وہ اس طرح ریلیز ہو جاتا ہے کہ کام کر کے ان کے اندر کی عورت کو تسکین ملتی ہوگی اور وہ خود کو محض دوسروں کی خواہشات پوری کرنے والی مشین نہیں سمجھتی ہوں گی۔"
زہرہ نے حیران ہو کر مجھے دیکھا۔"تم نے بالکل ٹھیک تجزیہ کیا ہے۔ جب یہاں رہنے والی عورتیں گروپ کی صورت میں کام کرتی ہیں تو بے حد خوش رہتی ہیں۔ آپس میں بات چیت اور ہنسی مذاق کرتی ہیں اور جب کسی

گاہک کے پاس جاتی ہیں تو بدل جاتی ہیں، مصنوعی ناز و ادا اور نخروں کا ایک خول خود چڑھا لیتی ہیں۔ ان کا اصل روپ اس وقت سامنے آتا ہے جب یہ صفائیاں کرتی ہیں، کھانا بناتی ہیں، اپنے کپڑے دھوتی ہیں اور دوسرے کام کرتی ہیں۔''

''اس کی وجہ وہی ہے اس گندے کام میں ملوث ہونے کا احساس ان کے ذہن پر بوجھ بن جاتا ہے۔ یہ بوجھ کم نہ ہو تو اس کے بوجھ تلے دب کر وہ مر بھی سکتی ہیں۔ پاگل بھی ہو سکتی ہیں۔'' میں نے سر ہلایا۔'' یہ لوگ بڑی چالاکی سے یہ سارا سیٹ اَپ چلا رہے ہیں۔''

''شاید۔'' اس نے مایوسی سے کہا۔'' یہ جتنے چالاک ہیں اتنے ہی سفاک بھی ہیں۔ ان کی ایک عورت ایک گاہک کے پاس سے فرار ہوگئی شاید اس نے ترس کھا کر خود بھگا دیا۔ عورت کراچی چلی گئی تھی۔ ان کے گرگے اس کا سراغ لگاتے ہوئے وہاں تک جا پہنچے اور اسے لے آئے۔''

''اسے کیا سزا ملی تھی۔''

''کچھ نہیں...... بس تین دن تک صحن میں بھوکا پیاسا باندھ کر رکھا تھا۔ اس کے کپڑے اتار دیئے تھے اور سر پر استرا پھیر دیا تھا۔''

''تم کہہ رہی ہو یہ کچھ سزا نہیں ہے۔''

''ہاں سزا تو اسے بھگانے والے کو ملی تھی، ایک روز اس کی کوٹھی میں ڈاکو گھس آئے اور اسے قتل کر گئے پولیس کو ڈاکوؤں کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔''

''ان کو زبان بندی کی قیمت دے دی گئی ہوگی۔''

''یہیں نہیں یہ لوگ اس شخص کی پندرہ سالہ بیٹی کو اٹھا لائے جب وہ آئی تو سنا ہے بالغ بھی نہیں ہوئی تھی اور اب اس سے یہاں کی عورتیں بھی شرماتی ہیں، اتنی پکی اور بے حیا ہوگئی ہے۔''

''پھر اس عورت کا کیا ہوا؟''

''ہونا کیا تھا سزا پوری ہوئی تو اسے پھر سے دھندے پر لگا دیا گیا تھا۔ وہ اسے نہیں مار سکتے تھے۔ وہ ان کا اثاثہ ہے، ہم ان کے لئے دولت کمانے والی مشینیں ہیں۔''

''اعلیٰ حکام کو اس مکروہ دھندے کا علم ہے؟''

''علم۔'' زہرہ طنزیہ انداز میں ہنسی۔'' وہ برابر کے شریک ہیں۔ میں نے اس شہر کے ان لوگوں کے ساتھ راتیں گزاری ہیں جو قانون اور عوام کے رکھوالے کہلاتے ہیں جن کا کام عوام کو انصاف مہیا کرنا اور ان کے جان و مال اور عزت کی حفاظت کرنا ہے۔''

''شاید اسی وجہ سے یہ مکروہ دھندے اتنی تیزی سے پنپ رہے ہیں۔'' میں نے سرد آہ بھریں'' اس ملک کے حکام بدنیت ہیں اور جب حاکم کی نیت درست نہ ہو تو عوام کا اللہ ہی حافظ ہوتا ہے۔''

''شہباز، میں یہاں سے نکلنا چاہتی ہوں۔'' اس نے کہا۔'' لیکن جب میں سوچتی ہوں یہاں سے نکل کر کہاں جاؤں گی تو میرے اندر کی یہ خواہش دم توڑ جاتی ہے۔''

''خدا کی زمین بہت وسیع ہے۔''

''ہاں مگر میرے لئے تنگ ہوگئی ہے۔''

''تم میرے ساتھ رہ سکتی ہو۔'' میں نے کہا۔ ''تم پڑھی لکھی ہو، خود کام کر کے اپنا پیٹ پال سکتی ہو، اگر تم کو یہاں خطرہ ہے تو میں تمہیں بیرونِ ملک بھی بھیج سکتا ہوں۔''

''مجھے بیرونِ ملک جا کر کیا کرنا ہے۔ میں ان کے چنگل سے نکل جاؤں یہی بہت ہے۔''

''میں نے سنا ہے یہ عورتوں سے باقاعدہ معاہدے کرتے ہیں۔ تم کس معاہدے کے تحت رہ رہی ہو۔''

وہ تلخ انداز میں بولی۔ ''مجھ سے معاہدہ نہیں ہے میں ان کی زرخرید ہوں۔ پہلے ان کی لگائی رقم مع سود لے وصول ہو جائے اس کے بعد یہ مجھ سے معاہدہ کریں گے۔''

''اور رقم کب پوری ہوگی؟''

''کبھی نہیں، میری معلومات کے مطابق یہ جن عورتوں کو خریدتے ہیں وہ ساری عمر ان کی غلام رہتی ہیں۔ ان کو کبھی آزادی نہیں ملتی۔ یہاں بیس کے قریب ایسی عورتیں اور لڑکیاں ہیں جن کو انہوں نے خریدا ہے، ان میں سے بعض سات آٹھ سال سے ان کے پاس ہیں۔''

''یعنی سیدھے طریقے سے تمہاری رہائی کا کوئی امکان نہیں ہے؟''

''میں نے تو اس کی آس بھی چھوڑ دی ہے۔'' اس نے حسرت سے کہا۔

اسی وقت ہلکے سے بزر کی آواز آئی جو دور کہیں بج رہا تھا۔ وہ کھڑی ہوگئی۔ اس نے سی ڈی پلیئر آف کر دیا۔ ''کھانے کا وقت ہوگیا ہے ملک صاحب۔ آپ کھانے میں کیا پسند کریں گے؟''

''کچھ بھی لے آؤ، بس ڈھنگ سے پکا ہو۔''

زہرہ نے لباس تبدیل کیا۔ اس نے سادہ سا شلوار سوٹ پہن لیا تھا جو اس پر سج رہا تھا۔ وہ بلاشبہ ان چند حسین ترین عورتوں میں سے تھی جن سے میں اب تک ملا تھا۔ اس پر ہر لباس سجتا تھا اور وہ خود اس قابل تھی کہ کسی محل نہ سہی کسی کوٹھی میں رانی ہوتی، کوئی شہزادہ اس کا شریکِ سفر ہوتا مگر اس کی قسمت کہ پہلے اسے پہلوان اللہ رکھا سے محبت ہوئی اور اس سے شادی کر لی، حالانکہ وہ شادی کے قابل نہیں تھا۔ اس میں غیرت بھی نہیں تھی ورنہ وہ زہرہ سے جسم فروشی کرانے کے بجائے خود چوری ڈاکے سے اپنے علاج کے لئے رقم جمع کر لیتا۔ پھر پہلوان کے مارے جانے کے بعد جب وہ میرے ساتھ بھاگی تو اسے راستے میں خادم حسین ملا جو شہزادہ نہ سہی پہلوان کے مقابلے میں بہت معقول قسم کا پڑھا لکھا انسان تھا۔ اس نے زہرہ کے ہوش ربا حسن کے آگے یوں ہتھیار ڈالے کہ زہرہ کا ماضی تک فراموش کرنے کو تیار ہوگیا تھا مگر بدقسمتی سے اس کے دشمن اسے بھولنے کو تیار نہیں تھے۔ وہ تعاقب کرتے ہوئے خادم حسین کے گھر تک آ گئے تھے اور انہوں نے خادم حسین کی جان لے لی۔ زہرہ جس دلدل سے نکلی تھی اس سے بھی زیادہ گہری اور گندی دلدل میں جا گری تھی۔

''کہاں کھو گئے ہو ملک صاحب؟'' زہرہ نے شوخی سے کہا تو میں چونکا تھا اور یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ وہ کھانے کی ٹرالی لے بھی آئی تھی اور مجھے پتا ہی نہیں چلا تھا۔ ''اتنی خود فراموشی اچھی نہیں ہوتی ہے۔'' اس نے بریانی اور چکن کڑاہی کی ڈشیں میز پر سجاتے ہوئے کہا۔

''خود فراموشی کتنی بھی ہو اچھی نہیں ہوتی ہے۔'' میں نے پلیٹ میں کھانا نکالنا شروع کیا۔

''کھانا ہم نے خاموشی سے کھایا تھا۔ کھانے کے بعد وہ برتن رکھنے گئی تو چائے لے کر آ گئی۔ یہ اعلیٰ درجے کی مہکتی چائے تھی جس کے تمام لوازمات ٹرالی میں الگ الگ تھے۔ اس نے چائے بنا کر دی۔ میں نے چائے پی کر جماہی لی۔ ''مجھے نیند آ رہی ہے۔''

''سو جائیں ملک صاحب۔'' زہرہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''ابھی تو پوری رات پڑی ہوئی ہے۔''

میں نے اسے گھورا تو وہ ہنسی تھی۔ ''مجھے اوڑھنے کے لئے کچھ دو۔''

زہرہ الماری سے کمبل لے آئی۔ باہر شدت کی سردی کے مقابلے میں اندر کی فضا مقابلتاً بہتر تھی۔ اس لئے گزارا ہو رہا تھا مگر لیٹتے ہوئے کچھ اوڑھنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ ذرا دیر بعد میں سو گیا تھا۔ میرا ارادہ کرنے کا تھا اس کے لئے رات کی تاریکی لازمی تھی اور اس وقت تک میں سوتا رہتا تو نگرانی کرنے والوں کو شک نہ ہوتا ورنہ میرا یہاں آنے کا مقصد ان پر واضح تھا۔ مجھے شک پہلے بھی تھا کہ اس عشرت کدے کے ہر کمرے میں سننے اور دیکھنے والے آلات ہوں گے جو سب کچھ ریکارڈ کرتے ہوں گے۔ اگرچہ یہاں آنے والے تمام ہی لوگ توپ قسم کے تھے، سیاستدان، صنعتکار، جاگیردار اور اعلیٰ سرکاری افسران۔ ان کو بلیک میل کرنے کا مطلب ان کا خاتمہ کرانا تھا مگر کبھی کبھی بلیک میلنگ کا موقع بھی آ سکتا تھا جب کوئی توپ شخص بلاوجہ اپنی توپوں کا رخ ان کی طرف موڑ دے اور نقصان پہنچانے پر تل جائے اس وقت یہ ترپ کا پتا نکال کر اس کے سامنے رکھ دیتے ہوں گے کہ سرکار اب کیا خیال ہے۔ پاؤں تلے دب کر تو چیونٹی بھی کاٹ لیتی ہے۔

کیمرے اور مائیک لگانے کا اصل مقصد عورتوں اور لڑکیوں کے عزائم سے باخبر رہنا تھا تا کہ ان میں سے کوئی باغیانہ روش اختیار کرے تو بروقت اس کا تدارک کیا جائے مگر مجھے لگ رہا تھا اس کمرے کی حد تک کیمرے نہیں ہیں اور کیمرے استعمال کرنا یوں بھی خطرناک تھا کہ بھانڈا پھوٹ جاتا تو یہاں آنے والے ان کے خلاف مشترکہ محاذ بنا لیتے اور زمین پر ان کو کہیں پناہ نہ ملتی۔ محض مائیک سے بھی کام چل جاتا۔ اگر کیمرا ہوتا تو اب تک کوئی نہ کوئی آ چکا ہوتا مجھ سے اور زہرہ سے اس تحریر کے بارے میں پوچھنے کے لئے جو ہم خاموشی سے لکھ رہے تھے۔ مگر یہ بھی ہو سکتا تھا کہ خاموشی سے انتظار کیا جا رہا ہو کہ میں چاہتا کیا ہوں اور جب میں حرکت میں آؤں گا وہ مجھے بآسانی گرفتار کر کے میری کوشش کو ناکام بنا دیں گے۔ بہرحال امید پر دنیا قائم تھی۔ ممکن ہے کیمرے ہوں اور انہوں نے کچھ نہیں دیکھا ہو البتہ حیران ہوں گے کہ میں اپنی پسند کی عورت کے پاس صرف میوزک سن کر گیا تھا اور ایسی کوئی حرکت نہیں کی جو متوقع لیکن یہاں عام تھی۔ ممکن ہے نگرانی کرنے والے میرے بارے میں زیادہ نہ جانتے ہوں اس لئے مجھ پر خصوصی کان رکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی ہو۔ میں سو کر اٹھا تو شام ہو چکی تھی بلکہ شام کے سات بج رہے تھے اور اندھیرا ہوئے بھی خاصی دیر ہو چکی تھی۔ زہرہ حسبِ معمول ٹی وی دیکھ رہی تھی اور اس نے حسبِ معمول نیشنل جیوگرافک لگا رکھا تھا۔

''لگتا ہے تمہیں اس قسم کے چینل اچھے لگتے ہیں؟'' میں نے کمبل اتارتے ہوئے کہا۔

''ہاں ان کو دیکھ کر آزادی کا احساس ہوتا ہے۔''

''غالباً تم ان جانوروں کی بات کر رہی ہو۔ ان بے چاروں کی آزادی کہاں باقی رہی ہے ان کے جسم سے ریڈیو کالر لگا دیئے گئے ہیں، ان کے بلوں تک میں کیمرے لگے ہیں۔''

''ہاں یہ تو ہے پھر بھی مجھے کھلے مناظر والے یہ چینل اچھے لگتے ہیں۔''

''میں واش روم میں آ گیا۔ یہ خاصا پرتعیش قسم کا باتھ روم تھا۔ پہلے میں نے منہ ہاتھ دھونے کے بارے میں سوچا لیکن پھر فیصلہ بدل کر نہانے لگا۔ گرم پانی شاور سے جسم پر گرا تو ساری کسلمندی دور ہونے لگی تھی۔ زہرہ نے یہ اچھا کام کیا کہ جب تک میں نہا کر آیا اس نے چائے منگوالی تھی یا خود لے آئی تھی۔

''گڈ! اس وقت اس کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔''

''مجھے پتا تھا کہ تم نہا کر آؤ گے تو چائے کافی طلب کرو گے۔''

''آہ...... کیا نام لیا ہے ظالم...... مجھے لگ رہا ہے میں نے نہ جانے کب سے کافی نہیں پی ہے۔''

''یہ کیا بات ہوئی، کافی بھی مل سکتی ہے۔ حویلی کا باورچی ایسی کافی بناتا ہے کہ تم نے کہیں ایسی کافی نہیں پی ہوگی۔''

''باورچی...... تم نے تو کہا تھا کہ کھانا بنانے کا کام عورتیں کرتی ہیں۔'' میں چونکا۔

''وہ تو کرتی ہیں مگر ان کا نگران باورچی ہے وہ فیصلہ کرتا ہے، کیا پکنا ہے اور کیسے پکنا ہے پھر وہ سب میں کام بانٹ دیتا ہے اور خود صرف نگرانی کرتا ہے البتہ چائے کافی جیسی چیزیں وہ خود بناتا ہے، میں رات کے کھانے کے بعد تمہارے لئے کافی بنوادوں گی۔''

جب مجھے یہاں لایا گیا تھا تو میرے سامان کے ساتھ میرے جسم سے بھاری جیکٹ بھی اتار لی گئی تھی۔ اب میں سیاہ پتلون، بنیان اور اس کے اوپر ہائی نیک پوری آستین کی گرم جرسی میں تھا۔ اس عمارت کے اندر یہ لباس کافی تھا مگر کھلی فضا میں جانے کے لئے کوئی جیکٹ یا سوئٹر لازم تھا۔ بہرحال باہر جانے کا مرحلہ ابھی دور تھا اور اگر میں کسی طرح یہاں سے نکل بھی جاتا تو سردی سے مرتا نہیں۔

''تم چھٹی پر ہو؟'' میں نے چائے نوش کرتے ہوئے زہرہ سے پوچھا۔

''گاہک آجائے تو ہمیں اس کے پاس بھیج دیا جاتا ہے۔ جو فارغ ہوتی ہیں وہ آجاتی ہیں۔ یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے پھر عورت پر بھی منحصر ہوتا ہے کہ اس کی کتنی مانگ ہے۔ ہفتے میں ایک دن تو لازمی چھٹی دی جاتی ہے۔''

''اور جو باہر جاتی ہیں ہفتے سے زیادہ کی بکنگ پر؟''

''یہ ان پر ہوتا ہے کہ وہ آرام کرنے کا موقع نکال لیں۔ بہرحال بزنس سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس کے لئے اصول و قواعد سب تبدیل کئے جا سکتے ہیں۔''

''شاہ نواز خود کہاں ہوتا ہے؟''

''میں اس بارے میں نہیں جانتی۔ وہ ہفتے میں ایک دو بار تو نظر آتا ہے۔ یہاں کی نگران اور سب کی باس شمشاد ہے۔''

''مسلح افراد کی بھی باس ہے۔''

''سب کی...... یہاں موجود ہر فرد اس کے حکم کا پابند ہے۔''

شمشاد مجھے بھی خطرناک عورت لگی تھی بلکہ اس میں نسوانیت نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ وہ صورت سے ہی سرد اور سفاک عورت لگتی تھی جو کامل بے حسی سے کسی کو قتل کر سکتی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''بزنس کے معاملات کون

دیکھتا ہے؟"

"کیا مطلب؟" وہ سمجھی نہیں تھی۔

"مطلب یہ کہ عورتوں کے لئے کون طے کرتا ہے کہ کس نے کہاں جانا ہے اور ان کے بدلے رقم کون وصول کرتا ہے۔"

"یہ سارے کام شاہ نواز خود کرتا ہے۔ حویلی میں آنے والے بھی جو ادائیگی کرتے ہیں وہ چوبیس گھنٹے کے اندر شاہ نواز کو دے دی جاتی ہے۔"

"یہ باتیں سب جانتے ہیں؟"

زہرہ مسکرائی۔ "سب جانتے ہیں مگر میری طرح بتاتا کوئی نہیں ہے۔"

"تمہیں خوف نہیں ہے اگر ان لوگوں کو پتا چل گیا تو؟"

"کیسے پتا چلے گا کوئی الہام تو ہونے سے رہا اور تمہیں بتا بھی دیا ہے تو اس سے کسی کو کیا نقصان ہے۔"

"میں دشمن ہوں ان کا۔" میں نے کہا۔ "ان کے لئے خطرہ بن سکتا ہوں۔"

"زندہ رہو گے تو خطرہ بنو گے۔ میں نے نہیں دیکھا کہ یہ کسی کے دشمن بن جائیں اور وہ زیادہ دن زندہ رہے۔" وہ مسکرا دی۔

"زندگی اور موت کا علم صرف خدا کو ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "ابھی تک تو دشمنوں کی خواہش کے برخلاف زندہ ہوں اور ان کے سینے پر مونگ دل رہا ہوں۔"

"کسی وجہ سے چھوٹ دے رکھی ہوگی۔" زہرہ بولی۔

"چھوڑو اس چکر کو۔ اپنی نازک سی عقل اس معاملے میں مت کھپاؤ، کھانے کے بارے میں کیا خیال ہے۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔" میں نے پیٹ سہلایا۔

"بس کچھ دیر میں بیل بجنے والی ہے۔" زہرہ نے گھڑی کی طرف دیکھا۔

مین نے اسے اشارے سے سی ڈی پلیئر آن کرنے کو کہا۔ اس نے ایک سی ڈی لگا کر آواز ذرا تیز کر دی اور میرے پاس آگئی۔ "کوئی خاص بات؟" اس نے پوچھا۔

"ایک روپیہ ہوگا تمہارے پاس، سکے والا؟"

"روپیہ...... سکے والا؟" وہ دنگ رہ گئی تھی۔ "اس کا کیا کرنا ہے؟"

"جب کروں گا تو دیکھ لینا۔ فی الحال دے دو۔"

"میرے پاس نہیں ہے۔" اس نے سر ہلایا۔

"میں نے کمرے کا معائنہ کیا، فرنیچر اور چیزوں کا جائزہ لیا بالآخر مجھے زہرہ کی جوتی پر لگا گول دھاتی بٹن نظر آیا۔ میں نے اس کا معائنہ کیا، یہ سائز میں ایک روپے کے سکے جتنا اور اس کے مقابلے میں کسی قدر موٹا تھا۔ میں نے اسے اٹھایا یا چھیڑا نہیں تھا۔ فی الحال میں کوئی چونکا دینے والی حرکت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس اثنا میں کھانے کا بزر بجا تھا اور زہرہ نے پوچھنے کا ارادہ ملتوی کر دیا کہ میں اس کی جوتی میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہا تھا۔ وہ کھانا لینے چلی گئی۔ کھانا اس بار بھی پُرتکلف تھا مگر میں نے بے توجہی سے کھایا۔ میرا ذہن اس سے زیادہ ضروری

سوچوں میں گم تھا۔ زہرہ نے مجھے ٹوکا۔ "ملک صاحب...... کھانا تو ٹھیک سے کھاؤ۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔" میں نے ہاتھ کھینچ لیا۔

"ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ بھوک لگ رہی ہے۔" وہ حیران ہوئی تھی۔

"میں رات کو بھوک سے کم ہی کھاتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم کافی بنوانے کے بارے میں کہہ رہی تھیں۔"

"اس کے لئے انتظار کرنا پڑے گا۔" اس نے کہا۔

"تم کھانا کھاؤ۔" میں نے کہا اور واش روم میں آ گیا۔ میں نے وہاں لگے بلب کا معائنہ کیا۔ واش روم میں ایک ہی بلب تھا اور اس سے مجھے تھوڑی سی دشواری ہو سکتی تھی۔ میں نے واش روم سے آ کر کمرے کے باہر والا دروازہ کھولا اور وہاں موجود مسلح نگران میری صورت دیکھتے ہی مستعد ہو گیا تھا۔

"کیا ہے؟" اس نے غرا کر کہا۔

"کچھ نہیں آج صبح سے تمہاری منحوس صورت نہیں دیکھی تھی۔" میں نے مسکرا کر کہا اور دروازہ بند کر لیا۔ ادھر سے ایک گالی سنائی دی تھی۔

"کیوں اس کے منہ لگ رہے ہو ملک صاحب۔" زہرہ بولی۔

میں نے سی ڈی پلیئر آن کیا لیکن سی ڈی غزلوں والی لگائی تھی اور زہرہ کے پاس آ کر پوچھا۔ "تمہارے پاس کوئی ٹارچ ہے؟"

اس نے سر ہلایا۔ "ایک چھوٹی ٹارچ ہے، گرمیوں میں لائٹ زیادہ جاتی ہے اور جنریٹر اسٹارٹ ہونے میں ذرا وقت لگتا ہے۔"

"مجھے دو۔" میں نے مطالبہ کیا۔ اس نے اٹھ کر الماری سے ایک چھوٹی لیکن طاقتور ٹارچ نکال کر مجھے تھما دی۔ میں نے اسے جلا کر دیکھا۔ اس میں سیل تقریباً نئے تھے۔ زہرہ کے پاس اضافی سیل تھے، میں نے وہ بھی لے لئے۔

"تمہارا ارادہ کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ابھی بتاتا ہوں۔" میں نے سی ڈی پلیئر آف کیا۔ "اب کافی لے آؤ۔"

زہرہ نے کھانے کے برتن سمیٹے۔ "ابھی لاتی ہوں۔"

زہرہ کے جاتے ہی میں نے باتھ روم کا رخ کیا۔ میں نے دروازہ کھلا چھوڑ دیا تاکہ اندر کسی قدر روشنی آتی رہے۔ میں نے سوئچ بند کر کے باتھ روم کا بلب بجھا دیا پھر اسے رومال کی مدد سے پکڑ کر اتار لیا۔ ہولڈر میں زہرہ کی جوتی سے اتارا گول دھاتی سکے نما بٹن رکھ کر اوپر سے بلب لگا دیا اور باتھ روم کا دروازہ بند کر کے باہر نکل آیا۔ بٹن میں نے زہرہ کی بے خبری میں اتارا تھا تاکہ وہ بلاوجہ کے سوالات نہ کرے۔ وہ دس منٹ بعد ٹرے میں کافی کے مگ لے آئی۔ میں نے کرسی ایسی جگہ رکھ لی تھی کہ جب وہ دروازہ کھولے تو مجھے باہر کھڑا گارڈ نظر آئے۔ وہ دروازے کے بائیں طرف کھڑا تھا۔ "کافی اچھی ہے۔" میں نے سپ لے کر کہا۔

"ملک صاحب آپ کہیں تو رات کے لئے کچھ خصوصی چیزیں منگوا لوں؟" زہرہ نے پوچھا۔

''نہیں رہنے دو۔ میں ان کا گاہک تھوڑی ہوں ادائیگی کہاں سے کروں گا۔''

''ادائیگی کی فکر نہ کرو۔ وہ میرے کھاتے سے ہو جائے گی۔'' وہ اٹھلا کر بولی۔ ہم کچھ دیر تک آنے والی رات کے بارے میں اس طرح باتیں کرتے رہے تھے تاکہ سننے والے اس مغالطے میں رہیں کہ ہمارا کوئی اور ارادہ نہیں ہے۔ کافی کے بعد میرے اشارے پر زہرہ نے ایک بار پھر سی ڈی پلیئر چلا دیا تھا اور ہم پاس پاس آکر محو گفتگو ہو گئے تھے۔ میں نے اسے باتھ روم کے بلب کے ساتھ کی جانے والی کارروائی سے آگاہ کیا۔

''اس کا مقصد؟''

''جیسے ہی سوئچ دبائیں گے نیوٹرل اور فیز آپس میں شارٹ ہو جائیں گے اور فیوز اُڑ جائے گا۔ پوری عمارت اندھیرے میں ڈوب جائے گی۔''

''ممکن ہے ہر جگہ بجلی نہ جائے صرف ہمارے حصے میں جائے۔''

''اس صورت میں بھی کام ہو جائے گا۔ مجھے بجلی بند ہوتے ہی سب سے پہلے باہر کھڑے شخص کو قابو کر کے اس سے رائفل حاصل کرنی ہوگی۔ ممکن ہے اس کے پاس پستول بھی ہو۔''

''ہوتا ہے...... میں نے دیکھا ہے۔''

''دوسرے مرحلے میں ہمیں تہہ خانے کا رخ کرنا ہے اگر اس طرف بھی لائٹ نہیں ہوئی تو میں قیصر کو ناک آؤٹ کر دوں گا۔ دوسری صورت میں تمہیں اس کو قابو کرنا ہوگا۔''

''میں کرلوں گی۔'' زہرہ بولی۔ ''مگر سوال یہ ہے کہ ہمیں باہر جانے کے بجائے تہہ خانے میں گھسنے کی کیا ضرورت ہے۔''

''ضرورت ہے۔ ایک بات بتاؤ تم نے کہا تھا کہ تم نے خفیہ تہہ خانے میں لکڑی کی بڑی سائز کی پیٹیاں دیکھی تھیں، تم ان کا حجم بتا سکتی ہو۔''

اس نے سوچا۔ ''وہ چار فٹ لمبی چوڑی اور دو فٹ اونچی تھیں۔''

''اب غور کرو۔ جن تنگ سیڑھیوں سے اتر کر تم نیچے گئی تھیں کیا ان سے یہ پیٹیاں تہہ خانے میں جا سکتی تھیں؟'' میں نے پھر پوچھا۔

اس نے غور کیا اور حیرت زدہ نظر آنے لگی۔ ''تم نے ٹھیک کہا ہے اس تنگ سے راستے سے پیٹیاں لانا لے جانا بے حد مشکل کام ہے۔''

''اسے ناممکن سمجھو۔ اس سائز کی پیٹیوں میں اگر اسلحہ اور گولہ بارود ہوا تو ان کا وزن کئی من ہو جائے گا اور چند افراد کے لئے بھی اسے اٹھانا ناممکن ہوگا۔''

''سیڑھیوں پر دو افراد بھی آمنے سامنے نہیں جا سکتے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن پھر یہ پیٹیاں تہہ خانے میں آئیں کہاں سے؟''

''یہی جاننے کے لئے تو ہم تہہ خانے کا رخ کریں گے۔ میرا خیال ہے وہاں آمدورفت کے لئے کوئی خفیہ راستہ ہے اور وہ راستہ اتنا بڑا ہے کہ اس میں سے گاڑیاں بھی گزر سکتی ہوں گی۔''

زہرہ مجھے گھورنے لگی تھی۔ ''تمہارے ذہن میں یہ سب آیا کیسے؟''

"بس آ گیا۔ اب غور سے سنو، جیسے ہی بجلی جائے گی میں مسلح شخص کو اندر کھینچ لوں گا۔ تمہیں اس پر ٹارچ سے روشنی کرنا ہوگی اور جیسے ہی اسے اندر کھینچوں دروازہ بند کر دینا ہوگا۔"

وہ فکرمند نظر آنے لگی۔ "اس کے بعد؟"

"میں اس کی جیکٹ اور کیپ پہن لوں گا۔ پتلونیں دونوں کی سیاہ ہیں اس لئے کام چل جائے گا۔ خدوخال چھپانے کے لئے میں کیپ آگے کر لوں گا۔ اسے باندھ کر بے بس کر کے یہاں ڈال دیں گے اور تم تہہ خانے تک میری رہنمائی کرو گی۔"

"میں سمجھ گئی۔"

"وہاں روشنی نہ ہونے کی صورت میں تم قیصر کے پاس جاؤ گی اور اسے غافل کرو گی۔ میں پیچھے سے اسے ناک آؤٹ کر دوں گا۔ روشنی ہونے کی صورت میں تم اسے وہاں لاؤ گی جہاں میں چھپا ہوں گا اور میں اسے چھاپ لوں گا۔"

"وہاں ایسی کوئی جگہ نہیں ہے صرف کمرے ہیں جن میں لڑکیاں اور ان کے گاہک ہوتے ہیں۔"

"چلو یہ موقع پر دیکھ لیں گے۔" میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ دس بج رہے تھے۔ "یہاں لوگ کب سو جاتے ہیں؟"

"نیند......" وہ ہنسی۔ "یہ رات کو جاگنے والی دنیا ہے۔ ویسے بارہ بجے کے بعد سب اندرون خانہ اتنے مصروف ہوتے ہیں کہ کوئی باہر نہیں آتا اور جو لڑکیاں فارغ ہوتی ہیں وہ بھی بارہ بجے تک سونے کے لئے چلی جاتی ہیں۔"

"پہرے پر کتنے افراد ہوتے ہیں؟"

"تین نچلی منزل پر اور تین اوپری منزل پر۔ قیصر ان کے علاوہ ہے اس کا کام صرف تہہ خانے پر پہرا دینا ہے۔"

"تمہاری بات سے لگ رہا ہے کہ قیصر کوئی خطرناک قسم کا شخص ہے تبھی اسے اتنی اہم جگہ کی پہرے داری سونپی گئی ہے۔"

"وہ سچ مچ سفاک اور بے رحم شخص ہے دوسرے اس سے خوف کھاتے ہیں۔ شمشاد تک اس سے دب کر رہتی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے اس کی حیثیت عام پہرے دار کے مقابلے میں زیادہ ہے ورنہ شمشاد اس سے دب کر نہیں رہ سکتی ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے جب وہ پہرے پر آتا ہے تو شمشاد بھی اس کی مرضی کے بغیر نیچے نہیں جا سکتی ہے۔" میں سوچنے لگا۔ تہہ خانے سے باہر جانے کا کوئی خفیہ راستہ یقیناً تھا جس کے ذریعے اسلحہ یا وہاں جو بھی رکھا جاتا تھا، آتا جاتا تھا۔ یہ راستہ یقیناً ایسا نہیں تھا کہ ہر کوئی اسے آسانی سے تلاش کر سکے۔ عین ممکن تھا میں اور زہرہ اسے تلاش کرنے میں ناکام رہتے۔ اس صورت میں کوئی اندر کا آدمی ہی ہماری مدد کر سکتا تھا ورنہ تہہ خانہ ہمارے لئے چوہےدان ثابت ہوتا اور وہ آدمی قیصر ہو سکتا تھا۔ وہ اہم حیثیت کا حامل تھا تو اسے لازماً خفیہ راستے کا بھی پتا

ہونا چاہئے تھا۔

ابھی میرے پاس وقت تھا اور میں اس پلان پر غور کر سکتا تھا۔ مجھے ہر پہلو سے سوچ سمجھ کر کام کرنا تھا۔ میں ناکامی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ میری ناکام کوشش شاید مجھے اتنا نقصان نہ پہنچاتی کیونکہ مجھے زندہ رکھنا ڈیوڈ شا اور مرشد علی دونوں کی مجبوری تھی۔ دونوں کی رال کروڑوں ڈالرز مالیت کے ان ہیروں پر ٹپک رہی تھی جو ایک وادی میں کہیں دفن تھے اور ان دونوں کا خیال تھا کہ میں ان کی وہاں تک رہنمائی کر سکتا تھا حالانکہ میرے فرشتوں کو بھی پتا نہیں تھا کہ برٹ شا نے اس وسیع وعریض وادی میں ہیرے کہاں چھپائے تھے۔ اس جگہ ہیرے تلاش کرنا بحرالکاہل میں ایک خاص مچھلی تلاش کرنے کے مترادف تھا جو کہیں بھی پائی جا سکتی تھی مگر ان ہیروں کی وجہ سے قید میں ہونے کے باوجود میری پوزیشن بہتر ہو سکتی تھی۔

خطرہ زہرہ کو تھا، پکڑے جانے اور فرار میں ناکامی کے بعد سارا نزلہ اس پر گرتا اور اسے عبرتناک انداز میں سزائے موت دے دی جاتی۔ جب یہ لوگ محض کسی پہریدار سے عشق لڑانے پر دونوں کو کتوں سے زندہ نچوا سکتے تھے تو میرا ساتھ دے کر زہرہ کہیں سنگین جرم کی مرتکب ہو رہی تھی اسے تو وہ جو سزا دیتے وہ ان کے نزدیک کم ہوتی اس لئے میں ناکامی کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ میں ٹہلتے ہوئے غور کر رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اور شمشاد اندر آ گئی۔ ”کیا حال ہیں ملک صاحب؟“ اس نے مخصوص طنزیہ انداز میں کہا۔ ”ادھر کا قیام لمبا ہی ہو گیا ہے لگتا ہے لڑکی زیادہ ہی پسند آ گئی ہے۔“

اس کی آمد غیر متوقع تھی۔ میں نے تو سوچا ہی نہیں تھا کہ میرا وقت ختم ہو سکتا تھا اور مجھے اس کمرے سے پھر اس قید خانے میں پہنچایا جا سکتا تھا اور لگ رہا تھا شمشاد اسی ارادے سے آئی تھی۔ میں نے مسکرا کر کہا۔

”تم نے کیا ہیرے رکھے ہیں دل ہی نہیں بھرتا۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”تم نے بھی چن کر لی ہے عورت۔ میں بتانے آئی تھی دو بجے تم کو دوبارہ تمہارے قید خانے میں پہنچا دیا جائے گا۔ اس وقت تک جتنا عیش کرنا ہے کر لو۔“

میں نے سکون کا سانس لیا اور احتجاج کیا۔ ”صبح تک تو وقت دو۔“

”اوہ نہیں ملک صاحب۔ اس نے دس بجے جانا ہے۔“ اس نے رکھائی سے کہا۔ ”اس کی بکنگ آئی ہے اور سن، تو بھی سو جانا تا کہ صبح تازہ دم ہو۔“ اس نے آخری جملہ زہرہ سے کہا اور کمرے سے نکل گئی۔

”شکر ہے۔“ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ”ورنہ میں تو سمجھ رہا تھا یہ حرافہ مجھے تم سے دور لے جائے گی۔“

”ابھی بھی دو بجے تک کی مہلت ہے۔“ زہرہ نے معنی خیز انداز میں کہا تھا۔

”اتنا وقت کافی ہے۔“ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا جس میں ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ میرے اشارے پر زہرہ نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ میں نے وہی رف پیڈ استعمال کیا اور اس پر لکھا۔ ”کوئی ایسا لباس پہن لو جو بھاگ دوڑ میں کام آئے اور موسم سے بچائے۔ جوتے بھی ایسے ہی لینا۔“

زہرہ نے سر ہلاتے ہوئے الماری کھولی۔ اس میں سے اس نے موٹی ویلویٹ کا سادہ سوٹ نکالا۔ اس میں شلوار کی جگہ ٹراؤزر تھا اور قمیص بھی چھوٹی سی تھی۔ اس میں وہ آسانی سے حرکت کر سکتی تھی۔ ساتھ ہی اس نے

سوئٹر نکالا۔ الماری کے نچلے حصے سے اس نے سیاہ جوتے نکالے، ان کی ایڑی اگرچہ اونچی تھی مگر صرف دو انچ اور یہ خواتین کے لحاظ سے نہ ہونے کے برابر تھی اگر میں اتنی اونچی ایڑی کا جوتا پہن کر دوڑ لگاؤں تو امکان یہی تھا کہ چند قدم بعد میرا ٹخنہ اتر جائے گا۔ ''تمہارے پاس کوئی قیمتی شے یا رقم ہے تو وہ بھی رکھ لو۔'' میں نے لکھ کر اسے دکھایا۔ اس نے سر ہلا کر الماری کے ایک لاک والے خانے سے زیورات اور خاصی تعداد میں نقد رقم نکال کر ایک سیاہ رنگ کے چھوٹے سے بیگ میں ڈالی۔ یہ زیورات اور رقم یقیناً اس کے ساتھ وقت گزارنے والوں نے اسے تحفے میں دیئے تھے۔ حیرت اس پر تھی کہ ان لوگوں نے یہ سب زہرہ سے چھینا نہیں تھا۔ ممکن ہے یہ ان کا اصول ہو گا کہ لڑکی کو جو تحفے میں ملے وہ اس کا ہو گا اور بظاہر یہ لوگ اصولوں کے پابند نظر آتے تھے کم سے کم چھوٹے موٹے بے ضرر معاملات کی حد تک۔

بارہ بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ زہرہ نے چینج کر لیا تھا کیونکہ باتھ روم کی روشنی نہیں جلائی جا سکتی تھی اس لئے اس نے کمرے میں لباس تبدیل کیا۔ میں نے رخ بدل لیا تھا حالانکہ اس سے پہلے کئی بار اسے بے لباس دیکھ چکا تھا مگر وہ مجبوری تھی، میں جان بوجھ کر یہ گناہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے گھوم کر خود کو دکھایا۔

''کیسی لگ رہی ہوں؟''

''پرفیکٹ۔'' میں نے جواب دیا، اگر کوئی ہماری باتیں سن رہا تھا تو وہ یہی سمجھا ہو گا کہ زہرہ نے موقع کی مناسبت سے کوئی سنسنی خیز لباس پہنا ہو گا۔ میں نے ٹارچ اسے تھمائی اور اسے اشاروں سے سمجھایا کہ اس نے کیا کرنا ہے۔ جب اس نے سر ہلا کر مجھے بتایا کہ وہ سمجھ گئی ہے تو میں نے باتھ روم کے بلب کا سوئچ دبایا اور اگلے ہی لمحے لائٹ غائب ہو گئی۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ لائٹ کہاں کہاں کی گئی تھی۔

''یہ کیا ہوا؟'' زہرہ نے بلند آواز سے کہا اور دروازہ کھول کر باہر کھڑے پہریدار سے پوچھا۔ ''یہ لائٹ کیوں بند ہوئی ہے؟''

''مجھے کیا معلوم، اندر جا۔'' اس نے غرا کر کہا۔

''مجھے اندھیرے سے ڈر لگتا ہے۔'' زہرہ بولی۔ وہ اچھی اداکاری کر رہی تھی۔

''وہ تیرا خصم ہے نا اندر۔'' پہریدار بولا۔ میں اس اثنا میں زہرہ کے پیچھے پہنچ چکا تھا۔ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے اشارہ دیا۔ اس نے ایک طرف ہوتے ہوئے ٹارچ پہریدار کے منہ پر روشن کی۔ اس سے بات کرتے ہوئے زہرہ کو اندازہ تھا کہ اس کا منہ کس طرف ہے۔ ٹارچ کی تیز روشنی نے اسے عارضی طور پر اندھا کر دیا تھا۔ جبکہ وہ مجھے واضح نظر آ رہا تھا۔ میں نے بائیں ہاتھ سے اس کا رائفل والا ہاتھ پکڑ کر اسے اندر کھینچا۔ اس نے چلانے کے لئے منہ کھولا تھا کہ دائیں ہاتھ سے ایک بھرپور گھونسا اس کے منہ پر رسید کیا۔ آواز کے ساتھ اس کا منہ بھی بند ہو گیا تھا۔ جب وہ آگے آیا تو میں نے اس کی ٹانگوں کے درمیان گھٹنا رسید کیا۔ چونکہ وہ آگے آ رہا تھا اس لئے گھٹنا دوگنی رفتار سے اس کی ٹانگوں کے درمیان گھس گیا تھا اس نے ماہی بے آب کی طرح منہ کھولا تھا جسے میں نے پھر گھونسا مار کر بند کر دیا۔ رہی سہی کسر زہرہ نے اس کے سر پر اسٹیل سے بنی ٹارچ مار کر پوری کر دی۔ وہ اوندھے منہ فرش پر گرا، قالین کی وجہ سے آواز نہیں آئی تھی۔ زہرہ نے پھرتی سے دروازہ بند کر دیا۔ میں نے پہریدار کی رائفل لی، وہ مکمل طور پر بے ہوش نہیں تھا اور برائے نام مزاحمت کر رہا تھا۔ میں نے

ناک کر کنپٹی پر آخری گھونسا مارا جو اس کے لئے کافی ثابت ہوا اور وہ مکمل طور پر ہوش سے بیگانہ ہو گیا۔

اس کی جیکٹ سے ایک عدد پستول اور رائفل کا ایک اضافی میگزین نکلا تھا۔ اس کی پنڈلی سے خنجر بندھا تھا۔ یہ خاص آرمی نائف تھی۔ ایک طرف سے دھار دار اور دوسری طرف سے دندانے دار تھا۔ اس کی نوک بھی بڑی تھی میں نے اسے نیام سمیت پنڈلی سے باندھ لیا۔ اس کے فٹ بھر لمبے پھل کی وجہ سے اسے جیب میں رکھا ہی نہیں تھا جا سکتا تھا۔ زہرہ کو پستول چلانا آتا تھا مگر فی الحال اسے قیصر سے نمٹنا تھا اس لئے میں نے اسے پستول نہیں دیا۔ باہر تاریکی تھی اور عورتوں کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ان میں کچھ مرد بھی بڑبڑا رہے تھے مگر ان کی آوازیں نمایاں نہیں تھیں۔ میں نے پہریدار کی جیکٹ پہن لی جو تقریباً میرے ناپ کی تھی۔ بس ذرا شانوں سے تنگ تھی۔

میں اور زہرہ بالکل خاموش تھے۔ میں نے اسے پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ بات نہیں کرنی ہے۔ ممکن ہے لائٹ جانے کے باوجود مائیک کام کر رہے ہوں اور ہماری آوازیں سن لی جائیں۔ زہرہ نے دروازہ کھولا ہم باہر آئے، ہر طرف تاریکی تھی۔ زہرہ نے ٹارچ روشن رکھی۔ میں نے عقب میں دروازہ بند کر دیا۔ پہریدار کے بارے میں مجھے یقین تھا وہ ایک ڈیڑھ گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہیں آئے گا۔ زہرہ رہنمائی کر رہی تھی۔ ایک طرف سے کسی مرد کے چلانے کی آواز آئی۔

''ارے، یہ کیا ہوا ہے۔ کوئی فیز کام نہیں کر رہا ہے۔''

اس بات سے مجھے امید بندھی تھی کہ شاید پوری عمارت یا کم سے کم اس فلور کی لائٹ جا چکی تھی۔ اگر یہ درست تھا تو خاصی حیران کن بات تھی کہ اتنی بڑی عمارت یا اس کی ایک منزل کو ایک ہی سرکٹ بریکر کے ذریعے بجلی دی جا رہی تھی۔ اس کا فیوز اُڑ جاتا یا سرکٹ بریک ہو جاتا تو پوری عمارت تاریکی میں ڈوب جاتی اور اس خامی نے میرا منصوبہ کامیاب کر دیا تھا۔ اس وقت ہر طرف تاریکی تھی اور کہیں بھی روشنی نہیں تھی۔ روشنی ہماری دشمن ہوتی۔ مجھے اطمینان تھا اگر انہوں نے فیوز دوبارہ لگا دیا تو وہ بھی اُڑ جائے گا کیونکہ جب تک بلب تلے دبا دھاتی بٹن نہیں نکالا جائے گا فیوز اسی طرح اڑتا رہے گا۔ میں نے زہرہ کو ایک جگہ روک لیا۔ ذرا آگے ٹارچ کی روشنی لہرا رہی تھی اور اسی طرف آرہی تھی۔ ''زہرہ کوئی چھپنے کی جگہ بتاؤ۔'' میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

''ادھر کمرے میں آؤ'' اس نے کہا اور ایک نزدیکی دروازے کا ہینڈل گھمایا۔ دروازہ کھل گیا اور ہم اندر گھس گئے۔ اندر تاریکی تھی پھر کسی نے خوفزدہ لہجے میں پوچھا۔ ''کک......کون ہے؟'' آواز سے وہ لڑکی لگ رہی تھی۔ زہرا نے میرا ہاتھ دبایا اور آہستہ سے بولی۔ ''فوزی، یہ میں ہوں، زہرہ...... باہر تھی تو اچانک لائٹ چلی گئی۔ اس لئے یہاں آگئی۔''

''لائٹ کیوں گئی ہے زہرہ باجی؟'' ایک دوسری نسوانی آواز نے کہا تو گویا کمرے میں دو لڑکیاں تھیں، باہر شور جاری تھا۔ کوئی چلا رہا تھا۔ ''ارے یہ حرامی بورڈ تو شعلے چھوڑ رہا ہے۔''

میں سمجھ گیا انہوں نے پھر فیوز لگایا تھا جو لگاتے ہی اُڑ گیا۔ ابھی میں سوچ رہا تھا کہ کیا کرنا چاہئے کہ کسی نے میرا ہاتھ پکڑا، میں سمجھا کہ زہرہ ہو گی مگر وہ تو کوئی اور تھی ان دونوں لڑکیوں میں سے کوئی تھی۔ فوزی یا دوسری۔

''کون......کون ہے۔'' اس نے چلانے کی کوشش کی تھی کہ میں نے اسے دبوچ لیا۔
''زہرہ نے فوراً ٹارچ جلائی۔''فوزی۔'' وہ بولی اور دوسری لڑکی کی طرف بھاگی۔''خبردار آواز نہ نکلے۔'' اس نے دوسری لڑکی سے کہا۔
''یہ کون ہے؟'' اس نے سرگوشی میں پوچھا۔
''یہ بہت خطرناک آدمی ہے اس کی بات نہ مانی تو یہ سب کی گردنیں کاٹ دے گا۔'' زہرہ نے اسے مزید خوف زدہ کیا۔ اس نے مجھ پر اور فوزی پر ٹارچ ڈالی۔ میں نے پستول نکال لیا تھا ان لڑکیوں کے لئے نہیں بلکہ ان کے لئے جو ان کا واویلا سن کر آتے مگر خیریت رہی، پستول کے نظارے اور زہرہ کے سمجھانے پر انہوں نے اپنی زبانیں بند رکھنے میں عافیت سمجھی تھی۔ بستر پر بیٹھی لڑکی نے نائٹی پہن رکھی تھی اور اس کی عمر بیس سال سے کم تھی، دبلی پتلی اور گوری چٹی لڑکی تھی، جو میری گرفت میں دبی تھی جسمانی طور پر وہ بھی ایسی ہی تھی۔
''میں تمہیں چھوڑ رہا ہوں لیکن کوئی آواز نکالنے کی کوشش مت کرنا۔ اس سے پہلے کوئی تمہاری مدد کو آئے میں تمہارا گلا کاٹ چکا ہوں گا۔''
اس نے سر ہلایا تو میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ لپک کر بستر پر بیٹھی دوسری لڑکی کے پاس چلی گئی اور اس سے چمٹ کر بیٹھ گئی۔ زہرہ میرے پاس آئی۔''سنو اگر انہوں نے کسی طرح لائٹ بحال کر لی تو ہمارا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔''
''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہئے۔'' میں نے آہستہ سے جواب دیا۔
''میں قیصر کو یہاں تک لاتی ہوں۔ باہر اس وقت لوگ ہیں۔ ذرا سا ہنگامہ ہوا تو سب آجائیں گے۔''
''وہ یہاں آجائے گا؟'' میں نے پوچھا۔
''اگر میں بلاؤں گی تو ضرور آئے گا۔ اسے قابو کرنا تمہارا کام ہوگا۔''
''اس کی تم فکر مت کرو۔ اسے لے آؤ۔''
زہرہ سر ہلا کر باہر جانے لگی تو ان لڑکیوں نے گھگیائی آواز نکالی۔''ہمیں چھوڑ کر مت جاؤ۔'' فوزی نے کہا۔ زہرہ رکی اور اس نے آہستہ سے کہا۔
''فکر مت کرو میں ابھی آتی ہوں۔''
''تم دونوں چپ کر کے بیٹھو گی۔'' میں نے لہجے کو سفاک بنا کر کہا۔''کوئی غیر ضروری آواز نکالی تو آواز ہمیشہ کے لیے بند کر دوں گا۔'' میں نے زہرہ کی طرف دیکھا۔''جاؤ اور اسے لے آؤ۔''
اس نے سر ہلایا اور کمرے سے نکل گئی۔ ٹارچ زہرہ کے پاس تھی لیکن اس دوران میں فوزی کی ساتھی لڑکی نے اپنی ٹارچ جلالی تھی اور اس کی روشنی میں وہ صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ فوزی نے ہمت کر کے پوچھا۔
''تم کون ہو؟''
''ان لوگوں کا دشمن......'' میں نے جواب دیا۔''مجھے یہاں سے نکلنا ہے اور کسی نے میرے راستے میں آنے کی کوشش کی تو میں اسے مار دوں گا۔''
''ہم......ہم کچھ نہیں کریں گے۔'' فوزی نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

''جب ہم یہاں سے نکل جائیں تب بھی خاموش رہنا۔'' میں نے کہا۔ ''اب بالکل چپ ہو جاؤ ذرا آواز نہ نکلے۔''

میں اپنی ساری توجہ باہر کی طرف رکھنا چاہتا تھا۔ زہرہ قیصر کو لانے گئی تھی اور اگر وہ کامیاب ہو جاتی تو مجھے اس پر قابو رکھنے کے لیے پوری طرح مستعد رہنا تھا۔ میں نے ایک بار پھر لڑکیوں کو دھمکایا کہ وہ آواز نہ نکالیں مگر پھر مجھے خیال آیا کہ زہرہ قیصر کو اس کمرے میں لائے گی تو وہ ان لڑکیوں کو دیکھ کر چونکے گا۔ میں نے کمرے کے ساتھ واش روم میں جھانکا۔ وہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں نے لڑکیوں کو حکم دیا۔ ''اندر جاؤ اور بالکل خاموش رہنا چاہے کمرے میں کچھ بھی ہو جائے۔ آواز نہ نکلے۔''

وہ اتنی دہشت زدہ تھیں کہ انہوں نے حکم کی فوری تعمیل کی اور واش روم میں چلی گئیں۔ میں نے ٹارچ ان کے پاس رہنے دی۔ کمرے میں تاریکی چھا گئی تھی اور یہ اس لحاظ سے اچھا تھا کہ قیصر کو میں نظر نہیں آتا۔ زہرہ کو گئے ہوئے پانچ منٹ ہونے کو آئے تھے۔ اب مجھے خدشہ ہونے لگا تھا کہ کہیں قیصر نے خطرہ بھانپ کر اسے نہیں روک لیا تھا۔ دس منٹ بعد میں خود باہر جانے کے لیے تیار ہو گیا تھا کہ مجھے باہر سے زہرہ کی مخصوص ہنسی سنائی دی۔ یہ ہنسی یقیناً مجھے خبردار کرنے کے لیے تھی۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

''اتنی بے تابی کیا ہے اندر تو چلو۔''

قیصر یقیناً اس کے حسن کے جال میں پھنس گیا تھا اور اس کی عقل گھاس چرنے جا چکی تھی ورنہ وہ سوچ سکتا تھا کہ جب عمارت کی لائٹ چلی گئی تھی تو عین اسی وقت زہرہ کیوں اس کے پاس آئی اور اسے چلنے پر اکسا رہی تھی۔ زہرہ کا کہنا درست تھا وہ اس پر ٹھیک سے لٹو تھا۔ جیسے ہی دروازے کا لٹو گھوما میں مستعد ہو گیا تھا۔ زہرہ پہلے آئی اور اس نے جان بوجھ کر ٹارچ کا رخ دوسری طرف رکھا تھا۔ قیصر نے اندر قدم رکھا اور پھر شاید اس کی چھٹی حس نے خبردار کیا میں نے اس کے سر پر وار کیا تھا مگر وہ اس کے سر پر نہیں لگا تھا۔

میں نے قیصر کے سر پر وار کیا مگر ایک سیکنڈ کے اندر وہ مستعد ہو گیا تھا۔ میں نے پستول کا دستہ اس کے سر پر مارنا چاہا تھا لیکن اس کے حرکت میں آنے کی وجہ سے، وہ اس کے شانے پر لگا، اس کا یہ ہاتھ بے کار ہو گیا تھا۔ اس نے فوراً عقب سے مجھے لات ماری جو بچاتے ہوئے بھی میرے بائیں گھٹنے پر لگی۔ ایک لمحے کو درد کی شدت نے مجھے تڑپا دیا تھا اور میں گرنے لگا تھا۔ گرتے گرتے بھی میں نے اس کی ٹانگ پکڑ کر کھینچ لی اور وہ منہ کے بل گرا تھا۔ ہڑ بونگ میں ٹارچ زہرہ کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ گرتے ہوئے میں نے پستول پر گرفت مضبوط رکھی تھی اس نے پاؤں چلایا تو اس کا پاؤں میری گرفت سے آزاد ہو گیا تھا۔ اس کے پاس رائفل تھی اور لازمی طور پر پستول بھی تھا۔ زہرہ کے ہاتھ سے گرنے والی ٹارچ لڑھک کر بیڈ کے پاس چلی گئی تھی۔ اس کی روشنی کے انعکاس سے کمرا کسی قدر روشن تھا۔ قیصر زمین سے اٹھ رہا تھا۔ اسے اٹھتے دیکھ کر میں نے زمین سے جست لگائی اور اسے لیتا ہوا نیچے جا گرا۔ اس نے تڑپ کر مجھے اچھالنے کی کوشش کی مگر میں اس سے چمٹا رہا۔ اس کے ہاتھ میری نظروں سے اوجھل تھے اور یہ خطرناک بات تھی۔ وہ پستول نکال کر اچانک مجھے شوٹ کر سکتا تھا اور میں کسی صورت اسے اس کا موقع دینا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے دوبارہ اس کے سر پر پستول سے وار کیا مگر وہ کمزور تھا۔ وہ ایک لمحے کے لئے ساکت ہوا تھا دوسرے لمحے اس نے مجھے اچھال دیا۔ میں بستر پر جا گرا اور لڑھک کر اس کے برابر میں

دیوار کے ساتھ گرا۔ اس نے فوری جوابی حملہ کیا۔ وہ اڑتا ہوا آیا تھا اس جگہ مدافعت کا موقع نہیں تھا اس لئے میں بستر کے نیچے گھس گیا۔ وہ خالی جگہ آ کر گرا اور میں نے نیچے سے تاک کر لات چلائی جو اس کے سر پر لگی اور اس کا سر دیوار سے لگا۔ وہ کراہا مگر دوسرے وار نے اسے ساکت کر دیا تھا۔ میں اس طرف سے نہیں نکل سکتا تھا، بستر کے دوسری طرف سے نکلا۔ زہرہ نے ٹارچ اٹھالی تھی۔ میں نے بے تابی سے پوچھا۔

''تم ٹھیک ہونا؟''

''ہاں لڑائی شروع ہوتے ہی میں ایک طرف ہوگئی تھی۔'' اس نے بتایا۔

''میں نے بے ہوش قیصر کا معائنہ کیا۔ وہ کسی قدر لمبا اور ٹھوس جسامت کا شخص تھا۔ وہ لڑائی میں ماہر لگتا تھا ذرا سی چوک ہوتے ہی وہ مجھ پر حاوی ہو جاتا۔ سر پر لگنے والی ضربوں کی وجہ سے وہ بے ہوش تھا مگر کب اسے ہوش آ جائے یہ کہنا مشکل تھا۔ میں نے لڑکیوں کے دوپٹوں سے اس کے ہاتھ پاؤں باندھے اور منہ میں بھی ایک کپڑا ٹھونس دیا۔ زہرہ یہ سب دیکھ رہی تھی۔ ''بس اب چلو۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''نہیں اسے لے کر جانا ہے۔ یہی تہہ خانے سے باہر جانے کا راستہ بتائے گا۔''

''اور ان دونوں کو؟'' اس نے لڑکیوں کے بارے میں پوچھا۔

''ان کو چھوڑ جاتے ہیں مگر یہ شور کریں گی۔'' میں نے کہتے ہوئے سوچا۔ 'ان کو بھی لے چلو۔ سمجھا دینا آواز نہ نکلے۔''

''ان کو لے جانا بے وقوفی ہوگی۔''

''اور چھوڑ کر جانا اس سے بھی بڑی بے وقوفی ہوگی۔ ان کو تیار کرو اور یہ پستول رکھو، دھمکاتی رہنا بھاگنے کی کوشش کریں تو بے دریغ گولی مار دینا۔''

زہرہ نے ان دونوں کو نکالا اور ان کو بتایا کہ ہم تہہ خانے جا رہے ہیں۔ وہ آواز نکالنے یا کسی کو مدد کے لئے بلانے کی کوشش نہ کریں۔ نائٹی والی لڑکی نے افراتفری میں اردگرد پھیلے اپنے کپڑے تلاش کر کے پہنے۔ اس کی حالت بتا رہی تھی کہ عام زندگی میں ان کی اخلاقی حالت کتنی پتلی تھی۔ میں نے قیصر کی رائفل ایک طرف ڈال دی تھی اور اس کا پستول زہرہ کے حوالے کر دیا تھا۔ ہم کمرے سے نکلے تو فوزی سب سے آگے تھی، اس کے بعد زہرہ، ہمارے درمیان میں شہلا تھی اس کا نام مجھے بعد میں پتا چلا تھا۔ ہم بغیر کسی دقت کے تہہ خانے کے دروازے تک پہنچے اور اندر داخل ہو گئے تھے۔ حیرت انگیز طور پر تہہ خانے میں روشنی تھی یعنی اس کا بجلی کا سسٹم الگ تھا۔ میں نے اندر آتے ہی دروازہ اندر سے بولٹ کر دیا تھا۔ اب کوئی اتنی آسانی سے اندر نہیں آ سکتا تھا۔

ہم نیچے آئے، پول والے حصے کی طرف سے بھاپ سی اٹھ رہی تھی اور تہہ خانے میں خاصی سردی تھی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے زہرہ کی طرف دیکھا۔ وہ سر ہلاتی ہوئی ایک دروازے کی طرف بڑھی۔ ہم طے کر کے آئے تھے کہ آواز نہیں نکالنی ہے۔ ممکن ہے تہہ خانہ نگرانی میں ہو۔ زہرہ نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا اور اشارے سے مجھے بلایا۔ میں نے دونوں لڑکیوں کو بھی چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ بادل ناخواستہ قدموں سے آگے بڑھیں، میں ان کے پیچھے تھا، کمرے میں داخل ہو کر میں نے قیصر کو میز پر ڈال دیا۔ زہرہ سوئچ بورڈ کے پاس کھڑی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''تم نے کوئی بٹن تو نہیں دبایا ہے؟''

''میں نے کوئی بٹن نہیں دبایا ہے۔''

''ابھی دبانا بھی مت۔'' میں نے کہا اور سوئچ بورڈ کا جائزہ لیا۔ اس پر کل پانچ بٹن تھے۔ زہرہ نے اس شخص کو تہہ خانے کا دروازہ کھولنے کے لئے بٹن دباتے دیکھا تھا۔ اسے یاد تھا آخری دو بٹن بائیں کے تھے لیکن پہلا بٹن کون سا تھا وہ اس بارے میں کنفیوژ تھی۔ تجربہ کیا جا سکتا تھا مگر خدشہ یہ تھا کہ غلط بٹن دبانے کی صورت میں کہیں کوئی الارم نہ بجنے لگے۔

''تمہیں یقین ہے تم نے تین بٹن دبانے کی آواز سنی تھی؟'' میں نے زہرہ سے پوچھا۔

''صرف آواز نہیں سنی تھی، دیکھا بھی تھا۔'' اس نے یقین سے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا اور پہلا بٹن اور پھر چوتھا اور پانچواں بٹن دبایا مگر کچھ نہیں ہوا۔ کوئی خفیہ راستہ نمودار نہیں ہوا یعنی میں نے غلط بٹن دبایا تھا۔ میں نے وقت ضائع کئے بغیر دوسرا بٹن اور پھر آخر کے دونوں بٹن دبائے۔ اس بار بھی کوئی راستہ نمودار نہیں ہوا تھا۔ اب آخری راستہ تھا۔ میں نے لگاتار آخری تینوں بٹن دبائے اور پُر امید نظروں سے اس دیوار کی طرف دیکھا جس میں بقول زہرہ کے دروازہ نمودار ہوا تھا مگر یہ کوشش بھی رائیگاں گئی۔

''راستہ نمودار نہیں ہوا، کیوں؟'' زہرہ نے اضطراری لہجے میں کہا۔

''اس کی وجوہات ہو سکتی ہیں۔'' میں نے سکون سے کہا۔ ''ایک میکنزم کام نہیں کر رہا ہے، دوسرے ہم غلط بٹن دبا رہے ہیں۔''

''اب کیا ہوگا؟''

''جو تقدیر میں لکھا ہے۔'' میں نے حقیقت پسندی سے کام لیا۔ ''ان بے چاریوں کو بلاوجہ لے آئے۔ ان کو اوپر ہی چھوڑ آتے۔'' میں نے افسوس سے لڑکیوں کی طرف دیکھا۔

''ہمیں جانے دو۔'' فوزی گڑگڑائی تھی۔ ''ہمارا کوئی قصور نہیں ہے۔''

''اب تم اوپر گئیں تو وہ تمہیں ہمارا ساتھی سمجھیں گے اور تم جانتی ہو یہ غداروں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔'' زہرہ نے ان سے کہا۔

''ہم تمہارے ساتھ نہیں ہیں۔'' شہلا چلائی۔ ''تم ہمیں زبردستی لائے ہو۔''

''یہ بات وہ نہیں مانیں گے۔'' میں نے ان کو سمجھایا۔ ''فی الحال تم دونوں خاموش ہو کے بیٹھو۔'' میں نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ تہہ خانے کا ہال خالی نظر آ رہا تھا مگر زیادہ دیر نہیں گزرتی جب اوپر والے ہمارے فرار سے واقف ہو جاتے اور وہ نیچے کا رخ کرتے۔ اگر ہم خفیہ تہہ خانے کا راستہ نہ تلاش کر پاتے تو چوہوں کی طرح پکڑے جاتے۔ فوزی اور شہلا ایک طرف خاموش کھڑی تھیں جبکہ زہرہ بے تابی سے دیوار ٹٹول رہی تھی جیسے انگلیوں سے راستہ کھول لے گی۔

''بے کار ہے راستہ اس طرح نہیں ملے گا۔'' میں نے اس سے کہا اور بے ہوش قیصر کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ بتائے گا۔''

''یہ تو بے ہوش ہے۔''

''ابھی ہوش میں لے آتے ہیں۔'' میں نے ایک طرف رکھی پانی کی بوتل اٹھا کر قیصر کے سر پر الٹ دی۔ موسم کی مناسبت سے پانی یخ ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر پڑا تو اچھا ردِعمل ہوا۔ ایک منٹ میں وہ ہوش میں آنے لگا تھا۔ میں نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا۔ ''شاباش جاگ جاؤ ورنہ ہمیشہ کی نیند سو جاؤ گے۔''

ایک منٹ بعد وہ پوری طرح ہوش میں تھا اور مجھے گھور رہا تھا پھر اس نے مجھے مطلع کیا۔ ''تم نے اچھا نہیں کیا ہے شہباز......اپنے حق میں......''

''میں عام طور سے اپنے حق میں اچھا نہیں کرتا ہوں لیکن تمہیں میں نصیحتیں سننے کے لئے ہوش میں نہیں لایا ہوں۔''

''پھر کیا چاہتے ہو تم؟''

''اس کمرے کو غور سے دیکھو۔ تم اس وقت تہہ خانے میں ہو اور مجھے خفیہ تہہ خانے میں جانے والا راستہ کھول کر دو گے۔''

''خفیہ تہہ خانہ۔'' اس کے لہجے میں حیرت تھی۔ ''میں سمجھا نہیں۔''

''تم اتنے معصوم نہیں ہو جتنا خود کو ظاہر کر رہے ہو۔ تم لوگ پہرا کس چیز پر دیتے تھے۔ شام کے بعد اس جگہ آنے پر پابندی کیوں ہے؟''

''پتا نہیں، تم کیا کہہ رہے ہو؟'' اس نے خونخوار لہجے میں کہا۔ ''مجھے کھول دو ورنہ تمہارا انجام دردناک ہو گا۔ بات ابھی مجھ تک ہے، شمشاد یا شاہنواز تک پہنچی تو......''

''تمہیں کتوں کے سامنے ڈال دیا جائے گا۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''تم اس کی کیا وضاحت پیش کرو گے زہرہ کے ساتھ اس کمرے میں کیوں گئے تھے۔''

اس کے چہرے کا رنگ بدلا تھا مگر اس نے ہمت نہیں ہاری۔ ''میں بتاؤں گا یہ مجھے دھوکے سے لے گئی تھی۔ کمرے میں پڑی لاش دکھانے۔''

''پھر وہ لاش کہاں گئی؟''

جواب دینے کے بجائے اس نے شرربار نظروں سے زہرہ کی طرف دیکھا اور پھر لڑکیوں کو گھورا۔ ''یہ بھی تمہارے ساتھ ہیں؟''

''ان کو مجبوراً لانا پڑا ورنہ یہ چیخ چلا کر سب کو جمع کر لیتیں۔ زہرہ تمہیں ان کے کمرے میں لائی تھی۔''

''کتیا......'' اس نے دانت پیس کر کہنا چاہا کہ میں نے بے رحمی سے پستول کا دستہ اس کے منہ پر مارا۔ اس کے سامنے کے دو دانت ٹوٹ گئے اور ہونٹ پھٹ گئے تھے، اس نے بے ساختہ چیخ ماری تھی۔

''اب کوئی اور غلط لفظ منہ سے نکالا تو دو دانتوں سے اور محروم ہو جاؤ گے۔ سولہویں دفعہ میں تمہارے منہ میں دانت نام کی کوئی شے نہیں ہو گی۔ ممکن ہے منہ بھی نہ باقی رہے۔''

اس نے خون کی کلی کی۔ اس چوٹ نے اسے مشتعل کر دیا تھا مگر اس نے مزید بکواس کرنے سے گریز کیا۔ غالباً وہ دل ہی دل میں ہم سے بدلہ لینے کے منصوبے بنا رہا تھا۔ ''مجھے بہر صورت تہہ خانے میں جانے والا راستہ درکار ہے۔''

''مجھے نہیں معلوم۔'' اس نے تکلیف دہ لیکن سرکش لہجے میں کہا۔ ''جس کو معلوم ہے اس سے معلوم کرلو۔''

''تم اس طرح نہیں مانو گے۔'' میں نے اسے کھینچ کر اوندھے منہ لٹایا۔ وہاں پر ایک طرف استری رکھی تھی۔ اسے پلگ کر کے میں نے قیصر کی کمر پر رکھ دیا۔ وہ تڑپا تھا۔ میں نے استری کو زیرو پر رکھا تھا اور ابھی یہ گرم نہیں تھی۔ فوزی اور شہلا ایک دوسرے سے لپٹی تھر تھر کانپ رہی تھیں۔

''ابھی میں استری گرم کروں گا۔ پہلے یہ تمہاری کھال جلائے گی، اس کے اندر چربی کی تہہ پگھلائے گی اور آخر میں تمہارے گوشت اور ہڈیوں کو جلائے گی۔''

''تم مجھ سے کچھ نہیں معلوم کر سکتے۔'' اس نے ضدی لہجے میں کہا۔

''ابھی پتا چل جاتا ہے۔'' میں نے کہا اور زہرہ کو اشارہ کیا کہ وہ باہر نظر رکھے ایسا نہ ہو اوپر سے اچانک کوئی آجائے۔ میں نے استری کا تھرمو اسٹیٹ گھمایا۔ یہ ہلکی اور فوری گرم ہو جانے والی استری تھی۔ چند سیکنڈ بعد وہ کلبلانے لگا اور پھر یک دم حلق پھاڑ کر چلایا۔ ''حرامزادے۔''

''میں نے درجہ حرارت اور بڑھایا۔'' ابھی کھال پر آبلہ بھی نہیں آیا ہے اور تم شور کر رہے ہو۔ بعد میں تم بتاؤ گے تو اپنے نقصان کی تلافی بھی نہیں کر سکو گے۔''

میں نے استری ہٹائی تھی تو اسے ذرا سکون ملا تھا۔ ''دیکھو، مجھے نہیں معلوم۔'' اس نے رک رک کر کہا۔

''میں صرف پہریدار ہوں...... نیچے کا۔'' اس نے جملہ چھوڑ کر چیخ ماری تھی کیونکہ میں نے استری اس کے دائیں کولہے پر رکھ دی تھی۔ اسے دباتے ہوئے کہا۔

''مجھے بے وقوف مت بناؤ۔ میں پہلے ہی خاصا بے وقوف ہوں۔ تم اپنے پورے جسم کی استری کروانا چاہتے ہو تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔''

استری کی گرمائش نے اس کی کھال جلانا شروع کر دی تھی اور گوشت جلنے کی بو آرہی تھی اگرچہ اس میں اور تکے بھننے کی خوشبو میں خاص فرق نہیں تھا مگر انسانی گوشت جلنے کی بو سے ہمیشہ کراہت آتی ہے اور تکوں کی بو سے منہ میں پانی آجاتا ہے۔ قیصر اب ذبح کئے ہوئے بکرے کی طرح چلا رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر استری ہٹالی۔

''اب بھی وقت ہے بتا دو ورنہ میں تمہارے دونوں کان جلا دوں گا یا کوئی ایسا عضو جلا دوں گا کہ تم بظاہر مرد دکھائی دو گے مگر مرد نہیں رہو گے۔''

''نہیں، خدا کے لئے نہیں۔'' اس نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔ ''بتاتا ہوں، ابھی بتاتا ہوں۔ پپ...... پانی دو۔''

''پہلے راستہ بتاؤ پھر پانی بھی مل جائے گا۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''تم نے مجھے سبق نہیں سنانا ہے طریقہ بتاؤ جس سے دروازہ کھل جائے۔''

کمرے میں دو عدد منرل واٹر کی پانچ لیٹر والی بوتلیں پڑی تھیں۔ ''نہیں، پہلے پانی، خدا کے لئے......''

میں نے فوزی کو اشارہ کیا کہ وہ پانی لے کر آئے۔ اس نے گلاس میں پانی نکالا۔ قیصر نے سر اٹھایا اور فوزی نے گلاس اس کے منہ سے لگا دیا۔ اسی لمحے زہرہ نے کہا۔ ''کچھ لوگ نیچے آئے ہیں وہ ستونوں کے پیچھے چھپ رہے ہیں۔''

میں نے جھانک کر دیکھا۔ سیڑھیوں کے پاس ستونوں کے عقب میں کم سے کم تین افراد کی موجودگی صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔ مختلف زاویوں سے لگے بلبوں کی روشنی میں فرش پر سائے بن رہے تھے۔ میں نے پستول نکالا اور ایک ستون کا نشانہ لے کر فائر کیا۔ تہہ خانے میں پستول کے فائر کی آواز بم کے دھماکے کی طرح گونجی تھی۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟" زہرہ گھبرا کر بولی۔

"ان کو بتا رہا ہوں کہ ہم نہتے نہیں ہیں۔" میں نے اسے پستول تھمایا۔ دروازے سے ایک طرف رہو اگر انہوں نے فائر کیا تو......"

میرا جملہ ادھورا رہ گیا تھا۔ باہر سے کسی نے فائر کیا اور گولی دروازے سے لگی تھی۔ یہ ٹھوس پلائی کا بنا دروازہ تھا اس لئے پار نہیں ہو سکی تھی۔ زہرہ جلدی سے اوٹ میں ہو گئی تھی۔ باہر سے کوئی چلایا۔ "شہباز ہتھیار پھینک دو ورنہ کتے کی موت مارے جاؤ گے۔"

میں قیصر کی طرف پلٹا تو وہ مسکرا رہا تھا اور اس کی مسکراہٹ اشتعال انگیز تھی۔ "تہ خانے کا راستہ بتاؤ۔" میں نے کہا۔

"ان سے پوچھنا جو باہر آئے ہیں۔" وہ زور سے بولا۔

میں نے اس کے منہ پر پھر پستول مارا۔ اس کا منہ دوسری طرف ہو گیا اور وہ ساکت ہو گیا تھا۔ میں نے پستول چیک کی۔ اس میں بیالیس گولیوں کا ایک میگزین تھا اور دوسرا میگزین میری جیب میں تھا۔ دو عدد پستول تھے۔ اسلحے کے لحاظ سے صورت حال مایوس کن نہیں تھی تو حوصلہ افزا بھی نہیں تھی۔ ایک رائفل اور دو پستولوں کے ساتھ ہم ان درجنوں مسلح افراد کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے جو باہر بہتر پوزیشن میں تھے اور ہماری عافیت اسی میں تھی کہ کسی طرح تہہ خانے تک جانے کا راستہ کھل جائے۔ باہر سے بار بار مجھے وارننگ دی جا رہی تھی۔ زہرہ اور لڑکیاں ایک طرف ہو گئی تھیں۔ میں نے ذرا سا دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ وہ لوگ قریبی ستونوں تک آ گئے تھے۔ آخری ستون دروازے سے محض دس فٹ کے فاصلے پر تھا۔ یہاں سے وہ ہمارے خلاف کارروائی کر سکتے تھے۔

میرا ذہن تیزی سے امکانی صورت حال پر غور کر رہا تھا۔ وہ مجھے مارنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ اس معاملے میں ان پر مرشد علی کا دباؤ تھا مگر ہمیں زندہ گرفتار کر لینا بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ قریب سے فائرنگ کر کے وہ دروازے کو گرا سکتے تھے یا اس میں سوراخ کر سکتے تھے اور اس کے بعد وہ گیس والے بم اندر پھینک کر ہمیں بے بس کر دیتے۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ میں خودکشی کا فیصلہ کر کے ان پر چڑھ دوڑوں اور وہ میرے ہاتھوں مارے جائیں۔ نہیں جب ان کی جان پر بنے گی تو وہ بلاتکلف مجھے مار دیں گے۔ میں نے پھر پستول سے فائر کیا اگرچہ ان کو روکنے کے لئے بے سود تھا بلکہ اس سے میری بے بسی اور بھی واضح تھی کہ میرے پاس اسلحے کی قلت ہے۔ زہرہ سوئچ بورڈ کے پاس کھڑی بار بار بٹن دبا رہی تھی کہ شاید تہہ خانے کا دروازہ کھل جائے مگر ابھی تک ایسے آثار نظر نہیں آئے تھے۔ دروازے کے میکنزم کو کہیں اور سے جام کر دیا گیا تھا ورنہ کوئی نہ کوئی کامبی نیشن تو کام کرتا۔

"یہ کام نہیں کر رہا۔" زہرہ نے پریشانی سے کہا۔ "ہم پکڑے جائیں گے۔"

"اتنی آسانی سے نہیں۔" میں نے کہا اور دروازے کی اوٹ سے پہلی بار ان لوگوں سے کہا۔ "شمشاد، شاہ

نواز تم میں سے کوئی میری بات سن رہا ہے۔"

"میں موجود ہوں۔" شمشاد کی آواز آئی۔

"اپنے آدمیوں کو پیچھے ہٹالو ورنہ میں قیصر اور ان دونوں لڑکیوں کو مار ڈالوں گا۔"

"ایسا کر کے تم ہمارا کام ہی کرو گے ان کے لئے سزا کا فیصلہ ہو چکا ہے۔" شمشاد نے سکون سے کہا۔
"ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے اگر تم ہتھیار ڈال دو اور تم مرنے کا فیصلہ کر چکے ہو تو اب ہم کیا کر سکتے ہیں۔"
لڑکیوں کے چہرے زرد پڑ گئے تھے۔ انہوں نے رونا چلانا شروع کر دیا کہ وہ بے گناہ ہیں اور میں ان کو زبردستی لے کر آیا تھا۔ "خاموش۔" میں نے دہاڑ کر کہا۔ "بکواس کرتے ہیں یہ، تم ان کی کمائی کی مشینیں ہو، اپنی کمائی کے ذریعے کو کوئی ختم کرتا ہے۔"

"تم ان کو نہیں جانتے۔" فوزی نے روتے ہوئے کہا۔ "یہ بہت سفاک لوگ ہیں۔"

زہرہ نے ان کی تائید کی۔ "وہ سب کو مار دیں گے کیونکہ ہم تہہ خانے کے راز سے واقف ہو گئے ہیں۔"

"اس طرح تو میں بھی جان گیا ہوں، مجھے کیوں چھوڑیں گے؟"

"تمہاری بات دوسری ہے اوّل تو تم ان کی قید میں ہو۔ یہ تمہیں رہا نہیں کریں گے، دوسرے تم حویلی سے تعلق نہیں رکھتے ہو، اس لئے تہہ خانے کا راز جاننا تمہارے لئے بے کار ہے۔"

زہرہ کا تجزیہ اس حد تک درست تھا کہ وہ مجھے رہا نہیں کرتے اس لئے تہہ خانے کا راز بھی راز ہی رہتا مگر یہ ناممکن تھا کہ ان کی اس کی پروا نہ ہو۔ اگر میں اس راز کے ساتھ فرار ہو جاتا تو یہ پہلی فرصت میں تہہ خانے سے تمام ممنوعہ اشیاء ہٹا کر اسے خالی کر دیتے۔ میں سوچ میں گم تھا کہ اچانک زہرہ چلائی۔

"شہباز بچو۔"

خود مجھے بھی آنکھوں کے گوشے سے حرکت کا احساس ہوا تھا اور میں نے بروقت سر نیچے کیا ورنہ استری میرے سر پر لگتی۔ نہ جانے کیسے قیصر نے اپنے ہاتھ کھول لئے تھے اور چالاکی سے کام لیتے ہوئے بے سدھ پڑا تھا۔ جب اس نے مجھے غافل پایا تو پہلے استری اٹھا کر ماری اور پھر خود مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ رائفل میرے ہاتھ میں تھی مگر مجھے استعمال کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ میں اس طرح گرا کہ وہ میرے اوپر تھا اور رائفل ہم دونوں کے درمیان میں تھی۔ وہ اپنے زخموں کو بھول کر بقا کی جنگ لڑ رہا تھا۔

"زہرہ دروازے کا خیال رکھو۔" میں نے چلا کر کہا۔ قیصر مجھ سے رائفل چھیننے کی کوشش کر رہا تھا ساتھ ہی میرے سر کو نشانہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے خاصی جدوجہد کے بعد اسے اچھال کر دور پھینکا بدقسمتی سے وہ سیدھا زہرہ کے پاس جا کر گرا۔ جب تک میں نے اٹھ کر رائفل اس کی طرف سیدھی کی اس نے ناقابلِ بیان پھرتی سے زہرہ کو جکڑ کر اس کا پستول چھین لیا تھا اور اس کے سر پر رکھ دیا۔

"بس اب حرکت کی تو میں اسے مار دوں گا۔" اس نے پھنکار کر کہا۔

"اپنے بارے میں تم باہر والوں کا فیصلہ سن چکے ہو۔" میں نے اسے یاد دلایا۔ "اس لئے ہمارا ساتھ دو میں تمہیں یہاں سے نکال کر لے جاؤں گا۔"

"بکومت، میں غدار نہیں ہوں۔ وہ مجھے ماریں یا بخش دیں میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔" اس نے

کہتے ہوئے اچانک زہرہ کو میری جانب دھکا دیا۔ اس کے حرکت میں آتے ہی میں بھانپ گیا تھا۔ میں فرش پر گرا اور زہرہ میرے پیروں سے الجھ کر گری۔ اس سے پہلے قیصر مجھے گولی مارتا، میں نے برسٹ مارا۔ وہ چلایا۔ اس کے ہاتھ سے پستول گر گیا تھا اور وہ خود دروازے کے باہر جا گرا۔ میں نے پھرتی سے رول کر کے دروازے کو لات ماری اور دروازہ بند ہو گیا۔ میں نے اٹھ کر اسے بولٹ کر دیا۔ قیصر بچ نکلا تھا۔ اس کے بازو میں گولی لگی تھی۔ میں ایک لمحے کی تاخیر کرتا تو وہ مجھ پر گولی چلا دیتا۔

''شہباز......'' زہرہ خوشی سے چلائی۔ ''دیکھو دروازہ۔''

میں نے پلٹ کر دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ تہہ خانے میں جانے والا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ''یہ کیسے ہوا؟''

''پتا نہیں۔'' زہرہ نے سوئچ بورڈ کی طرف دیکھا۔ وہ گولیوں سے چھلنی ہو گیا تھا اور شاید کسی گولی نے اندر سرکٹ کو بریک کر دیا تھا اور اس وجہ سے دروازہ کھل گیا تھا۔ یہ تائید ایزدی تھی۔ میں اس کا شکر ادا کرتا ہوا آگے آیا، سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں، میں نے لڑکیوں کی طرف دیکھا۔

''تم دونوں ہمارے ساتھ آؤ گی؟''

''میں چلوں گی۔'' شہلا نے جرأت کی۔ ''ورنہ یہ ہمیں مار دیں گے۔''

''بادل ناخواستہ فوزی نے بھی سر ہلایا۔ ''میں بھی چلوں گی۔''

اسی لمحے دروازے پر کسی نے فائر کیا۔ شاید وہ فائر کر کے بولٹ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے میز دھکیل کر دروازے کے سامنے کر دی۔ ''چلو......جلدی کرو۔''

''پہلے زہرہ گئی اس کے پیچھے فوزی اور شہلا تھیں اور آخر میں، مَیں اترا تھا۔ یہ تنگ سیڑھیاں تھیں، مجھے نیچے ایسا کوئی بٹن نظر نہیں آ رہا تھا جسے دبا کر دروازہ بند کیا جاتا۔ مگر جب سیڑھیاں اتر کر تہہ خانے میں آیا تو ایک سرخ بٹن نظر آیا تھا۔ میں نے اسے دبایا تو اوپر کا دروازہ بند ہو گیا۔ دوبارہ دبایا تو دروازہ کھل گیا۔ اسی لمحے اوپر سے برسٹ چلا اور میں نے دروازہ ٹوٹنے کی آواز سنی تھی۔ میں نے دوبارہ بٹن دبایا اور دروازہ بند ہونے لگا۔ میں نے رائفل سیدھی کی۔ ایک شخص دروازے پر نمودار ہوا۔ میں نے بنا تذبذب کے اس پر فائر کر دیا اور وہ پیچھے جا گرا۔ گولیاں اس کے سینے اور پیٹ پر لگی تھیں، کچھ گولیاں اس کے عقب سے چلیں مگر ان کا نشانہ کوئی نہیں تھا۔ اسی لمحے دروازہ بند ہو گیا۔ فوزی اور شہلا ایک طرف سہمی کھڑی تھیں اور زہرہ پیٹیوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ ''ان سب میں اسلحہ ہے۔'' اس نے یقین سے کہا۔

''ابھی دیکھ لیتے ہیں۔'' میں نے پنڈلی سے بندھا خنجر لیا اور ایک طرف رکھی پیٹیوں پر چڑھ گیا۔ رائفل میں نے زہرہ کو دے دی تھی۔ پیٹی پر چاروں طرف سے فولادی پتری لگا کر اسے بند کیا گیا تھا۔ میں نے خنجر سے پتری کاٹ دی پھر ایک طرف تختے تلے خنجر پھنسا کر زور لگایا تو کیلوں نے چرچراہٹ کے ساتھ اپنی جگہ چھوڑ دی۔ ذرا سی محنت کر کے میں دو تختے الگ کرنے میں کامیاب رہا۔ اندر موٹی گھاس بطور پیکنگ رکھی گئی تھی۔ میں نے ہاتھ مار کر اسے ہٹایا تو نیچے سے سیلوفین میں لپٹی ایک رائفل ہاتھ میں آ گئی۔ یہ کسی حد تک جی تھری سے ملتی جلتی تھی جو ہمارے ملک میں آرمی کے جوانوں کو دی جاتی ہے۔ یہ شاید جی ٹو رائفل تھی جو بھارت میں تیار ہوتی ہے۔ اس کی اصل دوسری جنگ عظیم میں جرمنی میں تیار ہوئی تھی اور وہ جی ون رائفل کہلاتی تھی۔ کلاشنکوف اور ایم

سولہ رائفلوں کے ساتھ اس کا شمار دنیا کی بہترین اسالٹ رائفلوں میں ہوتا ہے۔ میرے اندر وسوسے اور خدشات سر سرانے لگے تھے۔ یہ فوجی نوعیت کا اسلحہ کہاں سے آیا تھا اور کہاں بھیجا جا رہا تھا۔ پیٹی میں صرف رائفلیں تھیں، اس کے میگزین نہیں تھے۔ میں نے دوسری پیٹی کھولی اس میں بھی رائفلیں تھیں۔ اس قطار کی تمام پیٹیوں میں شاید یہی ہلاکت خیز اسلحہ بھرا ہوا تھا۔ پچاس بائی پچاس کے اس تہہ خانے میں سیکڑوں کے حساب سے پیٹیاں تھیں۔

"باہر جانے والا راستہ کس طرف ہو سکتا ہے؟" میں نے زہرہ سے پوچھا۔

"باہر جانے والا راستہ جہنم کی طرف جاتا ہے۔" اچانک ہی کسی کی آواز آئی۔ "شہباز ابھی تک تمہارے ساتھ نرمی کی گئی ہے۔ اس کا ناجائز فائدہ مت اٹھاؤ۔"

"تم شاید شاہ نواز ہو۔" میں نے کہا۔ "میں نے تم سے کبھی کوئی نرمی نہیں مانگی۔ میں دلالوں سے کچھ مانگنے کا قائل نہیں ہوں۔" جواب میں اس نے گالیاں دینا شروع کر دی تھیں۔ میں ہنسا۔ "اب تم آئے ہو نا اپنی اوقات پر۔"

"شہباز میں آخری بار کہہ رہا ہوں باہر آ جاؤ۔"

"ورنہ تم اپنے کمانڈوز بھیج دو۔ اس جگہ ایک گولی چلنے کا مطلب سمجھتے ہو۔ تمہارا اڈا سرے سے غائب ہو جائے گا اور اس جگہ صرف ایک گڑھا رہ جائے گا۔"

میری اس بات پر اسے سانپ سونگھ گیا تھا، خاصی دیر بعد اس نے مصالحانہ انداز میں کہا۔ "سنو تم اگر چاہو تو تمہیں بحفاظت نکلنے کا راستہ دیا جا سکتا ہے۔"

"وہ کیسے......؟ کیا تم اپنے تمام آدمیوں کو نہتا کر دو گے اور ان کا اسلحہ لے لو گے یا خود یہاں آؤ گے کہ میں تمہیں یرغمال بنا کر نکل جاؤں۔"

"اتنا احمق نہیں ہوں میں۔"

"اور میں نظر آتا ہوں۔" میں نے طنز کیا۔ "تمہاری بات پر بھروسا کرنے کے لئے باہر آ جاؤں، اتنا احمق میں بھی نہیں ہوں۔"

اس تہہ خانے میں لگے اسپیکر ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ منسلک مائیکروفون بھی بہت طاقتور تھے۔ میں اس بات کے دوران تہہ خانے کی دیواروں کے ساتھ گھوم رہا تھا، مجھے دروازے کی تلاش تھی اور وہ مجھے تیسری دیوار پر مل گیا جو مشرق کی طرف تھی۔ ایک بڑا سا ہینڈل لگا تھا اور خاص بات یہ تھی کہ وہ فولادی پٹ جو اس راستے پر لگائے گئے تھے ان پر ایک عدد تالا لگا تھا۔ تہہ خانے میں اترتے وقت مجھے خیال آیا تھا کہ اگر اس سے باہر نکلنے کا کوئی اور راستہ تھا تو شاہ نواز کے گرگے اس سے اندر آ سکتے تھے۔ اب سمجھ میں آیا کہ وہ کیوں نہیں آ سکے تھے۔ عین ممکن تھا کہ وہ ان فولادی پٹوں کے پیچھے ہوں مگر اندر آنے کے لئے ضروری تھا کہ کوئی اندر سے یہ تالا کھولے۔ حفاظتی نقطۂ نظر سے یہ بے حد ضروری تھا کہ بغیر اجازت کے کوئی باہر سے اس تہہ خانے تک رسائی حاصل نہ کر سکے۔

"شہباز تم کب تک یہاں رہو گے؟" شاہ نواز نے خاصی دیر بعد کہا۔ "تمہیں کبھی نہ کبھی تو اس جگہ سے

کالا ہوگا۔"

"احمق آدمی...... تمہیں کس نے اس جگہ کا سربراہ بنایا ہے۔ میرا خیال ہے یہ سارا سیٹ اَپ مرحوم جامی شاہ کا ہوگا ورنہ تم صرف دلالی کے لئے موزوں ہو۔" میں نے ایک اور پیٹی پر چڑھتے ہوئے کہا۔ "میں محصور ہونے کے لئے اس تہہ خانے میں نہیں آیا ہوں۔ مجھے معلوم تھا یہاں کیا ہے اور میں ذرا بندوبست کر رہا ہوں۔ اس کے بعد تم خود مجھے بحفاظت یہاں سے نکالو گے۔"

"کیسا انتظام؟" اس نے تشویش سے کہا۔

میں نے پیٹی کھولی۔ اس کے اندر بارودی سرنگیں تھیں اور یہ خاصی بڑی سرنگیں تھیں جو گاڑیوں اور بڑے سائز کے ٹرکوں تک کو تباہ کر سکتی تھیں۔ اسے کھلا چھوڑ کر میں برابر والے پیٹیوں کے انبار پر چڑھ گیا۔ اس میں ایل ایم جی اور ان کے ایمونیشن باکس تھے۔ میں نے ایک گن نکالی اور ایک عدد ایمونیشن باکس بھی نکالا۔ خالی ہاتھوں سے اسے صرف ہالی وڈ کی فلموں میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ حقیقت میں یہ ٹرائی اسٹینڈ پر رکھ کر چلائی جاتی ہے ورنہ اس کا دھکا بہت خطرناک ہوتا ہے۔ طاقتور آدمی بھی بمشکل برداشت کر سکتا ہے۔ مجھے زیادہ خطرہ سیڑھیوں والے راستے کی جانب سے تھا۔ میں نے ایل ایم جی کا ٹرائی پوڈ ایک پیٹی پر رکھا جو سیڑھیوں کے عین سامنے تھی۔ اس سے ایمونیشن بکس منسلک کیا جس میں شاید کئی سو گولیاں تھیں۔ کام مکمل کر کے میں نے تجربے کے طور پر سیڑھیوں پر ایک ہلکا سا برسٹ مارا۔ تہہ خانے کی محدود فضا میں ایسا شور گونجا تھا کہ کانوں کے پردے پھٹتے محسوس ہوئے تھے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" شاہ نواز چلایا۔

"فکر مت کرو، یہ ٹیسٹ فائر تھا لیکن اگر کسی نے سیڑھیوں والے راستے سے نیچے آنے کی کوشش کی تو تم سمجھ سکتے ہو۔ یہ گن اس کا کیا حشر کرے گی۔"

"تم پاگل ہو گئے ہو۔ بارود کے ڈھیر پر بیٹھ کر گولیاں چلا رہے ہو۔" شاہ نواز کے لہجے میں سچ مچ کا خوف تھا۔

"ابھی تو میں بہت کچھ کروں گا۔" میں نے کہا۔ "شاہ نواز اتنا یاد رکھنا، میں زندہ تمہارے ہاتھ نہیں آؤں گا، ایسا موقع آیا تو میں یہ سب اڑا دوں گا۔"

"نہیں...... خدا کے لئے...... یہ کروڑوں کا اسلحہ ہے۔"

"خدا کے لئے...... کیا تم یہ اسلحہ خدا کے لئے لائے ہو۔ یہ سب جنگی نوعیت کا اسلحہ ہے جو تخریب کاروں اور اس ملک میں انارکی پھیلانے والوں کو مہیا کیا جا رہا ہے۔ تم عورتوں کے ہی نہیں، اس زمین کے بھی دلال ہو۔"

اس سے باتوں کے دوران، میں پیٹیاں کھول کر دیکھ رہا تھا، ان میں راکٹ لانچر اور راکٹ تھے۔ پستول، مشین گنیں، دستی بم، ٹائم بم، ریموٹ کنٹرول بم، فاسفورس بم جو آگ لگا دیتے ہیں، دور مار رائفلیں اور ان سب کا بے تحاشا ایمونیشن تھا۔ میں نے جی تھری رائفل کے بجائے دو عدد مشین گنیں اور ان کے میگزین نکال لئے۔ اعشاریہ پینتالیس کے دو عدد پستول لے لئے۔ یہ سب ایک نمبر اسلحہ تھا۔ بموں کو چھیڑنا میں نے مناسب

نہ سمجھا کیونکہ مجھے ان کا استعمال نہیں آتا تھا اور ایسی کوشش کا مطلب خودکشی بھی ہوسکتا تھا البتہ میں نے ان کے باکس کھلے رہنے دیئے تھے۔ رائفل اور پستول میں نے ایک پیٹی میں ڈال دیئے تھے۔ ایک نیا پستول زہرہ کو دے کر اسے استعمال کرنے کا طریقہ سمجھایا اور اسے سیڑھیوں کے پاس کھڑا کر دیا۔ فوزی اور شہلا ایک طرف بیٹھ گئی تھیں۔ اب میں نے اصل کام شروع کیا۔ پیٹیوں سے بارودی سرنگیں نکال کر پورے تہہ خانے میں جا بجا پھیلانی شروع کر دیں۔ ہر بارودی سرنگ کا وزن چار کلو تھا اور اس کا دھما کا خیز مادہ کسی بڑی گاڑی کے پُرزے کرنے کے لئے کافی تھا۔ میں نے ایسی چالیس بارودی سرنگیں پورے تہہ خانے میں رکھ دیں۔ اس کے بعد دستی بم پھیلائے اور آخر میں فاسفورس بم لگا دیئے۔ زہرہ نے کئی بار مجھ سے پوچھنے کی کوشش کی مگر میں نے اسے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کو کہا۔ سب سے آخر میں، مَیں نے ایک عدد ریموٹ کنٹرول بم کا ریموٹ نکالا۔ اس میں سیل نہیں تھے مگر دھماکا نے کے لئے یہ برا نہیں تھا۔

ریموٹ کنٹرول بم بلکہ سوائے دستی بم اور فاسفورس بم کے تمام دھما کا خیز اشیاء کے اجزاء الگ کئے تاکہ غلطی سے بھی دھما کا نہ ہو۔ حد یہ کہ بارودی سرنگوں کی وہ پلیٹ بھی نہیں تھی جس پر دباؤ پڑنے سے سرنگ دھماکے سے پھٹ جاتی ہے۔ دستی بم میں ایک چابی لگی ہوتی ہے اور دوسری پن ہوتی ہے۔ جب تک چابی نکال کر پن کو نہ چھوڑا جائے بم نہیں پھٹتا۔ یہی کچھ فاسفورس بم میں ہوتا ہے۔ ریموٹ پر سات بٹن تھے یعنی اس سے سات بموں کو یکے بعد دیگرے اڑایا جا سکتا تھا۔ میں نے اسے جیب میں رکھ لیا تھا۔ اس کے بعد میں نے شاہنواز کو پکارا۔

"میں نے اپنا کام مکمل کرلیا ہے۔ اب ہم سب بارود کے ایک ایسے ڈھیر پر بیٹھے ہیں جسے صرف ایک بٹن سے اڑایا جاسکتا ہے۔"

"تم بکواس کررہے ہو۔"

"حالانکہ میں جہاں موجود ہوں تمہیں میری بات کا فوراً یقین کرلینا چاہئے۔ میں نے وسط میں رکھی ایک پیٹی سے سات عدد ریموٹ کنٹرول بم نکال کر تہہ خانے میں ایسی جگہوں پر چھپا دیئے ہیں جہاں ان کو دو گھنٹے سے پہلے تلاش کرنا ناممکن ہے۔ اس کے علاوہ پورے تہہ خانے میں بارودی سرنگیں، دستی بم اور فاسفورس بم بکھرے ہیں تم خود سوچ سکتے ہو ایک چنگاری اس جگہ کا کیا حال کرے گی۔"

"تم مرنا چاہتے ہو؟"

"میں جینا چاہتا ہوں لیکن کسی نے میرا یہ حق چھیننے کی کوشش کی تو اسے بھی میرے ساتھ مرنا پڑے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" شاہنواز نے خاصی دیر بعد اور خاصی بے بسی سے کہا۔ "تم کیا چاہتے ہو؟"

"سب سے پہلے تو خفیہ راستے کے سامنے سے اپنے سارے کتے ہٹالو۔ میں یہ راستہ کھولنے جارہا ہوں، مجھے ایک آدمی بھی نظر نہیں آنا چاہئے۔"

"مجھے کچھ دیر کی مہلت دو۔" شاہنواز نے عجلت میں کہا۔ "میں معلوم کرتا ہوں، میرے آدمی وہاں ہیں یا نہیں۔"

میں مسکرایا۔ "اس کا مطلب تھا شاہنواز نے اپنے آدمی پہلے ہی وہاں تعینات کر دیئے تھے۔ دس منٹ بعد

اس نے پُراعتماد انداز میں کہا۔ ”تہ خانے سے باہر جانے والے راستے پر اب میرا کوئی آدمی نہیں ہے۔“

”وہ سب باہر گھیرا ڈالے میرے باہر آنے کے منتظر ہیں۔“

”نہیں، میں نے سب کو ہٹالیا ہے۔“

”تو اب تم ایک عدد گاڑی اس جگہ پہنچا دو جس طرف سرنگ نکلتی ہے۔ ایندھن پوری طرح بھرا ہوا اور کوئی گڑبڑ نہ ہو۔“

”مجھے دس منٹ اور دو۔“ شاہ نواز کے لہجے میں اطمینان آ گیا تھا۔

زہرہ نے حیرت سے مجھے دیکھا اور کچھ کہنے کی کوشش کی مگر میں نے اسے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کیا تھا۔ میں نے پھر شاہ نواز سے کہا۔ ”بہتر ہوگا تم اوپر سے حویلی خالی کرالو، ممکن ہے کسی حادثے یا تمہاری طرف سے کسی دغابازی کی صورت میں مجھے یہ سب اڑانا پڑے۔“

”فکر مت کرو، تمہارے ساتھ کوئی دغا نہیں ہوگا۔“

”یہ تو اس وقت پتا چلے گا جب ہم باہر نکلیں گے۔“ میں نے کہا اور ذرا مجبور لہجے میں کہا۔ ”مگر نکلنا تو ہے۔ بس اتنا یاد رکھنا ہم زندہ ہاتھ نہیں آئیں گے۔“

زہرہ نے ایک بار پھر کچھ کہنا چاہا مگر میں نے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ اس کے بعد میں نے رومال سے پکڑ کر ایک طرف دیوار میں لگا بلب اتارا اور اس کے ہولڈر میں لگانے والے سرے پر لوہے کی پتری لپیٹی۔ زہرہ نے مجھ سے اشارے میں پوچھا کہ یہ کیا کر رہے ہو اور میں نے اسے اشارے سے ہی سمجھایا کہ وہ دیکھتی رہے۔ میں نے بلب ہولڈر کے پاس رکھ دیا اس کے بعد زہرہ کو ایک طرف بلایا اور زمین پر پڑی گرد پر انگلی سے لکھ کر سمجھانے لگا۔ اس نے سر ہلایا کہ وہ میری بات سمجھ گئی ہے۔ اسی لمحے اسپیکر کھڑکھڑائے۔

”شہباز، ایک لینڈ کروزر آ گئی ہے۔ تم اس میں جہاں چاہو جا سکتے ہو، تمہارا راستہ نہیں روکا جائے گا۔“ اس نے کہا۔

”مثلاً جہنم۔“ میں نے دل میں سوچا۔ اس کے ساتھ ہی میں حرکت میں آیا۔ زہرہ سیڑھیوں کے پاس کھڑی تھی۔ اس نے ٹارچ روشن کر لی تھی۔ میں نے اسے اشارہ کیا تو اس نے سیڑھیوں کے اوپر والے دروازے کو کھولنے والا بٹن دبا دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے بلب اٹھا کر ہولڈر میں لگایا۔ شعلہ سا لپکا اور لائٹ چلی گئی۔ بلب ہولڈر میں نہیں سما سکتا تھا اس لئے میں نے کوشش کر کے اسے ٹھونس دیا۔ زور لگانے سے اس کا شیشہ ٹوٹا اور شاید میرے ہاتھ پر بھی لگا تھا مگر میں پروا کئے بغیر بھاگا۔ زہرہ اور دونوں لڑکیاں سیڑھیوں کے پاس کھڑی تھیں۔ اوپر سے دو افراد کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں، بول کیا رہے تھے چلا چلا کر ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ یہ کیا ہوا ہے؟ میں جھکا جھکا اوپر تک آیا۔ جیسے ہی میں دروازے کے قریب پہنچا۔ ان میں سے ایک نے ایمرجنسی لائٹ جلا دی۔ ہم نے بیک وقت ایک دوسرے کو دیکھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ میرے ہاتھ میں مشین گن تیار تھی اور وہ اپنے ہتھیاروں سے ذرا دور تھے۔ میں نے برسٹ مارا اور وہ تینوں کربناک آوازوں کے ساتھ زمین بوس ہو گئے تھے۔ لائٹ اوپر بھی نہیں تھی اور مجھے امید تھی کہ مائیک بھی بے کار ہو گئے ہوں گے۔ یہاں صرف یہ تین افراد ہی تھے۔

"زہرہ ان کو لے کر اوپر آؤ۔" میں نے چلا کر کہا۔ ایک اضافی مشین گن میرے شانے سے لٹک رہی تھی۔ ان کے چار عدد فاضل میگزین تھے۔ میری جیکٹ کی جیبوں میں تین عدد دستی بم اور دو عدد فاسفورس بم تھے اور ان کی مدد سے مجھے راستہ صاف کرنا تھا۔ زہرہ سے میں نے گرد پر لکھ کر پوچھا تھا کہ وہ حویلی میں شاہ نواز کی جائے وقوعہ کے بارے میں جانتی ہے تو اس نے اثبات میں جواب دیا تھا۔ ہم بھاگتے ہوئے دوسری سیڑھیوں سے اوپر آئے۔ میں نے مارے جانے والے فرد کے پاس سے ایمرجنسی لائٹ اٹھالی تھی۔ زہرہ آگے تھی اور لڑکیاں میرے پیچھے تھیں۔ باہر نکلنے سے پہلے میں نے ان سے کہا۔ "تم اپنے کمرے میں چلی جانا۔"

"ہمیں چھوڑ کر مت جاؤ ورنہ یہ ہمیں مار ڈالیں گے۔" شہلا گڑگڑائی تھی۔

"ہمارے ساتھ مارے جانے کے زیادہ امکان ہیں۔" میں نے ان کو سمجھانا چاہا۔

"نہیں ہم تمہارے ساتھ رہیں گے۔" فوزی نے بھی کہا۔ وہ دونوں میری بات ماننے کے لئے تیار نہیں تھیں۔ ان کو زبردستی الگ کرنے سے خطرہ تھا کہ وہ شور مچا کر سب کو قبل از وقت خبردار کر دیں گی۔ بادل ناخواستہ میں نے ان کی بات مان لی۔ "او کے مگر تم دونوں ذرا پیچھے رہنا، کوئی آواز مت نکالنا اور ہم سے بچھڑ جاؤ تو اپنی جان بچانے کی خود کوشش کرنا۔"

"ہمیں منظور ہے۔" دونوں نے بیک وقت کہا۔

جیسا کہ مجھے توقع تھی اوپری منزل پر روشنی آ گئی تھی۔ ان لوگوں نے بجلی کسی نہ کسی طرح بحال کر لی تھی۔ زہرہ آگے تھی، وہ دائیں طرف کی ایک راہ داری میں مڑی۔ میں کسی بھی لمحے تصادم کے لئے پوری طرح تیار تھا مگر ایسا لگ رہا تھا کہ اندر کے سارے محافظ ہمیں روکنے کے لئے باہر بھیج دیئے گئے تھے اور وہ تہہ خانے سے آنے والے راستے پر مورچہ لگائے بیٹھے تھے۔ کئی راہ داریاں مڑنے کے بعد زہرہ نے ایک جگہ جھانکا اور اشارے سے مجھے بھی دیکھنے کو کہا۔ میں نے جھانک کر دیکھا راہ داری کے سرے پر ایک دروازے کے سامنے ایک مسلح شخص شانے سے رائفل ٹانگے کھڑا تھا حالانکہ ان حالات میں رائفل اس کے ہاتھ میں ہونی چاہئے تھی۔ وہ مشکل سے پندرہ فٹ کے فاصلے پر تھا۔ وقت کم تھا اگر میں براہ راست اس پر فائر کرتا تو شاہ نواز ہوشیار ہو جاتا جبکہ میں اس پر قابو پانا چاہتا تھا۔ یہ خیال مجھے تہہ خانے میں اس کی آواز سن کر آیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس راستے سے نکلنا بہت بڑی حماقت ہوگی، تہہ خانے میں ان کو اسلحے کا ذخیرہ اڑانے کی دھمکی دے کر میں ان سے بات منوا سکتا تھا مگر ایک بار کھلی فضا میں آنے کے بعد میں ان کے رحم و کرم پر ہوتا۔ وہ دور سے مجھے مار ڈالتے یا گاڑی سمیت اڑا دیتے۔ شاہ نواز تہہ خانے کے اس راز کے ساتھ کسی صورت مجھے زندہ نکل جانے کی اجازت نہ دیتا، چاہے اسے مرشد علی یا ڈیوڈ شا کی جانب سے مجھے زندہ رکھنے کی کتنی ہی سخت تاکید کیوں نہ ہوتی۔

میں نے محسوس کیا کہ شاہ نواز اتنا ذہین شخص نہیں تھا۔ جب میں نے اس سے خفیہ راستہ صاف کرنے اور وہاں گاڑی لانے کو کہا تو اس کے ذہن نے تسلیم کر لیا کہ میں فرار ہونا چاہتا ہوں۔ اس کی جگہ فتح خان یا مرشد ہوتا تو کبھی اس بات کو تسلیم نہ کرتا کہ میں ایسی کوئی احمقانہ حرکت کروں گا۔ شاہ نواز نے اپنی بیشتر افرادی قوت باہر بھیج دی تھی اور مجھے موقع مل گیا تھا کہ اس تک رسائی حاصل کر سکوں، ایک بار میں اس کو یرغمال بنا لیتا تو اس سے نکلنا آسان ہو جاتا۔

میں نے پہرے پر موجود شخص کے بارے میں سوچا اور اچانک مشین گن سامنے رکھتے ہوئے میں گھوم کر راہ داری میں آیا۔ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور اس کے ہاتھ بے ساختہ رائفل کی طرف بڑھے۔ میں نے مشین گن کو یوں جنبش دی جیسے برسٹ مارنے والا ہوں۔ اس کے ہاتھ رک گئے۔ میں نے سر کے اشارے سے اسے رائفل نیچے ڈالنے کو کہا۔ اس نے سعادت مندی سے حکم کی تعمیل کی اور دوسرے اشارے پر ہاتھ سامنے پھیلا کر اوندھے لیٹ گیا۔ میں نے اس کے پاس آ کر اچانک مشین کا دستہ اس کی گدی پر دے مارا اور وہ بے سدھ ہو گیا۔ زہرہ دیکھ رہی تھی وہ لپک کر آئی اور اس کے ساتھ دونوں لڑکیاں بھی تھیں۔ میں نے خفگی سے اس ہجوم کو دیکھا جو میرے ساتھ ساتھ تھا اور میری خوش قسمتی کہ میں اب تک ان کی وجہ سے کسی کی نظر میں نہیں آیا تھا۔

''شاہ نواز اس کمرے میں ہے؟'' میں نے زہرہ کے کان میں کہا۔

''میں نے اسے یہاں دیکھا ہے۔'' اس نے جوابی سرگوشی کی۔

میں دروازے کی طرف بڑھا تھا کہ دروازہ کھلا اور مجھے شمشاد کی صورت نظر آئی۔ اس کا منہ کھلا تھا کہ میں نے مشین گن کا رخ اس کی طرف کر کے ہلکا سا برسٹ مارا تو وہ نیچے گری تھی۔ گولیاں اس کے پیروں میں لگی تھیں۔ وہ نیچے گری اور میں اسے پھلانگ کر اندر آیا۔ دوسرا برسٹ میں نے شاہ نواز کے پاس مارا تھا۔ وہ برابر میں رکھی میز سے پستول اٹھانے جا رہا تھا کہ وہ منجمد ہو گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر لات ماری اور میز الٹ دی۔

''اپنے ہاتھ اوپر رکھو سر پر...... جلدی...... ورنہ اب تمہیں گولی ماروں گا۔''

اچانک عقب سے فائر کی آواز آئی۔ میں نے احتیاط سے دیکھا شمشاد زمین پر ساکت پڑی تھی اور اس کے سر میں سوراخ سے بھیجا صاف نظر آ رہا تھا۔ زہرہ اندر آئی۔ اس کے ہاتھ میں موجود پستول سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ ''اس نے تمہیں شوٹ کرنے کی کوشش کی تھی۔''

''تم نے پہل کر دی۔'' میں مسکرایا۔ ''ان سے ملو، اپنے شاہ نواز صاحب۔''

''ان سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔'' زہرہ نے اسے نظر جما کر دیکھا۔

''شاہ نواز شاید تم مجھے یہاں دیکھ کر حیران ہو رہے ہو، تمہارے خیال میں مجھے تہہ خانے کے خفیہ راستے سے باہر ہونا چاہئے تھا اور تم نے اپنے بیشتر مسلح ساتھیوں کو وہاں بھیج دیا ہے۔''

''میں......'' اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ ''ابھی بھی حویلی میں بے شمار لوگ ہیں۔ تم یہاں سے نہیں نکل سکتے۔''

میں نے گھوم کر اس کے عقب میں آنے کے بعد اس کے سر پر مشین گن کی نال رکھ دی۔ ''اگر تمہاری جان پر بنی ہو تب بھی میرا راستہ روکا جائے گا۔''

''وہ تمہیں اتنی آسانی سے نہیں جانے دیں گے۔''

''تو مشکل سے ہی سہی۔ میں جاؤں گا ضرور اور یاد رکھنا کوئی مشکل آئی بھی تو سب سے پہلے تم پر آئے گی اس لئے کوشش کرنا مشکل نہ آئے۔ اب اٹھ جاؤ۔''

''بات سمجھنے کی کوشش کرو اگر تم نے مجھے یرغمال بنا کر نکلنے کی کوشش کی تو میرے ساتھی تمہارے ساتھ مجھے بھی اڑا دیں گے۔''

''اتنے ناخلف ساتھی ہیں۔ جن کے نزدیک اپنے باس کی زندگی اور موت کی اہمیت نہ ہو۔''

''اہمیت کاروبار کی ہے۔'' اس نے سر ہلایا۔ ''جامی شاہ رکاوٹ بن رہا تھا، اس لئے اس کا تختہ الٹ دیا گیا۔ مجھ سے خطرہ ہوگا تو وہ مجھے بھی مار دیں گے، سربراہ کسی اور کو بنالیں گے۔''

''اب بکواس کرنے کے بجائے کھڑے ہو جاؤ۔'' میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر کھینچا۔

''ایک منٹ۔'' زہرہ نے پہلی بار مداخلت کی۔ ''یہ درست کہہ رہا ہے۔ اس حویلی میں پایا جانے والا ہر فرد بھیڑیا ہے۔ ان میں سے کوئی زخمی ہو جائے تو باقی مل کر اس کی تکا بوٹی کر دیتے ہیں اگر ہم نے اسے یرغمال بنا کر جانے کی کوشش کی تو وہ ہمیں نہیں جانے دیں گے۔''

''پھر کیسے نکلیں؟''

''اس طرح کہ دوسروں کو اس کی خبر نہ ہو۔''

''ایسا کیسے ممکن ہے؟'' میں نے زہرہ کو دیکھا۔

''اسے یہ ممکن بنائے گا۔'' زہرہ نے شاہ نواز کی طرف اشارہ کیا۔ ''اگر اس نے اپنی جان بچانی ہے تو۔''

''میں تمہیں عام حالات میں نکال سکتا تھا مگر ان حالات میں نہیں۔ اس وقت میں باہر جاؤں گا تو میری کار کی بھی تلاشی لی جائے گی۔''

میں نے محسوس کیا کہ اس کی بات میں کچھ نہ کچھ صداقت ہے۔ یہ جگہ شاہ نواز کا کنٹرول روم تھی۔ یہاں بیٹھ کر وہ پوری حویلی پر کیمروں اور مائیکس کی مدد سے نظر اور علم رکھتا تھا۔ وہاں درجن بھر مانیٹر تھے جو ایک ڈیوائس سے منسلک تھے۔ کیمروں کی تعداد خاصی زیادہ تھی۔ میں نے ریموٹ اٹھایا اور زہرہ سے کہا۔ ''اس پر نظر رکھنا۔''

اس سے پہلے میں نے یہ کام کیا کہ بے ہوش پہریدار کو بھی اندر کھینچ لایا اور دروازہ اندر سے بولٹ کر دیا۔ شمشاد کی لاش بھی ایک طرف کر دی تھی۔ فوزی اور شہلا نے اب خود کو سنبھال لیا تھا اور پہلے جیسی خوفزدہ نہیں لگ رہی تھیں۔ میں نے ریموٹ سے حویلی کا معائنہ کیا۔ لان میں طاقتور روشنیاں جل رہی تھیں، مختلف مناظر میں چار عدد خطرناک کتے مٹرگشت کرتے نظر آ رہے تھے۔ مین گیٹ پر تین عدد مسلح پہریدار تھے۔ ایک شخص اس جگہ تھا جہاں گاڑیاں پارک تھیں اس کے علاوہ مجھے عمارت سے باہر کہیں بھی کوئی شخص نظر نہیں آیا۔ میں نے سر گھما کر شاہ نواز کو دیکھا۔ ''وہ لوگ کہاں ہیں جو میرا راستہ روکیں گے۔''

''جب تم یہاں سے جانے کی کوشش کرو گے تو تم کو خود پتا چل جائے گا۔''

''میں تم سے کیوں نہ پوچھوں؟'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

زہرہ گھوم کر اس کے عقب میں آ گئی اور پستول کی نال اس کے سر پر رکھ دی۔ ''شاہ نواز جلدی سوچو...... ورنہ تم کو زندہ رکھنا بے کار ہے۔''

''راستہ روکنے والوں کے لئے میرے پاس ایک ترپ کا پتا ہے۔'' میں نے شاہ نواز کو بموں کا ریموٹ دکھایا۔ ''اس کے ہوتے ہوئے کوئی راستہ روکنے کی جرأت نہیں کرے گا۔''

''اس کی رینج ایک کلومیٹر سے زیادہ نہیں ہے۔'' شاہ نواز نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ ''اس کے بعد تم ان سے نہیں بچ سکتے۔''

''لیکن یہاں سے نکل تو سکتے ہیں۔''

''مرضی تمہاری۔'' شاہ نواز نے مرے ہوئے انداز میں کہا اور کھڑا ہو گیا۔

''اسی لمحے میں نے مانیٹرز پر کوئی ہنگامہ محسوس کیا۔ میں نے دیکھا۔ حویلی کے داخلی گیٹ پر گارڈز باہر کسی پر فائرنگ کر رہے تھے۔'' یہ کیا ہو رہا ہے۔'' میں نے شاہ نواز سے کہا۔

اس نے جلدی سے میز پر رکھی ڈیوائس کے چند بٹن دبائے اور گیٹ پر لگے کیمرے کا منظر آنے لگا۔ گیٹ کے عین سامنے دو عدد جیپیں کھڑی تھیں اور ان کے عقب سے گیٹ پر فائرنگ کی جا رہی تھی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے شاہ نواز کو دیکھا۔'' یہ کون ہیں؟''

''پتا نہیں۔'' اس نے خشک لبوں پر زبان پھری۔'' شاید جامی شاہ پھر آ گیا ہے۔''

میں چونکا۔'' جامی شاہ، وہ بچ گیا تھا؟''

''امکان ہے اس کی لاش نہیں ملی تھی۔'' اس نے بتایا۔ اسی لمحے میز پر رکھے ایک واکی ٹاکی نے بپ دی۔ شاہ نواز نے اجازت طلب انداز میں میری طرف دیکھا۔'' اگر میں نے کال ریسیو نہ کی تو وہ شک میں پڑ جائیں گے۔''

''ریسیو کرو مگر کوئی غلط بات مت کرنا۔ وہ تمہاری آخری بات بھی ہو سکتی ہے۔''

اس نے واکی ٹاکی اٹھایا۔'' ہاں کیا بات ہے؟''

''شاہ جی۔'' کوئی عقب سے آتی فائرنگ کی آوازوں میں چلایا۔'' کچھ لوگ خفیہ دروازے میں گھسنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم نے سرنگ میں پناہ لے لی ہے باہر انہوں نے گھیرا ڈال دیا ہے۔''

''کتے کے بچو، تم لوگ سو رہے تھے، کون ہیں یہ؟''

''پتا نہیں شاہ...... پر ان کا حملہ اتنا اچانک تھا کہ ہمارے چھ ساتھی مارے گئے، میرے ساتھ صرف دو بندے اور ہیں۔''

ان کو سرنگ میں آنے سے روکو بلکہ اندر چلے جاؤ۔''

''شاہ جی اندر والا راستہ اندر سے بند ہے۔'' وہ شخص چلایا۔ فائرنگ کی آواز قریب آ رہی تھی اور اس کی شدت میں بھی اضافہ ہو رہا تھا، کسی نے بھیانک چیخ ماری۔ واکی ٹاکی پر بات کرنے والا اب اپنے دفاع میں لگ گیا تھا۔ شاہ نواز کچھ دیر چلا چلا کر اسے آوازیں دیتا رہا پھر اس نے واکی ٹاکی سیٹ دیوار پر دے مارا۔ گیٹ پر آنے والے حملہ آور بھی حاوی لگ رہے تھے اور گارڈز اب مدافعت پر اتر آئے تھے۔

''شاہ نواز اگر یہ جامی شاہ کے آدمی ہیں تو میرے اتنے ہی دشمن ہیں، ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔ تمہاری نظر میں ایسا کوئی راستہ ہے۔''

''ہے تو۔'' اس نے ہچکچا کر کہا۔'' میں تمہیں اس راستے سے لے جاؤں گا لیکن تم بھی وعدہ کرو کہ مجھے چھوڑ دو گے۔''

''میرے وعدے کی کوئی اہمیت ہے تمہارے نزدیک؟''

اس نے سر ہلایا۔'' میں نے تمہارے بارے میں سنا ہے۔ تم شریف ماں باپ کی اولاد ہو اگر تم ان کی قسم

کھا کر یقین دلاؤ تو میں تمہیں یہاں سے نکال کر لے جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے میں وعدہ کرتا ہوں اب جلدی کرو، ایسا نہ ہو کہ تم ہمیں یہاں سے نکالنے کی پوزیشن ا
رہو۔"

"تم دونوں آؤ میرے ساتھ۔"

"یہ لڑکیاں۔"

"ان کو چھوڑ دو، آنے والوں سے ان کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

"تم اندر جاؤ۔" میں نے فوزی اور شہلا سے کہا تو وہ ہچکچاتی ہوئی وہاں سے چلی گئیں۔ ان کے جا
شاہ نواز نے ایک طرف موجود الماری کا پٹ کھولا اور میں یہ دیکھ کر دم بخود رہ گیا کہ اندر سیڑھیاں نیچے جا ر
یعنی یہ خفیہ راستہ تھا۔ میں نے شاہ نواز کا کالر پکڑا۔ "یہ راستہ کہاں جاتا ہے؟"

"نیچے ایک گیراج میں نکلتا ہے۔ وہاں ایک عدد بکتر بند جیسی جیپ کھڑی ہے۔ اس میں ہم بآسانی
سے نکل سکتے ہیں۔"

"گاڑی بلٹ پروف ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ایک حد تک۔" اس نے تصدیق کی۔

"شاہ نواز یاد رکھنا میں تمہارے پیچھے ہوں، کسی قسم کی چالاکی دکھانے کا مطلب وفات پانا بھی
ہے۔ زندہ رہو گے تو بہت کچھ دوبارہ حاصل کر لو گے، مجھے وعدہ بھلانے پر مجبور مت کرنا۔"

اس نے سر ہلایا۔ "ابھی تو میں خود یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔"

میں نے دیکھا حملہ آوروں نے گیٹ کے محافظوں پر قابو پا لیا تھا۔ ان میں سے دو تو مر چکے تھے ا
زخمی تھے۔ تیسرے کو آنے والوں نے پکڑ لیا تھا۔ یہ کل چار افراد تھے۔ میں نے شاہ نواز سے کہا۔ "ان م
کسی کو پہچانتے ہو؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ سب میرے لئے اجنبی ہیں۔"

ان میں سے ایک نے اچانک پکڑے جانے والے گارڈ کے سر پر پستول رکھ کر چلا دیا اور وہ مر ا
دیکھ کر شاہ نواز کا رنگ سفید ہو گیا تھا۔ اس نے التجا آمیز انداز میں کہا۔ "اب یہاں سے نکل جاؤ ان کو ا
میں بھی چند منٹ لگیں گے۔"

میں نے کیمروں اور مائیکس کو کنٹرول کرنے والی ڈیوائس پر ایک ہلکا سا برسٹ مارا، اس سے ک
اور مانیٹرز تاریک ہو گئے۔ "زہرہ پہلے تم نیچے جاؤ گی۔" میں نے کہا پھر شاہ نواز سے بولا۔ "نیچے کوئی ٹر
اب بھی وقت ہے بتا دو۔"

"نیچے کوئی ٹریپ نہیں ہے۔ جلدی کرو۔"

"زہرہ نیچے اتر گئی۔ چند لمحے بعد اس کی آواز آئی۔ "آ جاؤ، یہاں کچھ نہیں ہے۔"

میں نے شاہ نواز کو اندر دھکیلا اور اس کے پیچھے خود آیا۔ الماری کے پٹ میں نے اندر سے بند کر
زینہ بے حد تنگ تھا اور میں جیکٹ میں ٹھنسے سامان کے ساتھ دیوار سے رگڑ کھاتا نیچے تک پہنچا تھا۔ یہ ا

سا گیراج تھا جس میں بجیر وسائز کی ایک لوکل میڈ جیپ کھڑی تھی۔ اس کی باڈی مضبوط فولادی شیٹ سے تیار کی گئی تھی اور اس کے آگے بلڈوز جیسے بلیڈز لگے تھے۔ شیشے زردی مائل تھے جو ان کے بلٹ پروف ہونے کی علامت تھی۔ اس میں آگے پیچھے نشستیں تھیں اور عقب میں سامان رکھنے کا خانہ تھا جس میں ترپال تلے کچھ رکھا تھا۔ شاہ نواز نے سامنے سے گیراج کا دروازہ اَن بولٹ کر دیا مگر اسے کھولا نہیں تھا۔

''ڈرائیونگ کون کرے گا؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

''ظاہر ہے تم۔'' میں نے جواب دیا۔

''زہرہ گاڑی کا معائنہ کر رہی تھی۔ ''یہ چل سکتی ہے؟'' اس نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

''کیوں نہیں۔'' شاہ نواز نے اس کی ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولا اور بیٹھنے جا رہا تھا کہ میں نے بروقت روکا۔

''اتنی جلدی کیا ہے نورِ چشم۔ ہمیں تو سوار ہونے دو۔''

غالباً اس کے ذہن میں خیال تھا کہ وہ اندر گھستے ہی دروازہ بند کر لے گا اور ہم احمق باہر رہ جائیں گے۔ بلٹ پروف گاڑی میں وہ بالکل محفوظ رہے گا۔ اس کے بعد وہ ہمیں آنے والوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر فرار ہو جائے گا۔ پکڑے جانے پر اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ کے آثار آئے تھے۔ مجھے یقین ہو گیا اس کا ارادہ دھوکے کا تھا۔ اس نے کہا۔ ''تو بیٹھو، میں نے منع کیا ہے۔''

یہ کہتے ہی اس نے اچانک عقب کی طرف لات چلائی جو میرے گھٹنے پر لگی۔ اس پر قیصر سے معرکہ آرائی کے دوران پہلے بھی چوٹ لگ چکی تھی اور اس کا درد ابھی تک ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ میں لڑکھڑا کر گرا تو اس نے پھرتی سے اندر گھس کر دروازہ بند کرنے کی کوشش کی۔ میں نے پھرتی سے کام نہ لیا ہوتا تو اس نے دروازہ بند کر لیا ہوتا۔ میں نے مشین گن کی نال اڑا دی۔ وہ دروازہ بند کرنے کے لئے پورا زور لگا رہا تھا۔ میں نے کوشش کی کہ نال نکلنے نہ پائے۔ ایک بار وہ دروازہ بند کر لیتا تو ہم پیچھے رہ جاتے۔ میں فائر کر کے گاڑی کے ٹائر بھی نہیں پھاڑ سکتا تھا جو خاص قسم کے ٹیوب لیس ٹائر تھے یعنی بالکل ٹھوس، ان میں گولی گھس کر ٹائر کا ایک حصہ ہی بن جاتی۔ اس قسم کے ٹائر میدانِ جنگ میں جانے والی گاڑیوں میں ہوتے ہیں وہاں عام ٹیوب والے ٹائر کام نہیں آتے اور نہ ہی میدانِ جنگ میں کسی کے پاس اتنا وقت ہوتا ہے کہ بیٹھ کر ٹائر بدلتا رہے۔ بات کہیں اور نکل گئی۔ شاہ نواز نے دھوکا دیا تھا مگر اس میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ زہرہ بھاگ کر گئی اور اس نے بھی اپنا پستول پھنسا دیا۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھینچا تو شاہ نواز بھی کھنچا چلا آیا تھا۔ میں نے بروقت گھٹنا اس کے منہ کے سامنے کیا اور پھر بالوں سے پکڑ کر اس کا سر اوپر کیا جو لہولہان ہو رہا تھا۔

''افسوس شاہ نواز تم نے خود زندہ اور آزاد رہنے کا موقع گنوا دیا اب میں اپنے کسی وعدے کا پابند نہیں ہوں۔''

''خدا کے لئے مجھے معاف کر دو۔'' وہ بند ناک کے ساتھ مضحکہ خیز آواز میں بولا۔

''تا کہ تم مجھے پھر دھوکا دینے کی کوشش کرو۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''کیا خیال ہے اگر میں تمہیں اس جگہ پھینک جاؤں اور خود یہ گاڑی لے جاؤں تو؟''

''تم ایسا نہیں کر سکتے۔'' وہ چلایا۔ ''خدا کے لئے، یہ جامی شاہ کے آدمی ہوئے تو وہ میرے ٹکڑے کر کے بھی مطمئن نہیں ہوں گے۔''

''یہی تو میں چاہتا ہوں۔'' میں ہنسا اور اسے زور سے دھکا دیا۔ اندر گاڑی میں داخل ہو کر میں نے برابر والی نشست کا دروازہ کھولا، زہرہ اندر آ گئی۔ شاہ نواز گرتے ہی اٹھا اور پھر میری طرف آیا۔ میں نے دروازہ بند کر لیا تھا۔ ''خدا حافظ۔''

''خدا کے لئے۔'' وہ چلایا۔ ''شہباز ایک بار مجھے معاف کر دو۔''

''تمہارے منہ سے یہ لفظ اچھا نہیں لگتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''بہر حال وہ انسانوں کا بھی خدا ہے اور شیطانوں کا بھی۔ اس سے معافی مانگو، مجھ سے نہیں۔''

''تم اس طرح نہیں جا سکتے۔''

گاڑی میں آواز کی آمد و رفت کے راستے تھے اس لئے دروازے اور کھڑکیاں بند ہونے کے باوجود مجھے اس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ''کیا مطلب اس طرح نہیں جا سکتے؟''

''تم اس جیپ کو لے کر مین گیٹ کی طرف نہیں جا سکتے کیونکہ اس طرف جانے کا راستہ ہی نہیں ہے۔ اس طرف اونچے پشتے ہیں جن کو یہ جیپ عبور نہیں کر سکتی ہے۔'' وہ جلدی جلدی کہہ رہا تھا۔

میں انجن اسٹارٹ کرنے جا رہا تھا، چابی اگنیشن میں لگی تھی، میں رک گیا۔ ''پھر کیا جیپ لان میں چلانے کے لئے رکھی ہے۔'' میں نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔

''نہیں، جیپ ایک دیوار سے گزر سکتی ہے۔ اس طرف دیوار میں صرف نمائشی کھوکھلی اینٹیں لگی ہیں۔ یہ ایک ٹکر میں اسے گرا دے گی۔'' اس نے جیپ کی طرف اشارہ کیا۔ ''باقی ہر دو دو فٹ پر موٹی ٹھوس کنکریٹ کی دیوار ہے جسے بلڈوزر بھی نہیں توڑ سکتا ہے اور صرف مجھے معلوم ہے وہ نمائشی دیوار کہاں ہے۔''

''دوسرے لفظوں میں تم مطالبہ کر رہے ہو کہ تمہیں بھی لے جایا جائے۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''میری مدد کے بغیر تم نہیں نکل سکتے۔''

''ممکن ہے، نکل جاؤں۔''

''تو نکل کر دکھاؤ۔'' اس کے لہجے میں چیلنج تھا۔ وہ پیچھے ہٹ گیا تھا۔ ''یہ رہا دروازہ، اسے توڑ کر نکلو گے تو عقبی باغ میں ہو گے۔ جاؤ قسمت نے ساتھ دیا تو شاید تم کھوکھلی دیوار بھی تلاش کر لو مگر اب دیر مت کرو وہ لوگ کسی بھی لمحے یہاں آ جائیں گے۔ اس کے بعد تم بھی نہیں نکل سکو گے۔''

میں سوچ میں پڑ گیا تھا اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ غلط نہیں کہہ رہا ہے۔ اس کی مدد کے بغیر میں نہیں نکل سکتا تھا۔ زہرہ نے میری طرف جھک کر آہستہ سے کہا۔ ''اسے لے چلو، ممکن ہے یہ سچ کہہ رہا ہو اور اس نے جھوٹ کہا بھی ہو گا تو ہم اس سے نمٹ لیں گے۔''

''او کے۔'' میں نے دروازہ کھولا اور نیچے آ گیا۔ ''میں اور زہرہ پیچھے ہوں گے اور تم نے ذرا بھی بد عہدی کی تو تمہیں مار کر پھینک دیں گے۔''

''ایسے نہیں، پہلے تم وعدہ کرو، میری اس خطا کو معاف کر دو گے۔ باہر نکل کر مجھے قتل نہیں کرو گے۔ مجھے

جانے کا موقع دو گے۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں اگر تم نے ہمیں حویلی سے نکال دیا تو میں تمہیں زندہ سلامت جانے دوں گا۔'' میں نے اس سے وعدہ کیا۔''اب چلو دیر مت کرو۔''

اسی لمحے سیڑھیوں کے اوپر سے لوگوں کے بولنے اور توڑ پھوڑ کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں اور زہرہ پھرتی سے عقبی نشست پر آ گئے تھے اور شاہ نواز نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔ اس نے انجن اسٹارٹ کیا۔ اسی لمحے میں نے سیڑھیوں سے ایک مسلح فرد کو نمودار ہوتے دیکھا۔ اس نے جیپ پر برسٹ مارا تھا۔ گولیاں جیپ کی باڈی اور شیشے سے ٹکرا کر چٹ گئیں۔ شاہ نواز نے ایکسلیٹر دبایا اور جیپ نے جست لگائی۔ سامنے دروازہ اس کے سامنے گتے کا ثابت ہوا۔ ٹکر لگتے ہی دو حصوں میں پھٹ گیا۔ سامنے سیاہ آسمان اور روشن باغ تھا۔ جیپ ایک نرم اور مرجھائی گھاس والے لان پر دوڑ رہی تھی۔ اس نے پہلے دو گلاب کی کیاریوں کا حشر نشر کیا اور اس کے بعد لیموں کے چند پودوں کو روندتی ہوئی گزر گئی۔ عقب سے مسلسل فائرنگ ہو رہی تھی اور میں نے احتیاطاً سر نیچے کر لیا تھا۔ بلٹ پروف بھی ایک حد تک ساتھ دیتا ہے اگر اس پر مسلسل گولیاں پڑیں تو یہ ٹوٹ جاتا ہے چاہے دھات کا ہو یا شیشے کا۔

اب دائیں طرف سے بھی فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔ شاہ نواز نے جیپ گھمائی اور اس کا رخ ایک بار پھر حویلی کی عمارت کی طرف کر دیا تھا۔ ''اس طرف کیوں جا رہے ہو؟'' میں نے کہا لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ حویلی کے پاس آ کر جیپ ایک بار پھر موڑی اور اس بار اس کا رخ عقبی دیوار کی طرف تھا۔ اس نے تیز ایکسلیٹر دیا اور انجن گرجا۔ دھچکے سے ہم پیچھے گئے تھے۔ پہلے دیوار کے پاس جا کر شاہ نواز نے اس جگہ کا تعین کیا تھا اور پھر واپس آ کر جیپ دیوار کی طرف دوڑا دی تھی۔ اسی لمحے مجھے زمین ہلتی محسوس ہوئی تھی۔ میں نے بے ساختہ پلٹ کر دیکھا۔ میری نظروں کے سامنے عمارت کا مشرقی حصہ پھٹ کر بکھر گیا اور اس سے شعلے اور ملبہ نکل رہا تھا۔

''شاہ نواز جلدی کرو۔ اسلحہ خانے میں بلاسٹ ہوا ہے۔'' میں چلایا۔

''نہیں۔'' شاہ نواز نے کہا تھا۔ اس دوران میں دیوار قریب آ گئی تھی۔ زہرہ اور میں نے دونوں ہاتھ اگلی نشستوں پر جما دیئے تھے۔ اس کے باوجود تصادم کی شدت نے ہمیں اچھال کر چھت پر دے مارا۔ میں نے اینٹیں بکھرنے اور ملبہ جیپ پر گرنے کی سمع خراش آوازیں سنیں مگر جیپ رکی نہیں، اس تصادم کو سہتی ہوئی دیوار سے گزر گئی۔ زمین اب بھی حرکت میں تھی، اسی لمحے دھماکے کی شاک ویو جیپ سے ٹکرائی اور اس نے جیپ کو مزید آگے دھکیلا تھا۔ شاہ نواز جیپ کو اس کچے راستے سے اترنے اور الٹنے سے بچانے کے لئے دیوانہ وار جدوجہد کر رہا تھا، مجھے سر پر کسی شے کے بہنے کا احساس ہوا۔ یہ شاید خون تھا۔ میں نے ایک بار پھر پلٹ کر دیکھا اور اب کے حویلی کا بیشتر حصہ غائب ہو چکا تھا۔ اس جگہ سے شعلے اور ملبہ نکل کر آسمان کی طرف جا رہا تھا۔ پے در پے دھماکے اتنے تسلسل سے ہو رہے تھے کہ انہوں نے ایک مستقل اور قیامت خیز گڑگڑاہٹ کا روپ دھار لیا تھا۔

''شاہ نواز نے زبردست جدوجہد کے بعد جیپ کو صراط مستقیم پر رکھا تھا۔ یہ کچا راستہ ہائی وے سے مخالف سمت میں جا رہا تھا۔ کوئی ایک فرلانگ کے بعد اس نے جیپ روکی اور اسٹیئرنگ پر سر ڈال دیا۔ عقب میں آسمان

حویلی کے ملبے سے اٹھنے والے بلند و بالا شعلوں سے روشن تھا۔ میں اس تباہی کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ میں نے تہہ خانے میں بہت ساری چیزیں کھول کر پھیلا دی تھیں۔ ان میں دستی بموں سے لے کر بارودی سرنگیں تک شامل تھیں مگر ان میں سے کسی سے بھی از خود دھما کا ممکن نہیں تھا پھر یہ کس کی غلطی تھی۔ خاص طور سے ان لوگوں میں سے کسی کی جو خفیہ راستے سے لڑ بھڑ کر اندر داخل ہوئے تھے۔ کوئی بھٹکی ہوئی گولی کسی بارودی سرنگ یا دستی بم سے جا لگی تھی۔ اس کے دھماکے سے ایک چین ری ایکشن شروع ہوا تھا جس نے بالآخر پورے بارودی ذخیرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ کوئی فرلانگ بھر کی دوری سے دھماکوں کی شدت سے زمین لرز رہی تھی اور ملبے کے ٹکڑے اُڑ کر یہاں تک آ رہے تھے۔ ''جیپ آگے کرو'' میں نے شاہ نواز سے کہا۔

''یہ کیا تھا۔'' وہ گالی دینے کے انداز میں بولا۔ ''تم نے جھوٹ بولا تھا۔''

''احمقانہ باتیں مت کرو اگر میں ایسا کوئی کام کرتا تو کیا اتنے سکون سے اندر بیٹھا رہتا۔ ذرا غور کرو ہم نکلنے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی کرتے تو کبھی نکلنے کی نوبت نہ آتی۔''

''تمہیں اس کے سامنے وضاحت پیش کرنے کی کیا ضرورت ہے۔'' زہرہ نے مجھے گھورا اور پریشان ہو گئی۔ ''تمہارے سر سے خون بہہ رہا تھا۔''

''کوئی خاص نہیں ہے۔'' میں نے رومال سے سر صاف کیا۔ ''معمولی سی خراش ہے۔''

خود زہرہ کے منہ سے خون جھلک رہا تھا۔ اس کا چہرہ شاید سامنے سیٹ سے ٹکرایا تھا۔ میں نے اسے رومال دیا کہ وہ منہ صاف کر لے۔ شاہ نواز بظاہر ٹھیک نظر آ رہا تھا۔ اس نے جیپ آگے بڑھا دی تھی۔ حویلی کی تباہی نے اسے گم صم کر دیا تھا۔ اس کا تو سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ اس کا کاروبار، وہ لڑکیاں، مجھے فوزی اور شہلا کا خیال آیا ان کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سو بے گناہ لڑکیاں اگرچہ ان میں سے بعض پیشہ ور تھیں مگر اکثر مجبوریوں کی بنا پر بک کر آئی تھیں۔ شاہ نواز نے دوسرے فرلانگ کے بعد گاڑی پھر روک لی۔ اتنے فاصلے پر ہم محفوظ تھے۔ ہم جیپ سے اتر آئے۔

''یہ کیسے ہوا؟'' شاہ نواز نے صدمے سے کہا۔

''میرا خیال ہے حملہ آوروں کی غلطی سے کوئی بارودی ذخیرہ پھٹ گیا ہے۔''

''تم بھی تو ریموٹ کنٹرول بم لگا کر آئے تھے۔'' اس نے زہریلے انداز میں کہا۔ ''تمہیں پتا ہے حویلی میں سو تو صرف لڑکیاں تھیں اور تیس کے قریب دوسرے لوگ تھے۔''

''مجھے مجرم ثابت کرنے کی کوشش مت کرو۔'' میں نے برہمی سے کہا اور ریموٹ اس کے سامنے پھینک دیا۔ ''اسے کھول کر دیکھ لو۔''

اس نے سیل والا خانہ کھولا اس میں سیل نہیں تھے۔ زہرہ میرے برابر میں آ کھڑی ہوئی تھی۔ ''اصل مجرم یہ خود ہے۔ اس سے پوچھو، اتنے انسانوں کو بارود پر اس نے بٹھایا ہے یا تم نے۔ کیا اسے معلوم نہیں تھا کہ کسی دن غلطی سے بھی یہ بارود اُڑ گیا تو اوپر بسنے والی زندہ لاشیں سچ مچ کی لاشوں میں بدل جائیں گی۔ میں اسے مار ڈالوں گی۔'' زہرہ نے جذبات سے بے قابو ہو کر کہا۔

''سنا تم نے یہ تمہیں مجرم سمجھ رہی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے جو کیا تھا وہ صرف اپنی جان بچانے کے

"[illegible] اور تم۔" میں نے اچانک اس کے منہ پر تھپڑ مارا۔ "بے غیرت شخص مجھے سو افراد کا قاتل قرار دے رہے تھے کی یہ کیمپ تم نے کس کی فاتحہ کے لئے رکھی تھی۔"

"میرا اس سے تعلق نہیں ہے۔" اس نے کمزور لہجے میں کہا۔ "مرشد علی۔"

"حکومت، اسے تمہارے ساتھ شامل ہوئے ابھی چند مہینے ہوئے ہیں اور یہ کاروبار برسوں پرانا ہے۔ تم [illegible] کے دست راست تھے اور اس مکروہ کاروبار میں برابر کے شریک تھے۔ یہ میں تم سے بعد میں پوچھوں گا [illegible] کہاں سے آتا تھا اور کہاں جاتا تھا؟"

شاہ نواز کی رنگت مدھم ہو گئی تھی۔ وہ سرخی مائل رنگت کا تقریباً چالیس برس کا طویل قامت شخص تھا۔ اس [illegible] کے پیشے سے لاعلم شخص کو وہ خاصا معتزز نظر آتا۔ اگر زہرہ اتفاق سے اس تہہ خانے کو نہ دیکھ لیتی تو ہم آج [illegible] ہوتے۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ لوگ اتنے خطرناک کاروبار میں ملوث ہیں۔ خطرات کے [illegible] دنیا بھر میں اسلحے کی اسمگلنگ سب سے مشکل کام ہے کیونکہ ہر ملک اسلحے کی آمد کے بارے میں حساس [illegible] اور اس کی اسمگلنگ کے سدباب کی پوری کوشش کرتا ہے۔ یہ جگہ بھارتی سرحد سے زیادہ دور نہیں تھی اور [illegible] پڑھنے والا ایک معمولی ذہانت کا حامل شخص بھی جانتا تھا کہ بھارتی ناگ ہمیں تیسری بار ڈسنے کی تیاری کر رہا [illegible] اس سے پہلے کشمیر اور مشرقی پاکستان میں اس کا زہر کام کر چکا تھا اور اب یہی زہر ملک کے بعض سرحدی اور [illegible] مغربی حصوں میں پھیلایا جا رہا تھا۔ وہ ہمیشہ ہماری اندرونی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتا رہا ہے اور اب بھی [illegible] موقع مل رہا ہے تو وہ ہرگز نہیں چوکے گا۔ بدقسمتی سے ایسے غداروں کی کوئی کمی نہیں ہے جن کے نزدیک دین و [illegible] اور ملک و قوم سے زیادہ اہمیت اپنے قبائلی رواجوں کی ہے جہاں وہ خدا سے زیادہ اپنے خود ساختہ خداؤں [illegible] ارتے تھے۔ وہ اس انسانیت سوز غلامی سے آزاد نہیں ہونا چاہتے تھے جس میں ان کی جان، مال اور آبرو [illegible] ایک شخص کے قبضے میں ہوتی ہے۔

"کیا سوچنے لگے؟" زہرہ نے مجھے چونکایا۔

"کچھ نہیں، کاش یہ اسلحہ تباہ نہ ہوتا اور اس ملک کے سوئے محافظ آ کر دیکھتے کہ ان کی ناک تلے کیا ہو رہا ہے۔"

زہرہ ہنسی۔ "تم سچ مچ معصوم انسان ہو۔ یہ ان کی غفلت میں نہیں، ان کی ملی بھگت سے ہو رہا ہے۔ ملک کی کسی کو پروا نہیں ہے سب اپنی تجوریاں بھر رہے ہیں۔ اچھا ہوا یہ اسلحہ تباہ ہو گیا ورنہ یہ اپنی منزل پر پہنچ جاتا، کون جانے کتنے بے گناہوں کی موت کا سبب بنتا۔"

"یہ درست کہہ رہی ہے۔ اتنی بڑی تعداد میں اسلحہ ان کی مرضی کے بغیر کیسے آ سکتا ہے جو اس کو روکنے پر مامور ہیں۔ سرحد سے لے کر یہاں تک سب سے معاملہ سیٹ ہے۔ سب کو حصہ ملتا ہے اور اسلحہ آرام سے آتا ہے۔" شاہ نواز نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"اب نکلو یہاں سے۔ اتنے دھماکے ہوئے ہیں پولیس آنے والی ہوگی۔" میں نے کہا۔

اسی لمحے حویلی کی دوسری جانب سے ایک گاڑی نمودار ہوئی اور ہماری طرف آنے لگی تھی۔ میں اور زہرہ اس کی طرف لپکے، شاہ نواز پہلے ہی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکا تھا۔ "اب چلو دیر مت کرو۔" شاہ نواز نے

جیپ آگے بڑھا دی۔ ''اس راستے پر کوئی گاڑی ہمارا تعاقب نہیں کر سکتی ہے اس پر خاص طور سے ایسے کا
بچھائے گئے ہیں جو دوسری گاڑی کا ٹائر برسٹ کر دیں گے۔ اس کا ٹائر برسٹ نہیں ہو سکتا۔''
''میں نے دیکھا تھا۔''
''وہ گاڑی رک گئی۔'' زہرہ عقب میں دیکھتے ہوئے بولی۔ واقعی گاڑی رک گئی تھی۔
''اس کے ٹائر برسٹ ہو گئے ہوں گے۔'' شاہ نواز نے کہا۔ اسی لمحے جیپ کی رفتار کم ہونے لگی۔
''پتا نہیں۔'' اس نے انجن کو ریس دیتے ہوئے کہا مگر انجن کی رفتار مستقل گھٹتی جا رہی تھی۔ انجن
آخری ہچکی لی اور جیپ رک گئی۔ شاہ نواز نے پہلی بار غور سے فیول گیج کی طرف دیکھا۔ ''ٹنکی خالی ہے مگر یہ
ہو سکتا ہے۔ میں ہمیشہ اس کی ٹنکی فل رکھتا ہوں۔''
''ممکن ہے فیول گیج خراب ہو۔'' میں نے ذرا آگے ہو کر دیکھا۔ سوئی آخری سرے پر تھی۔
''نہیں جب میں نے جیپ اسٹارٹ کی تھی تو گیج ٹنکی کو فل کر کے دکھا رہا تھا۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا
''فیول لائن تو لیک نہیں کر گئی ہے۔ اتر کر دیکھو۔''
بادل ناخواستہ وہ نیچے اترا۔ میں اس پر بھروسا نہیں کر سکتا تھا عین ممکن تھا اس کی کوئی چالاکی ہو گی۔ ٹنکی
ہو اور گیج اسے خالی دکھا رہا ہو۔ میں اس پر بھروسا کر کے اتروں اور وہ جیپ لے کر اڑن چھو ہو جائے۔
اترتے ہی پورے چاند کی روشنی میں مجھے جیپ کے پیچھے وہ سیاہ لکیر دور تک جاتی نظر آئی جو یقیناً فیول لائن
رسنے والے ایندھن سے بنی تھی۔ میں نے جھک کر انگلی سے لکیر کو چھو کر سونگھا اس سے ڈیزل کی بو آ رہی تھی۔
''جیپ کسی پتھر سے چھو گئی اور فیول لائن میں سوراخ ہو گیا۔'' شاہ نواز نے کہا۔ ''ایک کین اور سا
فیول لیک ہوتا رہا تو ہم ایک کلو میٹر بھی نہیں جا سکیں گے۔''
روشنی کا بھی کوئی انتظام نہیں تھا ورنہ میں شاہ نواز کو جیپ کے نیچے گھسا دیتا۔ زہرہ پاس آئی۔ ''اب
ایسا نہ ہو وہ پیچھے سے آ جائیں۔''
''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' شاہ نواز نے تائید کی۔
''سڑک اس جگہ سے کتنی دور ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''یہ راستہ آگے جا کر ہائی وے سے مل جاتا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''دو تین کلو میٹر پیدل چلنا پڑے گا۔''
''تو چلو۔'' میں نے اسے آگے دھکیلا۔ ''اب رکو مت۔''
ہم نے پیدل مارچ شروع کیا۔ سردی غضب کی تھی لیکن حالات کی گرمی نے اب تک اسے محسوس کر
کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ اب پیدل چلنا شروع کیا تھا تو سردی نے بھی مزاج پوچھنا شروع کر دیا تھا۔ زہرا
بغلوں میں ہاتھ دے دیئے تھے۔ وہ میرے ساتھ چل رہی تھی جبکہ شاہ نواز کو سامنے رکھا تھا عقب میں
دھماکوں کی آوازیں تقریباً رک گئی تھیں۔ البتہ شعلے پہلے سے زیادہ بلند تھے۔ تباہی کی وسعت سے اندازہ ہوا
کہ حملہ آوروں میں سے شاید وہی بچے تھے جو ہمارے پیچھے آئے تھے۔ مارے جانے والے اکثر افراد قاتل
انسانیت کے مجرم تھے۔ مجھے افسوس ان عورتوں اور لڑکیوں کا تھا جو پہلے ہی اس جگہ جہنم کی زندگی گزار رہی تھیں
''شاہ نواز حویلی میں کتنی عورتیں اور لڑکیاں تھیں؟'' میں نے پوچھا۔

"سو سے کچھ اوپر صحیح حساب مجھے یاد نہیں ہے۔"

"اس کا حساب کون رکھتا تھا؟"

"اس کا حساب شمشاد رکھتی تھی۔"

"اور آمدنی کا حساب؟"

"وہ میرے پاس ہوتا تھا۔" اس نے کسی قدر گھبرا کر جواب دیا۔

"اس گندے کام سے اب تک تم نے کروڑوں کمائے ہوں گے یا شاید اربوں کما لئے ہوں۔ اب میں تمہیں ایک گولی ماردوں تو یہ سب کہاں جائے گا۔"

"تم۔۔۔تم ایسا نہیں کر سکتے۔ تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔"

"ہاں میں نے تم سے وعدہ کیا تھا۔ اس لئے میں تم پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا اور تم کو جانے دوں گا۔"

"مگر میں نے وعدہ نہیں کیا تھا۔" زہرہ نے پستول سے اشارہ کیا۔ "شاہ نواز میں تم کو نہیں جانے دوں گی۔"

"تم۔۔۔تم کون ہوتی ہو؟" اس نے حقارت سے کہا۔

"میں کچھ بھی نہیں ہوں لیکن یہ تمہارا باپ ہے۔" زہرہ نے پستول لہرایا۔ "زیادہ بک بک کی تو ابھی کتے کی موت ماردوں گی۔"

"یہ وعدہ خلافی ہے۔" شاہ نواز نے فریاد کی۔

میں نے معذرت کی۔ "سوری میں نے صرف اپنی حد تک وعدہ کیا تھا۔ زہرہ کی طرف سے نہیں۔"

"ویسے بھی تمہاری طرف میرے اور مجھ جیسی عورتوں کے کئی حساب نکلتے ہیں۔" زہرہ بولی۔ "اور وہ میں لوں گی، ابھی آگے چلو۔"

شاہ نواز نے آتش فشاں نظروں سے اسے دیکھا۔ کل تک جو عورت اس کے لئے ایک مشین سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی جسے وہ کمانے کے لئے استعمال کرتا تھا اور وہ خراب ہو جاتی تو اسے پھینک کر دوسری مشین لے آتا۔ آج وہ عورت ملک الموت کی طرح اس کے سر پر سوار تھی اور اس کی انگلی کی ایک جنبش شاہ نواز کو جہنم کے سفر پر روانہ کر سکتی تھی۔

"رک مت۔" میں نے اچانک اسے لات ماری۔ "یہ کس طرح سے دیکھ رہا ہے۔"

شاہ نواز زمین پر جا گرا پھر جلدی سے کھڑا ہو گیا اور پٹے ہوئے کتے کی طرح دم دبا کر چلنے لگا۔

"اب ہم کہاں جائیں گے؟" زہرہ فکر مند تھی۔

"جہاں تقدیر لے جائے۔" میں نے واضح جواب دینے سے گریز کیا۔ "ویسے میرے ذہن میں سونیا کے گھر جانے کا خیال تھا۔ مجھے یقین تھا وہ اور ناصر محفوظ تھے اور سونیا کا گھر بھی ان کی نظروں سے محفوظ تھا۔ میری خوش قسمتی کہ ڈیوڈ شاہ، فتح خان اور مرشد علی تینوں میں سے کوئی یہاں نہیں تھا اور میرا واسطہ شاہ نواز جیسے بدمعاش سے تھا جو صرف بدمعاشی دکھا سکتا تھا اور جب اسے بحران کا سامنا کرنا پڑا تو اس کی عقل جواب دے گئی۔

"وہ پیچھے سے آ سکتے ہیں۔" زہرہ نے کہا۔ وہ بار بار مڑ کر دیکھ رہی تھی۔

"اتنی آسانی سے نہیں آسکتے اور آ بھی گئے تو دائیں بائیں چھپنے کے لئے بہت جگہ ہے۔" میں نے سڑک کے اردگرد پھیلے جنگلات کی طرف اشارہ کیا۔

"وہ دیکھو......شاید کوئی گاؤں ہے۔" زہرہ نے فاصلے پر دکھائی دینے والی روشنیوں کی نشاندہی کی۔

"ہمیں کسی آبادی میں نہیں جانا ہے۔" میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

"پھر کہاں جانا ہے؟"

"سب سے پہلے ہمیں بڑی سڑک تک جانا ہے۔اس کے بعد دیکھیں گے کہ کہاں جانا ہے۔"

تم اس علاقے سے نہیں نکل سکتے۔" شاہنواز نے اچانک کہا۔

"وہ کیوں؟"

"اس سڑک کی ناکا بندی کی جا چکی ہوگی۔" اس نے کہا۔"جن لوگوں نے حویلی پر حملہ کیا ہے ان کو پتا چل گیا ہوگا۔وہ میری تلاش میں ہوں گے۔"

"تمہاری وجہ سے ہم بلاوجہ مارے جائیں گے۔"

"نہیں، وہ تمہاری تلاش میں بھی ہوں گے مگر میرے خون کے پیاسے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے وہ جامی شاہ کے آدمی ہیں مگر سوال یہ ہے جب جامی شاہ اس دن بمشکل اپنی جان بچا کر فرار ہوا تھا تو اتنی جلدی وہ دوبارہ طاقت حاصل کر کے حویلی پر دوبارہ حملہ آور کیسے ہوا؟"

جامی شاہ کے حامی ابھی بھی بہت ہیں۔خاص طور سے گوجرانوالہ کا چوہدری گروپ اس کا حامی ہے۔ان کی مرشد علی سے سیاسی مخاصمت ہے اس وجہ سے بھی وہ جامی شاہ کی حمایت میں سرگرم ہیں، مجھے کل اطلاع ملی تھی۔"

"لیکن تم نے اسے اہمیت نہیں دی۔"

اس نے سر ہلایا۔"تمہاری طرح میں بھی اس تذبذب میں تھا کہ زخم خوردہ جامی شاہ اتنی جلدی پلٹ آئے گا۔بدقسمتی سے اس وقت تم نے تہہ خانے پر قبضہ کر لیا تھا۔

"یہ کسی بھی حملہ آور کے لئے کامیاب ترین اسٹریٹجی ہوتی ہے اس وقت حملہ کرو جب اس کی توقع نہ ہو۔ جامی شاہ نے بھی ایسا ہی کیا۔"

"اگر تم نے مسئلہ نہ کیا ہوتا تو اس کا یہ حملہ بھی ناکام رہتا۔"

"آدمی کی جب شامت آتی ہے تو ایسے ہی آتی ہے، تمہیں پتا ہے مجھے اس تہہ خانے کا کیسے پتا چلا...... زہرہ سے پتا چلا اور اس نے اتفاق سے تمہارے آدمیوں کو وہاں سے اسلحہ نکالتے ہوئے دیکھ لیا تھا ورنہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔"

"شاید میری تقدیر ہی خراب ہے، لالچ میں آکر میں نے جامی شاہ کے خلاف بغاوت کی اور مجھے اکسانے والے غائب ہیں۔"

"حالانکہ مرشد علی چاہتا تو تم کو درجنوں مسلح افراد دے سکتا تھا، اس کے پاس ایسے مریدوں کی کوئی کمی نہیں ہے جو اس کے ایک اشارے پر کسی کی جان لے سکتے ہیں اور اپنی جان دے سکتے ہیں۔"

"وہ صرف آمدنی میں حصہ لینے آیا تھا۔ وہ بھی باس کا حصہ۔" شاہ نواز کا لہجہ زہریلا ہو گیا تھا۔

"افسوس، تم یہاں بھی ماتحت رہے جیسے جامی شاہ کے تھے اور حویلی کی تباہی اور لڑکیوں کے مرنے کے بعد مرشد علی کو تم سے کوئی دلچسپی نہیں رہے گی۔ اس کی بلا سے تم بھاڑ میں جاؤ بلکہ عین ممکن ہے وہ جامی شاہ کو دوبارہ طاقت حاصل کرتے دیکھ کر اس سے ہاتھ ملا لے۔"

"نہیں...... میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔"

"تم کیا کر سکو گے۔ تم ایک معمولی سا مہرہ ہو۔ دونوں طرف سے تمہارے وفادار مارے جا چکے ہیں اور تم خود کہہ چکے ہو، وہ تمہارے نہیں، کاروبار کے وفادار تھے۔"

شاہ نواز کا جھکا ہوا سر کہہ رہا تھا کہ وہ شکست مان چکا ہے۔ بس بڑھکیں مار رہا ہے۔ ہم بڑی سڑک تک پہنچ چکے تھے۔ اچانک زہرہ نے شاہ نواز کو رک جانے کو کہا۔ "بس تمہارا سفر یہیں تک تھا شاہ نواز۔"

"کیا مطلب؟" وہ چونک کر مڑا۔

"ابھی میں نے کیا کہا تھا۔ تمہارا فیصلہ میں کروں گی۔"

"نہیں، تم مجھے نہیں مار سکتیں۔"

"زہرہ میرا خیال ہے یہ زندہ حالت میں کارآمد ثابت ہو گا۔" میں نے مداخلت کی۔

"اس کے برعکس، یہ تمہارے اور میرے لئے خطرہ ہے۔ اسے ذرا سا موقع ملا تو یہ ہمیں مارنے میں دریغ نہیں کرے گا۔"

"زہرہ اسے ایک موقع دو۔"

"شہباز میں نے تمہاری مدد کی اور تمہارا ساتھ دیا۔ تم سے کچھ مانگا نہیں۔ اب میں اسے مانگ رہی ہوں۔" میں نے محسوس کیا کہ زہرہ کسی صورت اسے معاف نہیں کرے گی۔ میں نے گہری سانس لی۔ "ٹھیک ہے اگر تم اسے مارنا......"

میرا جملہ ادھورا رہ گیا تھا۔ اچانک فائر ہوا اور زہرہ الٹ کر پیچھے جا گری۔ فائر عقب سے ہوا تھا اور میرے عقب میں شاہ نواز تھا۔ خطرے کا احساس مجھے تیزی سے حرکت میں لایا تھا۔ میں گھومتے ہوئے زمین پر گرا اور دوسری گولی میرے سر سے چند انچ کے فاصلے سے گزری تھی۔ نہ جانے کہاں سے شاہ نواز نے یہ پستول برآمد کیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ تیسری بار گولی چلاتا میں نے مشین گن کا پورا راؤنڈ اس پر خالی کر دیا تھا۔ سینے اور پیٹ میں بے شمار خون اگلتے سوراخوں کے ساتھ وہ زمین پر جا گرا تھا۔ میں زہرہ کی طرف لپکا۔ وہ زمین پر ساکت پڑی تھی اور اس کے بائیں شانے پر دل سے ذرا اوپر سوراخ سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ مر چکی تھی یا مرنے والی تھی۔ میں اس کے پاس بیٹھا ہی تھا کہ سامنے سے ایک تیز روشنی نمودار ہوئی یہ کوئی بھاری بائیک تھی۔ وہ میرے سامنے آ کر رکی۔ روشنی کی وجہ سے مجھے بائیک کا سوار نظر نہیں آ رہا تھا۔

"واہ...... واہ...... اپنے شہباز صاحب۔" ایک آواز نے کہا تو میں بے ساختہ اچھل پڑا اور میں نے مشین گن اٹھانی چاہی۔ آواز نے دوبارہ کہا۔ "نا جی نا...... حرکت مت کرنا...... تم میرے نشانے پر ہو۔" آواز بلاشبہ فتح خان کی تھی۔

فتح خان کی آواز سنتے ہی میں ساکت ہو گیا تھا۔ مجھے اس کی بات پر ذرا بھی شبہ نہیں تھا۔ فتح خان وہ شخص تھا جو خوابوں میں بھی اسلحہ لے کر گھومتا تھا اور قتل و غارت گری کے لئے ایسے تیار رہتا تھا جیسے دعوتِ ولیمہ میں جانے والے کھانا کھانے کو تیار ہوتے ہیں۔ وہ نہ جانے کہاں سے آن ٹپکا تھا اور میں آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک گیا تھا۔ میں نے مشین گن زمین پر رکھ دی تھی اور بولا۔ "فتح خان! نہ جانے ہماری تقدیر میں کیا چیز میل کھاتی ہے جو بار بار ہم ایک دوسرے کے سامنے آجاتے ہیں۔"

"شاید ہمارے ہاتھ تمہارا موت!" اس نے ارشاد فرمایا۔

"معاملہ اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے۔"

"ممکن ہے۔" اس نے تسلیم کیا۔ "اب تم دونوں ہاتھ اوپر کر لو اور کتے کی دم کے مافک سیدھے ہو جاؤ۔"

"کتے کی دم کبھی سیدھی نہیں ہوتی۔" میں نے ہاتھ اوپر کرتے ہوئے اسے مطلع کیا۔

"میں سیدھی کر سکتا ہے کاٹ کر۔" اس نے بائیک اسٹینڈ پر کھڑی کر دی۔ وہ حویلی کی طرف سے آرہا تھا اور سو فی صد امکان تھا اسے صورتِ حال کا علم ہو چکا ہو۔ فوراً ہی اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ "یہ بتاؤ، تم نے اُدھر حویلی میں کیا حرامی پن کیا ہے؟"

"کچھ نہیں۔ وہ سب جامی شاہ کے آدمیوں کی کارروائی تھی، میں موقع سے فائدہ اٹھا کر بھاگ نکلا تھا مگر قسمت کی خرابی دیکھو، تمہارے ہتھے چڑھ گیا ہوں۔"

فتح خان ذرا آگے آیا۔ "تمہارا مطلب ہے حویلی کو تم نے تباہ نہیں کیا؟"

"نہیں...... وہاں پر جامی شاہ کے آدمی حملہ آور ہوئے تھے۔ انہوں نے نہ جانے کیا کیا کہ دھماکے ہوئے اور پوری حویلی تباہ ہو گئی۔"

"تمہارا مطلب ہے، تم کو اس بارے میں کچھ نہیں معلوم کہ حویلی کیسے تباہ ہوا؟" اس نے شک سے کہا۔

"فتح خان، اپنی عقل استعمال کرو۔ میں شاہ نواز کی قید میں تھا اور میرے پاس ایسی کیا شے تھی جس سے میں حویلی تباہ کر سکتا؟ افسوس کہ شاہ نواز میرے ہاتھوں مارا گیا ہے۔"

"تم نے اسے قتل کر دیا؟" وہ چونکا۔

"یہ دیکھو اس کی لاش!" میں ذرا سا ہٹا۔

"یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔" فتح خان کے لہجے میں جھنجلاہٹ آگئی۔ "ادھر حویلی میں سب تباہ ہو گیا۔"

میں نے جان بوجھ کر فتح خان کو اسلحے کے ذخیرے کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ اگر اسے پتا چل جاتا کہ میں ان کی وطن دشمن سرگرمیوں سے باخبر ہو گیا ہوں تو وہ فوری طور پر میرا پتا صاف کر سکتا تھا۔ "تم یقین سے کہہ رہے ہو کہ تمہیں حویلی کی تباہی کی وجہ نہیں معلوم؟"

"اب میں تمہاری قسم کھاؤں تو تم یقین کرو گے۔" میں نے جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کیا، ویسے فتح خان کے لہجے سے میرے اندر خطرے کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔

"تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟"

"کس بارے میں؟" میں نے معصومیت سے کہا۔

"حویلی کیسے تباہ ہوئی؟" اس نے جھلا کر کہا۔

"شاید کوئی بم پھٹا تھا۔"

"اتنا بڑا بم ہو سکتا ہے جو حویلی کو اس طرح ملبے کا ڈھیر کر دے؟"

"وہ امریکیوں نے تورا بورا میں ڈیزی کٹر بم گرائے تھے۔"

"بکومت...... تم اتنے بے خبر نہیں ہو جتنا بن رہے ہو۔"

"اب مجھے بموں کے بارے میں اتنی معلومات نہیں ہیں...... تمہارا تو پیشہ بھی ہے۔"

"شہباز خان!" فتح خان کے لہجے میں غراہٹ تھی۔ "مجھے بے وقوف مت بناؤ۔ سچ بتاؤ تم حویلی سے کیسے نکلے؟"

"شاہ نواز کو یرغمال بنا کر۔ یہاں آ کر اس نے اچانک نہ جانے کہاں سے پستول نکال کر زہرہ کو گولی مار دی اور اس سے پہلے کہ وہ مجھے مارتا، میں نے اسے جہنم رسید کر دیا۔ تم جانتے ہو میں پیشہ ور مجرم نہیں ہوں صرف اپنے دفاع میں مجبوراً کسی کو مارتا ہوں۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "تم اتنا بھی شریف نہیں ہے جتنا خود کو بنا کر پیش کرتا ہے۔"

"فتح خان، تم مجھ پر کس چیز کا شبہ کر رہے ہو؟"

"تم اچھی طرح جانتا ہے۔" اس نے کہا۔

"میں کچھ نہیں جانتا، اب یہ بتاؤ کہ تم میرے ساتھ کیا سلوک کرو گے؟ چھوڑ دو گے، مار دو گے یا اس بائیک پر جنگی قیدی بنا کر لے جاؤ گے؟"

"میں تیرے کو لے جاتا، پر افسوس، مجھے شبہ ہے تُو وہ بات جان گیا ہے جو تجھے نہیں جاننی چاہئے تھی۔ ہمارا تمہارا دشمنی بہت دن چلا۔ پر اب اس کے خاتمے کا وقت آ گیا ہے، تمہارے خاتمے کے ساتھ۔"

فتح خان کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی اور موٹے بیرل والی گن تھی، اسے میں نے فلموں میں دیکھا تھا، یہ مشین گن کی طرح برسٹ مارتی تھی اور لمحوں میں درجن بھر بندے لٹا دیتی تھی۔ عملی طور پر پہلی بار اسے دیکھ رہا تھا، میں نے ہاتھ اوپر کیا۔ "ایک منٹ، تمہارے خیال میں، مَیں کس بات سے واقف ہو گیا ہوں؟"

"حویلی کے نیچے موجود اسلحے سے۔" اس نے بتا دیا کیونکہ اپنے طور پر وہ مجھے مارنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

"اس اسلحے سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"پاگل کے بچے! اس حویلی میں موجود ہر چیز سے میرا تعلق تھا۔ یہ گدھا چند دن اور کام کرتا اس کے بعد سب مجھے سنبھالنا تھا۔ تم نے سب تباہ کر دیا۔"

"یعنی شاہ نواز کی چھٹی کا فیصلہ ہو گیا تھا؟"

"تم نے اسے مار کر اچھا کیا...... پر حویلی کو تباہ کر کے برا کیا۔ میں تجھے مارے گا، پر ایک گولی سے تم کو زیادہ تکلیف نہیں ہو گی۔"

"فتح خان!" میں بوکھلا گیا تھا۔ "تم سنجیدہ ہو؟"

"ہم نے کبھی مسخری نہیں کیا۔" اس نے کہا اور گن والا ہاتھ اوپر کیا، میں نے بچنے کے لئے غوطہ مارا، فائر

ہوا اور گولی نہ جانے کہاں گئی البتہ فتح خان کے چلانے کی آواز آئی تھی۔ میں نے زمین سے سر اٹھا کر دیکھا، وہ اپنے ہاتھ سے فوارے کی طرح ابلتے خون کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ سے گن اُڑ کر نہ جانے کہاں چلی گئی تھی پھر اس نے بائیں ہاتھ کو اپنی جیکٹ میں ڈالا تو میں حرکت میں آ گیا۔ میں نے زمین سے اٹھتے ہوئے جست لگائی اور بروقت اس کے بائیں ہاتھ کو پکڑنے میں کامیاب رہا ورنہ وہ مجھے اس ہاتھ سے بھی شوٹ کر سکتا تھا۔ میں اسے لئے زمین پر گرا۔ اس کا سر پختہ سڑک سے ٹکرایا اور وہ بے سدھ ہو گیا۔ مزید اطمینان کے لئے میں نے اس کا سر ایک بار پھر سڑک سے مارا اور اس کے ہاتھ سے پستول لے لیا۔ اس کے سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی میں گولی کا سوراخ تھا۔ کیا اس نے خود کو گولی ماری تھی، میں نے اس کی تلاشی لیتے ہوئے سوچا، اس کے پاس بس یہی ایک پستول تھا۔

''شہباز!'' مجھے زہرہ کی نحیف سی آواز آئی تو میں لپک کر اس کے پاس آیا۔

''تم زندہ ہو۔'' میں نے اس کا سر اٹھایا۔ پستول اس کے ہاتھ میں تھا جس سے اس نے بروقت فتح خان پر گولی چلائی تھی۔ شاہ نواز کے فائر نے اس کی جان نہیں لی تھی، وہ بے ہوش ہو گئی تھی اور بظاہر لگ رہا تھا وہ زندہ نہیں ہے۔ مجھے بھی موقع نہیں ملا تھا کہ اس کی نبض وغیرہ دیکھتا۔ جب فتح خان نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی تو زہرہ نے ہمت کر کے اسے ناکام بنا دیا۔

''میرا...... تمہارا ساتھ...... بس یہیں تک تھا۔'' وہ بہت آہستہ بول رہی تھی۔

''زہرہ میں تمہیں اسپتال لے جاؤں گا۔''

''نہیں، اب وقت نہیں ہے۔ تم نے پہلے بھی میرے لئے بہت کیا ہے۔''

''تم نے آج فتح خان سے بچا کر سارے بدلے چکا دیئے ہیں۔''

''اللہ مجھے معاف کر دے گا، میں بہت بری عورت ہوں۔'' اس کی آواز کراہنے کے انداز میں بلند ہوئی۔

''ضرور معاف کر دے گا۔ جو اس سے معافی مانگتا ہے، وہ اسے ضرور معاف کر دیتا ہے۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

''شہباز، تم اور دوسرے میرے لئے دعا کرنا۔ اللہ رکھا کے لئے دعا کرنا۔ خدا ہمیں معاف کرے اور ہمیں ایک ساتھ رکھے۔''

میرے گلے میں جیسے کچھ پھنسنے لگا تھا۔ ''زہرہ! ہم ایسا کریں گے، ضرور کریں گے۔ میں کبھی تمہیں فراموش نہیں کروں گا۔''

''خدا حافظ!'' اس نے کہا اور آنکھیں بند کر لیں، ایک ہچکی کے ساتھ حسن و دلکشی کا مجسمہ مٹی کے ڈھیر میں بدل گیا جسے جلد مٹی میں مل جانا تھا۔ میں نے اس کا سر نیچے رکھا اور اپنی آنکھیں صاف کیں۔ اب وہاں دو لاشوں اور ایک بے ہوش شخص کے ساتھ میں واحد زندہ فرد تھا۔ میں نے اس جگہ دیکھا جہاں فتح خان پڑا تھا تو مجھے دھچکا لگا۔ وہ جگہ خالی تھی۔ مکار فتح خان نہ جانے کب اس جگہ سے خاموشی سے کھسک گیا تھا جب میں زہرہ کی طرف متوجہ تھا۔ وہ سڑک کے دونوں طرف جا سکتا تھا۔ دونوں طرف گھنے درخت اور جھاڑیاں تھیں، میری خوش قسمتی کہ میں نے اس کا پستول لے لیا تھا ورنہ وہ اطمینان سے عقب سے مجھے گولی مار سکتا تھا۔ یک لخت مجھے خطرے کا

احساس ہوا۔ فتح خان ہوش میں اور میرے آس پاس تھا۔ میں نے مشین گن اٹھالی اور اس میں نیا میگزین لگایا۔ دوسری مشین گن میں نے جیپ میں چھوڑ دی تھی اور اس کا بھی میگزین لے لیا تھا۔

میں نے زہرہ کے ہاتھ سے بھی پستول لے لیا۔ اب میرے پاس دو پستول تھے۔ ابھی میں سوچ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے کہ لاہور والی سمت سے روشنیاں نمودار ہوئیں۔ یہ کئی گاڑیاں تھیں اور خاص بات یہ تھی کہ ان کے اوپر پولیس لائٹس فلیش کر رہی تھیں۔ میں یک دم بھاگا اور بائیک پر جا بیٹھا، خوش قسمتی سے چابی فتح خان نے بائیک میں لگی چھوڑ دی تھی، میں نے کک مار کر بائیک اسٹارٹ کی اور ہیڈ لائٹس بجھاتے ہوئے اسے دوڑا دیا۔ مجھے یقین نہیں تھا عقبی بریک لائٹ پولیس پارٹی کی نظر میں آئی تھی یا نہیں مگر اچانک ہی سائرن سنائی دینے لگے۔ ان ہوشیار، خبردار قسم کے سائرنوں کی تک آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی ہے، جس کا مطلب سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوتا ہے کہ ہم آ رہے ہیں، بھاگ جاؤ۔ ترقی یافتہ ممالک میں سائرن وہاں بجایا جاتا ہے جہاں مجرموں کے فرار کی راہ نہ ہو اور ان کو بدحواس کر کے سامنے لانا ہو۔ ورنہ جہاں پولیس نے مجرموں کو بے خبر رکھنا ہو وہاں بغیر سائرن کے خاموشی سے پہنچ جاتی ہے۔ ہمارے ملک میں پولیس کے پاس ناکا بندی کے وسائل نہیں ہیں اس لئے یہاں سائرن بجا کر آنا بے تکی حرکت ہے۔

میں نے بائیک کو ایکسلریٹر دیا اور ایک منٹ میں پولیس موبائلز خاصی پیچھے رہ گئی تھیں مگر مصیبتوں سے ابھی چھٹکارا نہیں ملا تھا۔ میں حویلی کے نزدیک پہنچا جس کے ملبے سے اب بھی شعلے اٹھ رہے تھے اگرچہ ان کی شدت میں خاصی کمی آئی تھی مگر حویلی کے عین سامنے دو بڑی لینڈ کروزر ٹائپ گاڑیوں نے راستہ بند کر رکھا تھا۔ یہ یقیناً وہی بدمعاش تھے جنہوں نے حویلی پر حملہ کیا تھا۔ میں نے ان گاڑیوں کو گیٹ پر حملہ کرنے والوں کے پاس دیکھا تھا، ان کے پاس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے کوئی ڈیڑھ سو گز کی دوری سے اچانک بائیک سڑک سے اتار لی۔ فوراً ہی ان گاڑیوں کی طرف سے کسی نے فائرنگ کی اور گولیاں سنسناتی ہوئی میرے آس پاس سے گزری تھیں۔ جھاڑیوں میں گھسنے سے پہلے میں نے دیکھا تھا کہ ایک گاڑی گھوم کر میری طرف آ رہی تھی۔

چاند غروب ہو چکا تھا اس لئے صبح قریب ہونے کے باوجود اندھیرا ہو گیا تھا اور اس جنگل میں تاریکی میں بائیک دوڑانے کا مطلب تھا کہ میں جلد کسی گڑھے میں تشریف فرما ہوں گا یا کسی درخت سے شرف ملاقات حاصل ہو گی۔ دونوں صورتوں میں بچ جانے کے بعد دشمن اٹھانے آتے۔ پولیس بھی دشمن تھی اور کئی مقدمات میں، مَیں ان کو مطلوب تھا اس لئے میں نے بادلِ ناخواستہ بائیک کی ہیڈ لائٹس روشن کر لیں۔ اس سے پیچھے آنے والوں کو خود میرا سراغ مل جاتا مگر مجبوری تھی۔ میں جان بوجھ کر تنگ راستوں سے گزر رہا تھا تاکہ یہ گاڑی میرے پیچھے نہ آ سکے مگر وہ بڑی ہوشیاری سے مجھے نظروں میں رکھتے ہوئے تعاقب کر رہے تھے اور فاصلہ برقرار رکھے ہوئے تھے۔ اچانک بائیک ایک نالے میں اتر گئی۔ وہ تیزی سے نیچے گئی اور جب دوسری دیوار پر چڑھنے لگی تو میں خود کود کر ایک طرف ہو گیا ورنہ یہ بھاری بھرکم بائیک الٹ کر مجھ پر آتی اور میرا نہ جانے کیا حشر ہوتا۔ حسبِ توقع بائیک پلٹ کر آئی اور میں بال بال بچا۔ یہ کوئی پندرہ فٹ چوڑا اور کوئی آٹھ فٹ گہرا نالا تھا جو اس وقت بالکل خشک پڑا تھا، صاف ظاہر تھا یہ برساتی نالا تھا اور بارشیں نہ ہونے کی وجہ سے خشک تھا۔ اس حادثے میں دو

ابھی باتیں ہوئی تھیں، ایک تو میں محفوظ رہا تھا دوسرے بائیک کا انجن چل رہا تھا۔ میں نے اٹھ کر بائیک اٹھائی۔ اس اثناء میں اوپر سے لوگوں کے چلانے کی آوازیں آئیں۔ "لو یئے ---- گا ے ---- ادھر دیکھ۔ حرامی نس جائے گا۔"

میں نے بائیک پر بیٹھ کر کہا۔ "اب تمہارا باپ بھی مجھے نہیں پکڑ سکتا۔" اور نالے میں گاڑی دوڑا دی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ نالا کہاں جا رہا ہے اور کس سے جا کر مل جائے گا۔ ممکن ہے میں نالے سے گزر کر کسی ندی میں غوطہ زن ہوں یا کسی نہر میں جا گروں۔ اس علاقے میں واحد دریا راوی تھا جسے میں پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ فی الحال دشمن پیچھے تھے اس لئے میں سستی کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ لوگوں کا شور کچھ دیر سنائی دیا تھا، اکا دکا فائر بھی ہوئے تھے لیکن یہ سب غم و غصے سے کئے گئے فائر تھے، میں ان کی زد سے باہر تھا۔ نالا بالکل خشک بھی نہیں تھا بلکہ اس میں نشیبی مقامات پر پانی جمع تھا۔ جب بائیک پانی سے گزرتی تھی تو چھینٹے چاروں طرف پھیل جاتے تھے، ایک جگہ گڑھا زیادہ ہی گہرا تھا اور بائیک اس میں جا کر اچھلی تھی، میں نے بمشکل اسے قابو کیا تھا۔ چار سو سی سی انجن کے ساتھ یہ طاقتور اور منہ زور سواری تھی۔ ذرا سا ایکسلریٹر دیتے ہی بدکے ہوئے گھوڑے کی طرح بھاگتی تھی۔ تقریباً بیس منٹ بعد میں نے بائیک روکی۔ اس کا انجن بند کیا اور اسے دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا کر دیا اور خود پودوں اور جڑوں کے سہارے نالے سے باہر آیا۔ اس جگہ نالا زیادہ چوڑا اور زیادہ گہرا ہو رہا تھا۔

میں چند منٹ تک سن گن لیتا رہا۔ یہ گھنا جنگل تھا اور فی الحال یہاں مکمل خاموشی تھی۔ مجھے وقت کا پتا نہیں تھا بس میرا اندازہ تھا کہ صبح کے پانچ بج رہے ہیں۔ اس جنگل میں کسی بڑی گاڑی کا آنا ممکن نہیں تھا لیکن ہو سکتا تھا کہ دشمن پیدل میرے پیچھے آ رہے ہوں۔ نالے نے مجھے فرار کا اچھا راستہ فراہم کیا تھا مگر ساتھ ہی اس نے مجھے ایک طرح سے اپنا قیدی بنا لیا تھا، میں بائیک سمیت اس سے نہیں نکل سکتا تھا، ہاں پیدل میں جس طرف چاہے فرار ہو سکتا تھا۔ میں دوبارہ نالے میں اترا۔ بائیک اسٹارٹ کی اور آگے کی طرف روانہ ہو گیا۔ مجھے کسی ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں سے میں اس نالے سے نکل سکوں۔ مگر کئی کلومیٹر آگے آنے کے بعد مجھے ایسی کوئی جگہ نہیں ملی تھی۔



میں نے سوچا کہ بائیک چھوڑ دوں اور پیدل نکل جاؤں مگر میں اتنی جلدی بائیک سے دستبردار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اگر دشمن سے اچانک سامنا ہو جاتا تو پیدل بھاگنے کے مقابلے میں بائیک پر فرار میں آسانی رہتی۔ یہی سوچ کر میں اسے چلاتا رہا۔ حتیٰ کہ میں اپنے اندازے کے مطابق اس جگہ سے کوئی بیس بائیس کلومیٹر دور نکل آیا تھا جہاں سے میں نے بائیک نالے میں داخل کی تھی۔ اب میں ساری رات تو نالے میں سفر نہیں کر سکتا تھا۔ صبح کے آثار نمودار ہونے لگے تھے اور میں بائیک روک کر نالے سے نکل آیا۔ اب گھنے جنگل کے بجائے جھاڑیوں سے گھرا ناہموار علاقہ تھا۔ یہاں زیادہ کیکر اور فراش کے جھاڑی نما درخت تھے۔ سامنے مشرق تھا جس طرف سے روشنی ہو رہی تھی اور عقب میں مغرب جہاں سے میں آیا تھا۔ آگے جانے کا مطلب بھارتی بارڈر سیکیورٹی فورس یا رینجرز کے ہاتھ لگ جانا تھا اور واپسی کے راستے پر پولیس اور دشمن موجود تھے اس لئے میں نے شمال کا رخ کیا۔ مشین گن میں نے شانے سے لٹکائی تھی لیکن کسی ناگہانی کا مقابلہ کرنے کے لئے پستول ہاتھ میں رکھا تھا۔

میں دس منٹ چلا ہوں گا کہ مجھے ایک جھنڈ سے جس میں شیشم کے چند درخت آپس میں جڑے کھڑے تھے دو افراد کے بات کرنے کی آواز آئی۔ "کمن دسوا اے تھلے تے دبایا ہے کہ نہیں۔"

"اس واری لمبا مال ہتھ آیا جے۔"

دونوں افراد پنجابی ہی بول رہے تھے اور کسی واردات کا ذکر کر رہے تھے جس میں ان کو کافی مال و دولت ملی تھی۔ مجھے ان کی باتوں میں کوئی بات عجیب سی لگی تھی۔ اس وقت میں سمجھ نہیں سکا تھا۔ یہ قطعی ویران علاقہ تھا اور دور دور تک ایسے آثار نہیں تھے کہ یہاں سے کوئی بندہ بشر گزرتا ہو۔ جرائم پیشہ افراد ایسے ہی ویرانوں میں اپنے ٹھکانے بناتے ہیں جہاں وہ قانون کی پہنچ سے دور رہ سکیں۔ ابھی اتنی روشنی نہیں ہوئی تھی کہ میں ان دونوں کو دیکھ سکتا۔ ان کی آوازوں سے لگ رہا تھا کہ وہ بولنے کے ساتھ کھانے پینے میں بھی مصروف تھے۔ ابھی میں ان کو اچانک ہینڈز اَپ کرانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں ان سے علاقے کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ وہ مجھے لاہور واپسی کا محفوظ راستہ بتا سکتے تھے۔ اچانک مجھے اپنے عقب میں آہٹ محسوس ہوئی تھی لیکن اس سے پہلے کہ میں پلٹ کر دیکھتا، کوئی ٹھوس شے میرے سر سے ٹکرائی اور میں نے کسی کو کہتے سنا۔

"سو ر دا پتر!"

میں نے مڑنا چاہا لیکن میرے پاؤں یک دم جواب دے گئے اور میں چکرا کر گر پڑا۔ میں نے ایک

داڑھی والے کو سامنے دیکھا جس نے پگڑی باندھ رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں لکڑی کا موٹا سا لٹھ تھا۔ اس دوسری بار مجھے گالی دی اور دوسری بار بھی لٹھ گھما کر سر پر مارا، اس بار میں نے بے ہوش ہو جانے میں عافیت سمجھی شاید وہ ان دونوں کا ساتھی تھا اور کسی ضروری یا غیر ضروری کام سے آس پاس گیا تھا۔ میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ یہاں ان دونوں کے علاوہ بھی کوئی ہو سکتا ہے؟ مجھے ہوش آیا تو دن خاصا چڑھ چکا تھا۔ درختوں سے سورج کی روشنی چھن کر آ رہی تھی۔ میرے ہاتھ پاؤں سخت رسی سے کس کر بندھے ہوئے تھے اور اس رسی کا ایک سرا درخت سے بھی بندھا تھا کہ میں لڑھک کر فرار نہ ہو جاؤں۔ میرے جسم سے سوائے کپڑوں اور جوتوں کے سب الگ کیا جا چکا تھا۔ یعنی تمام اسلحہ لیا جا چکا تھا اور میں قطعی بے بس ہونے کے ساتھ نہتا بھی تھا۔ میرے سر میں درد تھا مگر نا قابلِ برداشت نہیں تھا اور نہ ہی اب مجھے چکر آ رہے تھے۔ میں نے سر گھما کر ممکنہ حد تک دیکھا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں شیشم کے اسی جھنڈ میں بندھا پڑا تھا جہاں دو افراد محو گفتگو اور طعام تھے، اس کا ثبوت زمین پر پڑے روٹی کے ٹکڑے اور ایک عدد اچار کے آم کی گٹھلی تھی۔ زمین صاف ستھری اور کیڑے مکوڑوں سے پاک تھی ورنہ اب تک نہ جانے میرا کیا حشر ہو چکا ہوتا۔

"ارے کوئی ہے؟" میں نے کسی قدر دبی آواز میں پکارا مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ اگلی بار میں نے ذرا بلند آواز سے پکارا، اس کے بعد آواز کا لیول بلند اور پکارے جانے والے الفاظ میں غیر شریفانہ الفاظ کا تناسب بڑھ گیا مگر وہاں سب کے جواب میں ایک خاموشی تھی۔ نہ جانے وہ مجھے باندھ کر کہاں دفع ہو گئے تھے اور کیوں دفع ہو گئے تھے؟ مقصد مجھے قتل کرنا تھا تو یہ کام میری بے ہوشی میں بہ آسانی کیا جا سکتا تھا۔ اس طرح باندھ کر جانے کا ایک ہی مطلب تھا وہ واپس آنے کے لئے گئے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ میں ان کی عدم موجودگی میں فرار ہو جاؤں۔ تن بہ تقدیر میں چپ ہو کر ان کا انتظار کرنے لگا تھا۔ وقت گزرتا رہا۔ میں نے درمیان میں ایک بار ہاتھ کھولنے کی کوشش کی مگر مجھے جلد اندازہ ہو گیا کہ اس طرح میں سوائے خود کو تکلیف دینے کے اور کچھ نہیں کر سکوں گا۔ یہ کسی گھاس کے ریشوں سے بنی ہوئی نہایت سخت رسی تھی جس کے بل میری کلائیوں اور ٹخنوں میں گڑے جا رہے تھے۔ کم بختوں نے نہایت پیشہ ورانہ انداز میں باندھا تھا۔ میرے ہاتھ پشت پر بندھے تھے اس لئے میں پیر کھولنے کی کوشش بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے ہوش میں آئے ایک گھنٹا ہونے کو آیا تھا اور مجموعی طور پر مجھے اس جگہ پڑے چار گھنٹے سے اوپر ہونے کو آئے تھے۔

میرے اندر تشویش سر اٹھانے لگی تھی۔ ممکن ہے انہوں نے خود قتل کرنے کے بجائے مجھے مارنے کا یہ بھیانک طریقہ اختیار کیا تھا۔ وہ مجھے اس طرح باندھ کر ڈال گئے تھے کہ میں کسی طرح خود کو آزاد نہ کرا سکوں اور اسی جگہ بھوکا پیاسا مر جاؤں۔ یہ خیال آنے پر میں ایک بار پھر حلق پھاڑ کر چلایا۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ آس پاس کوئی بندہ بشر ہو تو اس کے کانوں تک میری فریاد پہنچ جائے۔ اس کے لئے کچھ کہنا لازمی نہیں تھا بس چیخ و پکار کافی تھی۔ میرا ذاتی تجربہ تھا، الفاظ کے مقابلے میں چیخنے کی آواز زیادہ دور تک سنائی دیتی ہے اور انسان کو زیادہ متوجہ کرتی ہے بشرطیکہ وہ سماعت رکھتا ہو۔ مگر دس منٹ میں میرا گلا خشک ہو گیا اور سانس اکھڑ گیا تھا۔ اس لئے میں ذرا چپ ہو کر آرام کرنے لگا۔ میں نے گزشتہ دس بارہ گھنٹے سے پانی نہیں پیا تھا۔ خوش قسمتی سے موسم خنک تھا ورنہ گرمی کا موسم ہوتا تو اب تک میرے گلے میں کانٹے پڑ چکے ہوتے۔ دس پندرہ منٹ آرام کے بعد میں نے ایک

ادھر آوازیں دینا شروع کی تھیں کہ کوئی کرخت آواز میں بولا۔

"چپ کر حرام جادے...... نیند کھراب کر دی ہے۔"

میں چونکا، وہ خبیث پاس ہی سو رہا تھا اور میری چیخ پکار اس کے سر پر سے گزر رہی تھی۔ اس کے الفاظ سن کر مجھے عجیب سا لگا تھا، کوئی بات تھی مگر فی الحال میرے ذہن میں نہیں آ رہی تھی۔ میں نے زور سے کہا۔

"مجھے اتنی دیر سے یہاں بھوکا پیاسا باندھ رکھا ہے...... میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کر رہے ہو۔ میری اور تمہاری کوئی دشمنی نہیں ہے۔"

"تینوں پھر بے ہوش کرنا پے سی۔" وہ بھنایا ہوا نمودار ہوا، اس کے ہاتھ میں وہی لٹھ تھا جو وہ دوبار پہلے بھی میرے سر پر مار چکا تھا۔ میں اسے دیکھ کر چونکا تھا۔ اب میں سمجھا کہ اس کا لہجہ مجھے کیوں عجیب لگ رہا تھا، وہ سکھ تھا۔ سکھوں والی مخصوص پگڑی اور بے تحاشا بڑھے ہوئے بال تھے۔ اس کے بائیں رخسار پر کسی تیز دھار آلے کے زخم کا نشان تھا۔

"تم سکھ ہو؟"

"ہور کی نظر آندا؟" اس نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔

جہاں تک مجھے معلوم تھا اس علاقے میں کوئی سکھ نہیں تھا۔ شاید یہ سرحد پار کر کے آئے تھے اور جرائم پیشہ تھے۔ "تم پاکستانی علاقے میں کیا کر رہے ہو؟"

"پاکستانی!" وہ چونکا۔ "اوئے توں پاکستانی اے؟"

"ظاہر ہے، پاکستان میں پاکستانی ہوں گے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

وہ بڑے جارحانہ انداز میں آیا تھا اور پوری سنجیدگی سے میرے سر پر دوبارہ بلکہ سہ بارہ لٹھ رسید کرنا چاہتا تھا مگر میری بات سن کر وہ رک گیا تھا۔ اس نے غور سے مجھے دیکھا جیسے میری دماغی حالت پر شبہ ہو۔ "توں سنجیدہ اے؟"

"اس حالت میں اس سے زیادہ سنجیدہ اور کیا ہو سکتا ہوں؟"

"اوہ میاں، توں بھارت میں ایں۔"

"بھارت میں!" میں بھونچکا رہ گیا تھا۔

"اس نے سر ہلایا۔ "اے امرتسر دا ضلع اے...... پر توں کتھے آ گیا؟"

"میرے پیچھے دشمن لگے تھے، ایک نالے میں بائیک چلاتا رہا تھا، مجھے تو پتا ہی نہیں چلا کب سرحد پار کر لی، میں تو سمجھ رہا تھا کہ پاکستان میں ہوں۔"

"دشمن کون؟" اس نے سوال کیا۔

"دشمن تو بس دشمن ہوتا ہے، وہ میری جان کے دشمن ہیں۔ میں ان سے بچ کر بھاگ رہا تھا۔"

"توں وی کم نئیں اے۔" اس نے مجھے گھورا۔ "تیرے کول تے بہت ہتھیار ملیا اے۔"

وہ تقریباً تیس بتیس برس کا دبلا اور لمبا شخص تھا۔ چہرے کے درشت تاثرات بتا رہے تھے کہ اسے اس لائن میں آئے عرصہ گزر گیا ہے۔ "اسلحہ میں نے اپنے دشمنوں سے چھینا ہے ورنہ میرے پاس کچھ نہیں تھا۔"

''جس کولوں چھیناسی......اس دا کی کیتا؟''

''اسے پتھر مار کر بے ہوش کر دیا تھا۔'' میں نے کہا۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ خود کو ذرا مظلوم اور کم خطرناک آدمی ظاہر کروں۔ ''تم لوگ ڈاکو ہو؟''

''آہو......میں دلیر سنگھ دا بندہ آں۔'' اس نے فخر سے کہا۔

''وہ تمہارے ساتھی تھے جو یہاں بیٹھ کر کھانا کھا رہے تھے؟''

اس نے پھر سر ہلایا۔ ''دونوں کم سے گئے نیں۔''

اس نے کام کی نوعیت نہیں بتائی تھی۔ وہ ڈاکو تھے اور ان سے کسی شریفانہ کام کی توقع محال تھی۔ وہ میرے نزدیک ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میں نے کہا۔ ''پانی مل جائے گا؟''

اس نے سوچا اور اٹھ کر چلا گیا۔ چند منٹ بعد وہ اسٹیل کے کٹورے میں پانی لایا اور میرا سر اونچا کر کے پیالہ میرے منہ سے لگا دیا۔ میں پیاس نہ ہونے کے باوجود سارا پانی پی گیا تھا۔ اب پانی مل رہا تھا پھر نہ جانے کب ملے۔ ''اوہ میاں! توں کیسا مسلا اے۔ میں تے سنیا سی مسلے کسی دے ہتھ نال کھاتے پیتے نہیں نیں۔''

''یہ غلط ہے۔ مسلمانوں میں چھوت چھات کا چکر نہیں ہے۔ ہاں پاکی ناپاکی اور حرام حلال کا چکر ہے پر کوئی انسان ہمارے لئے کمتر نہیں ہوتا۔'' میں نے وضاحت کی۔

وہ......کٹورا واپس لے گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ ان لوگوں کی باقاعدہ پناہ گاہ تھی اور انہوں نے اس جگہ قیام کے انتظامات کر رکھے تھے۔ اب کے وہ آیا تو میں نے اس سے ہاتھ کھولنے کی درخواست کی مگر اس نے انکار کر دیا۔ ''مینوں حکم نہیں اے......''

''دلیر سنگھ کون ہے؟''

''توں نہیں جاندا......وڈا گھبرو جوان اے۔'' اس نے کہا، اس کے بعد اس نے مجھے دلیر سنگھ کے پس منظر کے بارے میں تفصیلی آگاہ کیا تھا۔ دلیر سنگھ کا باپ گولڈن ٹیمپل میں بھارتی فوج کے آپریشن کے دوران مارا گیا تھا۔ اس وقت دلیر سنگھ صرف بارہ سال کا تھا۔ آپریشن کے بعد سکھوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہوئی تو دلیر کو پولیس اس کی ماں اور دو جوان بہنوں سمیت لے گئی۔ اس کی نظروں کے سامنے پولیس کے بہادر جوانوں نے اس کی ماں اور بہنوں کو اجتماعی زیادتی کا نشانہ بنایا۔ ایک بہن ذرا خوبصورت تھی جسے وہ درندے مسلسل زیادتی کا نشانہ بناتے رہے حتیٰ کہ بارہ گھنٹے بعد وہ مرگئی تو اس کی لاش بھی غائب کر دی۔ چار مہینے تک عذاب جھیلنے کے بعد وہ رہا ہوئے تو پتا چلا ان کے گھر پر گاؤں کے ہندو قابض ہو گئے تھے۔ ان کی زمین پر کھڑی فصل کو آگ لگا دی گئی تھی۔ اس سانحے سے پہلے دلیر سنگھ کا خاندان اچھا خاصا کھاتا پیتا تھا۔ اب غربت و افلاس کا شکار ہو گیا تھا۔

وہ گاؤں کے باہر جھونپڑی بنا کر رہنے لگے اور اس کی ماں، بہن محنت مزدوری کر کے پیٹ بھرنے لگیں۔ وہ ایک زمیندار کی زمین پر کام کرتی تھیں۔ ایک روز دلیر کی دوسری بہن غائب ہو گئی۔ اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔ ماں پہلے ہی شوہر اور ایک بیٹی کا صدمہ اٹھا چکی تھی۔ دوسری بیٹی بھی غائب ہوئی تو اس کا دماغی توازن بگڑ گیا تھا۔ وہ پاگل ہو کر گلیوں میں ماری ماری پھرنے لگی تھیں دلیر یہ سب دیکھ رہا تھا اور نفرت کا زہر اپنے اندر جمع کر رہا تھا۔ ماں کے پاگل ہونے کے بعد وہ گاؤں سے بھاگ نکلا اور امرتسر آ گیا۔ یہاں وہ جیب کتروں کے ایک گروہ کے

ہاتھ لگ گیا۔ دو سال ان کے ساتھ رہا پھر اپنے استاد کو قتل کر کے فرار ہو گیا۔ استاد ایک مجبور لڑکی کی عزت برباد کرنے کے درپے تھا۔ دلیر کو یہ گوارا نہیں تھا قتل کر کے بھاگا تو پولیس پیچھے لگ گئی۔ اس کے پاس مسلح سکھ حریت پسندوں کے پاس پناہ لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ ان دنوں پورا بھارتی پنجاب آگ میں جل رہا تھا اور سکھوں کے جذبات بپھرے ہوئے تھے۔ آئے دن بموں کے دھماکے اور قتل و غارت گری کے واقعات ہو رہے تھے۔

امرت سنگھ سنت جرنیل سنگھ بھنڈرانوالہ کے قریبی ساتھیوں میں سے تھا۔ اس نے جرنیل سنگھ کے مشن کو جاری رکھا۔ وہ حکومت کے خلاف کچھ کرنے سے قاصر تھا اس لئے اس کا نشانہ پنجاب میں آباد ہندو اور وہ سکھ بنتے تھے جو بھارت کے حامی تھے۔ دلیر سنگھ نے پورے جوش و خروش سے اس کا ساتھ دیا۔ خاص طور سے وہ پولیس والوں کا سخت دشمن تھا اور پہلے ہی سال اس نے چار پولیس والے قتل کر کے پورے علاقے میں سنسنی پھیلا دی تھی۔ امرت سنگھ نے اسے روکنے کی کوشش کی تو وہ بے قابو ہو گیا۔ چار سال بعد اس نے اپنا الگ گروہ بنا کر لوٹ مار اور قتل و غارت گری کی وارداتیں شروع کر دیں۔ پولیس اس کے پیچھے تھی مگر اس نے بھاگنے کے بجائے اتنی بے جگری سے پولیس کا شکار کیا کہ پولیس بھی اس کے نام سے خائف رہنے لگی تھی اور جس راہ سے دلیر سنگھ گزرتا تھا پولیس اس پر قدم رکھتے ہوئے بھی گھبراتی تھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دلیر سنگھ کا جوش بھی ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس نے چن چن کر ان پولیس والوں کو کیفر کردار تک پہنچایا جنہوں نے اس کی ماں اور بہنوں سے زیادتی کی تھی۔ پھر حریت پسندی کی تحریک بھی سست پڑتی گئی۔ بھارتی حکومت نے چالاکی سے سکھوں کے جذبات کا رخ کھانے، کمانے اور گانے بجانے کی طرف موڑ دیا تھا۔ جب دلیر سنگھ کے ساتھیوں اور ہم عصروں میں سب ٹھنڈے پڑ گئے تو مجبوراً اسے بھی راستہ بدلنا پڑا تھا۔ اس کے بعد وہ محض ایک ڈاکو رہ گیا۔ اس نے اپنی سرگرمیاں محتاط طور پر محدود کر لی تھیں اور قتل و غارت گری سے گریز کرنے لگا تھا۔ اس نے زیادہ زور زمینداروں کو لوٹنے اور ان سے بھتہ وصول کرنے میں لگا دیا تھا۔ یوں ڈاکے مارے بغیر ہی اسے بہت کچھ ملنے لگا تھا مگر اپنی دہشت قائم رکھنے کے لئے وہ سال میں دو تین بار لوٹ مار کی کارروائیاں ضرور کرتا تھا۔

اس نے اپنی گم شدہ بہن کو تلاش کر لیا تھا اور ماں کو اس کے ساتھ اپنے ٹھکانے پر لے آیا تھا۔ اس کا ڈیرا اس کی بہن ہی سنبھالتی تھی۔ دلیر سنگھ خود ڈیرے سے کم نکلتا تھا، اس کے آدمی سارا کام سنبھالتے تھے۔ اس نے پولیس اور اعلیٰ سرکاری افسران کو خوش رکھنے کا ہنر سیکھ لیا تھا اس لئے اب کوئی پولیس پارٹی اس کے ڈیرے کا رخ نہیں کرتی تھی اور کسی فرض شناس افسر کے ذہن میں ایسا کوئی کیڑا کلبلائے تو وہ پہلے افسر کو کنارے لگانے کی کوشش کرتا تھا مگر چھاپہ ناگزیر ہو جائے تو اپنا سب سامان سمیٹ کر ماں اور بہن کے ساتھ روپوش ہو جاتا تھا اور جب تک حالات معمول پر نہیں آتے تھے، وہ انڈر گراؤنڈ ہی رہتا تھا۔

''آج کل دلیر سنگھ کہاں ہے؟'' ساری داستان سننے کے بعد میں نے پوچھا۔

''توں کیوں پچھدا اے!'' اس نے مشکوک نظروں سے مجھے دیکھا۔

''ایسے ہی اس دلیر شخص کو دیکھنے کو دل چاہتا ہے۔''

''دلیر ہر ایک نال نہیں ملدا اے، ہور اس دے ڈیرے توں ہر کسی نوں جان دی اجاجت دی نئیں اے۔''

''اب میرے ساتھ کیا ہوگا؟'' میں نے ذرا اوپر ہو کر درخت سے ٹیک لگاتے ہوئے پوچھا۔

''جلد ملوم ہو جاوے گا۔'' وہ مسکرایا اور اس کی مسکراہٹ خاصی خوفناک تھی۔

میں نے پاؤں موڑا تو مجھے لگا پنڈلی پر کچھ چبھ رہا ہے۔ اچانک مجھے یاد آیا۔ میرے پاؤں سے ایک عدد خنجر بندھا تھا جس کا ان لوگوں کو پتا نہیں تھا اس لئے خنجر محفوظ رہا۔ مگر سوال یہ تھا، عقب میں بندھے ہاتھوں کے ساتھ میں اس سے کیا فائدہ اٹھا سکتا تھا؟

''توں سچ مچ...... پاکستانی اے؟''

''مجھے جھوٹ بول کے کیا ملے گا؟''

اسی لمحے درختوں کے باہر سے آہٹ سنائی دی پھر کسی نے پکارا۔ ''اوئے منگل سنگھ کتھوں مر گیا ایں۔''

''پروہنا کیو جا اے...... مرتے نئیں گیا۔''

''جا جی...... جیوندا اے۔''

پھر دو افراد اندر آئے۔ ان میں ایک پورا سکھ تھا یعنی تمام پیدائشی بالوں سمیت اور دوسرا مونا سکھ تھا۔ اس نے داڑھی تراش کر ہلکی کر لی تھی۔ سنا تھا مونے سکھ سوائے سر کے بالوں کے جسم کے دوسرے حصوں کے بال تراشتے تھے یا صاف کرا دیتے تھے گویا مونے سکھ ذرا صاف ستھرے قسم کے سکھ ہوتے ہیں۔ دوسرا اصلی تے وڈا سکھ تھا۔ دلیر سنگھ مہدی کا چربہ۔ اس کی طرح گول مٹول اور احمق نظر آنے والا۔ آواز دینے والا مونا سکھ تھا، اس نے جوتے سے میرے پاؤں پر ٹھوکر ماری۔ ''بدمعاشی تے نئیں کیتی؟''

''نا جی۔ بندے دا پتر بن کے ریا سی۔ میں آپ بنایا سی۔'' منگل سنگھ ہنسا۔ اس نے میرے بندھے ہاتھ پیر کی طرف اشارہ کیا تھا۔

''بھائیا جی، اس کا کی کرنا اے؟'' دوسرے نے کہا۔ آواز اور چہرے کے تاثرات سے وہ ذرا احمق لگتا تھا۔

''اے پاکستانی اے۔'' منگل سنگھ نے انکشاف کیا۔

''پاکستانی!'' مونا سکھ چونکا۔ ''تینوں کیویں پتا چلیا؟''

''اے آپ آکھیا سی۔''

''میں پاکستانی ہوں۔ میرے پیچھے دشمن لگے تھے۔ غلطی سے سرحد عبور کر کے اِدھر آ گیا۔ میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے، مجھے جانے دو۔''

''مونا سکھ مسکرایا۔ ''اب توُ نئیں جا سکدا اے۔ تینوں بی ایس ایف نے نئیں روکیا سی؟''

''مجھے تو اس طرف کوئی بارڈر سکیورٹی فورس نظر نہیں آئی۔''

''اِدھر سخت پہرا ہے۔'' اس بار مونے سکھ نے صاف اردو یا ہندی میں کہا۔

''پھر میری قسمت کہ مجھے کوئی نہیں ملا۔''

"یا تُو کوئی سرکاری جاسوس ہے۔" مونے نے سکھ نے دوسرے زاویے سے غور کیا۔"ہمارے پیچھے آیا ہے۔"

"اوہ نہیں بھائی، میں سوفی صد پاکستانی ہوں۔ اُدھر سرحد کے پاس کل رات بڑے ہنگامے ہوئے ہیں۔ ایک حویلی میں زبردست دھماکے ہوئے ہیں جس سے حویلی مکمل طور پر تباہ ہو گئی ہے، سو سے زیادہ افراد مارے جا چکے ہیں۔"

مونا سکھ چونکا۔"اچھا سرحد پر اس وجہ سے اتنی سختی ہے۔"

میں نے غور کیا۔"کیا تم لوگ بھی سرحد پار آتے جاتے ہو؟"

"تُو کیوں پوچھ رہا ہے؟" مونا سکھ بھڑکا تھا۔

"ابھی تم نے سرحد کا حوالہ دیا تو پوچھ لیا۔ ویسے یہ جگہ سرحد سے کتنی دور ہے؟"

"چار میل ہے۔" اس نے کہا۔

"بھائیا جلدی کریں۔" بھالو نے کہا، وہ حلیے اور جسامت سے بھالو لگتا تھا۔"مینوں بھک لگی ہے۔"

مونا سکھ اسے اور منگل سنگھ کو لے کر دوسری طرف چلا گیا۔ پھر پانچ منٹ بعد آیا اور نیام سے کرپان نکالی۔ مجھے لگا کہ میرا وقت پورا ہو گیا ہے مگر اس نے ایک جھٹکے سے میرے پیروں کی رسی کاٹ دی"چل، پر خیال رکھنا، بھاگنے کی کوشش کی تو کتے کی موت مار دوں گا۔"

میں نے پیروں کو جنبش دے کر دورانِ خون بحال کیا اور کسی قدر دقت کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ کب سے رکا دورانِ خون بحال ہوا تھا تو مجھے پہلے شدید تکلیف کا احساس ہوا تھا مگر ذرا سا چلنے پھرنے کے بعد پاؤں معمول پر آ گئے تھے۔"ایک مہربانی اور کرو۔ میرے ہاتھ کھول دو۔"

"نہیں ایسے ہی چل۔" مونے سکھ نے انکار کر دیا۔

وہ مجھے رہا کرنے کے موڈ میں نہیں تھے اور اچھی بات یہ تھی کہ انہیں میرے جاسوس ہونے کا یقین بھی نہیں آیا تھا ورنہ وہ مجھے مار کر میری لاش چیل کوؤں اور گیدڑوں کا نوالہ بننے کے لئے چھوڑ جاتے۔ فی الحال وہ مجھے اپنے قبضے میں رکھنا چاہتے تھے۔ میں نے دیکھا، ان لوگوں کے ساتھ دو عدد خچر تھے جن پر آٹھ عدد کریٹ لدے ہوئے تھے۔ ہر خچر پر دونوں جانب دو دو کریٹ لٹک رہے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ان کریٹس میں شراب کی بوتلیں تھیں، یہ لوگ سرحد پار شراب لے جاتے تھے۔ جو بوتل بھارت میں سو روپے میں بکتی تھی اس کے پاکستان میں ہزار روپے تک مل جاتے تھے۔ اس لئے پوری سرحد پر شراب کی اسمگلنگ نفع بخش پیشہ تھا۔ کریٹس کے علاوہ دونوں خچروں پر ایک ایک تھیلا بھی تھا، ان میں سے کسی میں مجھ سے حاصل کیا گیا اسلحہ بھی تھا۔

مونا سکھ دونوں خچروں کو لے کر سب سے آگے تھا۔ اس کے بعد میں تھا۔ میرے پیچھے بھالو اور سب سے آخر میں منگل سنگھ تھا۔ مجھے بس منگل سنگھ کا نام معلوم تھا۔ باقی دو کے نام معلوم نہیں تھے اسی طرح وہ میرے نام سے ناواقف تھے۔ اچانک ایک خیال میرے اندر آیا۔ یہ لوگ اسمگلر اور جرائم پیشہ تھے اسی طرح شاہنواز اور اس کے آدمی بھی اسمگلر ثابت ہوئے تھے۔ وہ بھارت سے لڑکیاں منگوانے کے ساتھ اسلحہ بھی حاصل کرتے تھے عین ممکن تھا ان کا ان سکھوں سے کاروباری تعلق ہو۔ اس صورت میں وہ میرے بھی دشمن ہو جاتے کیونکہ میں نے ان

کے کاروباری دوستوں کا نقصان کیا تھا۔ میں نے فوری فیصلہ کیا کہ میں نہ صرف اپنا نام غلط بتاؤں گا بلکہ شاہ نواز کی حویلی میں ہونے والے واقعات سے بھی خود کو الگ رکھوں گا۔ موٹا سکھ یا کوئی اور اپنے ٹھکانے پر لے جانے کے بعد یقیناً مجھ سے تفصیلی پوچھ گچھ کرتے اس لئے میں نے ابھی سے ایک کہانی تیار کرنا شروع کر دی تھی۔

وہ لوگ بے حد دشوار گزار اور ایسی خاردار جھاڑیوں کے درمیان سے گزر رہے تھے جس میں کوئی عام آدمی گھسنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا لیکن یہ اس راستے سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان کو پتا تھا کہ ان جھاڑیوں کے درمیان کہاں راستہ تھا جس سے وہ بغیر کانٹوں سے الجھے گزر سکتے تھے۔ ممکن ہے ان جھاڑیوں کے درمیان انہوں نے یہ راستہ خود بنایا ہو اور اس سے گزرتے ہوئے اس کی کتر بیونت کرتے رہتے ہوں۔ میرا یہ اندازہ درست نکلا جب میں نے موٹے سکھ کو اپنی کرپان سے ایک جگہ جھاڑیوں پر وار کرتے دیکھا۔ یہاں پر جھاڑیاں ذرا آگے تک بڑھ آئی تھیں۔ دوسری ہوشیاری انہوں نے یہ کی تھی کہ راستہ سیدھا نہیں رکھا تھا بلکہ یہ راستہ وقتاً فوقتاً رستے پر پہیلی ان جھاڑیوں کے درمیان بھول بھلیوں کی طرح گزر رہا تھا۔ بی ایس ایف کے اہلکار ان جھاڑیوں میں گھسنے کی ہمت نہیں کر سکتے تھے اور یہ لوگ نہایت اطمینان سے اپنا دھندا جاری رکھے ہوئے تھے۔ بندھے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ میرے لئے چلنا ذرا دشوار تھا لیکن ناممکن نہیں تھا۔ کانٹوں سے بچنا اصل مرحلہ تھا۔



کئی جگہوں پر کانٹوں نے مجھے الجھایا اور کپڑوں کا نذرانہ دے کر بچ نکلا۔ پانی پی لینے کے بعد مجھے اب پیاس تنگ نہیں کر رہی تھی، میرا پیٹ خالی تھا مگر حالات نے مجھے بھوک پر صبر کرنا سکھا دیا تھا۔ ایک گھنٹے بعد ہم ان جھاڑیوں سے نکل آئے تھے۔ اب کھیت اور کینو کے باغات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اکا دکا افراد نظر آئے لیکن کسی نے ہم پر توجہ نہیں دی تھی۔ ان لوگوں کے پاس پانی تھا، وہ انہوں نے خود بھی پیا اور مجھے بھی پلایا۔ مسلسل چلنے اور بھاری گرم جیکٹ کی وجہ سے مجھے کسی قدر گرمی لگنے لگی تھی۔ دوپہر کا ڈھلتا سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ بھالو نے اپنی جیب میں ایک چپٹی بوتل چھپا رکھی تھی جس سے وہ وقفے وقفے سے شراب کی چسکیاں لے رہا تھا۔ مجھ سمیت سب تھکن کا شکار تھے مگر موٹا سکھ رکنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس کے دو مفروضے ہو سکتے تھے یا تو سفر طویل تھا اور وہ رک کر وقت ضائع نہیں کر سکتے تھے۔ دوسرے منزل اتنی نزدیک تھی کہ اس وقت آرام کے لئے رکنا بے کار تھا۔ دوسرا مفروضہ درست نکلا تھا۔ جھاڑیوں سے نکلنے کے کوئی نصف گھنٹے بعد ہم ایک کچے احاطے میں داخل ہوئے جس میں ایک دیوار کے ساتھ قطار میں پانچ چھ کمرے تھے۔ احاطے میں ایک طرف چند بھینسیں کھڑی تھیں اور جا بجا نیم اور سفیدے کے درخت لگے تھے۔ احاطے کے دروازے پر ایک سکھ خودکار رائفل لئے کھڑا تھا اور اندر بھی تین چار مسلح پہرے دار گھوم رہے تھے۔ موٹے سکھ نے مجھے ان کے سپرد کیا۔

"اس دے ہتھ کھول کر اندر بند کر دے۔" اس نے حکم دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی کوئی خصوصی اہمیت تھی۔ اس کے کہنے پر دو افراد مجھ پر جھپٹے۔ ایک نے میرے ہاتھ سے رسی کھولی اور دوسرے نے مجھے کمروں کی طرف دھکیلا اور ایک کمرے میں دھکا دے کر مضبوط کواڑ باہر سے بند کر دیا۔ اس کمرے میں بس بھی دروازہ تھا اور کمرا بھی مختصر سا تھا۔ اس میں سوائے ایک چارپائی کے اور کچھ نہیں تھا۔ مجھے بند کرنے سے پہلے انہوں نے میری تلاشی لینے کی زحمت نہیں کی تھی اور اپنے طور پر فرض کر لیا تھا کہ لانے والوں نے میری تلاشی لے لی ہوگی

خنجر میرے پاس محفوظ تھا مگر فی الحال میں اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا حتیٰ کہ دیوار میں سوراخ کر کے فرار بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ دن کا وقت تھا، میں فوراً پکڑا جاتا، یہی کام میں رات کو آرام سے کر سکتا تھا۔ یہ فیصلہ کر کے میں چارپائی پر گرا اور چند منٹ کے اندر سو گیا تھا۔

پھر کسی نے مجھے ہاتھ مار کر جگایا۔ "اٹھ اوئے، کھوتے دے کھر ---- کیویں ستا پیا ایں۔"

یہ منگل سنگھ تھا۔ باہر اندھیرا ہو چکا تھا اور وہ میرے لئے کھانا لایا تھا۔ چنگیری میں باجرے کی موٹی سی روٹی کے اوپر ساگ اور مکھن کا ڈلا رکھا تھا۔ "کھانا کھا لے۔"

"ہاتھ دھونے کے لئے پانی مل سکتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بڑے نخرے نیں تیرے۔" اس نے طنزیہ انداز میں کہا اور باہر چلا گیا۔ جاتے ہوئے اس نے دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا۔ چند منٹ بعد وہ ایک لوٹے میں پانی لایا اور میں نے کمرے کے کچے فرش پر ہی ہاتھ اور موقع سے فائدہ اٹھا کر منہ بھی دھو لیا تھا۔ گزشتہ بیس گھنٹے بعد یہ پہلا کھانا تھا جو مجھے مل رہا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا جس نے مجھے زندہ رکھا اور اپنی نعمتوں سے نوازا۔ کھانا بے حد سادہ مگر اتنا ہی لذیذ بھی تھا۔ روٹی بے حد موٹی تھی اور میرے لئے کافی ثابت ہوئی تھی۔ باہر اندھیرا تھا اور سرد ہوا فراٹے سے چل رہی تھی، اب تک ان لوگوں کا رویہ شریفانہ تھا۔ انہوں نے تفتیش کے نام پر مجھے تشدد کا نشانہ نہیں بنایا تھا۔ پینے کو پانی اور کھانے کو کھانا دیا تھا۔ لیٹنے کے لئے چارپائی تھی اور جب منگل سنگھ چنگیری لینے آیا تو اس نے مجھے ایک عدد کمبل بھی لا دیا تھا۔

منگل سنگھ میرے بارے میں کیا فیصلہ ہوا ہے؟"

"میتوں نئیں پتا۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا اور چلا گیا۔ کمرے میں روشنی کا کوئی بندوبست نہ ہونے کی وجہ سے گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے کمبل اوڑھ لیا۔ سردی کی شدت میں یک لخت خاصا اضافہ ہو گیا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد میں نے باہر کی سن گن لی۔ تیز ہوا کی سائیں سائیں اور پیڑوں کے جھومنے کی آوازوں کے علاوہ مکمل سناٹا طاری تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ سب سو گئے تھے اور کوئی جاگ بھی رہا تھا تو کسی گرم بستر میں دبا ہوا تھا۔ پھر بھی میں نے اندازاً نصف گھنٹے اور انتظار کیا اور اس کے بعد بستر سے اتر کر دیوار کو ٹٹولا۔ اس کی جڑ زیادہ موٹی تھی۔ کچی مٹی سے اٹھائی جانے والی دیواروں کا اصول بھی یہی تھا۔ نیچے سے اوپر کی طرف تعمیر پتلی ہوتی جاتی تھی۔ میں نے دیوار کو دو فٹ اوپر سے کھودنا شروع کیا۔ مٹی خشک اور سردی کی وجہ سے سخت ہو رہی تھی مگر خنجر کی نوک اور مضبوطی کام دکھا رہی تھی۔ میں خنجر مارتا تھا تو مٹی جھڑ جاتی تھی اس کے باوجود میں احتیاط سے کام کر رہا تھا کہ آواز نہ ہو۔ اگر آواز سن کر کوئی آ جاتا تو میں رنگے ہاتھوں پکڑا جاتا۔

دیوار کھودتے ہوئے مجھے زہرہ اور اللہ رکھا کا ڈیرا یاد آیا، جب میں نے ایک رات فرار کے لئے ایسے ہی دیوار کھودی تھی اور پولیس کے آنے سے پہلے زہرہ کو لے کر فرار ہو گیا تھا۔ ہم کیسے کیسے مراحل سے گزر کر خادم حسین تک پہنچے تھے اور میں نے زہرہ کو اپنے طور پر ایک مضبوط پناہ گاہ میں چھوڑا تھا یہ اور بات تھی کہ دشمن نے یہ پناہ گاہ اگلے ہی روز مسمار کر دی تھی اور زہرہ کو لے گئے تھے۔ کتنے عذاب جھیل کر وہ شاہ نواز کے ہاتھ آئی جس نے اسے پیشہ ور کال گرل بنا دیا۔ اسے یاد کر کے میرا دل بوجھل ہو گیا تھا اور میرے ہاتھ ذرا دیر کے لئے رک گئے تھے۔ ایک اچھا کام یہ ہوا کہ بدی کا وہ اڈا ختم ہو گیا جس نے نہ جانے کتنی معصوم لڑکیوں کو طوائف بنا دیا تھا۔ اسلئے

کا وہ بہت بڑا ذخیرہ تباہ ہو گیا تھا جو قائم رہتا تو نہ جانے کتنے بے گناہوں کا لہو پی جاتا۔ زہرہ کا خیال آیا تو بے ساختہ ہاتھ اس کی مغفرت کی دعا کے لیے اٹھ گئے اس کا یہ قرض مجھ پر باقی تھا۔ اچانک باہر آہٹ سن کر میں چونکا اور تیزی سے چارپائی پر لیٹ کر کمبل تان لیا۔ اسی لمحے کواڑ ایک مخصوص آواز کے ساتھ کھلے تھے۔ کوئی اندر آیا تھا، میرا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ کمبل کے گوشے سے میں نے دیکھا۔ تاریکی بدستور قائم تھی، آنے والا کوئی روشنی ساتھ نہیں لایا تھا۔ اندر اندھیرا تھا اور اس بات کا امکان کم تھا کہ آنے والے کو کھودی جانے والی دیوار اور زمین پر پڑی مٹی نظر آ جائے۔ آنے والے نے میرا پاؤں پکڑ کر ہلایا۔

''کک......کون ہے؟'' میں نے خوف زدہ اور غنودہ لہجے میں کہا۔

''میں آں......منگل سنگھ......تُو سو جا۔''

''تو جگایا کیوں ہے؟'' میں نے کہا اور کروٹ لے لی۔ ویسے میں خنجر بکف اس کے لئے بالکل تیار تھا کہ وہ دیوار میں کی جانے والی کارروائی دیکھے تو اس کے شور مچانے سے پہلے میں اسے ہمیشہ کے لئے خاموش کر دوں۔ اس کے پاس اسلحے کی موجودگی عین ممکن تھی مگر پکڑے جانے پر مجھے یہ رسک تو لینا ہی تھا۔ وہ کچھ دیر کھڑا رہا، پھر جب اس نے باہر جا کر دروازہ بند کیا تو میں نے سکون کا سانس لیا تھا۔ تقریباً دس منٹ تک ساکت لیٹے اور کان دروازے سے باہر کی آہٹوں پر رکھنے کے بعد میں دوبارہ اٹھا۔ منگل سنگھ جا چکا تھا۔ میں نے دیوار پر کام دوبارہ شروع کیا۔ میرا خیال تھا کہ دیوار دو فٹ کے لگ بھگ موٹی ہوگی، ڈیڑھ فٹ سے کم ہونا ناممکن تھا۔ میں نے چھ انچ تک تقریباً دو فٹ قطر کا سوراخ کر لیا تھا۔ اب میں خنجر احتیاط سے چلا رہا تھا کیونکہ اندر پتھر آنے لگے تھے اور پتھر سے لوہا ٹکراتا تو خاصی بلند آواز پیدا ہو سکتی تھی اس لئے میں خنجر چلانے سے پہلے ہاتھ پھیر کر اطمینان کر لیتا تھا۔

رفتہ رفتہ سوراخ گہرا ہونے لگا۔ سردی کے باوجود مسلسل محنت سے بلکہ جان توڑ محنت سے میں پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ مٹی اُڑ رہی تھی اور میرے ناک منہ سے گزر کر گلے کو خشک کر رہی تھی اور مجھے اب پیاس لگنے لگی تھی۔ تھکن کے باوجود میں نے ہاتھ نہیں روکا، میں منگل سنگھ کے دوبارہ آنے سے پہلے سوراخ کر کے یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا، قسمت بار بار ساتھ نہیں دیتی ہے۔ تقریباً ڈیڑھ فٹ کی کھدائی کے بعد بھی مٹی موجود پا کر مجھے ذرا مایوسی ہوئی، میرا خیال تھا اب سوراخ آر پار نکل جائے گا۔ اب میری توجہ پہلے سوراخ مکمل کرنے پر تھی اس کے بعد اسے اتنا چوڑا کیا جا سکتا تھا کہ میں اس میں سے نکل جاتا۔ بالآخر دو منٹ کے بعد دیوار میں سوراخ نمودار ہوا اور اس سے گزر آنے والی سرد ہوا کا جھونکا اپنے چہرے پر محسوس کر کے مجھے بے اندازہ خوشی ہوئی تھی۔ اب میں نے زیادہ تندہی سے سوراخ چوڑا کرنا شروع کر دیا، میں اسے گول کرنے کے بجائے اوول صورت میں چوڑا کر رہا تھا۔ مجھے نکلنے میں آسانی رہتی اور وقت بھی ضائع نہیں ہوتا۔ بالآخر میں نے اتنا بڑا سوراخ کر لیا جس سے میں نکل سکوں تو میں نے کواڑوں کے قریب جا کر باہر کی سن گن لی۔ وہاں بدستور سناٹا تھا۔ میں سوراخ سے باہر آیا۔ اگرچہ اندازے کی غلطی کی وجہ سے مجھے خاصی جدوجہد کرنا پڑی تھی۔ میری جیکٹ شانے سے ادھڑ گئی تھی۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح میں نے باہر قدم رکھ دیا۔ یہاں زمین نشیب میں تھی اور گر کر میں نے دو قلابازیاں کھائی تھیں اور ایک جوہڑ میں جانے سے بال بال بچا تھا۔ یہ پانی کا نہیں بلکہ بھینسوں کی بہہ کر آنے والی غلاظت سے

جنم لینے والا جوہڑ تھا۔ اس سے اٹھنے والی بدبو سے دماغ خراب ہو رہا تھا۔ جو کھیتوں کی منڈیر کے ساتھ ساتھ تھا جس میں گندم کی فصل سر اٹھا رہی تھی۔ پودے ڈیڑھ فٹ تک بڑھ چکے تھے۔ چاند پندرھویں کا تھا اور تقریباً پورے چاند جتنا لگ رہا تھا۔ چاروں طرف روشنی تھی۔ ڈیرے کے احاطے میں گھنے درخت ہونے کی وجہ سے اندھیرا چھایا ہوا تھا۔

شمال کی جانب سے فراٹے کی سرد ہوا چل رہی تھی۔ میں نے خنجر کو نیام سمیت اپنی جیکٹ میں رکھ لیا۔ پنڈلی سے بوقت ضرورت اسے نکالنے میں ذرا وقت لگتا۔ میں فوری طور پر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ ان لوگوں کو پتا چلنے تک میں جتنا دور نکل جاتا اتنا ہی اچھا تھا۔ میں نے سامنے کی طرف سے جانے سے گریز کیا تھا، مجھے اندازہ تھا، میرے فرار سے آگاہ ہوتے ہی وہ مجھے ڈیرے کے سامنے والے حصے میں تلاش کریں گے اور میں اس سے مخالف سمت میں جا رہا تھا۔ تقریباً ایک فرلانگ کے بعد مجھے زمین کو پانی دینے والا چھوٹا سا نالا نظر آیا جسے پنجاب میں کھال بھی کہتے ہیں۔ اس میں شفاف پانی بہہ رہا تھا، میں نے اسے چلو میں لے کر چکھا۔ یہ صاف پانی تھا اور بے مزہ تھا۔ میں نے پانی پینے کے بعد اس سے منہ ہاتھ دھوئے اور کپڑوں اور بالوں پر لگ جانے والی مٹی صاف کی۔ خنجر بھی دھویا۔ دور تک کھیت پھیلے ہونے کی وجہ سے چھپنے کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی اور اس طرف کوئی آ نکلتا تو میرے لئے گندم کے پودوں کے درمیان لیٹ جانے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

مگر فی الحال کوئی پیچھے نہیں آیا تھا۔ شروع میں، مَیں بھاگنے کے انداز میں چلتا رہا اور بیس منٹ میں تقریباً دو میل دور نکل آیا تھا۔ اس کے بعد میں نے رفتار ذرا کم کر دی۔ اگرچہ دو میل کا فاصلہ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ وہ گھوڑے استعمال کرتے تو چند منٹ میں مجھے آ لیتے مگر اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ میرے فرار کی سمت کا صحیح ادراک کرتے اور پھر میرا پیچھا کرتے جبکہ میں نے شمال کا رخ کیا تھا اور ذرا آگے جا کر میں نے مشرق کی طرف چلنا شروع کر دیا تھا، چاند میری رہنمائی کر رہا تھا۔ اپنے حساب سے میں پاکستان اور بھارت کی سرحد سے کوئی چھ میل کے فاصلے پر تھا۔ اگر میں چلتا رہتا اور درمیان میں کوئی رکاوٹ نہ پیش آتی تو میں صبح سے پہلے سرحد عبور کر سکتا تھا۔

اب کھیت کم ہو گئے تھے اور خالی میدان یا جھاڑ جھنکار والے حصے زیادہ ہو گئے تھے۔ مجھے چلتے ہوئے دو گھنٹے ہونے کو آئے تھے اور میرا اندازہ تھا کہ میں سرحد سے دو تین میل کے فاصلے پر رہ گیا تھا لیکن یہ اندازہ غلط بھی ہو سکتا تھا۔ پاک انڈیا سرحد کوئی صراط مستقیم نہیں تھی۔ اکثر مقامات پر یہ لہراتی اور بل کھاتی جاتی تھی اور کبھی کبھی ایک دوسرے کی سرزمین میں اندر تک گھس آتی تھی۔ جیسے سمندر کا پانی خلیج بنا کر زمین میں گھس آتا ہے۔
اب مجھے کسی قدر اطمینان تھا، اتفاق کی بات الگ تھی مگر منگل سنگھ اور اس کے ساتھی اب مجھے نہیں پکڑ سکتے تھے۔

چلتے چلتے اچانک کوئی شے میرے پیروں تلے آئی۔ یہ کوئی نرم سی گول شے تھی۔ اگلے لمحے میری پنڈلی میں جیسے انگارے بھر گئے تھے۔ میں نے جھک کر دیکھا اور میرا خون خشک ہو گیا۔ ایک کوبرا سانپ میری پنڈلی میں پھن گاڑے ہوئے تھا۔ عام طور سے سانپ ڈس کر الگ ہو جاتا ہے مگر اس کے جسم کا ایک حصہ میرے جوتے تلے تھا اور ردعمل میں اس نے بلبلا کر مجھے ڈس لیا تھا بلکہ اس کے دانت میرے جسم سے الگ ہوئے ہی نہیں تھے اور اس کا زہر مسلسل میرے جسم میں داخل ہو رہا تھا۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر خنجر نکالا اور کوبرا کا سر اس کے

تن سے جدا کر دیا۔ اس کا سر الگ ہونے کے باوجود میری پنڈلی سے چپکا ہوا تھا۔ میں نے ہاتھ سے کھینچ کر اسے دور پھینک دیا۔ سانپ کا طویل جسم اذیت سے بل کھا رہا تھا، اس کی جان رفتہ رفتہ ہی نکلتی۔

میں نے محسوس کیا کہ پنڈلی میں بھرنے والی آگ رفتہ رفتہ اوپر کی طرف بڑھ رہی ہے۔ میں نے پائنچہ اوپر کیا اور جہاں سانپ نے ڈسا تھا، اس جگہ خنجر کی نوک داخل کر دی۔ کوبرا کا زہر ہلاکت خیز ہوتا ہے اور یہ بیس سے تیس منٹ میں ایک جوان اور طاقتور آدمی کی جان لینے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ اس کوبرا نے تو زیادہ ہی زہر میرے جسم میں داخل کر دیا تھا۔ خنجر کی نوک زخم میں داخل ہوتے ہی خون بہنے لگا تھا۔ جیکٹ کے کالر میں کھینچ کر بند کرنے والی ڈوری لگی تھی۔ میں نے وہ ڈوری نکالی اور اسے کس کر گھٹنے سے ذرا نیچے باندھ لیا تاکہ خون کا بہاؤ سُست ہو جائے۔ میں حیران تھا اس ویران علاقے میں کہاں طبی امداد تلاش کروں گا جبکہ یہاں دور دور تک بندہ نہ بندے کی ذات نظر آ رہی تھی۔ خون سیاہی مائل تھا اور دس پندرہ منٹ تک بہتا رہا۔ جب خون ذرا رکا تو میں کھڑا ہو گیا۔ مجھے کسی آبادی تک پہنچنا تھا جہاں مجھے طبی امداد مل سکے۔ میں چند قدم چلا ہوں گا کہ میرا سر چکرانے لگا۔ منظر دھندلانے اور لہرانے لگا اور پھر میں زمین پر گر گیا۔ آخری یادداشت کسی کتے کے بھونکنے کی آواز تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کتا بھونکتا اور دوڑتا میری طرف آ رہا ہے۔ اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا تھا۔ شاید بے ہوشی کی صورت میں موت مجھ پر غالب آ گئی تھی۔

سانپ کا زہر انسان پر دو طرح سے اثر کرتا ہے۔ ایک دماغ کے دفاعی حصار کو شکست دے کر دماغ کے اس حصے تک رسائی حاصل کرتا ہے جو دل اور سانس کے فعل کو قابو کرتا ہے۔ زہر آہستہ آہستہ دماغ کے اس حصے کو کام کرنے سے روک دیتا ہے اور نتیجے میں شکار دل اور سانس کے رک جانے سے موت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس میں آدمی کو نیند آتی ہے اور ایک بار وہ سو جائے تو عام طور پر اسے ہمیشہ کی نیند سمجھا جاتا ہے۔ دوسری قسم کا زہر خون میں شامل سرخ اور زرد ذرات کو فنا کر دیتا ہے۔ خون پانی کی طرح ہو جاتا ہے، جمنے کی صلاحیت کھو دیتا ہے، اندرونی اور بیرونی جریانِ خون شروع ہو جاتا ہے اور شکار خون بہنے کی زیادتی سے مر جاتا ہے مگر یہ کم خطرناک زہر ہے۔ اس میں بھی شکار کو نیند آتی ہے۔ مجھے کوبرا نے کاٹا تھا اس میں اوّل قسم کا خطرناک ترین زہر پایا جاتا ہے۔ اس وقت جب میرے حواس جواب دے رہے تھے، میں نے سوچ لیا تھا کہ اس دنیا میں میری یہ آخری چند سانسیں ہیں اور اس کے بعد مجھے ہوش میں آنا نصیب نہیں ہوگا اس لئے الوداع اے دنیائے فتنہ و فساد۔

☆======☆======☆

مجھے ہوش تو خاصی دیر بعد آیا لیکن غشی کی کیفیت میں، مَیں ایک مرد کی آوازیں سن رہا تھا۔

''کوبرا...... خطرناک زہر...... بھگوان نے بچایا...... حیرت انگیز!''

کبھی کبھی ایک نسوانی اور مدھم سی آواز بھی آتی تھی جس کے الفاظ میری سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ پھر مجھے ہوش آ گیا، مکمل احساس اور سمجھ کے ساتھ۔ میں ایک کھاٹ نما بستر پر پڑا تھا اور میرے جسم پر صرف میری پتلون تھی۔ جوتے، جیکٹ اور قمیص اتار لی تھی۔ عجیب بات تھی، اس کے باوجود مجھے سردی نہیں لگ رہی تھی۔ بس جسم پر ایک خوشگوار سی خنکی کا احساس ہو رہا تھا۔ یہ کوئی جھونپڑی تھی اور کسی سپیرے کی لگ رہی تھی۔ جا بجا سانپوں والی پٹاریاں پڑی تھیں۔ سانپوں کے ڈھانچے لٹک رہے تھے اور ایک طرف شاید نیولے کا ڈھانچا تھا۔ کھاٹ آرام دہ

تھی مگراس سے بُو سی اٹھ رہی تھی۔ جھونپڑی کچی مٹی کی تھی اوراوپر لکڑی کی چھت تھی۔ دروازے کی جگہ پردہ لٹک رہا تھا اوراس سے آتی روشنی بتا رہی تھی کہ باہر دن ہے۔

میں سوچ رہا تھا کہ میں بچ کیسے گیا؟ کیا اس سپیرے نے میرا علاج کیا تھا اور میرے جسم سے زہر کا اثر ختم کر دیا تھا۔ کیا خوب اتفاق تھا، سانپ نے مجھے جہاں کاٹا وہاں پر سپیرے کی جھونپڑی تھی۔ میں کچھ بے حس سا ہورہا تھا۔ مطلب یہ کہ سردی کے ساتھ بھوک اور پیاس بھی نہیں لگ رہی تھی، کچھ ایسا محسوس ہورہا تھا کہ میں نے پیٹ بھر کر طعام کیا ہو۔ ذہن پر بھی ہلکی سی بے حسی طاری تھی۔ یعنی میں سوچ رہا تھا مگر مجھے کسی شے یا بات پر تعجب نہیں ہورہا تھا۔ ذہن کی طرح جسم بھی پُر سکون تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو میرے جسم نے حرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ میرے اندر خوف کی لہر سی دوڑ گئی تھی، کیا میں مفلوج ہو گیا تھا؟ اگلی بار میں نے خود اٹھنے کے بجائے اپنا ہاتھ اٹھانے کی کوشش کی، میرا ہاتھ ایک ہی جگہ لرزتا رہا لیکن اٹھا نہیں۔ حد یہ کہ میں نے سر گھمانے کی کوشش کی تو اس میں بھی کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔ میرا جسم مکمل طور پر مفلوج تھا۔ سانپ کے زہر سے آدمی مر جاتا ہے لیکن یہ میں نے آج تک نہیں سنا تھا کہ آدمی مفلوج ہو جاتا ہے۔

''خدایا، یہ میرے ساتھ کیا ہورہا ہے؟'' میں نے سوچا پھر بولنے کی کوشش کی ''کوئی ہے؟''

میرا خیال تھا، باقی جسم کی طرح شاید میری آواز بھی مفلوج ہو اور خاصا زور لگانے پر میں سرگوشی کر سکوں گا۔ اسی وجہ سے میں نے سارا زور لگا دیا تھا اس لئے خاصی بلند آواز نکلی تو میں خود بھی چونک گیا تھا۔ چند لمحے بعد اس کا ردِعمل بھی نکلا تھا۔ ایک سیاہ فام لڑکی اندر آئی۔ اس نے ساڑھی پہن رکھی تھی اور اپنے سیاہ اور بے حد لمبے بال کھلے چھوڑ رکھے تھے جو آگے پیچھے اس کی ستر پوشی کر رہے تھے کیونکہ اس نے بلاؤز نام کی کوئی شے نہیں پہن رکھی تھی۔ میں نے بنگال کے بارے میں سنا تھا کہ وہاں بعض علاقوں میں عورتیں بلاؤز نہیں پہنتی ہیں مگر یہ مشرقی پنجاب تھا۔ یہاں نہ تو اس کا رواج تھا، نہ غربت تھی اور نہ کپڑے کی کمی۔

''تُو ہوش میں آ گیا رے!'' لڑکی نے آہستہ سے کہا۔ ''ابھی آرام کر باپو جڑی بوٹیاں لینے گیا ہے۔''

''سنو، تم کون ہو؟''

''میں..... میں اوشا ہوں۔ میرا باپو سپیرا ہے۔''

''میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔ میں حرکت کیوں نہیں کرسکتا؟''

''تجھے باپو کے سب سے شیشک ناگ نے کاٹا تھا۔ تیرا نصیب...... باپو نے تجھے مرنے سے پہلے دیکھ لیا۔ موتی نے بتا دیا تھا۔ باپو تجھے لے آیا اور تیرا علاج کیا۔ تُو نے باپو کا سب سے قیمتی ناگ مار دیا تھا۔ باپو نے تجھے بچانے کے لئے دوائی دی ہے اس کی وجہ سے تُو ابھی ہل نہیں سکتا ہے...... پر تُو ٹھیک ہو جائے گا۔''

''کب تک؟'' میں نے کہا۔ ''اور مجھے اس طرح کیوں ڈال رکھا ہے؟''

لڑکی میرے پاس آئی۔ ''تجھے ٹھنڈ لگ رہی ہے؟''

''نہیں۔'' میں نے کہا۔

''باپو کی دواؤں سے تیرے اندر گرمی بھر گئی ہے۔'' وہ میرے پاس بیٹھ گئی۔ اس کے بدن سے ایک انوکھی اور تیز چبھتی بو آ رہی تھی۔ جیسے وہ کوئی لڑکی نہ ہو، سیاہ ناگن ہو۔ اس کی عمر شاید سترہ اٹھارہ برس کی تھی مگر اس کا بدن

کسی بھرپور جوان عورت کا سا تھا۔ ساڑھی تلے سرکش شباب جو اپنی جھلک دکھانے کے لئے بے چین تھا، پتلی سی کمر کے نیچے جیسے ساڑھی تلے گاگر رکھے تھے۔ اس کے بازو شانے تک عریاں تھے۔ اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ میرے سینے پر رکھا اور اپنی گرم گداز ہتھیلیوں سے میرے سینے پر دائروں میں مالش کرنے لگی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "تُو کتنا سندر ہے رے!"

مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا لیکن دل پر جبر کر کے کہا۔ "لیکن میری سندرتا کس کام کی، میں تو مفلوج پڑا ہوں۔"

"تُو ٹھیک ہو جائے گا رے!" وہ بولی اور آہستہ سے میرے چہرے پر جھک آئی۔ میں اتنا بے بس تھا کہ چہرہ بھی نہیں ہٹا سکتا تھا۔ اس لئے وہ من مانی کرتی رہی۔ پھر پیچھے ہٹی اور شریر لہجے میں بولی۔ "تُو تو اس طرح شرما رہا ہے جیسے لڑکی ہے رے!"

"اُلو کی پٹھی!" میں نے دل میں کہا اور طنز کیا۔ "اور تیرے انداز میں کیا مردانگی پائی جاتی ہے۔"

"یہ جیون چار دن کا ہے، آدمی اپنی مرضی نہ کرے تو اس کا فائدہ!" وہ بے پروائی سے بولی۔ "تُو فکر مت کر، میں سارے ہی مردانہ کام نہیں کروں گی، کچھ تیرے لئے بھی چھوڑ دوں گی۔" اس نے معنی خیز انداز میں کہا تو اس کی بات کا مفہوم سمجھ کر مجھے پسینہ آ گیا تھا۔ وہ کمسن تھی مگر اس کا انداز پختہ کار عورتوں سے بھی بڑھ کر تھا۔ ممکن ہے اسے عملی تجربہ بھی ہو۔ اس کے انداز سے بھی کچھ ایسا ہی لگ رہا تھا۔

"تجھے پیاس لگ رہی ہے رے؟" اس نے حسبِ معمول جملے کے آخر میں رے فٹ کیا۔

"نہیں۔" میں نے جلدی سے انکار کر دیا۔ مجھے پیاس نہیں تھی مگر انکار کی وجہ یہ اندیشہ بھی تھا کہ اگر اخراج کا مسئلہ ہو گیا تو میں اس مفلوج حالت میں کیا کر سکوں گا؟ کیا بستر کو ہی باتھ روم کے طور پر استعمال کروں گا؟ میں نے لڑکی سے سوال کیا۔ "کیا تم ہندو ہو؟"

"ہاں اور تُو مسلمان ہے۔" اس کے انداز میں شرارت آ گئی تھی۔

"تمہیں کیسے پتا چلا؟" میں نے بے ساختہ پوچھا اور پھر پچھتایا۔ وہ معنی خیز انداز میں مسکرانے لگی تھی۔

"باپو تیرا علاج کر رہا تھا تب میں نے تجھے دیکھا تھا۔"

"میرے کپڑے اتار دیئے تھے تیرے باپو نے؟"

"ہاں، تجھ پر لیپ کرتا تھا، زہر کا اثر ختم کرنے کے لئے۔"

اس کی بات پر مجھے پھر زہرہ یاد آئی۔ اسے بھی سانپ نے ڈس لیا تھا اور ایک ہندو سادھو نے لیپ کر کے اور چھپکلی نما جونکیں لگا کر اس کا علاج کیا تھا۔ شاید اس سپیرے نے بھی ایسا ہی کوئی لیپ کیا تھا۔

"دو دن تیرا لیپ کیا تھا پھر کل تجھے جڑی بوٹیوں والے جل سے اشنان کرایا تھا۔"

"تین دن...... میں تین دن سے بے ہوش ہوں؟"

"آج رات تجھے پورے چار دن ہو جائیں گے۔" اوشا نے انگلیوں پر حساب لگایا۔

"اور میں نے اتنے دن سے کچھ کھایا پیا نہیں ہے۔"

"نہیں، باپو تجھے کچھ پلاتا تھا۔" اس نے جواب دیا۔

"تیرا باپو سپیرا ہے......سانپ بیچتا ہے؟"

"وِش بھی اور جڑی بوٹیاں بھی۔ باپو کئی وِش ملا کر ایسا وِش تیار کرتا ہے کہ کسی کو بھی سوئی میں لگا کر چبھو دو، وہ ایک منٹ میں مر جاتا ہے۔"

"گویا تمہارا باپو قاتلوں کو ہتھیار بھی بیچتا ہے۔"

"سب بیچتے ہیں۔" وہ بے پروائی سے بولی۔ "اگر تجھے کوئی کام نہ ہو تو میں جاؤں۔ باپو آنے والا ہوگا اور آتے ہی بھوجن مانگے گا۔"

وہ پلٹی اور بل کھا کر باہر چلی گئی۔ بالکل ناگن لگتی تھی۔ میں نے اس کے جانے کے بعد ایک بار پھر خود سے حرکت کرنے کی کوشش کی مگر صرف اتنی کامیابی ہوئی کہ میں ذرا سا سر ہلانے میں کامیاب ہوا تھا۔ نہ جانے اس خبیث سپیرے نے مجھ پر کون سی دوائیں آزمائی تھیں جن کے اثر سے میرا پورا جسم مفلوج ہو گیا تھا اور خدا جانے وہ میرا علاج کر رہا تھا کہ مجھ پر کوئی تجربہ کر رہا تھا۔ ابھی ادشا نے اعتراف کیا تھا کہ وہ قاتلوں کو زہر فروخت کرتا تھا، ایسے شخص سے یہ توقع محال تھی کہ وہ محض انسانی ہمدردی کے تحت کسی کی جان بچانے کی کوشش کرے گا۔ اگر وہ مجھ پر کوئی تجربہ کر رہا تھا تو اس سے مجھے فائدے کے ساتھ نقصان بھی ہو سکتا تھا۔

جھونپڑی کے باہر شاید برآمدہ تھا۔ جس میں باورچی خانہ تھا جس میں کھانا بن رہا تھا۔ مجھے ایک خیال اور ستانے لگا۔ ساری عمر کبھی غلطی سے بھی حرام نہیں کھایا تھا، نہ غذا میں اور نہ ہی دوسرے معنوں میں۔ اس سپیرے کی اولاد نے نہ جانے تین دنوں میں مجھے کیا کیا کھلا دیا تھا۔ اس میں کتنا حلال تھا اور کتنا حرام تھا۔ ہندو کے گھر کا کھانا تو ویسے ہی مشکوک تھا۔ اوپر سے وہ سپیرا بھی تھا۔ اچانک باہر سے کسی نے بھاری آواز میں کچھ کہا۔ ساتھ ہی کتا بھی بھونکا تھا پھر پردہ ہٹا اور ایک طویل قامت اور بانس کی طرح دبلا پتلا شخص اندر آیا۔ اس سردی کے عالم میں اس نے دھوتی پر ایک واسکٹ پہن رکھی تھی۔ وہ ادشا سے زیادہ سیاہ فام تھا لیکن اصل بات یہ تھی کہ وہ بے حد کریہہ المنظر تھا۔ "کیا حال ہیں مہاراج!" اس نے بھاری آواز میں کہا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس نے طنز بھی کیا تھا۔

"ٹھیک ہوں۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں تم نے مجھے سانپ کے زہر سے بچایا۔" میں نے مصلحتاً نرم لہجے میں کہا۔ میں صورت سے خبیث نظر آنے والے اس شخص کو بھڑکانا نہیں چاہتا تھا، خاص طور سے اس حالت میں جبکہ میں مفلوج پڑا تھا۔

"کرپا ہے مہاراج کی۔" وہ میری طرف جھکا۔ اس کے پاس سے تیز اور ناگوار بُو آ رہی تھی۔ اس نے غور سے مجھے دیکھا۔

"میں ہل نہیں سکتا۔"

"ابھی تجھ پر دواؤں کا اثر ہے مہاراج!" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ "ناگ دیوتا نے جتنا وِش تیرے شریر میں اتارا تھا، وہ چار آدمیوں کو مارنے کے لئے کافی تھا۔"

"پھر میں کیسے بچا؟"

"سچی بتاؤں...... یہ بھگوان کی لیلا ہے، وہ جسے چاہے امر کر دے۔" اس نے کہا۔ "میں نے بس کوشش کی

تھی۔ مجھے امید نہیں تھی تُو بچ سکے گا۔"

"یعنی ابھی میرا وقت نہیں آیا۔" میں نے سوچا، مجھے سکون ملا تھا یہ جان کر کہ میری جان بچانے کا سہرا اس کے سر نہیں جاتا تھا۔ اس نے صرف کوشش کی تھی۔ "میرا جسم کب تک ٹھیک ہوگا؟"

"کچھ سمے لگے گا مہاراج!" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"تم نے مجھے تین دن تک کیا کھلایا ہے؟"

"کچھ جڑی بوٹیاں اور سانپ کا ماس۔ یہ جروری تھا۔ تیرا جسم وِش برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔ اس کے لئے سانپ کا ماس کھلانا جروری تھا۔ تجھے سردی نہیں لگ رہی ہے۔"

"سانپ کا گوشت!" مجھے اپنا معدہ حلق کی طرف آتا محسوس ہوا تھا۔ "اور کیا تھا؟"

"وِش کا توڑ کرنے والی چند جڑی بوٹیاں تھیں۔ یہ خود وِش ہوتی ہیں اور جسم کو کچھ دیر کے لئے بے کار کر دیتی ہیں۔"

"کیا زہر کا اثر میرے جسم سے ختم ہو گیا ہے؟"

"اس حد تک کہ تم ہوش میں آ گئے ہو مہاراج! پر پورا اثر ختم ہونے میں سمے لگے گا۔"

"اس نے دوبارہ وقت کا ذکر کیا تھا اور دونوں بار اس نے بہت مبہم سا انداز اختیار کیا تھا۔ مجھے شک ہونے لگا، وہ یا تو مجھ پر کوئی تجربہ کر رہا تھا یا پھر اس نے کسی مقصد کے تحت مجھے جان بوجھ کر مفلوج رکھا ہوا تھا۔ میں کھل کر اپنے شکوک کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں فی الحال ظاہر کر رہا تھا کہ میں اس پر اعتماد کر رہا ہوں۔ اس سے مجھے اس کے عزائم کا اندازہ لگانے میں آسانی رہتی۔ "تمہیں بھوک لگ رہی ہے مہاراج؟"

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "مجھے بھوک نہیں لگ رہی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ پر کچھ نہ کچھ بھوجن تو کرنا ہوگا۔" اس نے کہا۔ "میں ابھی لاتا ہوں۔"

وہ یقیناً مجھے وہ جڑی بوٹیاں کھلانا چاہ رہا تھا جن کے اثر سے میں مفلوج پڑا تھا۔ مصیبت یہ تھی کہ انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ مجھے زبردستی کھلا سکتا تھا۔ چند منٹ بعد وہ ایک برتن میں سبز رنگ کا محلول لے آیا۔ ساتھ میں لکڑی کا چمچ بھی تھا۔ میں نے کسی قدر سخت لہجے میں کہا۔ "میں نے کہا نا مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"مہاراج! یہ دوا ہے...... نہیں کھاؤ گے تو وِش پھیلنا شروع ہو جائے گا اور پھر شاید میں کچھ نہ کر سکوں۔"
اس نے اطمینان سے کہا اور میرے پاس بیٹھ گیا۔ "ڈرو مت، اس میں کوئی شے تیرے لئے خطرناک نہیں ہے۔"

میں زیادہ انکار کر کے اسے بھڑکانا نہیں چاہتا تھا۔ مجبوراً میں نے اس کے گندے ہاتھوں سے وہ سوپ حلق سے اتارنا گوارا کر لیا۔ اس کا ذائقہ ہلکا سا نمکین اور کسیلا تھا اور اس سے ایسی بو آ رہی تھی جیسے سبز پتوں کو ملنے پر آتی ہے۔ میں نے بمشکل نصف پیالہ پیا اور پھر انکار کر دیا۔ اس نے شاید اتنے کو ہی غنیمت سمجھا تھا۔ "اب تجھے میٹھی نیند آ جائے گی۔"

"لہجے سے تم لوگ اس علاقے کے رہنے والے نہیں لگتے؟" میں نے کہا۔

"ہاں، ہم یوپی سے آئے ہیں۔ اِدھر مجھے وہ جڑی بوٹیاں مل گئی ہیں جن کی مجھے برسوں سے تلاش تھی۔ میں اور اوشا چار برس سے یہاں ہیں۔"

"یہ جگہ سرحد سے کتنی دور ہے؟"

"سرحد!" وہ کسی قدر حیران ہوا تھا۔ "وہ تو یہاں سے بہت دور ہے، بارہ تیرہ میل دور۔"

میں چپ رہا۔ یہ سوپ پینے کے بعد مجھے اپنے اندر پیٹ میں ایک عجیب سی ناگوار اینٹھن محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے تجسس سے پوچھا۔ "مہاراج! تُو سرحد کا کیوں پوچھ رہا ہے، کیا تو اُدھر جانا چاہتا ہے؟"

"نہیں۔" میں نے انکار کیا۔ "میں یہاں ایک سکھ دوست کے ساتھ شکار کھیلنے آیا تھا۔ اس سے بچھڑ گیا، میرا سارا سامان بھی اس کے پاس ہے۔"

"کس چیز کا شکار؟" اس نے غور سے مجھے دیکھا۔

"تیتروں کا۔" میں نے جواب دیا کیونکہ اس کا شکار پورے پنجاب میں ملتا تھا۔ لازمی بات تھی کہ اس علاقے میں بھی تیتر ملتے ہوں گے۔ اس نے سر ہلایا۔

"ہاں، ادھر پورب میں تیتر ملتے ہیں مگر جھاڑیوں کی وجہ سے شکار مشکل ہوتا ہے۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"سندھو۔" اس نے مختصراً کہا اور پیالہ لے کر چلا گیا۔ میرے پیٹ میں اینٹھن بڑھنے لگی تھی۔ مجھے خدشہ ہوا کہ یہ اینٹھن کسی اور شے میں نہ بدل جائے۔ یہاں تو دوسرا لباس ملنے کی امید بھی نہیں تھی۔ خود جھونپڑی کے مکینوں کے پاس لباس کی سخت کمی تھی۔ اب میرا سر چکرانے لگا تھا۔ دوا میں کوئی خواب آور جزو بھی تھا۔ سونے سے پہلے بھی مجھے اتنا یاد تھا کہ اوشا اندر آئی تھی اور چٹائی بچھا کر اس پر دراز ہو گئی تھی۔ میری آنکھ کھلی تو ابھی اندھیرا تھا۔ جھونپڑی میں دیا جل رہا تھا۔ میرے سامنے چٹائی پر اوشا بے حجابانہ انداز میں چاروں شانے چت لیٹی تھی اور اس کی ساڑھی کا پلو اتر گیا تھا۔ میں نے بے ساختہ لاحول پڑھی اور آنکھیں بند کر لیں۔ میں اس نظارے سے نظریں چرانے کے لئے سر بھی نہیں گھما سکتا تھا۔ میری کھاٹ کا سرہانہ ذرا اونچا تھا اس لئے مجھے سامنے کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ سندھو کہاں تھا؟ کیا وہ بھی اسی جگہ تھا اور بیٹی اس کے سامنے اس طرح سو رہی تھی مگر کان لگا کر سننے پر مجھے صرف اوشا کی نرم سانسوں کی آواز آئی تھی۔ اس کے علاوہ اندر مکمل خاموشی تھی۔ مجھے وقت کا اندازہ نہیں تھا۔ شاید یہ رات کا ابتدائی پہر تھا۔ سندھو شاید باہر سو رہا تھا۔ اوشا کے انداز سے لگ رہا تھا کہ اسے سردی محسوس نہیں ہو رہی تھی اور یہی حال سندھو کا تھا۔ لگتا تھا یہ دونوں باپ بیٹی شاید سانپ کا گوشت کھاتے تھے۔

اچانک اوشا سوتے سوتے کراہی۔ اس نے کروٹ لی۔ وہ اس طرح ہل رہی تھی جیسے آدمی نیند میں حرکت کرتا ہے۔ اس کی چمکیلی پشت میری طرف تھی اور لمبے بال ناگوں کی طرح چٹائی پر پھیلے ہوئے تھے۔ حرکت کرتے کرتے وہ اٹھ بیٹھی۔ اس نے سر گھما کر میری طرف دیکھا تو میں نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔ میں ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ میں گہری نیند بلکہ غشی میں ہوں۔ وہ اٹھی کیونکہ کپڑوں کی سرسراہٹ ہوئی تھی۔ میں نے ہلکی سی آنکھ کھولی۔ اوشا نیم وا آنکھوں کے ساتھ ساکت کھڑی تھی اور ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے چاکلیٹ سے مجسمہ تراش دیا ہو۔ ساڑھی کا پلو نیچے لٹک رہا تھا۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ گھومنا شروع کر دیا۔ اس نے نہ جانے کیا کیا کہ ساڑھی کے بل کھلنے لگے۔ ذرا سی دیر میں ساری ساڑھی اس کے قدموں میں ڈھیر تھی۔ نیچے اس نے منی اسکرٹ نما کوئی شے پہن رکھی تھی جس میں اس کی سیاہ سڈول ٹانگیں نمایاں تھیں۔

اس نے نشیلے انداز میں مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ اس کے بے حد سفید اور خوبصورت دانت جھلکنے لگے۔ میں نے دل ہی دل میں اس کی دلکشی کا اعتراف کیا۔ وہ سیاہ تھی مگر یہ سیاہی بھی اس کے حسن کو چھپانے میں ناکام رہی تھی بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ یہ سیاہی بھی اس کی کشش میں اضافہ کر رہی تھی۔ اس کے دیکھنے کے انداز سے مجھے خطرے کا احساس ہونے لگا، وہ کسی نشے کے زیر اثر تھی۔ آہستہ سے وہ ڈولتے اور لچکتے ہوئے میری طرف آئی۔ وہ کھاٹ کے کنارے بیٹھی پھر آہستہ سے میرے اوپر آئی اور جیسے چھا گئی۔ میں نے دل ہی دل میں خدا سے پناہ چاہی کہ اس کے ارادے بے حد خطرناک تھے، وہ جس طرح مچل رہی تھی، ایسا لگتا تھا جیسے کوئی ناگن اپنے ناگ کے لئے مچل رہی ہو۔ اس کے گرم گداز بدن کا لمس میرے لئے کسی پل صراط سے کم نہیں تھا۔

یہ درست ہے کہ میں شریف ماں، باپ کی اولاد تھا اور میری ماں نے مجھے بارہ سال کی عمر سے سمجھانا شروع کر دیا تھا کہ ہر عورت قابلِ احترام ہوتی ہے۔ چاہے اس سے کوئی بھی رشتہ ہو یا رشتہ نہ ہو۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے آج تک اس بات پر سختی سے عمل کیا تھا۔ جب میری زندگی کا رخ بدلا اور دن رات یوں بسر ہونے لگے کہ سابقہ زندگی خواب وخیال بن کر رہ گئی۔ اس نئی زندگی میں بے شمار عورتیں آئیں اور ان میں ہر طرح کی عورتیں تھیں مگر میرے قدم کبھی نہیں بہکے تھے۔ میں نے زہرہ کے بارے میں بھی کبھی اس انداز میں نہیں سوچا۔ وہ اندر سے بری عورت نہیں تھی۔ جو عورتیں سچ مچ بری تھیں ان کو بھی میں نے نظر انداز کیا تھا۔ لیکن بہر حال میں مرد تھا اور پہلے کبھی ایسی صورتِ حال پیش نہیں آئی تھی۔ میرا کچھ نہ کچھ متاثر ہونا فطری بات تھی۔ میں ذہنی طور پر کتنی ہی مزاحمت کرتا، میرا جسم ردِ عمل دکھاتا اور وہ دکھا رہا تھا۔ جب معاملہ حد سے گزرنے لگا تو میں جیسے چونک کر بیدار ہو گیا۔ ''اوشا...... یہ کیا کر رہی ہو، ہوش میں آؤ۔''

میری آواز سن کر اس نے سر اٹھا کر دیکھا اور مسکرائی۔ ''تم...... اٹھ گئے ہو؟''

''اوشا...... مجھ سے دور رہو۔''

''میں پیاسی ہوں...... میری پیاس...... بجھا دورے۔''

''اوشا!'' میں نے اس بار سخت لہجے میں کہا۔ ''ہوش میں آؤ...... ورنہ......''

''ورنہ...... تُو کیا کرے گا رے!'' وہ نشیلے لہجے میں بولی اور میرا منہ بند کر دیا۔ میں بے بس تھا، اسے دھکیل بھی نہیں سکتا تھا۔ شاید یہ باپ بیٹی مل کر چکر چلاتے تھے۔ سندھو اپنی دواؤں سے مردوں کو مفلوج کر دیتا تھا اور اوشا ان سے کھیل کر اپنے سفلی جذبات کی تسکین کرتی تھی۔ شاید وہ نفسیاتی مریض تھی، اس کھیل کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ اس کا باپ اس کے سامنے مجبور تھا۔ وہ اسے گنوانا نہیں چاہتا تھا اس لئے اس کو مرد کھلونے مہیا کرتا تھا۔ میرا دم گھٹنے لگا تھا اور میرے پھیپھڑوں نے سانس کے لئے مچلنا شروع کر دیا تھا۔ اچانک میں تڑپا اور وہ مجھ سے الگ ہو گئی تھی۔

''سندھو!'' میں آزاد ہوتے ہی چلایا۔ ''اسے روکو...... سندھو!''

اوشا میرے چلانے سے چونکی۔ اس نے ناگواری سے مجھے دیکھا، اسی لمحے باہر آہٹ ہوئی۔ ''اوشا، کیا بات ہے؟''

''کچھ نہیں باپو!'' اس نے اطمینان سے کہا۔ ''تم ادھر مت آنا۔''

"سندھو اسے روکو..... یہ حرافہ" اوشا نے پھر میرا منہ بند کر دیا تھا۔

"اوشا، میں اندر آرہا ہوں۔" سندھو کی آواز آئی۔

اوشا مجھ سے الگ ہوئی۔ اس نے خوں خوار نظروں سے مجھے دیکھا اور با دل ناخواستہ کھاٹ سے اتر کر اپنی ساڑھی باندھنے لگی۔ اس نے اپنی سیدھی ساڑھی باندھی اور تملاتی ہوئی باہر چلی گئی۔ اس کے چند لمحے بعد سندھو اندر آیا۔ اس نے ناگواری سے مجھے دیکھا۔ "تمہیں اتنا شور کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"تم اور تمہاری بیٹی!" میں غصے سے پھٹ پڑا تھا۔ میں نے اسے بے نقط سنائیں۔ "کاش کہ میں مفلوج نہ ہوتا تو اس کی گردن مروڑ دیتا۔"

"دھیرج، مہاراج دھیرج!" اس نے بے غیرتی سے کہا۔ "ابھی کیتا ہے۔"

میں خود پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے خیال آیا کہ مجھے ان لوگوں کے چنگل سے نکلنا تھا تو اپنا دماغ ٹھنڈا رکھنا ہوگا۔ سندھو میرے ارد گرد نہ جانے کیا کرتا پھر رہا تھا۔ پھر وہ ایک چھوٹا سا پیالہ لے کر آیا۔ پیالہ اس نے کھاٹ پر رکھا اور میرا سیدھا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ایک تیز دھار چاقو تھا۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟" میں نے تشویش سے کہا۔

"تیرے غصے کی وجہ سے خون میں وش بڑھ سکتا ہے۔ اس کا اثر کم کرنے کے لئے کچھ لہو نکالنا ہوگا۔"

اس نے چاقو سے میرے انگوٹھے میں ہلکا سا کٹ لگایا اور خون کے لئے اسے پیالے پر جھکا دیا۔ میں نہیں دیکھ سکا تھا کہ کٹ کتنا بڑا تھا اور خون کس رفتار سے بہہ رہا تھا۔ اس کی دوسری باتوں کی طرح مجھے اس کی یہ بات بھی بکواس لگ رہی تھی۔ میرا شک پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ یہ باپ بیٹی مل کر مجھ پر کوئی تجربہ کر رہے تھے۔ ممکن ہے تجربہ صرف سندھو کر رہا ہو اور اوشا اس کا ساتھ دے رہی ہو۔ چند منٹ بعد اس نے میرا ہاتھ اوپر کیا اور میرے انگوٹھے پر راکھ نما کوئی شے چھڑک دی تھی۔ اس کے اثر سے خون رک گیا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"تم اس خون کا کیا کرو گے؟"

"باہر پھینک دوں گا۔" اس نے کہا اور پیالہ لے کر باہر چلا گیا۔ اس نے جتنی احتیاط سے پیالہ اٹھا رکھا تھا، ایسا لگ رہا تھا، وہ اس میں موجود خون کو چھلکنے سے بچا رہا ہو یعنی اس نے میرے خون سے پورا پیالہ بھر لیا تھا، اس کے جاتے ہی اوشا اندر آئی۔ اس نے پردہ برابر کیا۔

"بڑا تیج ہے تُو۔" وہ میرے پاس آئی۔ اس نے باہر جا کر ساڑھی کو درست طریقے سے باندھ لیا تھا۔

"اوشا، تم لوگ میرے ساتھ کیا کھیل، کھیل رہے ہو؟"

"کیسا کھیل رے؟" اس نے معصومیت سے کہا۔ پھر جذباتی لہجے میں بولی۔ "میں تو تجھ سے کھیلنا چاہتی تھی رے، پر تُو نے باپو کو آواز دے دی۔"

"وہ میرا خون نکال کر لے گیا ہے۔"

"نکالا ہوگا۔" اس نے بے پروائی سے کہا اور ذرا جھک کر بولی۔ "اگلی بار میں تیرا منہ بند کر دوں گی۔"

"اوشا..... سندھو جانتا ہے تو اندر کیا کر رہی تھی؟"

وہ مسکرائی۔ "نہ جانتا تو اندر نہ آجاتا..... پر جب تک میں باہر نہیں گئی، باپو اندر نہیں آیا تھا۔"

اسے شرم اور غیرت کا احساس دلانا بے کار تھا۔ وہ دونوں ان احساسات سے عاری تھے۔ جانوروں کی طرح جو صرف اپنی نفسانی خواہشات پوری کرتے ہیں۔ اچانک میرے اندر کا چالاک انسان بیدار ہو گیا۔ میں نے اوشا کو دیکھا۔ "تُو اتنی سندر ہے...... پھر تجھے یہ سب کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کوئی بھی مرد تیرے ایک اشارے پر کھنچا چلا آ سکتا ہے۔"

"پر تُو نے باپو کو بلا لیا رے۔"

"سمجھنے کی کوشش کرو۔ میری جو حالت ہے اس نے مجھے غصہ ور کر دیا ہے اور کیا تیرا دل نہیں چاہتا کہ تجھے مکمل مرد ملے۔" اس بار میں نے بے شرمی سے کام لیا تھا۔

وہ پھر خطرناک انداز میں میرے پاس آ گئی۔ "من کیوں نہیں کرتا ہے رے...... پر مردوں کو میرا کالا تن اچھا نہیں لگتا۔"

"وہ کون ہیں، جو صرف رنگ دیکھتے ہیں۔" میں نے حیرت سے کہا۔ "تیرے پاس کیا نہیں ہے جو دنیا کی کسی دوسری عورت کے پاس ہو سکتا ہے؟"

"تُو سچ کہہ رہا ہے رے!" وہ خوش ہو گئی تھی۔ عورت کے معاملے میں خوشامد کا تیر کبھی خالی نہیں جاتا۔

"ہاں، کیا تُو آئینہ نہیں دیکھتی، یہ نقوش، یہ بال اور یہ جسم، یہ تو کسی بھی مرد کا خواب ہو سکتے ہیں اور جہاں تک رنگ کا تعلق ہے، تو سچی بات ہے اگر تُو گوری ہوتی تو اتنی خوبصورت نہ لگتی جتنی کہ اب لگتی ہے۔"

وہ خوش ہو کر میرے پاس آ گئی اور اپنی مہربانیاں نچھاور کرنے لگی۔ کم سے کم اس کا یہی خیال تھا، میں دل پر جبر کر کے برداشت کرتا رہا۔ شاید قارئین کو یہ بات عجیب سی لگے کہ میں ایک حسین لڑکی کو جبر سے برداشت کر رہا تھا لیکن یہ حقیقت ہے، ان باپ بیٹی کا یہ روپ دیکھنے کے بعد مجھے اوشا سے گھن آنے لگی تھی جیسے کسی کو پتا چل جائے کہ سونے کے اس برتن میں کبھی رفع حاجت کی گئی تھی تو وہ صاف ستھرا ہونے کے باوجود اس میں کھانا کھانے کو تیار نہیں ہوگا۔ "اوشا، کاش میں مفلوج نہ ہوتا۔" میں نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"تُو ٹھیک ہو جائے گا رے۔"

"کب؟" میں نے تڑپ کر کہا۔ "اب مجھ میں انتظار کی تاب نہیں ہے۔"

وہ مسکرائی۔ "فکر نہ کر، جلد ٹھیک ہو جائے گا۔ باپو کا کچھ کام ہے، وہ ہو جائے۔" وہ روانی میں کہہ گئی تھی۔ چالاک بنتی تھی اور عورت بننے کی کوشش کرتی تھی لیکن تھی تو سترہ برس کی نادان لڑکی۔ وہ نادانی میں تصدیق کر گئی تھی کہ اس کا باپ مجھے اپنے کسی تجربے کا نشانہ بنا رہا تھا۔

"میں تجھے بانہوں میں لینا چاہتا ہوں۔" میں نے حسرت سے کہا۔

وہ میرے اوپر لیٹ گئی۔ "لے آ گئی، میں تیری بانہوں میں۔"

"ایسے نہیں۔" میں نے کہا اور ایک بار پھر خود پر جبر کر کے کھلے الفاظ میں بتایا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ میں اس نادان لڑکی کے جذبات کو پوری طرح استعمال کرنا چاہتا تھا۔ میری توقع کے عین مطابق وہ میرے الفاظ کی گرمی سے پگھلنے لگی۔ بے تاب موجوں کی طرح میرے سینے کے ساحل سے ٹکرانے لگی تھی۔

"آرام سے میری جان!" میں نے اب اسے پُر سکون کرنا شروع کیا۔ "یہ بتا کہ تُو اس ویرانے میں پڑی

اپنی جوانی کیوں ضائع کر رہی ہے؟"

"اِدھر میرا باپو جو ہے۔"

"باپو اتنا کماتا ہے، تجھے کسی آبادی میں لے جا کر رکھ سکتا ہے، پھر اس ویرانے میں کیوں پڑا ہے؟ کیا اسے تجھ سے پیار نہیں ہے؟"

"باپو مجھ سے پیار کرتا ہے۔" اس نے دفاعی انداز میں کہا۔

"اگر وہ تجھ سے پیار کرتا تو تجھے اتنے برے حال میں اس ویرانے میں نہ رکھتا۔ تجھے اچھا گھر دیتا، اچھا لباس اور اچھی خوراک دیتا۔ یہاں اس جنگل میں تم کیا کھا رہی ہو، سبزیاں اور سانپ کا گوشت، یہ معمولی سا کپڑا پہن رہی ہو۔ تم تو اس قابل ہو کہ اچھا کھاؤ اور سب سے اچھا لباس پہنو۔"

میں نے اس کے ذہن میں باپ کے خلاف نفرت کا بیج بو دیا تھا اور مجھے امید تھی، جلد یہ بیج تناور درخت بن جائے گا۔ میں نے اسے اکسانے کا سلسلہ جاری رکھا اور سرد آہ بھر کر بولا۔ "اوشا، تیرا یہ روپ اور تیری یہ جوانی یہیں جنگل میں مٹی میں مل جائے گی۔ ذرا دیکھ تیرے ہاتھ اور پیروں کی نرمی خراب ہو رہی ہے۔ ابھی تو تیری جوانی کی عمر ہے، چند سال بعد یہ جنگل تجھے کھانا شروع کر دے گا۔"

اس نے بے ساختہ اپنے ہاتھ پاؤں چیک کئے اور پھر درشتی سے بولی۔ "بک بک نہ کر۔ کچھ نہیں ہوا ہے مجھے اور نہ ہوگا۔" وہ اپنی جگہ جا کر لیٹ گئی۔

"جیسے تیرے باپو کو کچھ نہیں ہوا ہے۔" میں نے طنزاً ہنس کر کہا۔

اس نے کروٹ لی اور کچھ دیر میں سو گئی۔ اس کے مدھم خراٹے سنائی دینے لگے تھے۔ میں غور کرنے لگا۔ اس بار میں عجیب طریقے سے پھنسا تھا۔ ایسے تو کبھی مجھے مرشد علی، ڈیوڈ شا اور فتح خان نے بھی گرفتار نہیں کیا تھا جیسا کہ اس جاہل سپیرے نے کیا تھا۔ میں ہاتھ پاؤں آزاد ہوتے ہوئے بھی ان کا قیدی تھا اور اپنی مرضی سے اپنی ایک انگلی بھی نہیں ہلا سکتا تھا۔ اس خبیث شخص نے مجھے علاج کے نام پر نہ جانے کیا چیزیں کھلائی تھیں جن سے میرا جسم مفلوج ہو گیا تھا۔ اوشا بے خیالی میں اعتراف کر گئی تھی کہ ابھی سندھو کے کام کی تکمیل میں دو تین دن باقی تھے۔ اس کے بعد ہی میرا فالج ختم ہو سکتا تھا۔ وہ کام کیا تھا، خاصی مغز ماری کے بعد بھی میں سمجھنے سے قاصر رہا تھا۔

میں نے بہتر سمجھا کہ سندھو کا مقصد جاننے کے بجائے اس پر توجہ مرکوز کروں کہ میں ان سے کیسے چھٹکارا حاصل کر سکتا تھا۔ ایک بات تو طے تھی، سندھو مجھے جو سبز سوپ پلا رہا تھا وہی میری اس حالت کا ذمے دار تھا۔ لہٰذا میں نے اب وہ سوپ کسی صورت نہیں پینا تھا۔ مصیبت یہ تھی کہ میں قطعی بے بس تھا۔ اگر میں انکار کرتا تو وہ سوپ زبردستی بھی پلا سکتا تھا اس لئے مجھے کوئی ایسا ڈراما کرنا تھا کہ وہ مجھے سوپ پلانے سے باز رہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ مجھے دن میں کتنی بار سوپ پلایا جاتا تھا۔ اگر اس نے صبح بھی مجھے پلانے کی کوشش کی تو میں کیا کروں گا۔ غور و فکر کرتے کرتے نہ جانے کب مجھے نیند آ گئی۔ اب کے میری آنکھ کھلی تو باہر اجالا پھیلا ہوا تھا اور اوشا غائب تھی۔ باہر برتنوں کے کھنکنے کی آواز بتا رہی تھی کہ کھانا بننے کا عمل جاری تھا۔ میرے لئے جو سوپ آیا تھا وہ پکا ہوا نہیں بلکہ کونڈی میں پیس کر تیار کیا گیا تھا۔ مجھے یاد آیا جب سندھو سوپ لے کر آیا تھا تو اس سے پہلے باہر کونڈی میں گھوٹنا

چلانے کی آواز آ رہی تھی اور فی الحال ایسی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اوشا نے اندر جھانکا اور میری کھلی آنکھیں دیکھ کر جیسے اڑتی ہوئی آئی تھی۔ اس کی بے تابی کا انداز اتنا خوف ناک تھا کہ میں بوکھلا گیا اور مجھے گزشتہ رات کا تجربہ یاد آنے لگا۔ "یہ کیا کر رہی ہو، ابھی سندھو آ جائے گا۔"

"باپو صبح سویرے چلا جاتا ہے، اب وہ دوپہر کو آئے گا۔" اس نے ہانپتی سانسوں کے ساتھ کہا۔ "تُو نے مجھ پر جادو کر دیا ہے رے۔"

"بدبختی ہے میری۔" میں نے دل میں کہا اور اس سے پوچھا۔ "کیا مجھے جڑی بوٹیوں والا سوپ نہیں ملے گا؟"

"سوپ!" اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"وہ جو تیرا باپو مجھے کل شام پلا رہا تھا۔"

"اچھا۔۔۔۔۔ وہ شام کو ملے گا۔" اس نے کہا۔

اس سے پہلے کہ وہ پھر اپنا کام شروع کرتی، میں نے جلدی سے پوچھا۔ "بس مجھے پورے دن رات میں صرف یہی کھانے اور پینے کو دیا جاتا ہے؟"

"تُو میرے باپو کو نہیں جانتا۔" اس کے لہجے میں فخر تھا۔ "وہ جڑی بوٹیوں کا ماہر ہے۔ تجھے جو چیز بنا کر کھلاتا ہے، اس سے تجھے پورے دن اور رات بھوک پیاس نہیں لگتی۔ سچی بتا، تجھے لگتی ہے؟"

"نہیں۔" میں نے اعتراف کیا اور پھر جھجکتے ہوئے اس سے رفع حاجت کے بارے میں پوچھا۔

"جب تک تو باپو کا یہ کھانا کھائے گا، تجھے اس کا چکر بھی نہیں ہوگا۔" اس نے اطمینان سے کہا لیکن مجھے تشویش لاحق ہو گئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ فطری کام میں رکاوٹ کسی طور درست کام نہیں ہے اور میں نے چار دن سے رفع حاجت نہیں کی تھی۔ اس بدبخت سندھو کا مقصد پورا ہو جاتا مگر میرے گردوں اور آنتوں پر اس کے کیا اثرات پڑتے، یہ کہنا دشوار تھا۔

"مم۔۔۔۔۔ میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔" میں نے اچانک کہا۔ شاید اسے خود سے دور رکھنے کے لئے مجھے یہی بہانہ سوجھا تھا مگر اس سے مجھے بعد میں ایک آئیڈیا آیا۔ وہ گھبرا کر مجھ سے دور ہوئی۔

"کیا زیادہ درد ہو رہا ہے؟"

"پتا نہیں، پیٹ میں اچانک ٹیس سی اٹھی ہے اور بڑھ رہی ہے۔" میں نے دردناک لہجے میں کہا اور کوشش کی کہ چہرے کے تاثرات لہجے سے ہم آہنگ نظر آئیں۔

"باپو بھی نہیں ہے۔" اس نے پریشانی سے کہا۔ "تجھے پانی لا کر دوں؟"

"ہاں، پانی پلا!" میں نے کراہنا شروع کر دیا۔ پانی سے مجھے خیال آیا۔ جڑی بوٹیوں والے سوپ میں کوئی ایسی شے شامل تھی جس نے میری پیاس ختم کر دی تھی ورنہ یہ تو ممکن تھا کہ انسان بھوک نہ محسوس کرے مگر پیاس تو لازمی لگتی تھی۔ جسم کو پانی پوری مقدار میں درکار ہوتا ہے اور جسم کے کل پانی میں صرف دس فی صد کی کمی ہو جائے تو انسان کی جان خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ اوشا بڑے سے مٹی کے کٹورے میں پانی لائی۔ "باپو نے تجھے پانی دینے سے منع کیا ہے، پر۔۔۔۔۔"

"میرے پیٹ میں بہت درد ہو رہا ہے۔" میں نے دل میں باپو کو ایک نا قابلِ بیان لقب سے نواز کر کہا۔
"باپو کو مت بتانا کہ مجھے پانی دیا تھا۔"

میں نے غٹاغٹ پانی پیا اور فی الحال اخراج کے مسئلے کو بھی ذہن سے نکال دیا۔ پتلون میری جان سے ...ہ کر نہیں تھی۔ اس کے بعد میں آنکھیں بند کر کراہتا رہا پھر میں نے ظاہر کیا کہ مجھے ذرا سکون مل رہا ہے۔ "اب ...درد کم ہے پر نیند آ رہی ہے۔"

"تم سو جاؤ!" اس نے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو مجھے ذرا تعجب ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے چھوڑ کر جانے کے لئے تیار نہیں ہوگی۔ اس کے انداز میں شروع میں کچھ ایسی ہی بے تابی تھی مگر میرے درد نے اس کے گرم جذبات کو دیکھتے ہی دیکھتے سرد کر دیا تھا اور وہ میرے لئے کسی محبت کرنے والی عورت کی طرح پریشان ہو رہی تھی۔ میں نے اطمینان کا سانس لے کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ میرے پاس بیٹھی رہی تھی، کبھی میرے ماتھے پر ہاتھ پھیرتی تھی اور کبھی پیٹ سہلاتی تھی۔ میں چاہتا تھا وہ چلی جائے تا کہ میں سکون سے اپنا جسمانی تجزیہ کر سکوں لیکن یہ بات میں اس سے کہنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ میری طرف مائل ہو رہی تھی اور اپنے باپ کے حکم کی کھلی خلاف ورزی کر رہی تھی۔ میں اسے خود برگشتہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

آخر میں نے گہری نیند میں ہونے کا تاثر دیا تو وہ اٹھ کر چلی گئی۔ میں نے اپنی جسمانی حالت پر غور کرنا شروع کیا۔ پیٹ بھر کر پانی پینے کے بعد میرے پیٹ کے نچلے حصے میں کچھ اینٹھن ہو رہی تھی لیکن اسے ناگوار نہیں کہا جا سکتا تھا۔ یہ اینٹھن غالباً اس لئے تھی کہ کئی دن بعد میرے معدے میں پانی گیا تھا۔ میں نے ہاتھ اور پاؤں ہلانے کی کوشش کی۔ ذہن کو جسم پر مرکوز کیا اور بار بار ذہن میں دہراتا رہا۔ "میں اپنے جسم کو ہلا سکتا ہوں، مجھے اپنے جسم پر قابو ہے۔"

یہ ذہنی مشق خاصی دیر جاری رہی حتیٰ کہ میں تھک گیا۔ اگرچہ میرے جسم کے کسی حصے نے حرکت نہیں کی تھی لیکن میں مایوس نہیں تھا۔ ذرا دیر سستانے کے بعد میں نے پھر سے یہ مشق شروع کر دی۔ تیسری بار میں میرے سیدھے ہاتھ نے ذرا سی حرکت کی۔ میرا دل بے ساختہ دھڑکا۔ یہ سچ مچ کی حرکت تھی یا میرے ذہن نے اسے خیالی طور پر محسوس کیا تھا۔ میں نے پھر کوشش کی۔ اس بار ہاتھ نے واضح طور پر حرکت کی، اس کی حرکت میں نے اپنے پاؤں پر محسوس کی تھی۔ یک دم ہی میرا حوصلہ جیسے دوگنا ہو گیا تھا۔ میں نے حرکت کو بڑھانے کی کوشش جاری رکھی۔ حتیٰ کہ میں اس ہاتھ سے گرفت کرنے کے قابل ہو گیا تھا۔ میں اپنی پتلون کو پکڑ سکتا تھا۔ شاید یہ پانی ہی کی وجہ سے تھا جو میں ٹھیک ہو رہا تھا۔ اس کے بعد میں نے پیروں کو حرکت دینے کی کوشش کی۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس کوشش میں کتنی دیر گزر گئی۔ اچانک باہر سے سندھو کے بولنے کی آواز آئی۔ وہ اوشا سے میرے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ اوشا نے اسے بتایا۔ "اس کے پیٹ میں درد ہو رہا تھا، پر اب آرام سے سو رہا ہے۔"

"درد!" سندھو کے لہجے میں تشویش تھی۔ "کیسا درد؟"

"پتا نہیں باپو! بس اچانک ہوا۔ چہرے سے لگ رہا تھا کہ بہت ہو رہا ہے۔"

"تو نے اسے پانی تو نہیں دیا تھا؟"

"نہیں باپو! پر اس نے مانگا بھی نہیں، اسے پیاس نہیں لگ رہی تھی۔"

''پانی دینا بھی مت ورنہ سب ختم ہو جائے گا۔'' وہ بولا اور اندر آیا، اس نے پردہ ہٹایا اور میں نے جلد سے آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے آتے ہی میرا پیٹ ٹٹولا۔ میں نے عضلات سخت کر لئے تھے۔ پھر وہ باہر چلا گم

''تُو نے اسے پانی تو نہیں دیا اوشا، سچ بتا۔''

''نہیں باپو! تیری سوگند!'' وہ صاف مکر گئی۔

''مجھے لگ رہا ہے اس نے پانی پیا ہے۔ میری ساری تپسیا بھنگ ہو جائے گی۔''

''باپو...... وہ بے چارہ تو اپنی انگلی نہیں ہلا سکتا۔'' اوشا کی شوخ آواز آئی۔ پانی کیسے پیئے گا۔ ادھر سے کو جانور تو آ کر دینے سے رہا۔''

''اچھا، میں کھانا کھا کر پھر جاؤں گا۔ آج پوری بوٹیاں نہیں ملی ہیں۔ بس دو دن کی بات ہے اور پھر م کام سپھل جائے گا۔''

سندھو ایک گھنٹے بعد چلا گیا تھا۔ اس کے جاتے ہی اوشا تیزی سے اندر آئی۔ میں تیار تھا۔ میں نے کر، ناک صورت بنائی اور اسے دیکھتے ہی کہا۔ ''پھر سے درد ہو رہا ہے۔''

''میں کیا کروں تیرے لئے رے!'' اس نے پریشان ہو کر مجھے دیکھا۔

''پانی...... پانی پلا دے۔''

''ابھی تو اتنا پانی پلایا تھا۔'' اس نے مزاحمت کی شاید اسے باپ کے حکم کا خیال آ رہا تھا۔

میں نے کراہ کر کہا۔ ''میں مر جاؤں گا۔ ایسا لگ رہا ہے میرے پیٹ میں کوئی چیز ہے جو اندر سے کھر رہی ہے، خدا کے لئے پانی دو۔''

اوشا تیار نہیں تھی مگر میری اداکاری دیکھ کر قائل ہو گئی۔ اس نے پھر مجھے مٹی کے کٹورے میں پانی بھر پلایا۔ جب اس نے پہلی بار پانی پلایا تھا تو مجھے ہلکی سی سردی لگنے لگی تھی۔ دوسری بار پانی پینے پر سردی لگنے احساس بڑھ گیا اور اس کے ساتھ ہی مجھے ناف پر دباؤ محسوس ہونے لگا۔ انگریزی میں اسے کال آف نیچر فطرت کی پکار کہتے ہیں۔ میں نے جھجکتے ہوئے اوشا سے کہہ دیا کہ میں کیا محسوس کر رہا تھا، وہ بھی جھینپ گئی ا اس نے کہا۔ ''ذرا رک، میں کچھ کرتی ہوں۔''

وہ باہر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک برتن تھا۔ اس کے بعد کا مرحلہ ہم دونوں کے لئے خاصا دشوار ثابت ہوا تھا۔ بہرحال جیسے تیسے اس مرحلے سے بھی گزر گئے۔ اس کے جانے کے بعد میں نے خاص سکون محسوس کیا تھا۔ پیٹ پر دباؤ کم ہوا تھا اور میں نے پھر سے جسم کو حرکت دینے کی سعی شروع کر دی۔ میں محسوس کیا کہ پانی پینے اور پھر اسے خارج کرنے کے بعد سے میری بے حسی کم ہوئی تھی اور اس وقت میری خوا کی انتہا نہ رہی جب میں نے اپنا پاؤں ہلانے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ میرا جوش اور حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ اگلا گھنٹے تک میں یہی کام کرتا رہا۔ جب اوشا آتی تو سوتا بن جاتا یا کراہنا شروع کر دیتا تھا۔ اسے مجبور کر کے م نے ایک بار پھر پانی پیا۔ البتہ مقدار کم رکھی تھی کہ اخراج کا مسئلہ نہ ہو۔ سندھو آنے والا تھا اور میں کسی صورت نہ چاہتا تھا کہ اسے اصل بات کا پتا چلے۔ دوسرا فیصلہ میں نے یہ کیا کہ کسی صورت اس کا بنایا ہوا سوپ حلق سے نہ اتاروں گا۔ سندھو شام کے قریب آیا تھا۔ اس وقت تک مجھے اچھی خاصی سردی لگنے لگی تھی اور مجھے لگ رہا تھا کہ

میرے رونگٹے کھڑے ہو رہے ہیں۔ یہ سردی کا اثر تھا۔ سندھو نے اندر آ کر چراغ جلایا۔ اسے دیکھتے ہی میں نے کراہنا شروع کر دیا۔ "میرے پیٹ میں تکلیف ہو رہی ہے۔" میں نے اسے آگاہ کیا۔

"تُو ابھی بوٹیوں والا بھوجن کرے گا تو بالکل ٹھیک ہو جائے گا مہاراج!" اس نے عیاری سے کہا۔

"نہیں، میں کچھ نہیں کھاؤں گا۔" میں نے درد بھرے لہجے میں کہا۔

"اس سے تیرے پیٹ کا درد ٹھیک ہو جائے گا۔ میں ابھی تیار کر کے لاتا ہوں۔" اس نے کہا اور باہر چلا گیا۔ اب میں نے بلند آواز سے کراہنا شروع کر دیا تھا۔ ساتھ ہی میں محسوس کر رہا تھا کہ میرے ہاتھ پیروں میں جان آ رہی ہے۔ گزشتہ شام کھائی بوٹیوں کا اثر ختم ہو رہا تھا۔ اگر میں کسی طرح سے اس خبیث کو روک دیتا تو شاید صبح تک میرے جسم میں اتنی جان آ جاتی کہ میں خالی ہاتھوں بھی اس سے نمٹ سکتا تھا۔ باہر کونڈی اور گھوٹنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے کوشش کر کے بائیں ہاتھ کو بھی حرکت دینا شروع کر دی تھی۔ جیسے ہی گھٹنے کی آواز بند ہوئی، میں نے اس طرح چلانا شروع کر دیا ہے جیسے کوئی مجھے کند چھری سے ذبح کر رہا ہو۔ سندھو اور اوشا لپک کر اندر آئے۔ "تجھے کیا ہوا ہے رے!" اوشا نے بے قراری سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"میں مر رہا ہوں...... میرے پیٹ میں کچھ ہو گیا ہے۔"

میری اداکاری اتنی مکمل ضرور تھی کہ اوشا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے مگر اس کا باپ ایک نمبر کا گھاگ اور مکار تھا۔ اس نے میری نبض دیکھی پھر پیٹ پر کان لگا کر سنا۔ "یہ ٹھیک ہے۔ اسے کچھ نہیں ہوا ہے۔"

میں نے اس طرح ہچکی لی جیسے یہ میری آخری ہچکی ہو۔ اوشا نے برہم ہو کر باپ سے کہا۔ "اسے اتنی تکلیف ہو رہی ہے اور تُو کہہ رہا ہے یہ ٹھیک ہے۔"

"اس کی نبض اور پیٹ ٹھیک ہے۔" سندھو نے پریشانی سے کہا۔

"تو کیا یہ ناٹک کر رہا ہے؟ اسے کیا جرورت ہے ایسا کرنے کی؟"

"تُو نہیں سمجھے گی جا کر پیالہ بنا کر لا۔" سندھو نے جھنجلا کر کہا۔ "ابھی پیئے گا تو ٹھیک ہو جائے گا۔"

"میں نہیں پیوں گا۔" میں نے نیم بے ہوشی کے سے انداز میں کہا۔ "میں مر جاؤں گا۔"

"باپو یہ......" اوشا نے کہنا شروع کیا۔

"دفع ہو جا حرامجادی!" سندھو چلایا۔ "جو کہا ہے وہ کر۔"

اوشا کچھ دیر اسے گھورتی رہی تھی پھر ایک جھٹکے سے باہر چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی سندھو نے مجھ پر جھک کر آہستہ سے کہا۔ "مہاراج! ناٹک مت کرو، تمہیں کچھ نہیں ہوا ہے۔"

"میں مر...... رہا ہوں۔" میں نے ڈوبتے لہجے میں کہا اور دانستہ سختی سے دانت بھینچتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔

"اوئے...... مہاراج! ہوش کر کیا ہوا ہے تجھے...... ارے جندہ بھی ہے یا مر گیا؟"

اوشا پیالہ لے کر اندر آ رہی تھی، اس نے باپ کی بات سنی تو چیخ ماری۔ "ارے مر گیا......" اس کے ہاتھ سے پیالہ گر گیا۔

"حرامجادی!" سندھو دہاڑا۔ "یہ کیا، کیا؟"

''باپو...... یہ مر گیا ہے؟'' اوشا لرزتی آواز میں بولی۔
''نہیں مرا ہے تیرا خصم۔ تُو نے پیالہ برباد کر دیا۔ اتنی مشکل سے بُوٹیاں مِلی تھیں۔'' اس نے اوشا کو تھپڑ مارا۔ اوشا نیچے گری تھی مگر اس نے تھپڑ کا ذرا بھی اثر نہیں لیا، اس کے بجائے خوش ہو کر بولی۔
''جیتا ہے...... ہے بھگوان!'' اس نے تشکر آمیز انداز میں کہا۔ ''میں تو ڈر گئی تھی۔''
''جندہ ہے...... حرامجادہ!'' سندھو نے اوشا کو دوسرا تھپڑ رسید کیا اور پاؤں پٹختا جھونپڑی سے چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی اوشا لپک کر میرے پاس آئی تھی۔
''تُو ٹھیک ہے رے؟''
میں نے آنکھیں کھولنے سے گریز کیا۔ باپ سے بمشکل جان چھوٹی تھی۔ اب میں اسے سر پر سوار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ کچھ دیر اپنی بے قراریوں کا اظہار کرتی رہی تھی، پھر باپ سے لڑنے چلی گئی کیونکہ چند لمحے بعد دونوں کی اونچی آواز سے بولنے کی آوازیں آئی تھیں پھر اوشا رونے لگی شاید اس بار سندھو نے اسے زیادہ ہی مارا تھا۔ وہ اندر آیا اور میرے پاس آ کر کسی ناگ کی طرح پھنکارا۔ ''کر لے مکاری...... پر یہ جیادہ دیر نہیں چلے گی۔''
اسے شبہ تھا کہ میں مکر کر رہا ہوں کیونکہ میری نبض درست تھی اور پیٹ بھی ٹھیک تھا۔ وہ پرانا پاپی تھا۔ اسے دھوکا نہیں دے سکتا تھا۔ وہ دو باتوں سے مجبور ہو گیا تھا، ایک تو اپنی اکلوتی بیٹی کے ہاتھوں اور دوسرے پیالے کے ضائع ہونے کی وجہ سے۔ اب اس کے پاس اتنی بوٹیاں نہیں تھیں کہ پھر سے میرے لئے ہرا سوپ تیار کر سکتا مگر مجھے خدشہ تھا کہ وہ کوئی اور بھی چکر چلا سکتا تھا، مجھے مفلوج رکھنے کے لئے وہ کوئی اور حربہ استعمال کر سکتا تھا۔ میرا یہ اندیشہ بعد میں درست ثابت ہوا۔ فی الحال میں بالکل ساکت تھا کیونکہ مجھے اندیشہ تھا، سندھو چھپ کر میری نگرانی نہ کر رہا ہو تاکہ مجھے حرکت کرتے دیکھ کر رنگے ہاتھوں پکڑ لے۔
رات ہوتے ہی سردی کی شدت میں اچانک اضافہ ہوا تھا اور میں خاصی ٹھنڈک محسوس کر رہا تھا اور اصل میں جڑی بوٹیوں کی طاری کی ہوئی بے حسی ختم ہو رہی تھی ورنہ سردی تو پہلے بھی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اوشا نے غلط کہا تھا کہ مجھے سانپ کا گوشت کھلایا گیا تھا جس کے اثر سے میں سردی محسوس نہیں کر رہا تھا۔ میں نے اطمینان محسوس کیا تھا ورنہ جب سے سانپ کا گوشت کھانے کا سنا تھا، اندر سے عجیب سی بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔ میں سردی برداشت کرتے ہوئے خود کو کانپنے سے روک رہا تھا ورنہ یہ کپکپی بھی بھانڈا پھوڑ سکتی تھی۔ اوشا حسبِ معمول سونے کے لئے اندر آئی۔ اب میں نے دانت وغیرہ ڈھیلے چھوڑ دیئے تھے اور ہلکے ہلکے منہ اور آنکھیں ہلا رہا تھا۔ جیسے ہوش میں آنے والا ہوں۔ اوشا قریب آئی اور آہستہ سے پکارا۔ ''اے...... تُو ہوش میں ہے؟''
میں نے اب تک ان باپ بیٹی کو اپنا نام نہیں بتایا تھا اور نہ ہی انہوں نے پوچھا تھا۔ دونوں باپ بیٹی مجھے اپنے مطلب کے لئے استعمال کرنا چاہ رہے تھے۔ ان کو میرے نام سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میں نے اوشا کی آواز پر ہولے ہولے کراہنا شروع کر دیا اور پھر نیم غشی کے عالم میں بولا۔ ''پانی...... پانی!''
''پانی!'' اوشا کا دم خشک ہو گیا تھا۔ ''باہر باپو ہے رے!''
''پانی...... پانی!'' میں نے سبق کو دہرایا۔
''تو مروائے گا رے! ابھی باپو نے اتنا مارا ہے۔''

میری بلا سے باپو اسے پرلوک روانہ کر دیتا۔ مجھے اپنا مطلب نکالنا تھا لہٰذا میں نے ہوش میں آئے بغیر نہایت دردناک طریقے سے کراہنا شروع کر دیا تھا۔ اس کا خاطرخواہ نتیجہ نکلا۔ کالی حسینہ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر میرے لئے پانی لانے کے لئے چلی گئی۔ اس کا احساس مجھے اس کے جانے کے بعد ہوا، میں نے جلد بازی کی تھی۔ سندھو جاگ رہا تھا، اس جیسے شاطر آدمی کو دھوکا دینا مشکل تھا خاص طور سے جب دھوکا خود اس کی بیٹی دے رہی ہو۔ یہی کام میں اسے اس وقت کہتا جب سندھو سو چکا ہوتا تو مسئلہ نہیں بنتا۔ وہ پندرہ بیس منٹ بعد کٹورے سمیت نمودار ہوئی تھی۔ ابھی اس نے کٹورہ میرے لبوں سے لگایا تھا کہ غصے سے پھنکارتا سندھو اندر آیا۔ اس نے ایک ہاتھ کٹورے پر مارا، اس کا سارا پانی مجھ پر اور کھاٹ پر پھیل گیا اور کٹورا اُڑ کر دیوار سے جا لگا۔ دوسرا ہاتھ اس نے اوشا کو مارا۔ ''حرامجادی! مجھے پہلے ہی شک تھا تُو اسے پانی دے رہی ہے۔''

''باپو...... بس ابھی دیا ہے۔'' اس نے سہمے ہوئے انداز میں کہا۔ ''تیری سوگند!''

''چپ...... حرام جادی!'' اس نے اوشا کو اپنا سوکھا اور سخت ہاتھ اتنی پھرتی سے مارا کہ وہ بچنے میں ناکام رہی۔ پھر وہ باہر گیا تھا، میں نے اوشا سے کہا۔

''بھاگ جا...... ورنہ ابھی تیری شامت آئے گی۔''

''بھاگ کر کہاں جاؤں گی؟'' اس نے افسردگی سے کہا۔

''کہیں بھی جا، جا کر جھاڑیوں، درختوں میں چھپ جا۔''

''مجھے ڈر لگے ہے۔'' اس نے انکار کیا اور میری کوشش کے باوجود اس پر قائم رہی۔ سندھو کو ایک چھڑی کے ساتھ اندر آتے دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ اب اس کی خیر نہیں تھی۔

''سندھو! اس کا قصور نہیں ہے، میں نے مجبور کیا تھا اسے۔''

''تُو چپ کر!'' اس نے شرربار لہجے میں کہا اور گھما کر اوشا کو چھڑی ماری۔ وہ چیخ مار کر زمین پر گری اور گول مول ہو کر چہرہ اور بازو چھپا لئے۔ سندھو نے چھڑی اس کی پشت پر برسانی شروع کر دی۔ ہر وار پر وہ کرب سے بل کھاتی تھی۔ اس کی چیخ اندر ہی اندر گھٹ رہی تھی۔ میں برداشت نہیں کر سکا اور میں نے چلا کر کہا۔

''سندھو، یہ تیری بیٹی ہے۔''

''پر تجھے زیادہ دکھ لگ رہا ہے۔'' اس نے زہریلے لہجے میں کہا اور پھر سے اوشا پر وار کرنے لگا۔ عقب سے اوشا کی پشت برہنہ تھی، اس پر چھڑی کے وار سے نشان بن گئے تھے۔ سندھو نے اسے اتنی بار مارا کہ پوری پشت پر لکیروں کا جال بن گیا تھا۔ میں چیخ رہا تھا، اسے گالیاں اور دھمکیاں دے رہا تھا۔ مگر وہ رکا نہیں، اس کا ہاتھ اس وقت رکا جب اوشا بے سدھ ہو گئی اور اس کا جسم زمین پر بکھر گیا۔

''تم نے مار دیا اسے!'' میں نے کہا، اسی لمحے میرے اندر تحریک سی ہوئی اور میں اٹھ بیٹھا تھا۔ سندھو بری طرح چونکا، پھر تیزی سے لپک کر اس نے مجھے دھکا دے کر لٹا دیا۔ میں حوصلہ کر کے اٹھ بیٹھا تھا لیکن مجھ میں طاقت نہیں تھی اس لئے میں بہ آسانی دوبارہ کھاٹ پر دراز ہو گیا۔

''یہ سارا اس کا قصور ہے۔ اس نے تجھے پانی دیا تھا تب ہی تُو حرکت کر رہا ہے۔''

''خبیث...... کتے...... تُو اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو گا۔'' میں نے مزاحمت کی۔ میں نے محسوس کیا

تھا کہ غصہ کرنے سے میرے اندر طاقت آرہی تھی۔ یہ بات غالباً وہ بھی سمجھتا تھا۔ اس لئے اس نے کہیں سے ایک عدد رسی برآمد کی اور مجھے کھاٹ کے ساتھ باندھنے لگا۔ میں مزاحمت کے قابل نہیں تھا اس لئے بے بسی سے بندھتا رہا، میری ذرا سی حماقت نے صورتِ حال کو مکمل طور پر میرے خلاف کر دیا تھا۔ سندھو جان گیا تھا کہ میں اس کی چال سے واقف ہو گیا ہوں۔

"من تو کرتا ہے تجھے شیش ناگ سے ڈسوا دوں۔" اس نے دانت پیسے اور ایک پٹاری اٹھا کر دکھائی۔ حرکت سے اس میں موجود سانپ نے پھنکار ماری تھی۔ "پر ابھی نہیں، ابھی مجھے تیرا اور خون چاہئے۔"

میرا خون خشک ہو گیا تھا۔ "میرا خون...... وہ کیوں؟"

"میں اس سے دوا بناؤں گا۔ سارے سانپوں کے زہر کا توڑ۔ اسے لوگ منہ مانگے دام پر خریدتے ہیں، ایک ایک رتی کا ہزار روپیا دیتے ہیں۔"

"اس کے لئے تم میرا خون نکال رہے ہو؟" میں چلایا۔ "حرام زادے!"

"توڑ تیرے خون سے بنتا ہے۔ رک جا، میں تجھے دکھاتا ہوں۔ کل تیرا پیالہ بھر خون لیا تھا اس سے تین چار رتی نکلا ہے۔" وہ جھونپڑی کے ایک گوشے کی طرف بڑھا۔ میں جانتا تھا کہ سانپ کے زہر کا تریاق اصل میں خون سے بنتا ہے۔ سانپ کا زہر ہلکا کر کے گھوڑے کو انجیکٹ کرتے ہیں۔ گھوڑے میں زہر برداشت کرنے کی طاقت ہوتی ہے۔ چند مہینے بعد گھوڑے کا خون نکال کر اسے مخصوص طریقے سے جمایا جاتا ہے جس سے ایک زرد رنگ کا مادہ نکلتا ہے اور یہی تریاق ہوتا ہے۔ ممکن ہے اب تریاق لیبارٹریز میں جدید طریقے سے بنائے جا رہے ہوں۔ یہ خبیث سپیرا گھوڑے کی جگہ مجھے استعمال کر رہا تھا۔ میرے خون سے بننے والا تریاق بقول اس کے ہر سانپ کے کاٹے کا توڑ ہوگا۔ وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک شیشی تھی جس میں زردی مائل سیال تیر رہا تھا۔

"یہ چار پانچ ہزار کا ہے۔ امیر زمیندار شوق سے لیتے ہیں۔ ان کو یا ان کے کسی رشتے دار کو سانپ کاٹے تو یہ توڑ اس کی جان بچا لیتا ہے۔"

"ابھی تم میرے جسم سے اور خون لو گے؟" میں نے پوچھا۔ خوف سے میرے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔ "مجھ سے پہلے بھی تم نے اور لوگوں سے یہ سلوک کیا ہے؟"

اس نے سر ہلایا۔ "دو بندے میں لایا تھا۔ ان کو سانپ سے ڈسوایا مگر وہ تین چار بار ہی خون دے سکے تھے، تُو جاندار ہے، زیادہ بار خون دے سکے گا۔"

"ان دونوں کا کیا ہوا؟"

"تیرا کیا خیال ہے؟" وہ مسکرایا۔

"تم نے ان کا خون نچوڑ کر ان کو مار دیا؟"

وہ کائیاں آدمی تھا صرف مسکراتا رہا۔ اس نے زبان سے اقرار نہیں کیا البتہ یہ واضح تھا، وہ اس وقت تک میرے جسم سے خون نکالنے کا سلسلہ جاری رکھے گا جب تک جسم سے میری جان نہیں نکل جاتی۔ پہلے وہ مجھے دوا کی مدد سے مفلوج رکھے ہوئے تھا اور اب جبکہ اس کا بھید کھل گیا تھا تو اس نے رسی کی مدد سے مجھے باندھ دیا تھا۔

"اس کے ساتھ کیا کرو گے؟" میں نے آنکھوں سے اوشا کی طرف اشارہ کیا۔

"اس کی فکر مت کر، یہ مرے گی نہیں۔ ابھی مرہم لگا دوں گا تو صبح تک ٹھیک ہو جائے گی۔" اُس نے بے پروائی سے کہا۔ اس نے تریاق والی شیشی واپس رکھ دی تھی اور ایک جھولے سے اس نے شیشے کا مرتبان نکالا جس میں کوئی سیاہ چمک دار شے بھری ہوئی تھی۔ اس نے اوشا کو چٹائی پر اوندھے منہ لٹا دیا اور مرتبان سے یہ سیاہ شے نکال کر اس کی پشت پر ملنے لگا۔ پھر اس نے مرتبان واپس جھولے میں رکھا اور باہر چلا گیا۔ اوشا کی پشت کو اس نے یونہی کھلا چھوڑ دیا تھا۔ وہ بہت سفاک اور بے رحم قسم کا شخص تھا۔ اس نے اپنی اکلوتی بیٹی کے ساتھ یہ سلوک کیا تھا۔ مجھے ذرا بھی شبہ نہیں تھا کہ اس نے جن دو افراد کے جسموں سے خون نکالا تھا ان کو مار کر اس جنگل میں ہی کہیں دفنا دیا ہو گا۔ میں ہاتھ پیروں کو معمولی طور پر ہلا سکتا تھا مگر اس نے رسی سے باندھ کر میری یہ محدود حرکت بھی روک دی تھی۔ اگر میں مکمل طور پر فٹ ہوتا تو تب بھی اس رسی کو نہیں کھول سکتا تھا، توڑنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پتا نہیں وہ اوشا کے ساتھ کیا کرے گا؟ میرے جسم پر اور کھاٹ پر پانی گرا تھا۔ شروع میں تو مجھے اتنا محسوس نہیں ہوا تھا، میں غصے میں تھا اور ذہنی طور پر مصروف تھا مگر اب سردی اس پانی کی وجہ سے مزاج پوچھ رہی تھی، دوا کا اثر زائل ہونے کی وجہ سے سردی لگ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد میں نے باقاعدہ لرزنا شروع کر دیا۔ میں نے چلا کر سندھو کو آواز دی۔

"سندھو! مجھے میرے کپڑے دو، مجھے سردی لگ رہی ہے۔"

وہ اندر آیا۔ "کچھ سزا تجھے بھی تو ملنا چاہئے، ایسے ہی پڑا رہ۔"

"مجھے بہت سردی لگ رہی ہے۔ صبح تک میں بیمار ہو جاؤں گا اور شاید تم پھر میرے خون سے تریاق حاصل نہ کر سکو۔"

اس کے مکروہ چہرے پر تشویش پھیل گئی تھی۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا، پھر اس نے میری جیکٹ لا کر مجھ پر ڈال دی اور اس کے بعد لوہے کی بنی ایک انگیٹھی لے کر آیا، اس میں لکڑی کا کوئلہ بھرا اور اسے آگ دکھا دی، کوئلے اچھی طرح خشک تھے اور مٹی کا تیل ڈالنے سے فوراً اچھی طرح جل اٹھے تھے، ان سے معمولی سا دھواں اٹھا تھا۔ اس نے انگیٹھی کھاٹ کے بالکل پاس رکھ دی۔

"لگتا ہے تمہیں اپنی اولاد سے زیادہ پیسے سے پیار ہے۔" میں نے طنز کیا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اپنی لڑکی کو تم نے ایسے ہی ڈال رکھا ہے اور مجھے کیونکہ خون حاصل کرنے کے لئے زندہ رکھنا چاہتے ہو جس سے تم پیسے کماؤ گے اس لئے میرا اتنا خیال رکھ رہے ہو؟"

"اسے کچھ نہیں ہو گا۔ ہم بہت سخت جان ہوتے ہیں، پر تُو صبح تک بیمار ہو جائے گا۔"

جیکٹ اوڑھنے اور نزدیک انگیٹھی جلنے سے مجھے سکون ملا تھا اور گیلے بستر کی تکلیف کم ہو گئی تھی۔ کم سے کم میں لرز نہیں رہا تھا۔ کچھ دیر بعد مجھے نیند آ گئی۔ ساری رات میں پُرسکون نیند سوتا رہا تھا، یہ تعجب کی بات تھی، حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں، مجھے نیند ہمیشہ پُرسکون آتی تھی۔ میری آنکھ صبح سویرے کھلی تھی، ابھی سورج نہیں نکلا تھا اور انگیٹھی کے انگارے سرد پڑ گئے تھے مگر میرا جسم گرم تھا۔ اوشا ایسے ہی اوندھے منہ پڑی تھی۔ میں نے کھاٹ کی رسیوں تلے حرکت کرنے کی کوشش کی مگر سندھو نے مجھے بہت کس کر باندھا تھا۔ میں زیادہ سے زیادہ

اپنی انگلیوں کو جنبش دے سکتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے جسم کی بے حسی خاصی حد تک کم ہوگئی تھی۔ اگر کوئی رسی کھول دیتا تو میں حرکت کر سکتا تھا اور شاید چل پھر بھی سکتا تھا۔ مگر مجھے آزاد کون کرتا۔ میں نے اوشا کی طرف دیکھا۔ اب تک اس کی بے ہوشی ختم ہو جانا چاہئے تھی۔

''اوشا!'' میں نے اسے دبی آواز میں پکارا۔ میری کوشش تھی کہ آواز باہر نہ جانے پائے ورنہ اوشا کے بجائے اس کا باپ آ جاتا۔ میری آواز پر اس نے جسم میں حرکت نہیں ہوئی مگر میں نے ہمت نہیں ہاری، آواز بلند کرنے کے بجائے میں اتنی ہی آواز میں پکارتا رہا۔ مجھے یقین تھا وہ ردعمل ظاہر کرے گی، اس کا خواب زدہ ذہن میری آوازیں سن رہا تھا اور وہ رفتہ رفتہ اوشا کو ہوش میں لے آتا۔ چند منٹ بعد اس کے جسم میں پہلی حرکت ہوئی۔ اس نے سر ہلایا۔ اب میں زیادہ تواتر سے اسے آوازیں دے رہا تھا۔ آخر اس نے آنکھیں کھولیں اور کراہی۔ ''اوشا اٹھو...... اس سے پہلے کہ سندھو آ جائے۔ وہ مجھے اور تمہیں مار دے گا۔''

اوشا نے اس بار پوری آنکھیں کھول دیں۔ ''مجھے کیا ہوا ہے، رے۔''

''تمہیں سندھو نے مارا تھا، پھر اس نے تمہیں یونہی چھوڑ دیا۔ اوشا وہ مجھے اور تمہیں مار دے گا۔ تم مجھے کھول دو، ہم یہاں سے بھاگ جاتے ہیں۔''

''کک...... کیسے؟'' اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔

''تم مجھے کھول دو۔ میں تمہیں یہاں سے لے جاؤں گا۔'' میں نے اسے ترغیب دی۔ ''شاباش اٹھو، اوشا! یہ وقت نکل گیا تو پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔''

وہ اٹھی اور ڈولتی، ڈگمگاتی میری طرف آنے لگی۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ کتنی ہی مضبوط سہی، تھی تو نازک سی لڑکی۔ سندھو نے گزشتہ رات اس کے ساتھ جو سلوک کیا تھا اس کی جگہ کوئی عام لڑکی ہوتی تو اب تک بے ہوش پڑی ہوتی۔ وہ کھاٹ پر میرے برابر میں بیٹھ کر گہرے سانس لینے لگی۔

''باپو نے مجھے کیوں مارا تھا رے؟'' اس نے پوچھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے رات کے واقعات یاد نہیں تھے۔

''تُو نے مجھے پانی پلانا چاہا، تیرے باپو نے منع کیا تھا، اس نے دیکھ لیا۔ تجھے مارا اور میں نے تجھے بچانا چاہا تو مجھے باندھ دیا۔''

''ہاں۔'' اسے یاد آ گیا۔ ''باپو نے مجھے چھڑی سے مارا تھا، باپو کہاں ہے؟''

''باہر ہے۔ صبح ہونے والی ہے، مجھے جلدی کھول دے، ورنہ وہ آ جائے گا۔''

اسی لمحے باہر آہٹ ہوئی۔ میں نے اضطراب سے کہا۔ ''اوشا، جا کر واپس لیٹ جا۔ بے ہوش بن جا...... وہ آنے والا ہے۔''

اوشا جلدی سے اٹھی اور جا کر چٹائی پر لیٹ گئی۔ اس کے فوراً بعد سندھو اندر آیا۔ میں بھی آنکھیں بند کر کے سوتا بن گیا تھا۔ اس نے مشکوک نظروں سے مجھے اور اوشا کو دیکھا۔ اوشا کو پاؤں سے ہلکی سی ٹھوکر ماری اور میری بندشوں کا معائنہ کیا کہ میں ٹھیک سے بندھا ہوں پھر اس نے اوشا کی پشت کے زخموں کو دیکھا۔ حیرت انگیز طور پر وہ چند گھنٹوں میں مندمل نظر آنے لگے تھے۔ اس کا مرہم جادو اثر ثابت ہوا تھا۔ حکیم قادس کے مرہم کی طرح۔ اس

نے دوبارہ مرتبان نکال کر اوشا کی پشت پر وہی مرہم لگایا اور باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی اوشا اٹھ بیٹھی۔

"ابھی رک جا، باپو جنگل میں جائے گا پھر میں تجھے کھول دوں گی۔" اس نے کہا لیکن مجھے ایسی کوئی خوش فہمی نہیں تھی کہ باپو اسے آزاد چھوڑ کر جنگل میں چلا جائے گا۔ اسے معلوم تھا کہ اوشا پہلی فرصت میں مجھے آزاد کرا دے گی۔ وہ ایسی حماقت نہیں کر سکتا تھا، اوّل تو وہ کہیں جاتا نہیں اور اگر جاتا تو ایسا بندوبست کر کے جاتا کہ اوشا مجھے آزاد نہ کرا سکے۔

"اوشا، تیری تکلیف کیسی ہے؟"

"تھوڑی سی ہے رے۔" اس نے کہا۔ "پر سر میں دھواں سا بھر رہا ہے۔"

"تو آرام کر۔" میں نے اسے مشورہ دیا۔ "ابھی تیرا باپو کہیں نہیں جائے گا۔"

"تجھے کیسے پتا؟"

"بس پتا ہے، اب لیٹ جا، آرام کر...... اگر ہمیں یہاں سے بھاگنے کا موقع ملا تو جسم میں جان ہونی چاہئے ورنہ کس طرح بھاگیں گے۔"

"اچھا!" اس بار وہ بحث کئے بغیر لیٹ گئی۔

باہر سندھو کھڑ پڑ کر رہا تھا۔ شاید ناشتا بنا رہا تھا۔ مگر کچھ دیر بعد گھوٹنے کی آواز آنے لگی تو میرا دم خشک ہو گیا تھا۔ وہ پھر میرے لئے بوٹیوں کا مہلک سوپ تیار کر رہا تھا۔ اب ضروری ہو گیا تھا کہ میں اوشا سے اپنے ہاتھ پاؤں کھلوالوں ورنہ سندھو زبردستی بھی سوپ میرے حلق میں اتار سکتا تھا۔ میں نے اوشا کو آواز دی۔

"اوشا، اِدھر آؤ۔"

"کیا ہے رے؟" اس نے نقاہت سے کہا۔ "مجھ سے نہیں اٹھا جا رہا ہے۔"

"اوشا، تیرا باپ مجھے زہر دینے کے لئے تیار کر رہا ہے، اس سے پہلے وہ آئے، مجھے کھول دے۔"

"تجھے...... وش!" اس نے حیرت سے کہا۔

"یہ جو میرے لئے دوا بناتا ہے، یہ زہر ہی تو ہے۔ اس کے اثر سے میں مفلوج ہو جاتا ہوں۔"

اوشا نے سر ہلایا اور کوشش کر کے اٹھی۔ اس نے میرے پاس آ کر اپنی کمزور انگلیوں سے رسی کی گرہیں کھولنے کی کوشش کی مگر یہ بے حد مضبوطی سے بندھی تھیں، اس نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ "مجھ سے نہیں کھل رہی۔"

"کوئی چاقو ہے، اس سے کاٹ دے۔ جلدی کر، سندھو آ گیا تو سب ختم ہو جائے گا۔"

سندھو شاید کھلی جگہ گھوٹنا چلا رہا تھا اور دور تھا اس لئے ہم بے خوف وخطر باتیں کر رہے تھے۔ یہ خدشہ نہیں تھا کہ آواز اس تک چلی جائے گی۔ بس یہ خدشہ تھا کہ وہ خود نہ آ جائے۔ اوشا نے سر ہلایا اور کوئی تیز دھار شے تلاش کرنے لگی مگر شاید جھونپڑی میں اس قسم کی کوئی چیز نہیں تھی۔

"چھری ہے...... پر باہر ہے۔" اس نے مجھے آگاہ کیا۔

"میرے کپڑوں میں ایک بڑا سا چاقو تھا وہ کہاں ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم...... باپو نے کہیں رکھا ہوگا۔"

"باہر دیکھ اگر سندھو اس طرف نہیں دیکھ رہا تو جا کر چپکے سے چاقو لے آ۔"

اس وقت اوشا میری ہر بات پر عمل کر رہی تھی یعنی اس نے خود کو میری مرضی پر چھوڑ دیا تھا۔ سندھو کے خلاف اس کے دل میں شاید نفرت بھر چکی تھی۔ اس نے پردہ ہٹا کر باہر جھانکا، پھر بولی۔ "باپو کا منہ جھونپڑی کی طرف ہے۔ میں باہر نکلی تو وہ فوراً دیکھ لے گا۔"

میں نے مایوسی سے چاروں طرف دیکھا۔ ہر طرف تھیلے لٹکے تھے یا جا بجا پٹاریاں تھیں۔ اچانک میری نظر ایک طرف رکھی ماچس پر گئی۔ "اوشا، اس سے رسی جلا دے۔" میں نے ماچس کی طرف اشارہ کیا۔

"تجھے آگ نہ لگ جائے۔" اس کے انداز میں تشویش تھی۔

"احتیاط سے کام کرنا۔" میں نے اسے حوصلہ دیا۔ سچی بات ہے یہ خدشہ میرے ذہن میں بھی تھا، میں بستر سے بندھا تھا اور اس میں آگ لگ جاتی تو میں بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔ جب تک رسی جلتی میں خود بھی جل جاتا ہوتا۔ مگر آزاد ہونے کے لئے میں ہر خطرہ مول لینے کو تیار تھا۔ اوشا ماچس لے آئی پر وہ بھی ڈر رہی تھی، میں نے اسے سمجھایا۔ "ڈرو مت، یہ دیکھو، بستر اور رسی کے درمیان میں خلا ہے۔ اگر آگ لگ بھی جاتی ہے تو تم میری جیکٹ سے مار کر آگ بجھا دینا۔ ڈرنا مت۔"

اس نے سر ہلایا۔ "مجھے ڈر ہے کہیں یہ بستر تیری چتا نہ بن جائے۔"

اندر سے ڈر جانے کے باوجود میں مسکراتا رہا۔ "کچھ نہیں ہوتا، بس تم گھبرانا مت۔"

اوشا نے کھاٹ پر بیٹھ کر پہلی ماچس کی تیلی جلا دی۔ "جب تیری انگلیاں جلنے لگیں تو تیلی پھینک دینا۔ اس کے بعد دوسری جلا لینا۔"

اس نے بہتر تجویز دی۔ "میں دیا کیوں نہ جلا لوں؟"

"یہ ٹھیک رہے گا۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔

اس نے پہلے ماچس سے دیا جلایا۔ اس کا تیل ختم ہو گیا تھا، کپی سے اس میں سرسوں کا تیل ڈالا۔ سرسوں کے تیل سے آگ لگنے کا خطرہ بھی نہیں ہوتا ہے جیسا کہ مٹی کے تیل سے ہوتا ہے، اس نے احتیاط سے رسی جلانا شروع کی، یہ سخت گھاس سے بنی رسی تھی۔ بالکل خشک تھی اس لئے ذرا سی دیر میں اس نے آگ پکڑ لی اور جلتے ہی اس کے بل بلند آواز سے ٹوٹے۔ میں ایک دم ساکت ہو گیا تھا۔ کیا یہ آواز سندھو تک گئی تھی۔ مگر گھوٹنا چلنے کی آواز بدستور آ رہی تھی۔ میں نے سکون کا سانس لیا اور اوشا سے کہا۔ "باقی بل بھی جلا دو۔"

اس نے دیے سے دو بل اور جلائے اور ان کے ٹوٹتے ہی رسی ڈھیلی ہو گئی تھی۔ اوشا نے دیا رکھ کر جلدی سے رسی میں لگنے والی آگ کو بجھایا۔

"اسے کھول دے۔" میں نے سرگوشی میں کہا۔

اسی لمحے گھوٹنا کوٹنے کی آواز رک گئی۔ اوشا گھبرا گئی۔ "باپو آ رہا ہے۔"

"یہ جیکٹ پھیلا دے۔ رسی کے ٹوٹے بل چھپا دے۔" میں نے اسے ہدایت کی۔ "اور فوراً اپنی جگہ لیٹ جا۔"

اوشا نے ایسا ہی کیا، اس نے جیکٹ یوں پھیلائی کہ رسی کے جل جانے والے بل اس کے نیچے چھپ گئے

اور جا کر اپنی جگہ لیٹ گئی تھی۔ میں نے بھی آنکھیں بند کر لیں۔ سندھو کچھ دیر بعد اندر آیا تھا۔

''مردار، اب تک پڑی ہے، اٹھ اوشا!'' اس نے پاؤں سے اوشا کو ہلایا۔

''باپو! نہیں اٹھا جا رہا ہے۔'' اس نے نقاہت سے کہا۔ ''تُو نے بے دردی سے مارا تھا۔''

''معمولی سی مار تھی تجھے سجا بھی تو دینی تھی۔ اب ٹھیک ہے میں نے دوا لگا دی تھی۔ دو تین دن میں بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ اٹھ اور اس کو بھی اٹھا۔ اسے دوا دینی ہے۔''

''اچھا باپو۔'' اوشا نے کہا اور سندھو پھر باہر چلا گیا۔

اوشا لپک کر میرے پاس آئی، اس نے جلدی جلدی رسی کے بل کھولنے شروع کر دیئے۔ وقت نہیں تھا۔ سندھو کسی وقت بھی آ سکتا تھا اور وہ میرے آزاد ہونے سے پہلے آ جاتا تو ہماری ساری جدوجہد رائیگاں جاتی۔ اس بخت نے رسی کو دس بارہ بل دیئے تھے اور اوشا کمزوری کی وجہ سے ان کو جلدی جلدی نہیں اتار پا رہی تھی۔ جیسے ہی میرے ہاتھ آزاد ہوئے، میں اس کی مدد کرنے لگا۔ ''اوشا!'' اچانک باہر سے سندھو کی آواز آئی۔ ''اٹھا دیا اسے؟''

میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا اور یہی کچھ کیفیت اوشا کی بھی ہوئی تھی مگر اس نے حاضر دماغی سے کام لیا اور اچانک جذبات میں ڈوبی آواز میں بولی۔ ''باپو! ابھی اِدھر مت آنا، میں بلا لوں گی۔''

اس نے بے شرمی سے کام لیا تھا لیکن وہ ایسا نہ کرتی تو ہم پکڑے جاتے۔ سندھو بے غیرتی سے ہنسا۔ ''اچھا......اچھا...... پر جیادہ دیر مت کرنا۔''

''اوشا، جلدی کر۔'' میں نے سرگوشی کی اور اپنے پیروں سے رسی کے بل ہٹانے لگا۔ وہ رسی سمیٹ رہی تھی تاکہ الجھ کر پھنس نہ جائے اور میں ایک دو بلوں کا اسیر ہو جاؤں۔ آزاد ہوتے ہی میں نے جلدی سے کھڑا ہونے کی کوشش کی اور اگر کھاٹ کا سہارا نہ لیتا تو گر ہی جاتا۔ چار دن سے زیادہ مسلسل پڑے رہنے اور پھر بندھے رہنے کے بعد میرا جسم سن ہو رہا تھا۔ اوشا میری حالت سے بھانپ گئی، اس نے مجھے سہارا دیا۔

''کیا ہوا تجھے؟''

''اوشا، میرا جسم سن ہو رہا ہے۔'' میں نے اسے بتایا تو وہ جلدی جلدی میرے جسم کی مالش کرنے لگی۔ پھر اس نے عجیب حرکت کی، اپنی ساڑھی کا پلو نیچے گرا دیا اور والہانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گئی۔ مگر اس بار اس کے انداز میں نفسانیت کے بجائے محبت تھی۔ اس کے لمس، اس کی اداؤں اور اس کی گرم جوشی نے وہ کام کر دکھایا جو کوئی بھی دوا نہیں کر سکتی تھی۔ دو منٹ کے اندر میں اپنے جسم پر قابو پا چکا تھا۔ میں نے اسے نرمی سے الگ کیا۔ ''اوشا، بس کر۔ تیرا اتنا ہی احسان کافی ہے۔''

میں نے پہلے ہی ایک کونے میں رکھا ڈنڈا دیکھ لیا تھا۔ میں نے اسے اٹھایا، یہ گول اور ایک طرف سے کسی قدر بھاری ڈنڈا تھا۔ میں نے اسے تولا۔ اس کا ایک ہی وار کسی آدمی کا سر توڑنے کے لئے کافی تھا۔ ''اوشا! جب میں اشارہ کروں تو اپنے باپو کو آواز دینا۔''

''تو کیا کرے گا رے؟'' وہ پریشان ہو گئی تھی، غالباً اسے اپنے باپ کی فکر ہو گئی تھی کہ میں اس ڈنڈے کی مدد سے اس سے کیا سلوک کروں گا؟

''فکر مت کر۔ سندھو کو بے ہوش کرنا ہے تاکہ وہ ہمیں فرار سے نہ روک سکے۔''

''پر ڈنڈا اسے زور سے لگ گیا تو؟''

''وہ مرے گا نہیں۔'' میں نے بھنا کر کہا۔ ''پر تُو اس طرح بحث کرتی رہی تو وہ آ کر ہم دونوں کو ضرور مار دے گا۔''

میرے الفاظ ابھی منہ میں تھے کہ سندھو اندر آ گیا۔ غالباً اسے شک ہو گیا تھا۔ ہم کتنا ہی آواز دبا کر بولتے، جھونپڑی کے باہر کچھ نہ کچھ سنائی دیتا اور یہ کچھ سندھو نے سن لیا تھا۔ وہ آگ بگولا ہو کر اندر آیا اور مجھے آزاد دیکھ کر دانت پیس کر بولا۔ ''مجھے پہلے ہی شک تھا، اس حرام جادی نے تجھے کھول دیا ہوگا۔''

اسے دیکھتے ہی میں نے ڈنڈا اپنے جسم کی آڑ میں کر لیا تھا۔ اوشا نے جلدی سے ساڑھی کا پلو اوپری جسم پر ڈالا۔ مگر اس کے باپ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا کہ وہ ایک اجنبی کے ساتھ نیم عریاں حالت میں اتنے نزدیک کیوں کھڑی تھی۔ اعتراض اسے اس پر تھا کہ اوشا نے مجھے آزاد کیوں کیا تھا۔ ''باپو، اسے کچھ مت کہنا۔''

''چپ کر......'' اس بار سندھو نے اسے وہ گالی دی جو کوئی باپ اپنی بیٹی کو نہیں دے سکتا۔ وہ میری طرف لپکا۔ ''پہلے میں اسے دیکھ لوں...... پھر تجھ سے......''

اس کی بات ادھوری رہ گئی تھی کیونکہ اس کے نزدیک آتے ہی میں نے ڈنڈا گھما کر اس کے سر پر رسید کیا تھا۔ کچھ ناتوانی تھی اور کچھ میں نے ہاتھ ہلکا رکھا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ایک غیر ملک میں مجھ پر قتل کا الزام آئے۔ بہر حال ضرب اتنی کاری تھی کہ سندھو چکرا کر نیچے گر پڑا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تھی کہ میں نے دوسری ضرب لگا دی اور اس بار وہ ناک آؤٹ ہو گیا تھا۔ ''باپو!'' اوشا بے ساختہ چیخی اور اس پر جھک گئی پھر اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ ''تُو نے مار دیا اسے؟''

''اتنا غیرت مند نہیں ہے یہ۔'' میں نے کہا اور جھک کر سندھو کی نبض دیکھی جو کسی قدر سست روی مگر باقاعدگی سے چل رہی تھی۔ ''فکر مت کر، بے ہوش ہے، ایک دو گھنٹے میں ہوش میں آ جائے گا۔''

اس نے سندھو کو چٹائی پر لٹا دیا۔ میں اپنی چیزیں تلاش کر رہا تھا۔ میری قمیص دھل کر باہر لٹکی تھی۔ جھونپڑی کے گرد بانسوں سے بنی چار دیواری تھی تاکہ جانور اندر نہ آ سکیں۔ ایک طرف ڈرم میں پانی رکھا تھا۔ میں نے منہ ہاتھ دھویا۔ پاس ایک رسی پر میری دھلی ہوئی قمیص پڑی تھی۔ میری جیکٹ صاف تھی لیکن پتلون بہت میلی ہو رہی تھی۔ میں نے اندر آ کر سندھو کے ہاتھ پاؤں باندھے۔ ''یہ کیا کر رہے ہو؟'' اوشا نے احتجاج کیا۔

''وہی جو یہ ہمارے ساتھ کر رہا تھا۔ ہوش میں آ کر یہ میرے ساتھ یہی سلوک کر سکتا ہے جو میں نے اس کے ساتھ کیا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''نہانے اور کپڑے دھونے کے لئے صابن مل سکتا ہے؟''

اس نے مجھے گھورا۔ ''ابھی تو تم مجھے بھاگ چلنے کے لئے کہہ رہے تھے اور اب نہانے کی فکر کر رہے ہو؟''

''ہاں، یہ قابو میں ہے۔'' میں نے مسکرا کر سندھو کی طرف اشارہ کیا۔

اوشا نے مجھے دونوں طرح کے صابن اور ایک کسی قدر صاف دھوتی دی۔ میں نے اسے پہنا اور پہلے اپنی پتلون دھو کر خشک ہونے کے لئے دھوپ میں ڈالی اور اس کے بعد دل کڑا کر کے سرد پانی سے نہا لیا۔ دھوپ کی وجہ سے مجھے کسی قدر آرام ملا تھا۔ اوشا اب مجھے دیکھ کر ہنس رہی تھی۔ نہانے کے بعد آڑ میں ہو کر میں نے دھوتی

دوبارہ باندھ لی۔ ابھی مجھے سردی لگ رہی تھی۔ مگر گزارہ تھا او پر قمیص اور جیکٹ پہن لی۔ ''تو کیوں دانت نکال رہی ہے؟'' میں نے اوشا کی طرف دیکھا۔

''عجیب سے لگ رہے ہو؟'' وہ ہنسی۔

''کھانے کو کچھ ہے۔ میں بھوک سے مرنے والا ہوں۔''

''باجرے کی روٹی بنا دیتی ہوں، ساتھ میں اچار ہے۔''

''چلے گا۔'' میرے منہ میں پانی آ گیا تھا۔ ''پر دس منٹ میں کھانا نہ ملا تو میری وفات کی ذمے داری تم پر ہوگی۔''

اس نے جلدی سے چولہے میں لکڑیاں سلگائیں اور توا رکھ کر روٹی ڈالنے لگی۔ اگرچہ ایک ہندو کے گھر سے اوپر وہ بھی اتنے غلیظ قسم کے، کچھ کھاتے ہوئے طبیعت گھبرا رہی تھی مگر پیٹ بھرنے کی مجبوری تھی۔ شکر ہے باجرے کی روٹی اور اچار میں کچھ حرام شامل ہونے کا خدشہ نہیں تھا۔ جیسے ہی اس نے روٹی توے سے اتاری، میں نے کھانا شروع کر دی، وہ آرام سے کھانے کی تلقین کرتی رہی جسے میں نے ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیا۔ ایک روٹی کیسے ختم ہوئی، مجھے پتا ہی نہیں چلا تھا حالانکہ یہ اچھی خاصی بڑی روٹی تھی۔ پھر میں نے دوسری روٹی بھی اسی طرح ختم کر دیا اور تیسری روٹی پر جا کر مجھے قرار آیا تھا۔ اچار مقامی سبزیوں کا تھا اور لذیذ تھا لیکن میں نے اوشا کی جانب سے مکھن کی پیشکش مسترد کر دی۔ نہ جانے اس میں کس جانور کے دودھ کا مکھن ہو؟

''بس!'' میں نے ایک سانس میں کٹورے کا پانی ختم کر کے کہا۔ ''اب یہاں سے چلنے کی تیاری کرو۔''

اس کا چہرہ چمک اٹھا تھا۔ اس نے جلدی جلدی اپنے چند کپڑے اور ضروری سامان ایک پوٹلی میں باندھا۔ میری پتلون دھوپ میں صحیح سے خشک نہیں ہوئی تھی۔ میں نے ایک پتیلی میں چولہے کے انگارے بھر کر اس سے استری کر کے پتلون کو تقریباً خشک کر لیا۔ پتلون کے ساتھ میں نے موزے بھی دھو لئے تھے۔ ان کو بھی خشک کیا۔ پھر میں نے پتلون اور جوتے پہنے، میرا خنجر سندھو کی ایک پوٹلی سے برآمد ہوا تھا۔ کھانے پینے کے بعد میرے اندر توانائی آ گئی تھی اور میں اب چوبیس گھنٹے بغیر کھائے پیئے گزارہ کر سکتا تھا۔ اوشا نے سگھڑ بیبیوں کی طرح چار روٹیاں اور ڈال لی تھیں اور ان کو اچار کے مرتبان کے ساتھ ایک کپڑے میں لپیٹ لیا تھا۔ اس نے ساڑھی اچھی طرح باندھ لی تھی مگر بلاؤز نہ ہونے کی وجہ سے اس کی پشت کھلی تھی۔ سامنے سے اس نے پلو لے لیا تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ یہ اس علاقے کا رواج نہیں تھا، وہ تماشا بن جاتی۔ ''تیرے پاس بلاؤز نہیں ہے؟''

''وہ کیا ہوتا ہے رے!'' اس نے سادگی سے پوچھا۔ میں نے اسے الفاظ اور اشاروں سے سمجھایا کہ بلاؤز کیا ہوتا ہے۔ اس نے انکار کیا۔ ''وہ تو نہیں ہے میرے پاس۔''

سندھو اور اوشا زبان کے لحاظ سے پوربی لگتے تھے اور وہاں بھی بلاؤز کا رواج تھا۔ شاید سندھو نے زحمت سے بچنے کے لئے اسے بلاؤز کے بارے میں بتایا ہی نہیں تھا۔ تا کہ ایک ساڑھی سے کام چل جائے۔ ہم روانہ ہونے کے لئے بالکل تیار تھے۔ اوشا نے التجا آمیز انداز میں کہا۔ ''میں ایک بار باپو کو دیکھ لوں۔''

''اچھا یاد دلایا، اس کے ہاتھ پاؤں کھولنے ہیں ورنہ وہ اس ویرانے میں بندھا بندھا مر جائے گا۔'' میں نے کہا اور ہم اندر آئے۔ میں نے خنجر سے اس کے ہاتھ پیروں کی رسیاں کاٹ دیں۔ اوشا اس کے بے ہوش جسم

سے لپٹ کر رونے لگی جیسے بیٹیاں گھر سے رخصت ہوتے وقت باپ سے لپٹ کر روتی ہیں۔ میں نے سوچا کہ میں اسے لے جا کر حماقت تو نہیں کر رہا ہوں، یہ تو ڈھول گلے میں باندھنے والی بات ہوگی، میں اسے کہاں لے جاؤں گا اور کہاں رکھوں گا؟ بہتر تو یہی تھا کہ میں اسے اس کے باپ کے پاس چھوڑ جاؤں مگر میں سندھو کی سفاکی دیکھ چکا تھا، اس سے بعید نہیں تھا کہ اوشا کو مار ڈالے۔ اب سندھو نے ہلکا ہلکا ہلنا شروع کر دیا تھا اور اس کی آنکھیں بھی پھڑک رہی تھیں۔ "یہ ہوش میں آنے والا ہے، اب چل" میں نے اوشا کا بازو پکڑ کر کھینچا۔

اس نے حسرت سے اپنے باپ کو دیکھا اور اس روز مجھے یقین آ گیا۔ باپ کیسا ہی کیوں نہ ہو بیٹیوں کے لئے باپ ہی ہوتا ہے۔ ہم جھونپڑے سے نکلنے والے تھے کہ مجھے باہر کسی مشین کی گھر گھر سنائی دی، میں نے غور کیا۔ "اوشا کوئی گاڑی اس طرف آ رہی ہے۔ کیا سندھو سے ملنے کوئی آتا ہے؟"

"گاڑی میں تو بس ایک بندہ آوے ہے۔" اس نے سوچ کر کہا۔ "مجھے اس کا نام نہیں معلوم۔"

"وہ جو کوئی بھی ہو، اسے باہر جا کر بتا دو کہ باپو جنگل میں گیا ہے، رات تک آئے گا۔"

"باپو نے کبھی مجھے اس کے سامنے جانے نہیں دیا۔ وہ میرے بارے میں نہیں جانتا۔"

"یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ بس اسے کسی طرح ٹال دو۔ وہ اندر آ گیا اور تیرے باپ کو دیکھ لیا تو سوچ، ہم یہاں سے جا سکیں گے؟"

"میں...... جاتی ہوں۔" اس نے ہچکچا کر کہا۔ "گاڑی کی آواز بالکل قریب آ گئی تھی، پھر وہ رک گئی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ کوئی فور وہیل ڈرائیو جیپ تھی، اس قسم کے علاقے میں ایسی ہی گاڑیاں موزوں رہتی تھیں۔

☆======☆======☆

میں نے سندھو کی طرف دیکھا، وہ ساکت پڑا تھا اور بظاہر اس کے جلد ہوش میں آنے کے امکانات نہیں تھے۔ اوشا بانسوں کی دیوار میں بنے دروازے تک گئی، اسی لمحے باہر سے کسی نے زور سے پکارا۔

"سندھو...... اے...... سندھو، کہاں مر گیا ہے۔ مالک آئے ہیں۔"

اوشا نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ میں نے اسے اشارے سے باہر جانے کو کہا۔ باہر جو بھی آیا تھا، وہ اصل میں سندھو کا گاہک تھا اور اس سے کوئی دوا، کوئی تریاق، کوئی زہر لینے آیا تھا۔ اوشا نے بادل ناخواستہ دروازہ کھولا اور باہر چلی گئی۔ "کیا ہے...... کون ہے رے تُو؟"

"اے چھوری...... تُو کون ہے؟" ایک اور آواز آئی اور میں نے فوراً محسوس کر لیا بولنے والے کی رال اوشا پر ٹپک گئی تھی۔

"سندھو میرا باپو ہے۔ وہ جنگل میں گیا ہے، شام تک آئے گا۔"

"کوئی بات نہیں، باپو نہیں ہے تو کیا...... تُو تو ہے۔ جب تک سندھو آتا ہے تیرے ساتھ سے بتا لیں گے۔"

"اوشا نے غالباً بھاگنے کی کوشش کی اور اسے کسی نے پکڑ لیا۔ کیونکہ وہ چلائی تھی۔ "چھوڑ مجھے حرام جادے۔"

"گالی دیتی ہے۔" بولنے والے نے اسے تھپڑ مارا تھا۔ "تیری زبان کاٹ لوں گا۔ مجھے نہیں جانتی

ہے...... راج کنور ہے میرا نام۔"

"چھوڑ مجھے۔" ادشا پھر چلائی۔

"مالک...... یہ تو ہری ہے۔" باہر سے پہلے بولنے والے شخص نے کہا، وہ راج کنور کا ملازم لگ رہا تھا۔

میں نے خنجر نکالا اور جھونپڑی سے باہر جانے لگا تھا کہ عقب سے آہٹ ہوئی۔ میں نے گھوم کر دیکھنا چاہا تو کوئی سخت سی شے میرے سر سے ٹکرائی۔ سر ترچھا ہونے کی وجہ سے وار براہ راست گدی پر نہیں پڑا تھا ورنہ میں ذرا سی بے ہوش ہو جاتا پھر بھی مجھے چکر آ گیا تھا۔ میں نیچے گرا تو میں نے سندھو کو گالی دیتے سنا۔ میں نے نیم وا آنکھوں سے اس کے ہاتھوں میں وہی ڈنڈا دیکھا جس سے میں نے اس کا سر بجایا اور اس نے دو گھنٹے کے اندر ہی اڈا میرے سر پر رسید کر کے بدلہ چکا دیا تھا۔ باہر سے ادشا کے چلانے کی آواز آئی تو وہ مجھے بھول کر باہر کی طرف لپکا۔

"مالک...... اسے چھوڑ دے۔ یہ میری بیٹی ہے۔" میں نے چکراتے ذہن سے سندھو کی آواز سنی۔

"اچھا تُو نے پہلے کبھی نہیں بتایا۔ ہم سے چھپا رہا تھا۔" اوباش آواز والے راج کنور نے کہا۔

"نہیں مالک! یہ میری بہن کے پاس تھی اسے ابھی لایا ہوں۔"

"چل اچھا ہے، اسے بھی لے چلتے ہیں۔ تجھے بڑے کنور نے بلایا ہے۔"

"بڑے کنور نے...... وہ کیوں؟" سندھو بولا۔

"مالک سے سوال کرتا ہے؟" نوکر نے سندھو کو جھاڑا۔ "چل اپنا سامان لے آ...... جا۔"

"باپو، میں نہیں جاؤں گی۔" ادشا روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ میں اپنے ذہن سے لڑ رہا تھا۔ وار ترچھا ہونے کے باوجود نازک جگہ لگا تھا۔ اس لئے میرا ذہن بے قابو ہو رہا تھا۔ کنور راج یا راج کنور وہ جو کوئی بھی تھا، وہ ان کو لے جانے آیا تھا اور ممکن تھا کہ مجھے بھی لے جاتا۔ جبکہ میں فی الحال کسی اور کے ہاتھ نہیں آنا چاہتا تھا، مگر میرے چاہنے سے کیا ہوتا تھا، جو میری تقدیر میں لکھا تھا وہ تو میرے ساتھ ہونا تھا۔ باہر سندھو ان کو بتا رہا تھا کہ اس نے بڑے کنور کے لئے ایک بندہ حاصل کیا ہے اور اس کے خون سے کنور صاحب کے علاج کے لئے دوا تیار کر رہا ہے۔

"کہاں ہے وہ منش؟"

"اندر پڑا ہے۔ بھاگ رہا تھا، میں نے ڈنڈا مار دیا۔"

"باپو، تُو نے اسے ڈنڈا مار دیا؟" ادشا چلائی۔

"چپ حرام جادی! اس کو بھول جا۔"

"سندھو، یہ کیا چکر ہے؟" راج کنور نے کہا۔

"کچھ نہیں مالک! کچھ نہیں۔"

مگر راج کنور اور اس کا ملازم اندر آئے۔ انہوں نے وہ گٹھری دیکھ لی جو ادشا نے فرار کے لئے بنائی تھی، کھانے کی پوٹلی بھی۔ راج کنور نے کہا۔ "تیری چھوکری اس کے ساتھ فرار ہو رہی تھی۔ اس نے میرے پاؤں پر ٹھوکر ماری۔ میں بے ہوش بن گیا تھا۔ درحقیقت میری جان نکل گئی تھی اور فی الحال میں کچھ کرنے کے قابل نہیں

تھا۔ میں انتظار کر رہا تھا کہ کب میری طبیعت بہتر ہو اور میں ان سے نمٹ سکوں۔ جیپ ایک اچھی خبر تھی، اگر میں ان سے جیپ حاصل کر لیتا تو تیزی سے سرحد کے پاس جا سکتا تھا، اس کے بعد سرحد عبور کرنا الگ مرحلہ تھا۔

''اسے بھی ڈالو جیپ میں۔ ویسے یہ ہے کون؟''

''پتا نہیں مالک! اس کے پاس سے بس ایک چھرا ملا تھا۔''

''کوئی کاغذ یا شناخت کی کوئی شے؟''

''کچھ نہیں سرکار۔ بالکل بے نام ونشان آدمی ہے۔ اس لئے تو......''

''اب سب محل میں ہوگا۔ چلو نائیک اسے اٹھا کر جیپ میں ڈالو۔''

''مالک، یہ خطرناک آدمی ہے۔ اسے باندھ کر لے جانا ہی ٹھیک ہوگا۔'' سندھو نے ایک بار پھر مجھے مروانے کا بندوبست کر لیا۔ راج کنور نے حیرت سے کہا۔

''جب خطرناک آدمی ہے تو تُو نے کیسے اسے قابو کیا؟''

''جڑی بوٹیوں سے مالک! میں نے اسے مفلوج بنا دیا تھا۔''

''پھر یہ آزاد کیسے ہوا؟''

''مکاری کی مالک! میری دوا کھانے سے انکار کر دیا۔ میں نے اسے رسیوں سے باندھا لیکن اس نے کسی طرح خود کو کھول لیا۔ اس لئے تو کہہ رہا ہوں، باندھ دو مالک! ایسا آدمی پھر نہیں ملے گا، اس میں عجیب شکتی ہے، یہ شاہ کوبرا کا زہر بھی برداشت کر گیا تھا۔''

''ٹھیک ہے نائیک، اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دے۔'' راج کنور نے اپنے ملازم کو حکم دیا۔ وہ جا کر رسی لے آیا اور میرے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے۔ میں مزاحمت نہیں کر سکا تھا اس کے بعد اس نے مجھے اٹھانا چاہا مگر ناکام رہا۔ پھر اس نے سندھو کے ساتھ مل کر مجھے جیپ میں منتقل کیا۔ یہ ڈبل کیبن جیپ تھی جس کے عقبی حصے میں بھی خاصی گنجائش تھی۔ یہاں ٹائر رکھے تھے۔ میں ان پر آڑا ترچھا ڈال دیا گیا تھا۔ اوشا دبی دبی زبان میں باپ سے کہہ رہی تھی کہ وہ نہیں جائے گی۔

''سندھو! تیری چھوکری میں بڑے نخرے ہیں۔'' راج کنور نے کہا۔ ''لگتا ہے اس کے کس بل نکالنے ہی پڑیں گے۔''

''معافی دو مالک! ابھی بالک ہے۔''

''اچھا!'' راج کنور کا مزید لہجہ غلیظ ہو گیا تھا۔ ''ابھی کچھ دیر پہلے اسے دیکھا ہے، اس میں بالک والی کوئی بات نظر نہیں آئی۔''

سندھو اور اوشا کو عقبی حصے میں جگہ ملی تھی۔ سندھو کو اوشا سے زیادہ اپنے سانپوں اور ان جڑی بوٹیوں کی فکر کھائے جا رہی تھی جو وہ جھونپڑی میں چھوڑے جا رہا تھا۔ اس نے دبی زبان میں راج کنور سے کہا۔ ''مالک، الا کا کیا ہوگا؟''

''مرتا کیوں ہے، بڑے کنور سے مل کر آ جانا۔ ان کو تیری دوا سے فائدہ ہوا تھا پر اب پہلے جیسا فائدہ نہیں ہو رہا ہے۔''

"اب ہوگا۔" سندھو نے یقین سے کہا۔ "میں نے اس آدمی کے خون سے تیار کیا توڑ بھی لے لیا ہے۔ اس سے بڑے کنور ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"سوچ لے، ایسا نہ ہوا تو بڑے کنور غصے والے ہیں۔ تجھے سزا بھی ہو سکتی ہے۔"

"مالک ہیں۔ چاہے بخش دیں، چاہے سجا دیویں۔"

ڈرائیونگ نائیک نے سنبھالی تھی اور راج کنور اس کے برابر میں بیٹھا تھا۔ اس کی باتوں اور لہجے کی نخوت سے لگ رہا تھا وہ اونچی ذات کے دولت مند لوگ تھے۔ ممکن ہے جاگیردار ہوں اور رعایا پر خدا بن کر حکومت کرتے ہوں۔ جیپ روانہ ہوئی تو ناہموار راستوں پر عقبی حصہ زیادہ ہی اچھل رہا تھا۔ اس طرف دو ٹائر تھے اور ایک عدد بڑا سا بکس رکھا تھا، یہ ایسا بکس تھا جس میں کھانے پینے کا سامان رکھا جاتا ہے۔ انجن کے شور میں مجھے کچھ خاص سنائی نہیں دے رہا تھا اور جیپ کے اچھلنے کودنے سے میں چیزوں سے ٹکرا رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اب اگر ایک دو گھنٹا چلتی رہے گی تو میرا توفیک بن جائے گا۔

لیکن اس سے بھی زیادہ تشویش ناک بات یہ تھی کہ میں جس چکر سے بچ کر سندھو کے پاس سے فرار ہو رہا تھا راج کنور مجھے اسی مقصد کے لئے لے جا رہا تھا یعنی میرا خون نچوڑ کر دوا بنانے کے کام میں لانا اور نہ جانے ان کے چنگل سے میں نکل بھی سکوں گا یا نہیں۔ میرے حواس کسی قدر میرے قابو میں آ گئے تھے لیکن اب ان کا فائدہ نہیں تھا۔ نائیک نے میرے ہاتھ پاؤں سختی سے باندھے تھے اور میں حرکت بھی نہیں کر سکتا۔ میں پچھتایا کہ کاش میں پہلے ہی نکل جاتا۔ میں نے نہانے دھونے اور کھانے پینے میں اتنا وقت گنوا دیا اور یہ بھول گیا کہ انہونیاں اور خطرات میرے تعاقب میں رہتے ہیں۔ اب کاش کہہ کر پچھتانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا، میری تو زندگی اس چکر میں کاش لے آئی تھی، کاش میں اس روز سفیر اور مونا کے ساتھ مری نہ جاتا یا کاش وہاں سے جلدی نکل جاتا اور مال روڈ پر نہ رکنا پڑتا جہاں نادر علی سے مڈبھیڑ ہوئی تھی۔

خلاف توقع جیپ نصف گھنٹے بعد ہی کسی ہموار سڑک پر آ گئی اور برق رفتاری سے دوڑنے لگی۔ سورج سر پر آنے کے بعد ڈھل رہا تھا اور میرا اندازہ تھا، یہ لوگ ہمیں چالیس پچاس میل تک دور لے جائیں گے مگر جیپ کی رفتاری سے ایک گھنٹے سے بھی زیادہ چلتی رہی تھی اور اس دوران میں کم سے کم ساٹھ ستر میل کا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ سورج کے رخ سے میں نے اندازہ لگایا کہ جیپ شمال کی طرف جا رہی تھی۔ مشرقی پنجاب کا شمالی حصہ کشمیر اور ہماچل پردیش کے پہاڑوں سے لگتا ہے۔ مجھے جیپ کے عقبی شیشے کے باہر پہاڑوں کی جھلک نظر آنا شروع ہو گئی تھی۔ سڑک بھی بل کھانے لگی تھی جیسا کہ پہاڑی راستوں میں ناگزیر ہوتا ہے۔ سندھو اور اوشا قطعی خاموش تھے اور راج کنور اور نائیک کبھی کبھی آپس میں بات کرنے لگتے تھے۔ ایک جگہ رک کر انہوں نے ایندھن بھروایا تھا پھر جیپ ایک جگہ رک گئی۔ نائک نے نیچے اتر کر عقبی دروازہ کھولا اور مجھے ایک طرف دھکیل کر باکس باہر نکالا، سامنے دیکھا یہ کوئی سرسبز سا میدان تھا جس میں دور گائیں اور بھیڑیں چر رہی تھیں۔ لگتا تھا راج کنور کے لنچ کا وقت ہو گیا تھا۔ نائیک نے باسکٹ باہر رکھتے ہوئے اسے اطلاع دی۔

"اسے ہوش آ گیا ہے۔"

"کھانے کے بعد اسے باہر لانا۔" راج کنور نے اسے حکم دیا۔

نائیک اپنے مالک کے لئے دسترخوان سجانے لگا۔ اوشا اور سندھو بھی باہر آ گئے تھے۔ صرف میں اندر بندھا پڑا تھا۔ نائیک کو میں نے پہلی بار قریب سے دیکھا تھا۔ وہ گٹھے ہوئے جسم کا اور گنجے سر والا چہرے سے ہی خطرناک نظر آنے والا شخص تھا۔ بدمعاشی کے اشتہار کے طور پر اس نے بڑی بڑی مونچھیں پال رکھی تھیں۔ اپنے تنومند جسم کی نمائش کے لئے اس نے اس موسم میں بھی دھوتی کے اوپر باریک کرتہ پہن رکھا تھا۔ جب اس نے مجھے باندھا تھا تو میں بے ہوش بنا ہوا تھا۔ نائیک کے نقوش شمالی انڈیا والوں کے سے تھے، کسی قدر چپٹی ناک، باریک آنکھیں اور صاف رنگت۔ ابھی میں نے راج کنور کو نہیں دیکھا تھا۔ نصف گھنٹے بعد نائیک پھر آیا۔ اس نے عقبی دروازہ کھولا اور میرے پیروں سے بندھی رسی کھول دی۔

''نیچے اتر!'' اس نے درشت لہجے میں کہا۔ وہ اپنے مالک کے اشارے پر بھونکنے، غرانے اور کاٹنے والا کتا تھا۔ میں نیچے اتر آیا۔ اس نے جان بوجھ کر مجھے دھکا دیا۔ مگر میں اپنے قدم مضبوطی سے جما چکا تھا اس لئے ہلا بھی نہیں، میں نے آہستہ سے کہا۔ ''زبان سے بولو۔''

''تو......'' وہ مشتعل ہوا تھا۔

''نائیک اسے لے آ۔'' کنور نے پکارا۔ میں نے اسے دیکھ لیا۔ وہ سبز گھاس پر بچھے دسترخوان پر بیٹھا تھا اس کے سامنے خالص ہندوانی انداز کا کھانا سجا تھا۔ پوریاں، بھاجی، حلوہ، چٹنیاں، دال اور چاول۔ یہ سب تھالیوں میں رکھا تھا۔ وہ کھا چکا تھا۔ اوشا اور سندھو ذرا فاصلے پر بیٹھے تھے اور سندھو للچائی نظروں سے کھانے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مالک کی آواز سن کر نائیک غرانے والے کتے سے فوراً دم ہلانے والا کتا بن گیا۔ میں خود آگے بڑھا۔ راج کنور تقریباً چالیس برس کا گوری چٹی رنگت کا مالک تھا۔ دبلا مگر مضبوط جسم اور تیکھی آنکھیں تھیں۔ اس نے شانوں تک دراز بال رکھے تھے، ہونٹوں کے اوپر باریک مونچھیں تھیں، مجموعی طور پر وہ خوش شکل شخص تھا مگر چہرے کے تاثرات سے عیار نظر آتا تھا۔

''مہاشے جی! کون ہو تم؟'' اس نے پوچھا۔ سندھو نے اسے بتا دیا تھا کہ میں مسلمان ہوں۔

''میرا نام رضوان حسن ہے۔'' میں نے سوچ کر غلط بیانی سے کام لیا۔ ''دہلی کا رہنے والا ہوں اس علاقے میں شکار کھیلنے آیا تھا کہ سانپ نے ڈس لیا اور پھر اس اژدہے کے ہاتھ لگ گیا۔'' میں نے سندھو کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ میرے جسم سے خون نکال رہا تھا۔''

''مہاشے جی ذرا سا خون نکلنے سے تم مر نہیں جاؤ گے اور یہ بھی دیکھو کہ اس سے کتنے لوگوں کا بھلا ہوا ہے۔'' راج کنور نے چالاکی سے کہا۔

''ایسا ہے تو تم کیوں نہیں خون دے دیتے...... یہ سپیرے کی اولاد ہے تو تمہارے پاس۔''

''جبان سنبھال کر بات کر!'' نائیک غرایا۔

''کتا اچھا پالا ہے تم نے۔'' میں نے آرام سے کہا۔ ''صرف بندھے ہاتھ والوں پر غراتا ہے یا مقابلہ بھی کر سکتا ہے۔''

''تیری تو......'' نائیک بے قابو ہو کر میری طرف لپکا تھا کہ کنور کے اشارے پر رک گیا۔

''سورما ہے تُو۔'' کنور نے میری طرف دیکھا۔

"نہیں، سورما تو یہ ہے۔" میں نے ہنس کرنا ئیک کی طرف دیکھا۔ "شاید تم نے کبھی آزمایا نہیں۔"

راج کنور کی آنکھوں میں ایک لمحے کو نفرت چمکی تھی پھر وہ نارمل ہو گیا۔ "مہاشے جی...... تمہارے پاس کوئی شناختی شے نہیں ہے۔"

"یہ اس سے پوچھو...... اس نے میرا پرس نکال لیا ہوگا۔" میں نے سندھو کی طرف اشارہ کیا۔ "اس میں ساڑھے سات ہزار روپے بھی تھے۔"

"بکتا ہے یہ۔" سندھو چلایا۔ "مجھے اس کے پاس سے کچھ نہیں ملا تھا۔"

"اب تو تم یہی کہو گے۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "رقم کی مجھے اتنی پروا نہیں ہے لیکن مہربانی کر کے میرے کاغذات اور پرس دے دو۔"

"سندھو!" راج کنور نے اس کی طرف دیکھا۔

"مالک! یہ جھوٹا ہے، آپ خود دیکھ لو، میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔"

"یہ درست کہہ رہا ہے، جب میں اسے قابو کر کے اس کے جھونپڑے سے فرار ہونے والا تھا تو میں نے اس کی تلاشی لی تھی، اس کے پاس سے پرس نہیں ملا تھا۔ شاید اس نے کہیں چھپا دیا ہے۔" میں نے اس کی حمایت کی۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ جنگل میں کہیں گر گیا ہو یا کوئی شرارت میں لے گیا ہو۔" سندھو نے اپنے دفاع میں دلیل دی۔

"ممکن ہے۔" میں نے تسلیم کیا۔ "تم اپنے کتے کو وہاں چھوڑ آئے ہو، وہ بھوکا نہ مر جائے۔" میں بولا۔

"اس کی پروا مت کرو، وہ خود شکار کر کے کھاتا ہے۔" سندھو بولا۔ "ہماری واپسی تک وہ جھونپڑے کی رکھوالی کرے گا۔"

"اور اگر تم واپس نہ گئے تو؟" میں نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"کیوں نہیں جائیں گے۔" وہ جلدی سے بولا۔

"مہاشے جی! تم اس کی نہیں، اپنی فکر کرو۔" کنور نے سرد لہجے میں کہا۔

"راج کنور! میرا نام رضوان ہے، بہتر ہوگا کہ تم مجھے اس نام سے پکارو اور تمہارا ارادہ کیا ہے، کسی کو اس طرح قید کرنا سنگین جرم ہے۔"

"تم اس کی بھی فکر مت کرو۔ تمہارا معاملہ بھیا سے ہے اس لئے تمہارے بارے میں وہی فیصلہ کریں گے۔" اس نے کہا اور نائیک کو آواز دی۔ "یہ تم لوگ کھا لو۔ اسے بھی دے دو۔" اس نے میری طرف اشارہ کیا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "شکریہ، مجھے بھوک نہیں ہے۔"

راج کنور معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ "تیری مرضی! ویسے جب آدمی کو بھوک نوچتی ہے تو وہ کتوں کا بچا کھچا کھانے کے لئے بھی تیار ہو جاتا ہے۔"

"ممکن ہے ان لوگوں کو تجربہ ہو۔" میں نے نائیک اور سندھو کی طرف دیکھا جو بچے کچے پر ٹوٹ پڑے تھے۔ "مجھے کبھی اس کا اتفاق نہیں ہوا۔"

راج کنور کا چہرہ بگڑ گیا تھا۔ ''بہت جبان چلتی ہے تیری۔''

''میں نے کیا کہا؟'' میں نے معصومیت سے کہا۔

راج کنور میرے پاس آیا، اس کا قد مجھ سے ذرا کم تھا اس لئے اسے میری آنکھوں میں دیکھنے کے لئے اچکنا پڑا تھا۔ ''میرے سامنے سر اٹھانے والا کبھی سکھی نہیں رہتا۔'' اس کے لہجے میں دھمکی تھی۔

''کنور صاحب! آپ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے اس لئے بہتر ہے مجھ سے الجھنے سے گریز کریں اور مجھے جانے دیں۔ ممکن ہے کل آپ پچھتائیں کہ مجھے ساتھ کیوں لائے؟'' میں نے بھی اسی کے لہجے میں کہا۔

''بس کچھ دیر باقی ہے۔ جب ہم حویلی پہنچیں گے تو دیکھیں گے کون پچھتاتا ہے۔''

راج کنور نے چیخ کر پیک اَپ کرنے اور روانہ ہونے کا حکم دیا۔ پیٹ پوجا ادھوری رہ جانے پر نائیک اور سندھو نے کھا جانے والی نظروں سے مجھے دیکھا۔ نائیک نے پھرتی سے سارے برتن باکس میں پیک کئے اور راج کنور کے لئے ایک وہسکی کی بوتل نکال کر اسے ایک گلاس بنا کر دیا۔ پھر اس نے باکس رکھا۔ میرے پاؤں باندھ کر مجھے عقبی حصے میں دھکیل دیا اور خانہ بند کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ''تیرے کس بل نہ نکالے تو نائیک نام نہیں۔''

''ہاں، پھر کھل نائیک رکھ لینا۔'' میں نے بھی آہستہ سے کہا۔ وہ خون کے گھونٹ پی کر چلا گیا۔

اوشا کے چہرے سے تکلیف کے آثار نظر آ رہے تھے۔ شاید مرہم کا اثر ختم ہو رہا تھا۔ اس نے سندھو سے کہا تو اس نے اوشا کو جھڑک دیا۔ ''خاموش بیٹھ، ذرا سی تکلیف سے تُو مر نہیں جائے گی۔''

''کیا تکلیف ہے اسے؟'' راج کنور نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔ ''عورتوں والی؟''

''نہیں مالک! اس کی کمر پر چوٹ لگی تھی، اس میں تکلیف ہو رہی ہے۔'' سندھو خوشامدانہ انداز میں بولا۔

''اچھا، حویلی چل کر اسے بھی دیکھیں گے۔''

جیپ روانہ ہوئی، میرے خیال میں ہم سندھو کے ڈیرے سے کوئی سو میل دور آ چکے تھے۔ پنجاب کراس کر لیا تھا اور شاید ہماچل پردیش میں تھے۔ پہاڑ اب بلند ہوتے جا رہے تھے اور دور اُن میں برف کی سفیدی نظر آ رہی تھی۔ سردی بڑھ گئی تھی اور نائیک نے ایک صدری پہن لی تھی۔

''باپو، مجھے سردی لگ رہی ہے۔'' اوشا نے آہستہ سے کہا۔

سندھو نے اسے اپنے جھولے سے ایک سیاہ گولی دی۔ ''اسے کھا لے۔''

''یہ کیا ہے؟'' راج کنور نے پوچھا۔

''مالک...... سانپ کی ہڈیوں سے بنی ایک دوا ہے، اسے کھانے سے سردی نہیں لگتی۔''

''تیرے پاس عجیب عجیب اور دلکش چیزیں ہیں۔'' اس نے کہا۔ میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا دلکش چیز سے اس کی کیا مراد تھی؟ اس بار ایک گھنٹے کے سفر کے بعد جیپ ایک وادی میں داخل ہوئی جس کے وسط میں ایک سرخ رنگ کی عالی شان محل نما عمارت تھی۔ دور دائیں طرف پہاڑ کی ڈھلان پر ایک گاؤں بھی نظر آ رہا تھا۔ وادی کے عقب میں جنگلات سے بھرے اونچے پہاڑ تھے اور فضا میں زعفران کی خوشبو تھی شاید اس وادی میں زعفران کاشت ہوتی تھی اور یہی کنور خاندان کی دولت کا راز تھا ورنہ اس وادی میں کوئی اور نقد آور فصل مشکل سے ہی

کاشت ہوسکتی تھی۔ بعد میں میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔ زعفران ہی کنور خاندان کی دولت مندی کا سبب تھا۔

جیپ ذرا نشیب میں گئی اور پھر بلندی پر حویلی کی طرف گئی۔ حویلی ایک نسبتاً اونچے ٹیلے پر تھی اور کم سے کم تین ایکڑ رقبے پر پھیلی تھی۔ وسط کی اصل عمارت کے گرد چاروں طرف بڑے رقبے پر باغ تھا اور اس کے گرد سرخ پتھروں سے بنی اونچی چاردیواری تھی جس پر ہر بیس فٹ کے بعد چوبرجیاں بنی تھیں۔ انداز کسی قلعے کی فصیل کا سا تھا۔ جیپ بڑے پھاٹک کے سامنے چند لمحے کے لئے رکی اور پھاٹک کھلتے ہی اندر چلی گئی۔ میں نے دیکھا پھاٹک پر تین مسلح پہرے دار تھے اور ان سب کے پاس جدید ترین سب مشین گنیں تھیں۔ اندر باغ میں ایک راستہ گھومتا ہوا عمارت کے کورڈ پورچ تک گیا تھا۔ جیپ وہاں رکی تو کنور نے نیچے اترتے ہی استقبال کے لئے آنے والے ایک شخص سے کہا۔ "منشی دل جی! اسے قید خانے میں ڈال دیجئے اور ان دونوں کو نوکروں کے ساتھ ٹھہرایئے۔" اس نے بالترتیب میری طرف اور پھر اوشا اور سندھو کی طرف اشارہ کیا۔

"جو حکم مالک!" منشی نے کہا۔ اس نے بڑی شاندار قسم کی مونچھیں پال رکھی تھیں۔ ملیشیا کے شلوار سوٹ میں وہ سرحد کا کوئی خان لگ رہا تھا مگر وہ اس حویلی کا منشی تھا۔ کنور بے نیازی سے اندر چلا گیا۔ منشی کے اشارے پر مجھے دو افراد نے اتارا، میرے پاؤں کھول دیئے گئے تھے تاکہ خود سے چل سکوں البتہ ہاتھ انہوں نے قید خانے میں جا کر کھولے۔ یہ قید خانہ حویلی کے دائیں طرف ایک مختصر سی چاردیواری میں تھا۔ اس میں نوکروں کے لئے مکانات بنے تھے۔ مجھے لانے والوں کا رویہ معقول تھا اس لئے میں نے ان سے پانی مانگا۔

"مجھے پیاس لگ رہی ہے۔"

وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔ "لگتا ہے تُو پہلی بار آیا ہے اِدھر؟" ایک بولا۔

"ہاں، کیا یہاں پہلی بار آنا کوئی خاص بات ہوتی ہے۔"

"یہاں جو آتا ہے اسے دو دن کھانا پانی نہیں ملتا، سمجھ لے یہ اس قید گھر کی پہلی سجا ہے۔"

میں حیران ہوا تھا۔ "ایسا تو میں نے کہیں نہیں سنا۔"

وہ مجھے ایک کوٹھڑی میں بند کر کے چلے گئے تھے۔ انہوں نے جانے سے پہلے میرے ہاتھ بھی کھول دیئے تھے۔ کنور خاندان کے قید خانے کا یہ انوکھا اصول تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں بہت غلط قسم کے لوگوں میں پھنس گیا ہوں۔ یہ انسانیت سے قطعی عاری تھے، اس کا ایک نمونہ یعنی راج کنور کافی تھا۔ ان لوگوں کے ہاتھ آنے سے لگ رہا تھا کہ میری کم بختی کا ایک دور اور شروع ہونے والا ہے لیکن ساتھ ہی مجھے اندر سے اطمینان تھا، اگر خدا کی طرف سے میرا وقت پورا نہیں ہوا تو میں اس آزمائش میں بھی پورا اتروں گا۔ میں نے کوٹھڑی کا جائزہ لیا۔ یہ سات بائی نو کی پتھریلی کوٹھڑی تھی جس میں ایک طرف سلاخوں والا دروازہ تھا اور دوسری طرف زمین سے نو فٹ کی بلندی پر روشن دان تھا جس میں لوہے کی سلاخیں لگی تھیں۔ ایک طرف زمین پر گھاس بچھی تھی، یہی گھاس بستر تھا۔ کمبل اور تکیے کی عدم دستیابی سے واضح تھا کہ مجھے ان کے بغیر ہی گزارہ کرنا تھا۔ سردی قابلِ برداشت تھی۔ روشن دان جنوب کی سمت تھا اگر یہ شمال کی طرف ہوتا تو یخ بستہ ہوا مجھے جما ڈالنے میں کوئی کسر نہ چھوڑتی۔ میں گھاس پر دراز ہو گیا۔ "لے بیٹا شہباز! اب دو دن عیش کر، کھانے اور پانی کے بغیر۔"

جب گیدڑ کی شامت آتی ہے جنگل سے اس کا پیٹ بھر جاتا ہے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے۔ جہاں اس کے شریکے یعنی کتے پہلے ہی بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں اور ظاہر ہے ان کا سلوک گیدڑ سے کچھ اچھا نہیں ہوتا ہے۔ اس وجہ سے شامت ثابت کرنے کے لئے گیدڑ کو گھسیٹا جاتا ہے۔ بظاہر ایسا لگ رہا تھا کہ میری شامت آئی تو میں نے بھی شاہ نواز کی حویلی کا رخ کیا تھا اور اس کے بعد مجھے واپس راجا عمر دراز کے پاس جانا نصیب نہیں ہوا تھا لیکن میں اسے تقدیر کی خرابی قرار نہیں دوں گا کیونکہ اس وجہ سے مجھے حویلی تباہ کرنے کا موقع ملا۔ بے شک یہ کام میں نے نہیں کیا تھا مگر اسباب میں نے کر دیئے تھے۔ فاشی اور اسلحے کا ایک بہت بڑا اڈا تباہ ہوا۔ عورتوں کا مجھے افسوس تھا اور ساری عمر رہے گا مگر مارے جانے والے مردوں میں تمام اس قابل تھے کہ ان کو بارود پر بٹھا کر آگ دکھادی جاتی۔

گھاس حیرت انگیز طور پر نرم اور گرم تھی، میں سو گیا۔ جب میری آنکھ کھلی تو رات کا وقت تھا۔ کوٹھڑی کے سامنے راہ داری میں بلب جل رہا تھا۔ اس جگہ پر چھ کوٹھڑیاں تھیں، تین راہ داری کے بائیں جانب اور تین دائیں جانب۔ مجھے دائیں طرف کی پہلی کوٹھڑی میں ڈالا گیا تھا جبکہ میرے سامنے والی کوٹھڑی خالی تھی، باقی چار کے بارے میں، مَیں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ خالی ہیں یا ان میں کنور خاندان کا کوئی معتوب موجود ہے۔ یہ تو طے تھا کہ یہ قید خانہ کنور خاندان کے ذاتی مجرموں اور دشمنوں کے لئے تھا ورنہ میری معلومات کے مطابق بھارت کا کوئی علاقہ ملک کے قانون کی عمل داری سے باہر نہیں تھا۔

میں نے سونے کی کوشش کی مگر مجھے نیند نہیں آئی۔ پھر مجھے مونا اور سغیر کا خیال آیا۔ وہ دبئی میں ہوں گے۔ کسی جدید قسم کے تمام سہولیات اور آسائشوں سے مزین اپارٹمنٹ میں ہوں گے مگر اداس ہوں گے۔ ان کو میری یاد آتی ہوگی۔ وہ سوچتے ہوں گے کہ میرے پاس آ جائیں مگر میں کہاں تھا، یہ خود میرے فرشتوں کو نہیں معلوم تھا مونا اور سغیر کیسے آتے۔ سونیا اور ناصر میرے لئے بے قرار ہوں گے، حویلی کی تباہی کے بعد میرا حال جاننے کے لئے مارے مارے پھر رہے ہوں گے۔ راجا عمر دراز کے آدمی بھی میری زندگی یا موت کا پتا چلانے کی کوشش کر رہے ہوں گے۔

لیکن صرف میرے دشمنوں کو معلوم تھا کہ میں بچ گیا ہوں۔ حویلی کی تباہی کی رات فتح خان جیسے صرف یہ جاننے کے لئے وہاں نمودار ہوا تھا۔ زہرہ نے مرنے سے پہلے اس پر گولی چلا کر مجھے بچالیا تھا۔ فتح خان کے ہاتھ میں سوراخ ہوا تھا، یہ معمولی سا زخم تھا جو چند دن میں ٹھیک ہو جاتا اور پھر وہ میری غفلت کا فائدہ اٹھا کر فرار ہو گیا۔ اگر چہ میرے دشمن مرشد علی اور ڈیوڈ شا جان گئے ہوں گے کہ میں زندہ ہوں مگر یہ تو انہوں نے بھی نہیں سوچا ہوگا کہ میں غلطی سے سرحد عبور کر کے انڈیا کی حدود میں چلا گیا تھا۔ وہ اب تک مجھے پاکستان کی حدود میں تلاش کر رہے ہوں گے۔ اچانک مجھے خیال آیا۔ راجا عمر دراز مجھے انڈیا لانا چاہ رہا تھا اور قدرت نے خود مجھے وہاں پہنچا دیا تھا مگر اپنے طے کئے ہوئے راستے سے۔ جب میں نے حویلی کا رخ کیا تھا تو چند دن بعد ہماری روانگی تھی۔ کیا راجا عمر دراز بھی یہاں آ چکا ہے؟ میں نے سوچا۔ اس نے آسام جانا تھا اور میں شمالی مغربی انڈیا میں تھا۔ آسام یہاں سے کم سے کم دو ہزار میل کے فاصلے پر تھا۔ ممکن ہے تقدیر مجھے یہاں بھی راجا عمر دراز سے ملا دے۔

میری داستان کا ایک اور متحرک کردار ایمن تھی، کئی حوالوں سے وہ اس داستان میں شامل ہوئی تھی، پہلے

جب وہ نوعمری میں اپنے باپ کے ہمراہ آئی تھی اور برٹ شا نے عمر دراز کے محل سے تصویر چوری کرائی تھی اور اس کا الزام اس خاکسار کے سر آیا تھا۔ ایک لمبی جدوجہد کے بعد میں خود کو اس چکر سے نکال سکا تھا۔ میں نے ایمن کو بچایا تھا اور یہی بات ہمارے آئندہ کے تعلق کا سبب بن گئی۔ اس نے مجھ سے رابطہ کیا۔ برٹ شا غائب تھا۔ سب نے یہی سوچ لیا تھا کہ وہ مر چکا ہے۔ لیکن وہ فتح خان کی قید میں زندہ تھا بلکہ اب بھی ہے۔ پھر مرشد علی اور ڈیوڈ شا کا تعلق ہو گیا۔ ڈیوڈ شا جو برٹ شا کے خطاب اور جاگیر پر قابض ہو گیا تھا۔ ایمن اس کی دشمن تھی اور ڈیوڈ شا میرا دشمن تھا اس لئے ایمن خود بخود میرے کیمپ میں آ گئی لیکن میری طرف آنے کی صرف یہ وجہ نہیں تھی۔ نوعمری کی ملاقات میں اس کے اندر ایک پسندیدگی کی چنگاری باقی رہ گئی تھی اور جب ہم دوبارہ ملے تو یہ چنگاری بھڑک کر شعلہ بن گئی۔ اس نے کھل کر اپنی محبت کا اعتراف کر لیا۔

جہاں تک میرا تعلق تھا، میں اسے پسند ضرور کرتا تھا اور شاید ایک حد تک اس سے محبت بھی کرتا تھا لیکن یہ محبت ایسی نہیں تھی کہ میں اس کے حصول کا سوچتا۔ وہ محبت میں نے ایک بار ہی کی تھی۔ جب میں نے کسی کی چاہ کی تھی اور تقدیر نے اسے کسی اور کی جھولی میں ڈال دیا تھا۔ اب اسے چاہنا تو ایک طرف رہا، اس کے بارے میں سوچنا بھی میرے لئے گناہ سے کم نہیں تھا۔ سویرا کا خیال آیا تو باقی گھر والوں کی یاد بھی آئی تھی۔ بابا، ماں جی، بھائی اور آپا۔ سب مجھے یاد کرتے ہوں گے، ماں جی کے بارے میں تو میں جانتا تھا، ان کی کوئی شام آنسوؤں سے خالی نہیں جاتی ہو گی۔ بابا اوپر سے پتھر تھے اور اندر سے نرم۔ وہ سب کے سامنے میرا ذکر بھی نہیں کرتے ہوں گے لیکن اندر سے مجھے ضرور یاد کرتے ہوں گے۔

میں نے شکر ادا کیا تھا کہ شاہد بھائی کو میرے اور سویرا کے تعلق کا علم نہیں ہوا ورنہ ان کے لئے تو ساری عمر کی خوشی برباد ہو جاتی۔ مجھے یاد ہے، بچپن سے وہ میرے لئے اپنی پسندیدہ چیز کی قربانی دے دیا کرتے تھے۔ مجھے ان کی جو چیز پسند آتی تھی، میں آرام سے اس پر قبضہ کر لیا کرتا تھا اور وہ خوشی سے دستبردار ہو جاتے تھے۔ جو چیز ان کے لئے ضروری ہوتی تھی، میرے ذرا سے رونے دھونے پر وہ بھی میری نذر کر دیا کرتے تھے۔ میں نے دل کی گہرائیوں سے دعا مانگی کہ اللہ میرے بھائی اور سویرا کو خوش رکھے اور ان کو ڈھیر ساری خوشیاں دے۔

اچانک کسی نے دروازہ کھولا تو میں چونکا۔ یہ وہی کل والے دو ملازم تھے۔ یہ غالباً اس قید خانے کے نگران اور جیلر تھے۔ دونوں کے پاس دیسی ساخت کی شاٹ گنیں تھیں۔ ایک اندر آیا، اس نے کہا۔ ''ہاتھ آگے کر۔'' میں نے خاموشی سے حکم کی تعمیل کی تو اس نے ایک ہتھکڑی مجھے پہنا دی۔

''بڑے کنور کے سامنے جانا ہے۔'' اس نے گویا مجھے خبردار کیا۔ ''تمیز سے رہنا اور جب کچھ پوچھا جائے تو بولنا ورنہ چپ رہنا۔''

وہ مجھے لے کر باہر آئے۔ صبح سویرے کا وقت تھا اور سردی کی شدت سے ماحول دھواں دھار ہو رہا تھا۔ میں لرز اٹھا تھا، انہوں نے فرغل پہنے ہوئے تھے، میری جیکٹ یہاں کی سردی کا مقابلہ کرنے میں ناکام ہو رہی تھی۔ خدا خدا کر کے ہم محل کی عمارت میں آئے تو میری جان میں جان آئی تھی۔ مختلف راہداریوں سے گزرتے ایک وسیع و عریض کمرے میں پہنچے۔ اس میں ایک طرف آتش دان تھا اور اس میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ اس کے سامنے کرسی پر ایک جبہ پوش بیٹھا اور اس کا سر بھی سرپوش کے اندر تھا، اس کے عقب میں ایک کھڑکی کھلی تھی

جس سے سرد ہوا اندر آ رہی تھی، مجھے عمر دراز کا انداز فکر یاد آیا جب اسے کسی بات یا مسئلے پر غور کرنا ہوتا تو وہ اسی طرح گرم سرد ماحول میں بیٹھ کر سوچتا تھا۔ ''مالک! بندہ پیش ہے۔'' منشی دل جی نے کہا۔

سرپوش والے نے سر ہلایا۔ اس کا پورا جسم اس جبے میں اس طرح چھپا تھا کہ میں اس کی ذرا سی جھلک دیکھنے سے قاصر تھا۔ اس نے ہاتھ سے ہلکے سے اشارہ کیا تو منشی نے میرے ساتھ آنے والوں کو حکم دیا۔ ''تم دونوں باہر رکو۔ جب بلایا جائے تو آنا۔''

دونوں ذرا جھکے اور الٹے قدموں باہر نکل گئے۔ بڑا شاہانہ انداز تھا اس جگہ کا۔ ممکن ہے یہ خاندان انگریزوں کے زمانے سے راجا وغیرہ ہو۔ بھارت نے آزادی کے بعد جاگیریں، ریاستیں اور راجدھانیاں ختم کر دی تھیں لیکن بعض خاندان عملاً اب بھی اپنے علاقوں میں حکمران تھے اور ان کا قانون چلتا تھا کنور خاندان بھی ان میں سے ایک لگتا تھا۔ بڑے کنور نے سر ہلایا تو منشی جلدی سے جھک گیا۔ میں نے سرسراتی سی آواز سنی، الفاظ سمجھ میں نہیں آئے، منشی نے کھڑے ہو کر کہا۔ ''کنور جی پوچھ رہے ہیں، تم کیا کرتے ہو؟''

''میرا بزنس ہے، سپلائی کا۔'' میں نے سوچ سمجھ کر کہا۔ ''دفتروں میں ضرورت کا سامان سپلائی کرتا ہوں، ویسے میرا تعلق الہ آباد کے ایک زمیندار گھرانے سے ہے۔''

بڑے کنور نے پھر کچھ کہا۔ منشی اس کے سر ہلاتے ہی سرپوش سے لگ گیا تھا۔ ''کنور جی کہہ رہے ہیں، اپنا پتا اور فون نمبر بتاؤ۔ اپنے آبائی علاقے کا پتا بھی دو۔''

''کنور صاحب! اوّل تو میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں آپ کو جانتا نہیں ہوں اور نہ ہی میں نے آپ کا کوئی نقصان کیا ہے۔ مجھے سندھو نے پکڑ لیا تھا اور دھوکے سے میرے خون سے کوئی دوا بنا رہا تھا۔ اس لئے مہربانی کر کے مجھے جانے دیں۔''

''بکومت!'' منشی نے غصے سے کہا۔ ''کنور جی کے سوال کا جواب دو۔''

''سوری، میں جواب نہیں دوں گا۔ اگر میں نے کوئی جرم کیا ہے تو مجھے پولیس کے حوالے کر دیا جائے ورنہ جانے دیا جائے۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

سرپوش نے پھر کچھ کہا اور منشی نے اس کی ترجمانی کی۔ ''کنور جی کہتے ہیں تم ہم سے تعاون کرو تو تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ تمہیں انعام دیا جائے گا اور جانے کی اجازت بھی دے دی جائے گی۔''

''کیسا تعاون؟''

''یہ تمہیں بعد میں بتایا جائے گا۔''

''ایک انعام تو آتے ہی ملا ہے۔ کل سے کھانا تو ایک طرف رہا، پینے کو پانی بھی نہیں ملا ہے۔'' میں نے تلخی سے کہا۔

''تم فکر مت کرو، اس کی تلافی کر دی جائے گی۔'' منشی دل جی نے کہا۔

مجھے بڑے کنور کے بارے میں تجسس ہو رہا تھا آخر اس نے خود کو سرتاپا کیوں چھپا رکھا تھا کہ اس کا ایک ناخن تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ کیا وہ کسی خاص مرض میں مبتلا تھا یا نفسیاتی مریض تھا؟ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ وہ بیمار ہے اور اس کے علاج کے لئے ساری دنیا کے علاجوں کے بعد اس خبیث سپیرے سے رجوع کیا گیا تھا جو کالی ماتا کی

طرح انسانوں کی بلی لے کر دوائیں تیار کرتا تھا۔ اس نے راج کنور سے کہا تھا کہ وہ میرے خون سے بڑے کنور کے لئے دوائیں تیار کر رہا ہے۔ ممکن ہے اس کی بات سچ ہو لیکن مجھے لگ رہا تھا کہ وہ محض مجھے قبضے میں رکھنے کے لئے کنور کو استعمال کر رہا تھا۔

بڑے کنور نے بہ شرط تعاون مجھے رہا کرنے کی خوشخبری سنائی تھی۔ میں نے غور کیا کہ یہ تعاون کیا ہو سکتا تھا۔ کیا وہ چاہتا تھا کہ میں اس کے علاج کے لئے اپنے خون کی قربانی دیتا رہوں۔ بڑے کنور نے منشی دل جی کے توسط سے مجھ سے اور بھی کئی سوال کئے اس کے بعد منشی نے جیل کے نگران کو بلا کر میری ہتھکڑی کھلوائی اور مجھے بذاتِ خود محل کے ایک حصے میں لایا۔ بظاہر یہ مہمان خانہ تھا، کمرے فرنیچر اور آرائش اشیاء سے مزین تھے مگر وہاں جابجا مسلح پہرے داروں کی موجودگی سے میں کھٹکا تھا یا شاید ذرا معزز قسم کا قید خانہ تھا کیونکہ اب بڑے کنور کو میری ضرورت تھی اس لئے مجھے یہاں منتقل کر دیا گیا تھا۔ منشی نے مجھے اس معزز جیل خانے کے جیلر کے سپرد کیا۔ یہ بھی شریف اور نرم دل نظر آنے والا شخص تھا مگر اسے دیکھنے کے بعد بھی مجھے شبہ نہیں ہوا کہ یہ جیل خانہ نہیں ہے۔

''یہ بڑے کنور کے مہمان ہیں۔'' منشی نے کہا۔ ''ان کے آرام اور آسائش کا پورا خیال رکھنا ہے۔''

''آپ بے فکر رہیں منشی جی!'' اس نے کسی قدر معنی خیز انداز میں کہا۔

منشی مجھے اس کے سپرد کر کے چلا گیا۔ ''آیئے جناب!'' اس نے نستعلیق لہجے میں کہا اور مجھے ایک کمرے تک لایا۔ ''آپ کا قیام یہاں رہے گا۔''

''شکریہ، لہجے سے آپ دلی کے رہنے والے لگتے ہیں۔'' میں نے اندازے سے کہا۔

''جی جناب! یہ بھی باسی تھا اسی اجڑے دیار کا۔''

''آپ مسلمان ہیں؟''

''بہت سارے ہندو بھی آپ کو دہلی کی ڈھلی ہوئی زبان بولتے نظر آئیں گے۔'' وہ ہنسا۔ ''بندے کو پریم ناتھ کہتے ہیں۔ والد صاحب شاعری کرتے تھے اور کچھ نہیں کرتے تھے اس لئے خاصی کم عمری میں غم روزگار میں مبتلا ہونا پڑا۔''

''میں مسلمان ہوں رضوان احمد نام...... یہ اطلاع اس لئے کہ کھانے میں میری مسلمانیت کا خیال رکھئے گا۔''

''آپ بے فکر رہیں۔'' وہ ہنسا اور جانے لگا۔ پھر دروازے پر پہنچ کر رکا۔ ''ایک بات کا خیال رکھئے گا۔ یہاں بنا ضرورت اور بنا اجازت نقل و حرکت منع ہے۔''

''یعنی میں اس کمرے سے باہر نہیں جا سکتا؟''

''نہیں کمرے سے باہر جا سکتے ہیں لیکن مہمان خانے سے نہیں۔'' اس نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

کمرا مہمان خانہ ہوتے ہوئے بھی شاہانہ انداز کا تھا۔ شاندار ڈبل بیڈ، بڑی سی ڈریسنگ ٹیبل، دیوار گیر الماری اور فرش پر بچھا دبیز قالین، کھڑکی کے پردے قالین کے ہم رنگ تھے۔ وسط میں چھت کے ساتھ فانوس لٹک رہا تھا اور دیواروں پر شیشے کے گولے تھے جن کے اندر دودھیا بلب روشن تھے۔ جب ایک قیدی کے لئے یہ کمرا تھا تو کنور خاندان کی رہائش گاہوں کے بارے میں سوچا جا سکتا تھا۔ ایک طرف شیشے کی میز پر جگ وگلاس

رکھا تھا۔ میں نے اس سے پانی پیا۔ کل صبح کی کھائی باجرے کی روٹی کب کی ہضم ہو چکی تھی اور پیٹ میں صحیح معنوں میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ میں نے کمرے کے ساتھ غسل خانے کا معائنہ کیا۔ یہ بھی خاصا پُرتعیش قسم کا تھا۔ میں نے اس میں موجود سہولتوں سے استفادہ کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا تھا۔ باتھ ٹب میں گرم پانی بھر کر اور اس میں جھاگ بنانے والے لیکوڈ کے ساتھ یوڈی کلون بھی ڈالا، گرم پانی نے جیسے میرے اندر سے ساری کوفت مایوسی، تھکن اور درد کو نچوڑ لیا تھا۔ میں بالکل تازہ دم ہو گیا تھا۔ نہا دھو کر میں باہر آیا تو پریم ناتھ موجود تھا۔ اس نے بنا اجازت اندر آنے پر معذرت کی۔

"ناشتا تیار ہے، بس آپ کے آنے کی دیر ہے۔"

"پریم جی! مجھے دوسرا لباس اور ایک عدد بار برچاہیے۔"

"آپ ناشتا کرلیں۔ دونوں چیزیں آجائیں گی۔"

ناشتا پُرتکلف تھا۔ بکرے کے بھنے ہوئے گردے، کلیجی اور تلے ہوئے انڈوں کے ساتھ دیسی گھی میں بنے پراٹھے، مکھن اور دودھ کے ساتھ سنگترے کا جوس تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ قربانی کے جانور کو کھلایا پلایا جا رہا ہے۔ کنور خاندان کی مہربانیوں پر مجھے ذرا بھی شبہ نہیں تھا کہ وہ کس لیے یہ سب کر رہے تھے، مگر میں نے ہر چیز سے انصاف کیا اور ڈٹ کر کھایا۔ بھرپور ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے حجامت بنوائی۔ شیو کے ساتھ ہی سر کے بال بھی چھوٹے کرائے جو خاصے بڑھ گئے تھے۔ میرے کمرے میں پریم ناتھ چند جوڑوں کے ساتھ میرا منتظر تھا۔ یہ اونی کُرتے اور پاجامے تھے جن کے ساتھ روئی کی صدریاں تھیں۔ میں نے اس میں سے ایک سائز لیا۔

"میرا خیال ہے یہ مجھے آجائے گا۔" میں نے کہا۔

"بہتر، میں ایسا ہی ایک کُرتہ، پاجامہ اور بھیج دیتا ہوں یا آپ کوئی اور لباس پہننا پسند فرمائیں گے؟"

"اگر مل سکے تو گرم ٹراؤزر اور اونی جرسی، یہاں سردی زیادہ ہے۔"

"جی جناب، چند دن پہلے ہلکی سی برف باری بھی ہوئی تھی۔ یہ جگہ سطح سمندر سے چار ہزار فٹ کی بلندی پر ہے۔"

"کیا یہ جگہ ہماچل پردیش میں ہے؟"

"جی جناب! راج پور نام ہے۔ راج کنور موجودہ راج کنور صاحب کے پردادا تھے، انگریزوں نے ان کو یہ جاگیر دی تھی۔"

"یہ وادی اب بھی ان کی ملکیت ہے؟"

"ایسا ہی سمجھ لیں جناب، یہاں بسنے والا ہر شخص بڑے کنور صاحب کی رعایا میں شامل ہے۔"

"ایک گھنٹے بعد مجھے بھجوا کافی دیجئے گا۔"

اس کے جانے کے بعد میں نے ایک بار پھر غسل خانے کا رخ کیا۔ سر دھو کر لباس تبدیل کیا۔ براق سفید رنگ کا یہ لباس میرے ناپ کے عین مطابق تھا اور بالکل نیا تھا۔ پیٹ بھر کر کھانے کا خمار رفتہ رفتہ مجھ پر حاوی ہو رہا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی "آجاؤ۔" میں نے بلند آواز سے پکارا۔

ایک تیکھے نقوش والی نوجوان لڑکی اندر آئی۔ اس نے ٹرے میں کافی کے لوازمات اٹھا رکھے تھے۔ "نمستے

سرکار۔"

میں نے سر کے اشارے سے اس کے سلام کا جواب دیا۔"کافی بنادو۔"

اس نے سلیقے سے کافی بنائی۔ چینی اور کریم کا پوچھا۔ میں نے کریم سے منع کر دیا۔"صرف چینی ڈال دو ایک چمچ، تم ملازمہ ہو؟"

"جی سرکار سونتا نام ہے ہمارا۔"

میں نے اس کے نام پر تبصرے سے گریز کیا۔ ممکن ہے اسے میرا نام عجیب لگتا۔ سرخی مائل سفید رنگ کی یہ لڑکی دلکش اور معصومانہ نقوش رکھتی تھی۔ ساڑھی اس کے کسی قدر بھرے جسم پر سج رہی تھی۔

"اچھا نام ہے، سونتا! اس کے کیا معنی ہوئے؟"

"پتا نہیں صاحب! ماتا پتا نے رکھا تھا نام۔"

"اچھا سونتا! یہ بتاؤ، محل میں ایک سپیرا اور اس کی بیٹی آئے تھے، تم کو ان کے بارے میں پتا ہے؟"

"نہیں صاحب، ہم تو بس اس جگہ ہوتے ہیں۔" اس نے معصومیت سے کہا اور کافی تیار کر کے مگ مجھے تھما دیا۔"اگر ہماری جرورت ہو تو یہ بٹن دبا دیجئے گا۔" اس نے دیوار پر لگے ایک بٹن کی طرف اشارہ کیا اور باہر چلی گئی۔

میں آرام دہ کرسی پر نیم دراز کافی کے سپ لینے لگا۔ بڑے کنور کا رویہ میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ میرے حالات اتنی جلدی پلٹا کھائے تھے کہ مجھے یہ سب عجیب اور مصنوعی سا لگا تھا، کہاں تو میں بارہ گھنٹے سے قید خانے میں بھوکا پیاسا پڑا تھا اور اچانک ہی مجھے شاہی مہمان کا درجہ دے دیا گیا۔ جیسے شہزادے کو اچانک جادوگر کی قید سے رہائی دے کر شاہی محل میں پہنچا دیا گیا ہو مگر یہ محل بھی ایک دھوکا تھا۔ وقت بدلتا تو شہزادے کو پتا چلتا کہ وہ جادوگر کی قید میں ہی ہے صرف قید خانہ بدلا ہے۔ بہرحال کسی نئی ابتلا سے پہلے یہ مہلت بھی غنیمت تھی، میں جسمانی اور ذہنی طور پر خود کو تیار کر سکتا تھا۔ اس کے بعد بڑے کنور اپنے اصل روپ میں سامنے آتے بھی تو مجھے حیرت نہ ہوتی۔ کافی لذیذ تھی اس سے نیس کیف کی مخصوص خوشبو تو نہیں آ رہی تھی مگر اس کی مہک نیس کیف سے اچھی ہی تھی۔ کنور صاحب اپنے لئے کوئی خصوصی بلینڈ ہی منگواتے ہوں گے۔ نیس کیف تو عام آدمی بھی پیتا ہے اور جو چیز عام آدمی کی رسائی میں ہو وہ ان بڑے لوگوں کے ناک تلے کہاں آتی تھی۔ میں نے جلد مگ خالی کر دیا۔ ناشتا، غسل، حجامت، نیا لباس اور پھر کافی ان سب نے میری روح کو سرشار کر دیا تھا۔

سوچتے سوچتے میں نے محسوس کیا کہ میرا سر ہلکا سا بھاری ہو رہا ہے۔ میں نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور اٹھنا چاہا تو کمرا میری نظروں کے سامنے گھوم گیا تھا۔ یہ کیا ہو رہا تھا۔ میں گرتے گرتے بچا تھا، بڑی مشکل سے میں کھڑا ہوا اور ڈگمگاتے قدموں سے دیوار پر لگے بٹن کی طرف بڑھا۔ مجھے کافی میں کچھ دیا گیا تھا۔ کوئی زہر یا کوئی سریع الاثر دوا۔ مجھے بٹن تک پہنچنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ میں دھڑام سے منہ کے بل قالین پر گرا تھا۔ اگر یہ دبیز قالین نہ ہوتا تو مرے دانت ٹوٹ جاتے یا ناک چاپانی ہو جاتی۔ چکراتے ذہن کے ساتھ میں نے دروازہ کھلتے دیکھا اور نائیک اندر آیا تھا۔ اس نے نزدیک آ کر جھک کر مجھے دیکھا اور تمسخر اڑانے والے انداز میں کہا۔

"کیا حال ہیں مہاشے جی؟"

اس کے ساتھ ہی مجھے ہوش نہیں رہا تھا۔

مجھے ہوش آیا تو میں کسی بند سی جگہ پر ایک چٹائی پر لیٹا تھا، میرے جسم پر صرف پتلون اور شرٹ تھی مگر یہاں سردی خاص نہیں تھی اور کمرے میں کوئی حرارت والی شے بھی نہیں تھی۔ چاروں طرف سے بند اس کمرے کا صرف ایک دروازہ تھا، اس کے اوپر گول دائرے میں جالیاں لگی تھیں، ان سے تازہ ہوا کی آمدورفت جاری رہتی تھی کیونکہ کمرے میں گھٹن ذرا بھی نہیں تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ کسی تہہ خانے میں تھا۔ اس موسم میں صرف زیرزمین تہہ خانے ہی گرم ہوتے ہیں۔ دوا کا اثر ختم ہو گیا تھا اور میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ میں یاد کرنے لگا جب سونا مجھے کافی دے کر گئی اور دوا کا اثر ہونے لگا تھا تو نائیک اندر آیا تھا۔ آخر اس کا مقصد کیا تھا۔ میں مکمل طور پر ان لوگوں کے قبضے میں تھا، اگر انہوں نے میرے خلاف کچھ کرنا تھا تو اس کے لئے انہیں یہ کام کرنے کی ضرورت نہیں تھی، تو کیا نائیک نے اپنے آقاؤں سے چھپ کر یہ حرکت کی تھی؟ راج کنور یا بڑے کنور کو یہ سب کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

میں نے سر جھٹکا۔ ''جو ہوگا دیکھا جائے گا۔''

اسی لمحے دروازہ کھلا، پہلے راج کنور اور پھر نائیک اندر آئے۔ نائیک نے حسبِ معمول جسم کی نمائش کرنے والا باریک کرتہ پہن رکھا تھا، اس کمرے میں اسے صدری کی ضرورت نہیں تھی، میں کھڑا ہو گیا تھا۔

''راج کنور! اس حرکت کا مقصد؟''

وہ مسکرایا۔ ''تم نے راستے میں بہت بکواس کی تھی، اس کا حساب لینا ہے۔''

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''میں نے تو کچھ نہیں کہا تھا تمہیں؟''

''تو نے سورما بننے کی کوشش تو کی تھی۔'' نائیک کڑوے لہجے میں بولا۔ ''بہت اکڑ ہے تجھ میں، آج سب نکل جائے گی۔''

''اوہ اچھا!'' میں نے گہری سانس لی۔ راج کنور اور اس کا چمچہ خاص نائیک دونوں ایک جیسے کمینے تھے، جو ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا تھا یہ اس کے دشمن ہو جاتے تھے۔ ''راج کنور! اس کے لئے دھوکے سے بے ہوش کرنے کی کیا ضرورت تھی، تم مجھے براہ راست بھی یہاں لا سکتے تھے۔''

وہ مسکرایا۔ ''بس ایک وجہ تھی۔''

''اب تم کیا چاہتے ہو؟''

''تجھے نائیک سے مقابلہ کرنا ہوگا۔''

میں نے نائیک کی طرف دیکھا، اس نے اپنا کرتہ اتار دیا تھا۔ ''میں اس سے مقابلہ کیوں کروں اور اس سے کیا فائدہ ہوگا؟''

''اگر تو نے نائیک کو ہرا دیا تو تجھے جانے کی اجازت ہوگی۔'' راج کنور بولا۔ میں نے دیکھا، اس کے کرتے کی جیب ذرا لٹکی ہوئی تھی یعنی اس میں کوئی ہتھیار تھا۔

''سچ مچ!'' میں نے استہزائیہ لہجے میں پوچھا۔ ''تم اتنے ہی بااختیار ہو تو مجھے اس طرح یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی؟''

"تیری جبان بند کرنا پڑے گی۔" نائیک دانت پیستا میری طرف آیا، اس کے گٹھے ہوئے طاقتور جسم سے لگتا تھا کہ وہ باقاعدگی سے کسرت کرتا ہے۔ میں اس کے لڑنے کے انداز سے ناواقف تھا، ممکن ہے وہ کراٹے اور جوڈو کا استعمال کرتا ہو یا دیسی کشتی کے داؤں پیچ لگاتا ہو مگر اس نے ویسٹرن فلموں کے انداز میں مجھے مکا رسید کرنے کی کوشش کی۔ میں نے بچنا چاہا اور عام حالات میں، مَیں بچ بھی جاتا مگر اس وقت میری حرکت کسی قدر سُستی سے ہوئی تھی۔ میں نے جتنی تیزی سے سر بچانا چاہا تھا، وہ ممکن نہیں ہو سکا اور شاید یہ دوا کا اثر تھا۔ مکا میرے دائیں رخسار کو چھوتا گیا اور میں چٹائی پر جا گرا۔ راج کنور مسکرایا تھا۔ میں نے تیز لہجے میں کہا۔ "مجھے کوئی دوا دی گئی ہے۔ میں پوری طرح چوکس نہیں ہوں۔"

"بہانے مت کرو۔" نائیک نے مجھے گریبان سے پکڑ کر کھینچا اور میں خود کھنچا چلا آیا لیکن جب میں نے اسے جوابی گھونسا مارنے کی کوشش کی تو مجھے پتا چلا کہ میرا ہاتھ بھی اتنا ہی سُست ہو رہا تھا جتنا کہ میرا باقی جسم۔ نائیک نے بہ آسانی خود کو بچایا اور مجھے دوسرا گھونسا رسید کیا، میں پھر چٹائی پر جا گرا۔ اس بار مجھے منہ میں خون کا ذائقہ محسوس ہوا تھا۔ راج کنور کی سازش میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ مجھے اس طرح بے بس کر کے اور پٹوا کر اپنی انا کی تسکین کرنا چاہتا تھا۔ میں اٹھا تو نائیک دوبارہ میری طرف جھپٹا تھا، وہ خود بھی مجھے پیٹنے کے لئے بے تاب نظر آتا تھا۔ میں نے بظاہر تو اسے گھونسا مارنے کی کوشش کی مگر ساتھ ہی میرا گھٹنا اٹھا اور نائیک کی رانوں کے درمیان میں لگا۔ بے شک میری رفتار سُست تھی مگر اس کا ازالہ اس کی رفتار نے کر دیا۔ میرا گھٹنا خاصی قوت سے اس کے جسم کے نازک ترین مقام پر لگا تھا۔ نائیک کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی تھی اور وہ پیچھے جا گرا۔ میں نے راج کنور کی طرف دیکھا۔

"کیسا بودا ہے تمہارا آدمی، ایک وار نہیں سہہ سکا؟"

راج کنور کا چہرہ غصے سے سیاہ ہو گیا تھا۔ اس نے نائیک کی ماں بہن کو یاد کرتے ہوئے اسے حرام خوری کا طعنہ دیا۔ میں پھر ہنسا۔ "اس کا قصور نہیں ہے، یہ شاید آج تک تمہارے کسانوں کی پٹائی لگاتا رہا تھا۔"

نائیک بمشکل اٹھا اور ایک بار پھر حملہ آور ہوا لیکن اس حملے میں زیادہ زور ان گالیوں پر تھا جو اس کے منہ سے نکل رہی تھیں۔ میں نے اس کے نزدیک آنے کا انتظار کیا اور یکدم زمین پر گرتے ہوئے سلپ لگائی۔ وہ مجھ سے ٹکرا کر منہ کے بل گرا تھا اور سخت فرش نے اس کے ناک منہ کو برابر کر دیا تھا۔ وہ ذرا سا اٹھا تو اس کے چہرے پر خون تھا۔ میں اس حالت میں بھی اس پر بھاری پڑ رہا تھا۔ میں ہنسا۔ "گیا تمہارا یہ کھل نائک!"

نائیک نے چیخ کر مجھے گالی دی۔ جواب میں، مَیں نے قدرے سُستی سے سہی لیکن اس کی پسلیوں پر دو تسلی بخش قسم کی ٹھوکریں رسید کیں۔ وہ صرف نمائش کی چیز تھا جس سے راج کنور دوسروں کو ڈرانے دھمکانے کا کام لیا کرتا تھا۔ اسے لڑنا نہیں آتا تھا، سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس کے اندر مقابلے کی ہمت نہیں تھی۔ مجھے کافی میں سُست کرنے والی دوا دینے کے باوجود وہ مجھ پر قابو نہیں پا سکا تھا اور دو ضربوں نے اس کا کام تمام کر دیا تھا۔ میں نے اسے ایک ٹھوکر اور ماری، اسی لمحے مجھے آنکھوں کے گوشوں سے کوئی شے اپنی طرف آنے کا احساس ہوا، وہ شے میرے سر سے ٹکرائی اور اگلے ہی لمحے میں پھر بے ہوش ہو چکا تھا۔

پہلی بار ہوش میں آنے کے بعد طبیعت جتنی اچھی تھی، دوسری بار اتنی ہی تکلیف ہو رہی تھی۔ سر کے اندر

درد کا ایک سمندر شور مچا رہا تھا اور جب اس کی منہ زور لہریں سر کی دیواروں سے ٹکراتی تھیں تو اذیت سر سے شروع ہو کر سینے تک جاتی تھی، اس سے نیچے معدے میں متلی کا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے آنکھیں کھولنے سے گریز کیا۔ نہ جانے راج کنور نے کس چیز سے وار کیا تھا۔ مجھے اپنی ساری کھوپڑی پلپلی سی لگ رہی تھی۔ شاید اس کے اندر میرا مغز ڈول رہا تھا۔ مجھے سر کو چھوتے ہوئے بھی ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں میری انگلیاں سر میں نہ گھس جائیں۔

خاصی دیر بعد جا کر سر کی تکلیف کسی قدر کم ہوئی تو مجھے شدت سے غصہ آنے لگا۔ یہ غصہ حالات پر تھا جنہوں نے مجھے کھلونا بنا لیا تھا اور جیسے چاہے مجھ سے کھیل رہا تھا۔ غضب خدا کا، پچھلے چند گھنٹوں میں دو بار بے ہوش کیا جا چکا تھا۔ جب غصہ بھی ذرا کم ہوا تو میں نے ڈرتے ڈرتے اپنے سر کو چھوا۔ میرا خیال تھا کہ کھوپڑی گل و گلزار ہو رہی ہوگی مگر اسے بے داغ اور بے خراش پا کر میں دنگ رہ گیا تھا۔ میں نے اچھی طرح ٹٹولا، کسی چوٹ یا گومڑ کا نام و نشان نہیں تھا۔ میں نے آنکھیں کھولیں اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ یہ مہمان خانے کا وہی کمرا تھا جو مجھے دیا گیا تھا۔ میں بستر پر لیٹا تھا۔ برابر میں تپائی پر پانی کا جگ، گلاس اور دو عدد سفید رنگ کی گولیاں تھیں جو بظاہر اسپرین کی لگ رہی تھیں مگر میں نے ان کو نظر انداز کر کے جگ سے پانی پیا اور تقریباً سارا ہی جگ پی گیا تھا۔ پانی پی کر میری حالت میں خاصی بہتری آئی تھی۔

کھڑکی کے باہر تاریکی تھی۔ یعنی رات ہو چکی تھی اور میں نے نہ جانے کتنا وقت بے ہوشی میں گزار دیا تھا۔ میرا خالی پیٹ بتا رہا تھا، مجھے آخری بار کھانا کھائے ہوئے خاصی دیر ہو چکی ہے۔ کمرے میں کوئی گھڑی نہیں تھی۔ میں نے ملازم کو بلانے والی گھنٹی کے بٹن پر ہاتھ رکھا۔ چند لمحے بعد دروازے پر دستک ہوئی اور اس کے چند لمحے بعد دروازہ کھلا اور وہی تیکھے نقوش والی حسین لڑکی اندر آئی جس نے کافی میں مجھے کوئی نشے والی دوا دی تھی۔ ممکن ہے وہ ساقی ہوتی تو لوگ اس کے ہاتھ سے زہر بھی خوشی سے پی لیتے، اس کے معصوم چہرے پر ذرا بھی پریشانی یا شرمندگی نہیں تھی حالانکہ کافی اس نے ہی لا کر دی تھی۔

"میں نے کافی تم سے منگوائی تھی؟" میں نے ڈانٹ کر پوچھا۔

"جی سرکار" اس نے ترنم سے کہا۔

"بنائی کس نے تھی، تم نے؟"

"نہ جی! وہ کیا ہے......رام لال، اس نے بنائی تھی۔" اس نے سہم کر کہا۔ "کیا اچھی نہیں سرکار؟"

گویا کافی میں دوا رام لال نے ڈالی تھی، اس لڑکی کو کچھ کہنا بے کار تھا میں نے اس سے کام کی بات کی۔

"مجھے بھوک لگ رہی ہے۔"

"میں کھانے کو کچھ لاتی ہوں سرکار۔"

"میرے فوت ہونے سے پہلے لے آنا۔"

وہ کچھ نہیں۔ "کیا سرکار؟"

"کھانے کو لاؤ بی بی!"

وہ میرے بے تکلفی پر شوخ لہجے میں ہنسی اور چلی گئی۔ میں بستر پر دراز ہو کر اس چکر پر غور کرنے لگا۔ راج کنور نے مجھے اس طرح کیوں بلایا تھا۔ اسے کس کا خوف تھا میرے معاملے میں؟ ظاہر ہے بڑے کنور کا اور

بڑے کنور کو مجھ سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی جس کی وجہ سے راج کنور کو یہ کام چھپ کر کرنا پڑا تھا۔ اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ سوہنا کچھ دیر بعد میرے لئے ٹرالی میں رکھ کر کھانا لائی۔ میں نے منہ ہاتھ دھو کر کھانا کھایا۔ میں نے اس دوران میں سوہنا سے انٹرویو کیا۔ "کل جب تُو کافی لے کر آئی تھی تو اس کے بعد دوبارہ نہیں آئی؟"

"ہماری چھٹی ہو گئی تھی سرکار۔"

"تُو آج آئی تو اب سے پہلے میرے کمرے میں نہیں آئی؟"

"کیسے آتی جی! ادھر آپ نے تختی لگا رکھی تھی۔"

"کیسی تختی؟" اس نے مجھے دروازے کے باہر سے لٹکنے والی تختی لا کر دکھائی جس پر ڈونٹ ڈسٹرب لکھا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "اس کا مطلب سمجھتی ہو؟"

"نہ جی! پر اتنا پتا ہے جب یہ تختی لگی ہو تو کمرے میں نہیں جانا۔"

یعنی ان لوگوں نے پکا بندوبست کر لیا تھا۔ کسی کو پتا نہیں چلا کہ میں کمرے سے باہر ایک تہہ خانے میں تھا جہاں راج کنور نے اپنے گرگے نائیک کے ذریعے میری مرمت لگوا کر اپنی اَنا کی تسکین کا سامان کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان کو میری طرف سے خطرہ تھا اس لئے کافی میں مجھے جسمانی حرکات سُست کرنے والی دوا دی تھی یا وہ بے ہوش کرنے والی دوا کے مابعد اثرات تھے اس کے باوجود نائیک مجھ پر حاوی نہ ہو سکا تھا اور زیر ناف ضرب کھانے کے بعد اس نے اپنی ناک بھی تڑوالی تھی۔ اس کے بعد راج کنور نے مجھے ناک آؤٹ کر دیا تھا۔ یہ سب مجھے بچگانہ سا لگا تھا۔ بہرحال راج کنور ایک فیوڈل لارڈ تھا اور اپنی اَنا کی تسکین کے لئے اس سے کسی بھی حرکت کی توقع کی جا سکتی تھی۔

ایک ناکام کوشش کے بعد وہ دوسری حرکت کر سکتا تھا یا اس نے میرا سر بجانے کو کافی سمجھا تھا، اس نے میرے سر پر کوئی ایسی چیز ماری تھی جو نرم اور وزنی تھی، یہ کام چمڑہ چڑھے سیسے کے ٹکڑے سے لیا جا سکتا تھا یا تھیلی میں ریت بھر کر بھی لیا جا سکتا ہے، اسے رسی سے باندھ کر اور گھما کر کسی کے سر پر مارا جائے تو اس کا مغز ہل جاتا ہے۔ بظاہر کوئی چوٹ نہیں آتی ہے مگر ضرب کی شدت سے موت بھی واقع ہو سکتی ہے ورنہ ہوش تو غائب ہو جاتے ہیں جیسے میرے ہو گئے تھے۔ سوہنا برتن لے کر چلی گئی۔ وہ نصف گھنٹے بعد آئی تھی۔ "سرکار، آپ کو بڑے کنور نے بلایا ہے۔"

"بڑے کنور نے...... کہاں؟"

"ابھی چلو گے تو دیکھ لینا۔ دیر مت کرو، وہ خفا ہوں گے۔"

بڑا کنور اپنے مخصوص کمرے میں موجود تھا۔ یعنی آتش دان کے سامنے کرسی پر بیٹھا تھا اور شال کی طرف کھلی کھڑکی سے یخ بستہ ہوا آ رہی تھی۔ بڑا کنور مخصوص چغے میں تھا اور خاص بات یہ تھی کہ اس کے سامنے ایک عدد کرسی رکھی تھی۔ میں اندر آیا اور سوہنا نے اسے میری آمد کی اطلاع دی تو اس نے سر ہلایا اور بولا۔ "شہباز ملک، سامنے بیٹھ جاؤ۔"

"تم...... مجھے جانتے ہو؟" میں چونکا اور کرسی پر بیٹھنا بھول گیا تھا۔

اس نے سر بلکہ بڑ ہلایا اور اپنی دھیمی کھرکھراتی آواز میں بولا۔ "دو دن اس کام میں لگے مگر مجھے تمہارے

بارے میں سب پتا چل گیا۔"

"مثلاً؟" میں نے استہزائیہ انداز میں کہا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ مجھے میری جیکٹ صاف ستھری حالت میں مل گئی تھی اس لئے خاص سردی نہیں لگ رہی تھی۔

"کہاں سے شروع کروں؟ تمہارے باپ ملک صاحب سے ...... یا اس پیاری سی لڑکی سے جو اب تمہاری بھابی ہے؟ مونا اور سفیر کے بارے میں بتاؤں یا مرشد علی اور ڈیوڈ شا کے بارے میں؟ حرف آخر میں لال حویلی کا ذکر کروں یا راجا عمر دراز کا؟ وہ اب بھارت میں ہے۔"

"بس...... بس، میں نے مان لیا۔ تم میرے بارے میں سب جان گئے ہو مگر اس کا مقصد......؟"

"میں خود سے متعلق ہر آدمی کے بارے میں اپنی معلومات مکمل رکھنے کا عادی ہوں، یہ سوچے بغیر کہ اس سے مجھے فائدہ ہوگا یا نہیں؟" اس نے کہا۔ "شہباز ملک، میرا مشغلہ انسانوں اور ان کے رویے پڑھنا ہے اور میں ہر بار کچھ نہ کچھ نیا جان لیتا ہوں۔"

"کیونکہ ہر انسان ایک نیا انسان ہوتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "مگر تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"سندھو کا کہنا ہے، تمہیں شاہ کو برا نے ڈسا تھا اور تم بچ نکلے اس لئے تمہارا خون کچھ ایسے اثرات رکھتا ہے جس سے بعض بیماریوں کا علاج کیا جا سکتا ہے۔"

"لہٰذا اب تم میرا خون نچوڑو گے۔" میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"نہیں، تمہارے جسم سے ہر ہفتے ایک لیٹر خون لیا جائے گا۔ نارمل حالت میں آدمی کے جسم کی یہ کمی ایک ہفتے میں پوری ہو جاتی ہے لیکن ہر ہفتے خون لیا جائے تو اس سے بعض خطرات ہوتے ہیں مگر ان کا بھی ازالہ کیا جا سکتا ہے۔ طاقتور خون بنانے والی دواؤں اور ڈرِپس سے۔"

"یعنی تم ہر ہفتے میرا ایک لیٹر خون نکالو گے، اس سے دوا بنے گی تو تمہیں کیا فائدہ ہوگا؟"

اس نے آہستہ سے چغے کا ہڈ الٹ دیا۔ وہ پھسل کر اس کے شانوں تک آ گیا۔ میں لرز گیا تھا، میرے سامنے ایک کریہہ المنظر شخص بیٹھا تھا جس کے چہرے اور گردن کے نظر آنے والے حصوں پر عجیب سے داغ تھے جیسے کسی سانپ کی کھال پر قدرت نقش بناتی ہے۔ اس نے چغے کی آستینیں بھی الٹ دیں۔ اس کے پنجوں اور کلائیوں پر بھی ایسے ہی نشان تھے۔ "مجھے سترہ برس کی عمر میں ایک سانپ نے ڈس لیا تھا۔ کوشش کر کے میری جان بچا لی گئی تھی لیکن اس کے بعد سے یہ دھبے میرے پورے جسم پر پھیل گئے، اس کے اثر سے میرے جسم کے سارے بال جھڑ گئے اور میں روشنی برداشت کرنے کے قابل نہیں رہا۔"

اس نے چوغہ درست کر لیا۔ سترہ برس کی عمر سے وہ اس طرح کپڑے کے قید خانے میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس کی عمر چالیس برس بھی ہو سکتی تھی اور پچاس برس بھی۔ اس نے ایک طویل عرصہ اسی طرح گزارا تھا۔

"کیا تم نے اس کا علاج نہیں کرایا؟"

"دنیا میں جہاں بھی کوئی طریقہ علاج رائج ہے میں وہاں گیا مگر......" اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوا۔" میں نے اس کی بات مکمل کی۔ "پھر تمہیں سندھو کے طریقہ علاج پر کیوں یقین ہے؟"

''اس سے مجھے فائدہ ہوا ہے۔ وہ دو سال سے میرا علاج کر رہا ہے اور میری حالت خاصی بہتر ہوئی ہے۔ اس سے پہلے میری کھال گلنے لگی تھی۔''

''سندھو ایک دھوکے باز آدمی ہے۔ مجھ سے پہلے وہ دو افراد کو اسی طرح خون نچوڑ کر مار چکا ہے۔''

''سندھو مجھے دھوکا نہیں دے سکتا۔'' اس نے جواب دیا۔ دو افراد کے مارے جانے کی بات اس نے نظرانداز کر دی تھی۔ ''اور بے فکر رہو۔ یہاں وہ اپنے طریقے سے کام نہیں کرے گا۔ خون ڈاکٹر کی نگرانی میں نکالا جائے گا اور کسی بھی خطرے کی صورت میں خون لینے کا عمل روک دیا جائے گا۔''

''اتنی مہربانی کیوں؟'' میں نے کسی قدر طنز سے کہا۔ ''میں تمہارے قبضے میں ہوں، چاہو تو میرے جسم کا سارا خون ایک ساتھ نکال لو۔''

''مجھے صحت چاہئے لیکن اس کے لئے میں کسی کی جان نہیں لینا چاہتا۔''

''سندھو نے تمہارے لئے دوائی بنانے کے لئے دو انسانوں کی جان لی تھی۔''

''میں بے خبر تھا، اب ایسا نہیں ہوگا۔''

''او کے، میں نے مان لیا، تم ایک رحم دل اور اچھے انسان ہو۔ اب یہ بتاؤ، مجھے اس کے بدلے کیا ملے گا؟''

''جو تم چاہو۔ تم غیر قانونی طور پر بھارت میں آئے ہو اور تم جانتے ہو کہ تم پولیس کے ہاتھ لگ گئے تو تمہارا کیا ہوگا؟''

''تشدد سے جیل میں انتقال۔''

''میں تمہیں بحفاظت واپس پاکستان پہنچانے کا ذمہ لیتا ہوں۔ نقد انعام جو تم مانگو، لیکن مجھے امید ہے تم کوئی نامعقول مطالبہ نہیں کرو گے۔''

میں نے سر ہلایا۔ ''تمہاری باتوں سے لگتا ہے تم نے باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہے۔''

''میں اسکول کالج، یونیورسٹی نہیں گیا مگر میرے پاس ان سب لوگوں سے زیادہ علم ہے جو عمر کے بیس پچیس سال ان اداروں میں گزار دیتے ہیں۔ تم مجھ سے فلکیات سے لے کر زعفران کی کاشت تک کسی بھی موضوع پر بات کر سکتے۔ میں نو زبانیں جانتا ہوں۔ ان میں بین الاقوامی زبانیں بھی شامل ہیں۔''

''تمہاری اردو بھی بہت اچھی ہے۔''

''شکریہ اس کا مطلب ہے تم نے سمجھوتا کر لیا ہے۔''

''مجبوری ہے، اگر میں انکار کروں گا تو تم زبردستی پر اتر آؤ گے اور میں تمہارے قبضے میں ہوں۔'' میں نے شانے اچکائے۔

''مجبوری تو ہے۔ مجھے ہر قیمت پر صحت چاہئے مگر تم بے فکر رہو، تمہیں نقصان نہیں ہوگا۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ تم کسی کی جان بچانے کے لئے خون کا عطیہ دے رہے ہو اور یہ غلط بھی نہیں ہے۔''

''میں نے مان لیا، مجھے تمہاری طرف سے خطرہ نہیں ہے لیکن تمہارا بھائی راج کنور!''

وہ چونکا۔ ''راج نے تم سے کچھ کہا؟''

میں نے اسے مختصر الفاظ میں بتایا کہ میرے ساتھ کل کیا ہوا تھا۔ "اگر میرے سر پر گومڑ ہوتا تو ابھی شو
ل جاتا، خیر تم نائیک کی صورت ملاحظہ کر سکتے ہو۔ میں نے اس کی ناک توڑ دی تھی۔ ممکن ہے وہ اپنے سا
کے دانتوں سے بھی محروم ہو گیا ہو؟"

"یہ راج نے اچھا نہیں کیا۔ بہر حال تم فکر مت کرو، اب ایسا نہیں ہوگا۔"

"میں اپنی حفاظت کر سکتا ہوں، میں نے سوچا تمہارے علم میں لے آؤں۔"

"میں راج کو سمجھا دوں گا۔" اس نے کہا۔ "یہ بتاؤ کہ ڈیوڈ شاہ اور راجا عمر دراز میں کتنا تنازعہ ہے؟"

"تم نے تو کہا تھا کہ تم سب جانتے ہو؟"

"ہاں، مگر تفصیلات کے ساتھ نہیں۔ دو دن میں اتنا معلوم کر لینا بھی میرا ہی کام ہے۔ چند دن اور ملتے
میں یہ بھی معلوم کر لیتا۔"

میں نے غور کیا اور بولنا شروع کیا۔ "ان دونوں کے درمیان تنازعہ کچھ خاندانی نوعیت کا ہے۔ عمر دراز
ڈیوڈ شا کا چچا ولیم شا ایک ساتھ کسی ہمالیہ کی مہم پر گئے تھے اور وہاں سے ان کے ہاتھ کچھ نوادرات لگے تھے۔ سا
تنازع ان نوادارات کی ملکیت کا ہے۔"

"میں نے سنا ہے کہ ان نوادارات سے کچھ اور کہانیاں بھی منسلک ہیں۔ جیسے ایک پُر اسرار وادی کی کہانی
جو ہمالیہ کے وسط میں پائی جاتی ہے۔"

"میں نے بھی سنا ہے لیکن میں ان سے کلی طور پر واقف نہیں ہوں۔" میں نے بادلِ ناخواستہ کہا۔ اب
مجھے ذرا تشویش لاحق ہو گئی تھی۔ بڑا کنور اس معاملے میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لے رہا تھا اور کچھ زیادہ ہی باخبر بھی
تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ چغے کے سرپوش کی اوٹ سے وہ مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔

"کیا یہ درست ہے کہ عمر دراز کے پاس ایک ایسا پتھر ہے جو سیاہ ہے مگر اسے روشنی میں رکھو تو وہ سفید
چمکدار ہو جاتا ہے؟"

"درست ہے۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"راجا کا ایک حکیم ہے جو امراض اور چوٹوں کا حیرت انگیز علاج کرتا ہے؟"

"یہ بھی درست ہے۔" میں نے بادلِ ناخواستہ جواب دیا۔ "اس نے میرے ہاتھ کا علاج کیا تھا۔
ڈاکٹروں نے اسے کاٹنے کی تیاری بھی کر لی تھی۔" میں نے بایاں ہاتھ آگے کیا۔

"یہ بالکل ٹھیک ہے؟"

"نہیں، کبھی کبھی سردی میں اس کی گرفت کمزور پڑ جاتی ہے۔"

"علاج مکمل ہوا تھا؟"

"نہیں، بدقسمتی سے عین آخری دنوں میں علاج ادھورا رہ گیا تھا۔"

"عمر دراز کا یہ آدمی کہاں ہے؟"

"جب تم نے اس کے بارے میں اتنی معلومات حاصل کی ہیں تو تم کو یہ بھی پتا ہوگا کہ وہ کہاں ہے؟"

اس نے سرپوش ہلایا۔ "ہاں معلوم ہے لیکن میں تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔"

"وہ ڈیوڈ شا کے قبضے میں ہے۔" میں نے بتا دینے میں کوئی حرج نہیں سمجھا تھا۔

"ڈیوڈ شا کے قبضے میں...... کیوں؟"

"ڈیوڈ شا اس سے ان دواؤں کے فارمولے چاہتا ہے جو حیرت انگیز طور پر ناقابلِ علاج چوٹوں کو بھی ٹھیک کر دیتی ہیں۔"

"ڈیوڈ شا برطانیہ کا ایک لارڈ ہے۔" بڑے کنور نے پُرخیال انداز میں کہا۔

"ساتھ ہی بہت خطرناک اور سفاک آدمی ہے۔"

"اس حیثیت کے آدمی کو ایسا ہی ہونا چاہئے۔" اس نے کہا اور اچانک بولا۔ "منشی دل جی!"

فوراً ہی دروازہ کھلا اور منشی دل جی اندر آیا۔ "شاید بڑے کنور کے پاس مواصلاتی رابطے کی کوئی شے تھی جو اس کے سرپوش کے اندر پوشیدہ تھی۔" "حکم بڑے کنور سرکار!"

"اب یہ ہمارا خاص مہمان ہے۔" بڑے کنور نے میری طرف اشارہ کیا۔ "اس کی خاص حفاظت کرنی ہے، کسی کو اس تک رسائی نہ ہو۔"

"سمجھ گیا سرکار!"

"اس کے کھانے پینے کی ساری ذمے داری تمہاری ہے۔"

"جی سرکار!"

"بڑے کنور، کیا مجھے باہر جانے اور کسی سے رابطہ کرنے کی اجازت ہوگی؟" میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"نہیں...... اس چار دیواری کے اندر تم کسی محافظ کے ساتھ گھوم سکتے ہو۔ باہر جانے اور کسی سے رابطہ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ یہ تمہارے اپنے مفاد میں ہے۔"

بڑا کنور مجھے شاید بچہ سمجھ کر بہلا رہا تھا۔ یہ میرے نہیں اس کے مفاد میں تھا۔ وہ میرا لہو نچوڑنے کی فکر میں تھا اور یہ کام مجھے بہلا پھسلا کر اور شریف بن کر کرنا چاہتا تھا۔ جو کام سندھو نے زور زبردستی سے کیا تھا وہی کام وہ مہذبانہ انداز میں کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ منشی دل جی مجھے لے کر باہر آیا مگر محل سے باہر لے جانے کے بجائے وہ اس کے وسط میں ایک کمرے میں لے آیا۔ کمرا بے حد آراستہ و پیراستہ تھا مگر اس کی ساخت سے ظاہر تھا کہ وہ قید خانہ ہے۔ اس میں داخلے کا صرف ایک دروازہ تھا اور ایک دروازہ باتھ روم کا تھا۔ نہ کوئی کھڑکی تھی، نہ کوئی روشن دان۔ "یہ آپ کا کمرا ہے سرکار!" اس بار منشی دل جی کے انداز میں احترام تھا۔ یہ بھی منافقت تھی۔

"میں بڑے کنور کا شکر گزار ہوں۔" میں نے جوابی منافقت کا مظاہرہ کیا۔ "وہ دیالو آدمی ہیں۔"

"آپ کمرا دیکھ لیں، پھر کسی شے کی ضرورت ہو تو بتا دیں۔"

"فی الحال تو نہیں، ویسے میں اب میں آرام کروں گا۔"

وہ چلا گیا۔ کمرے میں آرام و سکون کا ہر سامان تھا مگر اس میں میرا دم گھٹ رہا تھا۔ میں نے دروازہ آزمایا حسبِ توقع وہ باہر سے بند تھا، اندر اس کے کوئی کنڈی یا تالا نہیں تھا صرف ایک ہینڈل تھا جس سے پکڑ کر اسے کھولا جاتا تھا۔ میں نے جوتے اور جیکٹ اتاری اور بستر پر دراز ہو گیا۔ ابھی میں سونے کے بارے میں سوچ رہا

تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی، میں نے بلند آواز سے کہا۔ ''آ جاؤ۔''

دروازہ کھلا اور منشی دل جی کے ساتھ سندھو اندر آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک عدد پیالہ تھا۔ میں اٹھ بیٹھا۔

''تم...... خبیث آدمی، پھر میرے لئے زہر تیار کر کے لائے ہو۔''

''نہیں شہباز صاحب!'' منشی دل جی نے کہا۔ ''یہ دوا ہے جو خون بناتی ہے۔''

''میں اس شخص پر بھروسا نہیں کر سکتا تھا۔'' میں نے سندھو کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ پہلے بھی مجھے دوا کے نام پر مفلوج کرنے والا زہر دیتا رہا ہے۔''

''یہ ہمارے قابو میں ہے۔ اس نے ذرا بھی غلط حرکت کی تو اس کی خیر نہیں ہوگی۔ آپ بے خطر یہ دوا پی لیں کیونکہ یہ دوا بڑے کنور سرکار کے لئے بنتی ہے۔''

''اور میں پینے سے انکار کر دوں تو؟''

''تو ہم سمجھیں گے کہ آپ تعاون سے انکار کر رہے ہیں۔'' منشی کا لہجہ دھمکی آمیز ہو گیا تھا۔ ''دوا آپ نہ بھی لیں تب بھی اپنا کام تو کرنا ہے۔''

اس کا مطلب تھا کہ میں بے شک ٹانک نہ پیوں، میرا خون تو نکالا جائے گا۔ مجبوراً میں نے سر ہلایا۔

''لاؤ، یہ مجھے دو۔''

سندھو نے ڈرتے ڈرتے پیالہ مجھے دے دیا۔ یہ چاندی سے بنا خوبصورت پیالہ تھا اور ساتھ ہی چاندی کا چمچ بھی تھا۔ سبزی مائل سوپ سے خوشبو سی اٹھ رہی تھی۔ مجھے یاد تھا سندھو مجھے زبردستی جو سوپ پلاتا تھا اس سے بو آتی تھی۔ شاید یہ سچ مچ طاقت کی دوا تھی جو خون بناتی تھی۔ ہر ہفتے میرے جسم سے ایک لیٹر خون نکالنے کے لئے ضروری تھا کہ مجھے طاقتور اور خون بنانے والی غذائیں اور دوائیں دی جائیں۔ میں نے چمچ ایک طرف رکھا اور پیالہ منہ سے لگا کر خالی کر دیا۔ اس کا ذائقہ بھی فرحت بخش تھا۔

سندھو نے پیالہ لیا۔ ''یہ دوا دن میں تین بار پینا ہوگی۔''

منشی جی نے مجھے تسلی دی۔ ''شہباز صاحب آپ فکر نہ کریں، آپ کا پورا خیال رکھا جائے گا۔''

میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ میرا اتنا ہی خیال رکھا جاتا جتنا کہ قربانی کے جانور کا رکھا جاتا ہے۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد میں لیٹ گیا اور سو گیا۔ رات بھر مجھے گہری اور بے خواب نیند آئی۔ شاید سوپ میں کوئی خواب آور جزو بھی شامل تھا۔ صبح میری آنکھ کھلی تو ذہن ہلکا پھلکا ہو رہا تھا اور طبیعت میں تازگی سی تھی۔ میں نے اٹھ کر غسل کیا اور باہر آ کر ملازم کو بلانے والا بٹن دبایا۔ خلاف توقع پاس سے آواز آئی۔ ''حکم سرکار!''

''مجھے ناشتا چاہئے۔'' میں نے کہا۔ ''فوراً اور گرما گرم۔''

پندرہ منٹ کے بعد دروازے پر دستک دے کر سوہنا جیسی ایک لڑکی اندر آئی۔ صورت شکل کے لحاظ سے وہ اس قابل بھی تھی کہ کسی محل پر راج کرتی لیکن یہاں وہ نوکرانی تھی، یہ بھی عیاش امراء کے چونچلے ہوتے ہیں۔ نوکرانیاں بھی چھانٹ کر رکھتے ہیں۔ لڑکی ناشتے کی ٹرالی لائی تھی اور اس نے برتن میز پر سجانا شروع کر دیئے۔ ناشتے میں تلے اور ابلے ہوئے انڈے تھے۔ دیسی گھی میں بنے پراٹھے اور حلوہ تھا۔ سنگترے کا جوس، دودھ اور شہد بھی تھا۔ مکھن اور لسی الگ سے تھی۔ مجھے زبردست بھوک لگ رہی تھی اس لئے میں نے سب کے ساتھ بھرپور

انصاف کیا اور ناشتے کے بعد کافی طلب کی۔

"اس کی اجازت نہیں ہے سرکار!" لڑکی نے معصومیت سے کہا۔

"کیا!" میں نے خفگی سے کہا۔ "اتنے اچھے ناشتے کے بعد چائے، کافی نہ ملے تو ناشتے کا فائدہ؟"

"منشی جی نے منع کیا ہے۔"

"منشی کہاں ہے اس سے میری بات کراؤ۔"

"منشی جی۔" وہ سہم گئی۔ "ہماری ایسی جرأت!"

"اچھا بابا اسے میرا پیغام دو۔" میں نے تنگ آ کر کہا۔ مگر اس کی ضرورت نہیں پڑی۔ کچھ دیر بعد منشی دل جی سندھو کے ہمراہ نازل ہو گیا۔ سندھو کے ہاتھ میں پیالہ تھا۔ میں نے منشی سے کہا۔ "تم نے چائے، کافی پر کیوں پابندی لگائی۔"

"جب تک یہ دوا پی رہے ہیں۔ نشے والی کوئی شے استعمال نہیں کرنی ہے۔"

"بھاڑ میں گئی دوا۔" میں نے بھنا کر کہا۔ "تم لوگ مجھ پر پابندیاں لگائے جا رہے ہو۔"

"مجبوری ہے سرکار! اس دوا کی تاثیر ختم ہو جاتی ہے، یہ بتائیں آپ خود میں چستی محسوس نہیں کر رہے؟"

"مجھے چستی کی ضرورت نہیں ہے۔"

"سرکار، مجھے مجبور مت کریں۔" منشی دل جی نے مغموم سے لہجے میں کہا۔

"کیا کرو گے تم؟"

"آپ نے دوا لینے سے انکار کیا تو آپ اس کمرے میں بند رہیں گے۔ سندھو کا کہنا ہے کہ اسے صرف چھ بار خون چاہئے۔ چھ ہفتے بعد آپ کو آزاد کر دیا جائے گا۔ یہ بڑے کنور کا وعدہ ہے۔ اگر آپ انکار کریں گے تو اپنی قید میں خود اضافہ کریں گے۔"

اس کی بات قابلِ غور تھی۔ اس بات کا موہوم سا امکان تھا کہ یہ کام مکمل ہونے کے بعد مجھے جانے دیں اور میں انکار کر کے اپنی قید میں اضافہ ہی کرتا۔ فی الحال یہاں سے فرار ہونے کا امکان بھی نہیں تھا۔ اگر مجھے فرار ہونا تھا تب بھی ضروری تھا کہ میں اپنا رویہ دوستانہ رکھوں تاکہ مجھے باہر گھومنے کی آزادی مل سکے۔ میں نے سر ہلایا۔ "معاف کرنا، مجھے غصہ آ گیا تھا لاؤ، پیالہ دو۔"

سندھو نے مجھے پیالہ دیا جسے میں نے ایک سانس میں خالی کر دیا۔ "منشی دل جی، میں باہر کھلی ہوا میں جانا چاہتا ہوں۔"

"کچھ دیر میں ایک محافظ آ کر آپ کو لے جائے گا۔"

"مجھے کسی محافظ کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"آپ بھول رہے ہیں سرکار! بڑے کنور نے آپ کی حفاظت کا حکم دیا ہے۔" وہ چالاکی سے بولا اور سندھو کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔ ان کا انداز مہذبانہ تھا لیکن مجھے ذرا بھی شبہ نہیں تھا۔ اگر میں نے تعاون سے انکار کیا تو یہ مہذب چولا اتار کر اپنی اصل صورت میں سامنے آ جائیں گے۔ دس منٹ بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے آنے کی اجازت دی تو ایک نیپالی گورکھا اندر آیا۔ اس نے محافظوں والی وردی پہن رکھی تھی لیکن

اس کے پاس بظاہر کوئی ہتھیار نظر نہیں آ رہا تھا، ہاں اس نے لباس میں چھپا رکھا ہو تو الگ بات تھی۔ اس نے اٹینشن کھڑے ہو کر گلابی اردو میں کہا۔ ”صاب! چلنے کو تیار ہے۔“

”چلو!“ میں نے جوتے اور جیکٹ پہن لی۔

وہ مجھے لے کر مختلف راہ داریوں سے گزرتا ایک کھلے صحن میں نکلا، اس کا فرش اور چار دیواری سنگ مرمر کی تھی۔ اس میں جا بجا فوارے اور پھولدار پودوں کے تختے لگے تھے۔ یہ انوکھے پودے تھے جو اتنے شدید سرما میں بھی ہرے بھرے تھے اور ان پر پھول آ رہے تھے۔ صحن عبور کر کے ہم پندرہ کے قریب سیڑھیاں اتر کر ایک کھلے اور وسیع باغ میں آئے، زمین پر مرجھائی خشک گھاس تھی اور پودے اور درخت پتوں سے محروم تھے، اس باغ پر خزاں آئی ہوئی تھی۔ اس کے ایک طرف اونچی سی دیوار تھی جو اس محل کی دیوار تک جا رہی تھی۔ اس کا مقصد باغ کے اس حصے کو جدا رکھنا تھا۔ ”اس دیوار کے پیچھے کیا ہے؟“

”یہ حصہ کنور خاندان کے لئے مخصوص ہے وہاں کنور خاندان اور ان کی خاص ملازماؤں کے سوا کوئی نہیں جا سکتا۔“

”یعنی کسی غیر مرد کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔ وہاں کنور خاندان کی عورتیں ہوتی ہیں؟“

”جی جناب!“ اس نے سر ہلایا۔

میں نے چہل قدمی شروع کر دی، وہ میرے ساتھ ساتھ تھا۔ ”بڑے کنور اور راج کنور بس دو بھائی ہیں۔“

”نہیں ایک چھوٹے بھی ہیں، شیام کنور، وہ دلی میں پڑھتے ہیں۔“

”اور بہنیں؟“

”دو ہیں۔“ اس نے چھوٹا سا جواب دیا۔

”شادی شدہ یا غیر شادی شدہ؟“

”صاب، آپ کیسا سوال کرتا...... ابھی میرے کو جواب کا اجاجت نہیں ہے۔“

”تم نے پھر بھی بہت کچھ بتا دیا۔“

”صاحب، سمجھو...... ہم کو کنور صاحب کا عورتوں کا بات نہیں کرنا۔“

مجھے سونا اور اس دوسری ملازمہ کا لباس یاد آ گیا۔ اپنی تسکین کے لئے انہوں نے اس سردی میں بھی ملازماؤں کو اتنا مختصر سا لباس دے رکھا تھا اور اپنی عورتوں کا ذکر بھی گوارا نہیں تھا۔ وہی مخصوص جاگیردارانہ ذہنیت۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ جب کسی خاندان کی عورتوں میں بے حیائی آتی ہے تو یہ پہلے اس خاندان کے مردوں میں آتی ہے۔ جس خاندان کے مرد بے حیا ہو جائیں، اس خاندان کی عورتیں حیا والی ہو ہی نہیں سکتیں۔ جس حصے میں، مَیں ٹہل رہا تھا یہ بھی خاصا بڑا تھا۔ پورے فٹ بال کے گراؤنڈ جتنا بڑا تھا۔

”اس جگہ کی اتنی حفاظت کی جاتی ہے، کیا کنوروں کا کسی سے جھگڑا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”جی سرکار! اُدھر قبائلی ہیں۔“ اس نے کہا اور پھر یوں پریشان نظر آنے لگا جیسے اسے یہ بات منہ سے نہیں نکالنی چاہئے تھی۔

”کیا جھگڑا ہے ان سے؟“

"مجھے نہیں معلوم سرکار۔" اس نے جان چھڑانے کے انداز میں کہا۔

"دیکھو، اگر تم مجھے نہیں بتاؤ گے تو میں منشی سے پوچھ لوں گا اور اس نے دریافت کیا کہ مجھے کیسے علم ہوا تو میں تمہارا نام لے دوں گا۔"

اس بلیک میلنگ پر اس نے بے بسی سے مجھے دیکھا۔ "سرکار، میرے کو مافی دیو۔"

"اس کا مطلب ہے مجھے منشی سے ہی پوچھنا پڑے گا۔" میں نے سر ہلایا۔

اس نے ہتھیار ڈال دیے۔ "سرکار، میرا نام نہ آئے۔"

"نہیں آئے گا۔" میں نے اسے تسلی دی۔

"کنور لوگ بہت ظالم ہے۔" اس نے فریاد کی۔

"میں نے کہا نا، ان کو پتا نہیں چلے گا۔" میں نے جھنا کر کہا تھا۔

اس نے شمال کی طرف اشارہ کیا۔ "ادھر کنور صاحب کے دادا کا زمین تھا، ریاست کا۔"

"ٹھیک ہے، پھر...... کیا ہوا؟"

"بھارت سرکار ریاست ختم کیا تو قبائلی لوگ نے زمین پر قبضہ کر لیا۔ اِدھر کنور چاہتا ہے کہ زمین اس کو مل جائے۔ اُدھر پہاڑ سے قیمتی پتھر ملتا ہے۔ پھر جنگل بھی ہے۔ اس کا کٹائی کنور اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے، ان کے پاس ٹھیکہ ہے۔"

"ٹھیکہ کس کے پاس ہے۔"

"کنور صاحب کے پاس......"

"کون سا کنور؟"

"راج کنور اور کون کا کنور!" اس نے تعجب سے کہا۔ "اس نے قبائیلوں کی جگہ اپنا مزدور رکھا، ان کو کام نہیں دیا۔ ان کو جنگل میں آنے اور جانور چرانے کا اجاجت بھی نہیں ہے۔"

"قبائیلوں میں اتنی ہمت ہے کہ ان لوگوں کا مقابلہ کر سکیں؟"

"وہ بہت زیادہ ہوتا...... خونخوار اور قاتل ٹائپ کا لوگ ہے۔ دس سے اوپر مزدور مار دیا۔ سارا مزدور کام چھوڑ کر بھاگ گیا۔"

"پھر کام کیسے چل رہا ہے؟"

"کنور صاحب اِدھر سے لوگ لے گیا، ان کو اُدھر بسایا۔ ان سے کام لیتا۔ اِدھر کا لوگ اس کا غلام ہے۔"

"قبائلی بھی مارے گئے ہیں اس لڑائی میں؟"

"بہت، ایک رات کنور صاحب نے اپنے آدمیوں کے ساتھ ان کا بستی پر حملہ کیا۔ فائر کر کے لوگوں کو مارا۔ بستی کو آگ لگایا، ان کا عورتوں کو اٹھا لیا۔"

"تم بھی شامل تھے اس لشکر میں؟"

اس نے سر ہلایا۔ "ہم بھی کنور صاحب کا غلام۔"

"تمہارا نام کیا ہے دوست؟"

''ترگیوری......'' صاحب! اس نے بتایا۔

ترگیوری نے جو معلومات فراہم کی تھیں اس کے مطابق سابق والیان ریاست کی اولاد اب بھی ریاست کے لوگوں کو اپنا غلام سمجھتی تھی اور وہ ان کو آزادی دینے کے لئے تیار نہیں تھی۔ نہ معاش کی، نہ جسم کی اور نہ ذہن کی۔ وہ ان کی جان، مال اور آبرو پر اپنا حق اپنے آباؤ اجداد کی طرح مسلم سمجھتے تھے۔ ''کیا یہ قبائلی اتنے طاقتور ہیں کہ اس قلعے نما محل پر حملہ کر سکیں؟''

''دو مہینے پہلے انہوں نے حملہ کیا بھی تھا۔ وہ سو ڈیڑھ سو افراد تھے جو رات کی تاریکی میں چپکے سے آئے تھے۔ وہ بستی پر ہونے والے حملے کا بدلہ لینا چاہتے تھے۔ وہ محل کے اندر گھس آئے۔ ان کے پاس پرانی بندوقیں اور تیر کمان تھے جبکہ محل کے محافظوں کے پاس جدید اسلحہ تھا۔ سخت خون خرابہ ہوا اور دونوں طرف سے لوگ مارے گئے۔ قبائلی زیادہ مرے تھے۔ ایک دو ہی جان بچا کر بھاگے تھے۔ باقی مارے گئے یا پکڑے گئے۔''

''پکڑے جانے والوں کا کیا ہوا؟''

''ان کو سب کے سامنے پھانسی دے کر کسی خفیہ جگہ دفنا دیا گیا۔''

''ڈیڑھ سو افراد مارے گئے۔'' میں دم بخود رہ گیا تھا۔ ''کہیں شور نہیں ہوا؟''

''پچاس ساٹھ محل کے محافظ بھی مارے گئے تھے۔ قبائلیوں نے بہت شور کیا مگر ریاست کی حکومت پر کنور صاحب کا اثر ہے۔ کچھ بھی نہیں ہوا۔''

''قبائلی انتقام کی فکر میں ہوں گے وہ پھر حملہ کر سکتے ہیں۔''

''اس وجہ سے کنور صاحب نے یہ سب کیا ہے۔ اندر باہر سو سے زیادہ مسلح بندے ہیں۔''

''کنور لوگ اس محل سے باہر نہیں جاتے۔''

''جاتے ہیں پر گارڈز کے ساتھ۔''

''قبائلیوں کے علاقے میں جن کو بسایا تھا، ان کا کیا ہوا؟''

''کچھ ہیں۔ وہ اُدھر ہی ہیں۔ قبائلی جانتے ہیں کہ وہ بھی مجبور ہیں۔''

گویا ان قبائلیوں میں اتنی عقل اور انسانیت تھی کہ انہوں نے اپنی طرح کے مجبور انسانوں پر غصہ اتارنے کے بجائے فتنے کے مرکز پر حملہ کیا تھا۔ بے شک ان کے ڈیڑھ سو کے قریب آدمی مارے گئے تھے مگر مجھے یقین ہے وہ پھر حملہ کریں گے۔ معاف کرنا قبائلیوں کا مزاج نہیں ہوتا، چاہے ان کا تعلق کسی بھی ملک اور مذہب سے ہو۔ وہ بار بار حملہ کریں گے، جب تک خود ختم نہیں ہو جاتے یا کنور خاندان کو ختم نہیں کر دیتے۔ بے شک ان کو حکومت کی مدد اور حمایت حاصل تھی مگر عوام کی طاقت کا مقابلہ حکومت نہیں کر سکتی تو اس کے سامنے کنور خاندان کیا چیز تھی۔ ''تمہارے خیال میں یہ سب بڑے کنور کی مرضی سے ہو رہا ہے؟''

''پتا نہیں، پر سارے کام راج کنور صاحب کرتے ہیں۔'' ترگیوری نے بتایا۔

''پولیس نے کبھی مداخلت کی؟''

''ایک بار پولیس کے بہت سارے لوگ قبائلیوں کی بستیوں میں گئے تھے لیکن وہ اطلاع پر اوپر پہاڑوں پر بھاگ گئے تھے، پولیس کے ہاتھ بس وہی لگے جو بھاگ نہیں سکے تھے۔''

"ان کے ساتھ پولیس نے کیا، کیا؟"

"مار پیٹ کر چھوڑ دیا۔ کنور صاحب نے بہت دھمکیاں دی تھیں، دو خالی بستیوں کو آگ بھی لگا دی تھی۔"

وہ شروع میں مجھے بتاتے ہوئے ہچکچا رہا تھا مگر جب اس نے بولنا شروع کیا تو اس کے لہجے میں ایک جوش سا آ گیا۔ الفاظ سے نہیں پر لہجے سے وہ مجھے کنور خاندان کا مخالف اور قبائلیوں کا حامی لگا تھا۔ میں یہ بات اس سے براہ راست پوچھتا تو وہ گھبرا جاتا اور انکار کر دیتا۔ میں نے غور سے اسے دیکھا۔ "ترگیوری تمہارا تعلق کہاں سے ہے میرا خیال ہے" "تم نیپالی یعنی گورکھے نہیں ہو؟"

"نہیں، میرا تعلق اسی علاقے سے ہے۔ میرا خاندان تین نسلوں سے یہیں آباد ہے۔"

"تمہارا تعلق قبائل سے ہے؟"

اس نے سر ہلایا۔ "پچاس سال پہلے ہم اِدھر آ گئے تھے۔"

"تم لوگوں کا رابطہ نہیں ہے اب؟"

"دوریوں سے خون اور نسل کے رشتے نہیں مٹتے۔"

"ترگیوری، میں تمہارا دشمن نہیں ہوں کیونکہ میں ان لوگوں کا قیدی ہوں۔ اس لئے مجھ پر اعتماد کرو، مجھ سے تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔"

"جی صاحب! آپ ابھی کتنی دیر باہر رہو گے؟" اس نے موضوع بدل دیا۔

"کیا تمہیں میرے بارے میں خاص ہدایت ہے؟"

"جی صاحب! آپ ایک گھنٹے سے زیادہ باہر نہیں رہ سکتے۔" اس نے گھڑی دیکھی۔ "ابھی پانچ منٹ باقی ہیں۔"

"ترگیوری، فرض کرو، قبائلی اس جگہ پھر حملہ کرتے ہیں تو تمہاری ہمدردیاں کس کے ساتھ ہوں گی؟" میں نے اچانک پوچھا تو اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا تھا۔ پھر اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"صاحب! میں کنور صاحب کے ساتھ ہوں۔"

اس نے بلاواسطہ بتا دیا تھا کہ اس کی ہمدردیاں بے شک قبائلیوں کے ساتھ ہوں گی مگر اس جنگ میں وہ کنور کے شانہ بشانہ ہوگا۔ میں چلتے چلتے رکا۔ "ترگیوری، اس محل میں قبائل سے تعلق رکھنے والے اور افراد بھی ہیں؟"

اس نے سر ہلایا۔ "عورتیں ساری قبائل کی ہیں۔"

اب میں سمجھا تھا۔ سونتا اور دوسری لڑکی کے نقوش مجھے ایک جیسے کیوں لگے تھے۔ ترگیوری کے نقوش بھی کچھ ایسے ہی تھے۔ "یہ عورتیں صرف کام کرتی ہیں یا ان سے......؟"

"یہ صاحب لوگوں کے بستر بھی سجاتی ہیں۔" اس کا لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔ "ان کو مہمانوں کو بھی پیش کیا جاتا ہے۔ جیسے کتوں کے آگے ہڈی ڈالتے ہیں۔"

"یہ ہر اس جگہ ہے جہاں انسان انسانوں کے آقا بن کر بیٹھے ہیں۔" میں نے سرد آہ بھری۔ مجھے یہ جان کر دھچکا لگا تھا کہ سونتا اور اس جیسی معصوم لڑکیاں ان ہوس زدہ لوگوں کی ناپاک خواہشات پوری کرتی تھیں۔

اگرچہ اس سے ان پر حرف نہیں آتا تھا مگر ان کی معصومیت سے ابھرنے والا تاثر ضرور متاثر ہوا تھا۔

"یہ لڑکیاں محل میں کیسے آئی ہیں؟"

"اغوا کر کے۔ بردہ فروش کمسن لڑکیوں کو اغوا کر کے لاتے ہیں۔ پھر کنور اور ان جیسے دوسرے عیاش لوگوں کو فروخت کرتے ہیں۔"

آج کے دور میں بھی بردہ فروشی کا کاروبار پورے زور شور سے جاری تھا۔ غربت زدہ علاقے پیداواری مراکز تھے تو امراء ان کے خریدار تھے۔ انسانی غلامی جاری تھی۔ نام نہاد امن پسند ممالک جو دن رات انسانی حقوق کی بات کرتے نہیں تھکتے جو دہشت گردوں کو ختم کرنے کے لئے ملکوں اور معاشروں کو پامال کرنے سے نہیں چوکتے تھے مگر ان مظلوموں پر ان کی نظر نہیں جاتی تھی جو انٹرنیٹ اور آزادی کے اس دور میں غلام تھے اور ان کی تعداد لاکھوں کروڑوں میں تھی۔ یہ غلام ساری دنیا میں تھے۔ ان کے آقا ان کے جان و مال اور جسم پر پورا تصرف رکھتے تھے۔

ترگیوری مجھے کمرے میں چھوڑ کر چلا گیا تھا اور دروازہ حسبِ سابق باہر سے لاک کر دیا گیا تھا۔ مجھے دن میں تین بار کھانا دیا جاتا تھا، ساتھ ہی مجھے سوپ پینا پڑتا تھا۔ دن میں ایک بار ایک گھنٹے کے لئے مجھے کھلی فضا میں وقت گزارنے کا موقع ملتا تھا۔ ہر بار میرے ساتھ مختلف محافظ نگراں ہوتا تھا۔ کمرے میں، مَیں بیشتر وقت ایکسرسائز کر کے گزارتا تھا۔ کمرے میں ٹی وی اور انگریزی کے اخبارات اور رسائل بھی مہیا کر دیئے گئے تھے۔ فرصت کے اوقات میں ان سے دل بہلاتا تھا۔ اس دوران میں رفتہ رفتہ مجھے اس سفید محل کے بارے میں معلومات بھی ملتی رہی تھیں۔ یہ تقریباً پچاس ہیکٹر پر پھیلا ہوا عمارتوں کا کمپلیکس تھا۔ اسے آپ نصف مربع کلومیٹر سمجھ سکتے ہیں۔ اس میں سب سے نمایاں تو محل کی سفید عمارت تھی جو وسط میں تھی اس کے علاوہ مختلف مقاصد کے لئے مختلف عمارتیں اس کے چاروں طرف تھیں۔ ایک طرف ملازموں کے لئے مخصوص کمپاؤنڈ تھا اور اس کے اندر جیل بھی تھی۔ اس کمپاؤنڈ کے اندر آنا جانا آسان نہیں تھا۔ اس میں ایک باقاعدہ گیٹ تھا جس پر پہرے دار موجود ہوتے تھے۔ پانچویں دن صبح ناشتے کے بعد مجھے سوپ پلانے کے بعد تیار ہونے کو کہا۔ منشی دل جی مجھے لینے آیا تھا۔

"کہاں جانا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"آج آپ کا خون کا نمونہ لیا جائے گا اس کا ٹیسٹ ہوگا۔"

"اس کے بعد۔"

"اس کے بعد آپ کا خون لیا جائے گا۔"

"آج ہی؟"

"نہیں، رپورٹ کل تک آئے گی۔" منشی دل جی نے کہا۔

اس کے ساتھ میں سفید محل کے سامنے کی طرف ایک مختصر سی عمارت میں آیا۔ اندر داخل ہوتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ چھوٹے پیمانے پر اسپتال تھا وہاں ڈاکٹر تھا اور دو عدد نرسیں بھی۔ ایک طرف کمرے تھے جہاں مریضوں کو رکھا جا سکتا تھا۔ ایک اور کمرا آپریشن کے لئے تھا، مجھے وہیں لایا گیا۔ ڈاکٹر کو سب پتا تھا۔ اس

مجھے کاؤچ پر لٹایا۔ پہلے اس نے میرا درجۂ حرارت اور بلڈ پریشر لیا۔ اس کے بعد اس نے ایک لمبی سی سرنج سے میرا خون نکالا اور سرنج والی جگہ پر روئی رگڑ کر صاف کیا۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا۔

''کام ہو گیا ہے؟''

''نہیں، ابھی ایک سیمپل اور لینا ہے۔'' اس سوکھے سیاہ رُو ڈاکٹر نے سپاٹ سے لہجے میں بتایا۔

''کس قسم کا سیمپل!''

''ابھی پتا چل جاتا ہے۔ اِدھر کرسی پر آؤ۔''

اس نے جس کرسی کی طرف اشارہ کیا تھا وہ کچھ الیکٹرک چیئر جیسی لگ رہی تھی جس پر سزائے موت کے مجرموں کو بٹھا کر زندہ روسٹ کیا جاتا ہے۔ ''اس پر کیوں؟''

''سوال مت کرو۔'' اس نے کسی قدر درشت لہجے میں کہا۔

''جب مجھے پتا نہیں چلے گا کہ تم کس قسم کا سیمپل لینا چاہ رہے ہو......؟''

''ارے بابا...... ایک سیمپل لیں گا، معمولی سا، اس میں اتنا شور کائے کو کرتا ہے؟'' اس نے بمبئی والوں کی خاص زبان میں کہا۔ ''یہ جو تیرا ہاتھ ہے اس سے ایک سیمپل لینا ہے۔'' اس نے میرے بائیں ہاتھ کی طرف اشارہ کیا۔

مجھے یاد آیا، ڈیوڈ شا کے قبضے میں ایک بار ڈاکٹر نے میرے ہاتھ سے سیمپل لیا تھا اور اس نے بھی مجھے کرسی سے جکڑ دیا تھا کیونکہ سوئی گوشت یا ہڈی میں اتاری تھی جس سے مجھے بہت تکلیف ہوئی تھی۔ ہاتھ کو جکڑنے کا مقصد سرنج داخل کرنے کے دوران ہاتھ کو ہلنے سے بچانا تھا۔

''ابھی تیرا ہاتھ نہیں ہلیں گا...... اور تیرے کو تکلیف نہیں ہوئیں گی۔'' میں کرسی پر بیٹھ گیا اور اس نے چمڑے کے تسمے سے میرا ہاتھ جکڑ دیا۔ اس کے بعد باریک ترین سوئی کی لمبی سی سرنج میرے ہاتھ کی پشت میں داخل کر دی۔ اس سے پہلے اس نے سن کرنے والی دوا لگائی تھی، اس کے باوجود میں مارے تکلیف کے اچھل پڑا تھا۔ اگر ہاتھ نہ جکڑا ہوتا تو وہ ہل جاتا اور شاید سوئی اندر ہی ٹوٹ جاتی، اس نے سرنج کھینچی تو اندر سے کچھ مواد آ گیا۔ اس کے بعد اس نے احتیاط سے سوئی باہر نکال لی اور مزید سن کرنے والی دوا لگائی۔ سوئی نکالتے ہی مجھے خاصا سکون ملا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ بھی کھول دیا۔ ''اب تم جا سکتا ہے۔''

میں آپریشن روم سے نکلا تو منشی دل جی میرا منتظر تھا۔ اس نے مجھے واپس میرے کمرے میں چھوڑا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''بڑے کنور سے ملاقات ہو سکتی ہے؟''

''یہ تو ان کی مرضی پر ہے، لیکن میں آپ کی درخواست پہنچا دوں گا۔'' اس نے کہا۔ ''کسی چیز کی بھی ضرورت ہو تو مجھے حکم دیجئے گا۔''

''فی الحال تو نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''ہاں، مجھے کمپیوٹر اور انٹرنیٹ مل سکتا ہے؟''

اس نے سوچا۔ ''میں کنور صاحب سے پوچھ کر بتاتا ہوں۔''

میرا خیال تھا کہ مجھے شاید ہی اجازت ملے کیونکہ انٹرنیٹ کے ذریعے میں کسی سے بھی بات کر سکتا تھا یا کوئی پیغام دے سکتا تھا۔ یہ بات یہ لوگ بھی سمجھتے تھے۔ اس لئے مشکل تھا کہ مجھے کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی ہوا بھی

دیں۔ اس دن مجھے جواب نہیں ملا، اگلے روز جب وہ مجھے دوبارہ اسپتال لے جانے آیا تو میں نے اس
پوچھا، اس نے سر ہلایا۔ "میں کنور صاحب سے پوچھنا بھول گیا۔"
"منشی جی! اگر نہیں ہے تو صاف منع کر دو۔ بہانے کیوں بناتے ہو؟"
وہ مسکرایا۔ "آپ سمجھدار آدمی ہیں۔"
ڈاکٹر کے ساتھ دو نرسیں تھیں، اسی کی طرح سیاہ رُو اور منحوس صورت۔ نہ جانے کیوں وہ مجھے ڈاکٹر
زیادہ قصائی لگتا تھا۔ ایسا شخص جس نے اس پیشے کی حرمت بیچ دی ہو۔ اس نے مجھے آپریشن روم میں میز پر لٹا
میرے بازو سے سرنج لگائی اور پھر اسے ایک ائرٹائٹ تھیلی سے لگا دیا۔ فوراً ہی میرا سرخ اور صحت مند خون
میں بھرنے لگا۔ "کل کے ٹیسٹ کی رپورٹ کیا ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔
"کلیئر ہے۔" اس نے مختصر جواب دیا۔
"کیا کلیئر ہے؟"
"نو انفیکشن اینڈ نو ڈیسیز!" اس نے خون آنے کی رفتار کم کی۔
میں تھیلی کو بھرتے دیکھ رہا تھا۔ یہ ایک لیٹر سے زیادہ خون رکھ سکتی تھی اور پندرہ منٹ کے اندر بھر
ہو رہی تھی۔ میں نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ "اس میں کتنا خون آ سکتا ہے؟"
"بارہ سو ملی میٹر!"
"اور یہ بھرنے والی ہے۔" میں نے کہا۔
"یس۔" وہ بولا اور خون روک دیا۔ اس کے بعد اس نے احتیاط سے تھیلی الگ کر کے اسے نزدیک
رکھے فریج میں رکھا دیا۔ اس نے دوسری تھیلی نکال کر کینولا سے لگانی چاہی تو میں نے اسے روک دیا۔
"یہ کس خوشی میں......؟ میں نے بس ایک لیٹر خون دینا تھا۔ تم نے اس سے زیادہ ہی لے لیا ہے۔"
اس نے تھیلی واپس رکھ دی۔ "اپن کو کیا معلوم؟"
"تم کو نہیں معلوم کہ ایک آدمی کے جسم میں ساڑھے چار لیٹر خون ہوتا ہے اور ایک وقت میں آدھا
سے زیادہ خون نہیں دے سکتا۔" میں نے طنز کیا۔ "کیا تم میرا سارا خون نکال لینا چاہتے تھے؟"
نرس نے مجھے ایک ڈرپ لگائی اور اس میں ایک انجکشن شامل کیا۔ اس کے بعد پینے کے لئے گلوکوز
سنگترے کا جوس دیا تھا تاکہ میں خون نکالے جانے سے کمزوری نہ محسوس کرنے لگوں۔ ڈرپ سے خون کی کمی
ہونے والی کمزوری پوری ہو گئی تھی۔ طاقت کے انجکشن، جوس اور گلوکوز نے مجھے چاق و چوبند کر دیا تھا۔ جسم
پاس خون کے اجزاء ذخیرہ رکھتا ہے، کسی حادثے کی صورت میں خون ضائع ہو یا کسی کو عطیہ کیا جائے، جسم
کی یہ آسانی پوری ہو جاتی ہے بشرطیکہ کمی ایک حد سے اوپر نہ ہو۔ منشی دل جی مجھے واپس لانے لگا مگر میں
کمرے میں جانے سے انکار کر دیا تھا۔
"میں کھلی فضا میں کچھ وقت گزارنا چاہتا ہوں۔"
"مرضی آپ کی!" منشی دل جی نے راستہ بدل دیا۔ وہ مجھے باغ میں لے آیا۔ اس روز موسم قدرے
تھا اور دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ "آپ اس جگہ سے باہر مت جایئے گا، میں ابھی کسی کو بھیجتا ہوں۔"

''آپ خود کیوں نہیں میرے ساتھ آ جاتے؟''
وہ مسکرایا۔ ''میں بڑے کنور کا ذاتی سیکرٹری ہوں۔ وہ مجھے جو کام کہتے ہیں، وہی کرنے جاتا ہوں، اس کے علاوہ میرا ہمہ وقت ان کے پاس رہنا لازمی ہے۔''
''راج کنور نظر نہیں آ رہا؟'' میں نے سرسری سے انداز میں کہا۔
''چھوٹے کنور کی اپنی مصروفیات ہیں، ضروری نہیں ہے وہ آپ کو نظر آئیں۔'' اس نے خشک لہجے میں کہا اور چلا گیا۔ اس نے جتا دیا تھا کہ میں ایک قیدی ہوں اور میری ایک حد ہے۔ چند منٹ بعد ایک نگران وہاں آن موجود ہوا۔ مجھے تر گیوری سے دوبارہ بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ خون دینے کے بعد میرے شب و روز پھر اسی طرح گزرنے لگے۔ تین وقت غذائیت سے بھرپور کھانا پھر خون بنانے والی دوا پینا، ورزش کرنا، اخبارات اور ٹی وی سے دل بہلانا اور سو جانا۔
ایک ہفتے بعد میں ایک بار پھر خون دے رہا تھا۔ سوکھے سے ڈاکٹر نے تھیلی بھر کر میرا خون نکالا اور مجھے شربت اور دوسری طاقت کی چیزیں دی گئیں، اس کے باوجود میں اٹھا تو میں کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ایک بار خون دینے والے کو کم سے کم دو مہینے تک خون نہیں دینا چاہئے اور یہاں ایک ہفتے بعد ہی میرے جسم سے پھر اتنا ہی خون نکال لیا گیا تھا۔ اگر اس طرح میرا ہر ہفتے خون نکالا جاتا رہا تو چند ہفتے بعد میں حرکت کرنے کے قابل بھی نہ رہتا۔ کمزوری اور نقاہت کا احساس ایک دن رہا تھا پھر میں معمول پر آ گیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ نکالے جانے والے خون کا یہ کیا کر رہے تھے؟ اس سے اگلے روز میں باغ میں چہل قدمی کر رہا تھا کہ میں نے کنور فیملی کے لئے مخصوص حصے کی دیوار سے ایک لڑکی کو جھانکتے دیکھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکرائی۔ ''ہیلو! آپ کون ہیں؟'' اس نے معصومانہ بلکہ بچگانہ انداز میں کہا۔
''میں شہباز ملک ہوں اور تم؟''
''میں آشا ہوں۔''
''آشا بے بی، تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہی ہو؟''
''میں آشا ہوں اور دیوار سے تمہیں دیکھ رہی ہوں۔''
اس کے چہرے کے نقوش اور لہجے سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ کنور خاندان سے ہی ہے۔ میں نے تکا مارا۔ ''تم راج کنور کی بہن ہو نا؟''
میں نے جو تکا مارا وہ نشانے پر لگا۔ اس نے کسی قدر تعجب سے کہا۔ ''آپ کو کیسے پتا چلا؟''
''تمہاری صورت بہت ملتی ہے راج کنور سے۔''
''تم کون ہو؟ میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔'' اس نے میرا معائنہ کیا۔ وہ کبھی آپ کر کے بات کرتی تھی اور کبھی تم کر کے۔
''میں بڑے کنور کا دوست ہوں۔''
''ارجن بھیا کا!'' اس نے تعجب سے کہا۔ ''لیکن ان کا تو کوئی دوست نہیں ہے۔ ان کے پاس کوئی نہیں آتا، وہ اکیلے رہتے ہیں۔''

"یہ ان کا مقدر ہے۔" میں نے دل میں کہا اور بولا۔" میں ابھی ان کا دوست بنا ہوں۔"
"اچھا!" وہ مطمئن ہوگئی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ذہنی طور پر اپنی عمر سے پیچھے تھی۔
"تم پڑھتی ہو؟"
"ہاں، مجھے شیلا پڑھاتی ہے۔" اس نے سر ہلایا۔
"تم اسکول نہیں جاتیں؟"
"مجھے تو شوق ہے پر مجھے جانے نہیں دیتے۔" اس نے حسرت سے کہا۔
"کون نہیں جانے دیتے؟"
"راج بھیا!" اس نے جواب دیا۔" وہ کہتے ہیں میں گھر پر پڑھوں۔"
"تو تم گھر پر پڑھتی ہو؟"
"ہاں، مس شیلا مجھے سب پڑھاتی ہیں۔ وہ بہت اچھی ہیں، میرا بہت خیال رکھتی ہیں۔"
میرا خیال تھا کہ آشا کی کند ذہنی کی وجہ سے اسے اسکول میں داخل نہیں کرایا گیا، ایک تو وہ دوسرے بچوں کے مذاق کا نشانہ بنتی لیکن اصل مسئلہ کنور خاندان کی ناک کا تھا کہ اس کے اوپر ضرب نہ آئے حالانکہ ایسے بچے اسکول میں بہتر تعلیم حاصل کرتے ہیں اور عقل نہ سہی ان میں اعتماد ضرور آجاتا ہے۔
"تم پڑھنے کے علاوہ اور کیا کرتی ہو؟"
"میں ٹینس کھیلتی ہوں۔ سوئمنگ کرتی ہوں۔"
"تم یہاں سے باہر جاتی ہو؟"
اس نے منہ بنایا۔"بہت کم مجھے کوئی اکیلے جانے نہیں دیتا۔"
"تم دیوار کے اس طرف نہیں آسکتیں؟"
"راج بھیا کہتے ہیں یہ حصہ دوسرے لوگوں کے لئے ہے۔"
"مجھ سے پھر ملو گی۔" میں نے اس بیزار نگران کو دیکھا جو مجھ سے دور سیڑھیوں کے پاس کھڑا تھا۔ اسے مجھ پر نظر رکھنے کی ہدایت ہوگی۔ اگر اسے منع کیا جاتا کہ وہ مجھے کسی اور سے بات نہ کرنے دے تو وہ مجھے روک دیتا۔
"آپ کہاں رہتے ہیں؟"
"محل کے اندر ہی۔" میں نے جواب دیا۔
"محل کے اندر۔" وہ ذرا سوچ میں پڑی پھر اس نے سر ہلایا۔" میں معلوم کرلوں گی۔"
آشا کی عمر شاید بیس کے آس پاس تھی۔ بے حد حسین چہرہ، دودھیا روشن رنگت، شربتی آنکھیں، ستواں چھوٹی سی ناک اور نسبتاً گداز لب۔ مگر سب سے بڑھ کر معصومیت تھی جو اسے قابلِ دید بناتی تھی۔ اتنا معصوم چہرہ میری نظر سے کم ہی گزرا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ جلد مجھ سے ملنے کی کوشش کرے گی اور اس سے ملنے کا سوائے اس کے اور کوئی مقصد نہیں تھا کہ میں محل اور اس کے مکینوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مجھے ہمیشہ یہاں نہیں رہنا تھا اگرچہ بڑے کنور کا وعدہ تھا کہ اس کا کام ہو جانے کے بعد وہ میری مدد

کرے گا اور مجھے واپس پاکستان پہنچا دے گا مگر میں اس کے وعدے پر تکیہ کر کے بیٹھ جاتا تو یہ میری حماقت ہوتی۔ زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ مجھے پاکستان کے بجائے عدم آباد پہنچا دیا جائے۔ مجھے یہاں سے نکلنا تھا اوراس سے پہلے کوئی راستہ معلوم کرنا تھا جس سے میں بحفاظت نکل سکتا۔ اب تک مجھے ایسا کوئی راستہ سمجھ میں نہیں آیا تھا دوسرے لفظوں میں ملا نہیں تھا مگر آشا سے گفتگو کے بعد مجھے امید بندھی تھی، میں نے اس پر اپنے قید خانے کا محل وقوع واضح کرنے کی کوشش کی تھی نہ جانے وہ سمجھی یا نہیں۔ مگر وہ آئی نہیں، اس کے بجائے خون دینے والا دن آ گیا۔ میں اب تک ہلکی سی کمزوری محسوس کر رہا تھا مگر میں خون دینے سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔

اس بار خون نکالے جانے کے دوران میرا سر چکرانے لگا تھا۔ میں نے سخت کوشش کی بے ہوش نہ ہونے پاؤں۔ مجھے یہ خدشہ بھی تھا کہ میں بے ہوش ہو گیا تو یہ خبیث صورت قصائی نما ڈاکٹر میرے جسم سے زیادہ یا سارا ہی خون نہ نکال لے۔ میں اپنی کوشش میں کامیاب رہا۔ جب مجھے طاقت کے انجکشن کے ساتھ ڈرپ دی گئی تو میری حالت سدھرنے لگی تھی۔ اس کے بعد میں نے یکے بعد دیگرے سنگترے کے دس اور گلوکوز کے کئی عدد گلاس پیئے تب کہیں جا کر میرے حواس بحال ہوئے تھے۔ اس کے باوجود جب میں واپس جا رہا تھا تو میرے پاؤں لرز رہے تھے۔ منشی دل جی میری حالت سے بے پروا نظر آ رہا تھا۔ وہ لوگ یہ خیال کئے بغیر بے دردی سے میرا خون نکال رہے تھے کہ میں مر بھی سکتا تھا۔

یہ پورا دن میں بستر پر ہی لیٹا رہا تھا۔ اب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا تھا۔ اتنی شرافت سے ان لوگوں کے ساتھ چلا آیا تھا اور اب تک ان کے ساتھ تعاون کر رہا تھا حالانکہ مجھے راستے میں فرار ہو جانا چاہئے تھا۔ اب تک کے تجربات سے ثابت تھا کہ قدرت نے میرے لئے کوئی آفت چھوٹی نہیں رکھی تھی۔ مجھے اس لنکا میں جو بھی ملا تھا وہ باون گز کا ہی تھا۔ محل میں آنے کے بعد میں پھنس گیا تھا اور اپنی مرضی سے واپس نہیں جا سکتا تھا، مناسب موقع کے انتظار میں، مَیں نے یہ مہلت بھی گزار دی تھی اور اب میری جو حالت ہو رہی تھی، اس میں فرار کا خیال بھی محال لگ رہا تھا۔ اس دن میں صرف کھانا کھانے کے لئے اٹھا تھا۔ ورنہ مجھ سے اٹھا نہیں جا رہا تھا۔ رات کسی وقت آہٹ سے میری آنکھ کھلی۔ میں رات کا کھانا کھاتے ہی سو گیا تھا۔ اسے نیند کے بجائے کمزوری کی غشی کہنا مناسب ہو گا۔ میں نے آنکھیں کھولیں اور آشا کو سامنے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ نہ جانے کیسے اندر آئی تھی کیونکہ دروازہ باہر سے لاک ہوتا تھا۔ میں نے بولنے کے لئے لب کھولے تھے کہ اس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ اس نے میکسی نما ڈھیلا سا نائٹ ڈریس پہن رکھا تھا جس نے اس کے جسمانی خدوخال چھپا لئے تھے اس کے باوجود احساس ہوتا تھا کہ وہ متناسب جسامت رکھتی ہے۔

''شہباز جی! آپ کو کیا ہوا ہے؟'' اس نے نزدیک آ کر سرگوشی میں کہا۔ ''میں نے صبح آپ کو کلینک سے آتے دیکھا تھا، آپ بہت کمزور لگ رہے تھے۔ آپ بیمار ہیں کیا؟''

میں نے اسے دیکھا، اس بے چاری کو علم ہی نہیں تھا کہ اس کا ڈریکولا صفت بھائی میرا خون پی رہا تھا۔ یہ محاورہ نہیں حقیقت تھی لیکن اسے یہ بتانا بے کار تھا۔ ''ہاں، میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

اس نے ہمدردی سے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ ''شہباز جی، آپ کو کیا بیماری ہے؟''

''بیماری تو کوئی نہیں ہے۔'' میں نے سرد آہ بھری۔ ''بس ارجن بھیا مجھے جانے کی اجازت نہیں دے

رہے ہیں۔ اس جگہ پڑے پڑے بیمار ہو گیا ہوں۔"
اس نے میری تائید کی۔ "میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہے شہباز جی! کبھی کبھی میں بھی بیمار ہو جاتی ہوں روتی ہوں اور چیخیں مارتی ہوں پھر ڈاکٹر رشی آکر مجھے انجکشن لگاتا ہے تو میں سو جاتی ہوں۔"
وہ بے چاری گھٹن کو ہسٹریا کی صورت میں نکالتی تھی۔ ڈاکٹر کا نام رشی تھا، میں نے سرگوشی میں کہا۔ "مجھے لگ رہا ہے رشی مجھے کوئی غلط دوا دے رہا ہے جس کی وجہ سے میں کمزور ہوا ہوں۔"
"رشی ارجن بھیا کے کہنے پر ایسا کر رہا ہے تاکہ تم یہاں سے جا نہ سکو۔" اس نے اپنی ذہنی سطح کے مطابق ایک نتیجہ نکالا، ڈاکٹر رشی کی حرکت کا۔
"یہی بات ہے۔" میں نے زور دے کر تائید کی۔
"لیکن بھیا، ایسا کیوں کر رہے ہیں؟" وہ الجھ گئی تھی۔
"وہ مجھے بہت پسند کرتے ہیں اس لئے مجھے جانے کی اجازت نہیں دے رہے ہیں۔"
"وہ تو ٹھیک ہے پر، تمہیں اس طرح روکنا تو اچھا نہیں ہے۔"
"پتا نہیں، کلینک لے جا کر وہ میرے ساتھ کیا کرتے ہیں، میں بے ہوش ہو جاتا ہوں۔"
"میں بھیا سے بات کرتی ہوں۔" اس نے ہمدردی سے کہا۔
"بالکل نہیں۔" میں جلدی سے بولا۔ "وہ مجھ سے ناراض ہوں گے اور میں ان کی ناراضی برداشت نہیں کر سکتا۔"
"پھر میں کیا کروں تمہارے لئے؟"
"تم مجھے یہاں سے باہر نکال سکتی ہو؟" میں نے آہستہ سے کہا، ویسے مجھے شرم آئی تھی، میں ایک پاگل ہو جانے والی بچی کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کر رہا تھا۔
"میں ...... نہیں تو ...... مجھے خود باہر جانے کی اجازت نہیں ہے۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔
"تب میں شاید ہمیشہ کے لئے یہاں رہوں ...... میری بہن میرا انتظار کرتی رہ جائے گی۔" میں نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔
"بہن!" وہ چونکی۔ "تمہاری بہن بھی ہے؟"
"ہاں، اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ کیا لوگوں کی بہن نہیں ہوتی ہے، میری بھی ایک بہن ہے، اس کے میرے سوا دنیا میں اور کوئی نہیں ہے۔ پتا نہیں وہ میرے لئے کتنا رو رہی ہوگی، اسے تو معلوم بھی نہیں ہے کہ میں یہاں ہوں، کاش کہ میں اسے اطلاع دے سکتا۔"
"تمہاری بہن کہاں ہے، میں اسے بتا دوں گی۔"
"وہ پاکستان میں ہے۔" میں نے کہا۔
"پاکستان ......" وہ چونکی۔ "تم پاکستان سے آئے ہو؟"
"بڑی مشکل سے آیا ہوں۔ ارجن مجھے اسی وجہ سے جانے نہیں دے رہا ہے کہ میں پھر نہیں آسکوں گا۔"
"پر بھیا تو کبھی محل سے باہر نہیں گئے؟"

"ان سے میری قلمی دوستی ہوئی تھی۔ میرا مطلب ہے وہ جو خطوں کے ذریعے دوستی ہوتی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے، میری دوست ہے رانی...... دلی میں رہتی ہے، اس سے میری دوستی ہے، وہ مجھے خط لکھتی ...اور میں اسے خط لکھتی ہوں۔"

"بس تمہارے بھیا سے میری ایسی ہی دوستی ہے۔"

"مجھے اپنی بہن کا نمبر بتاؤ، میں اسے کال کر دوں گی۔"

"میری بہن کے پاس فون نہیں ہے۔ میرا ایک دوست ہے اسے تم میرے بارے میں بتانا، وہ میری ...ں کو بتا دے گا۔" میں نے اسے ندیم بھٹی کے گھر کا نمبر بتایا کاش کہ مجھے ناصر کا نمبر یاد ہوتا تو وہ بتاتا۔ میں نے ...ٹا کو اچھی طرح سمجھایا کہ اسے کیا کہنا ہے۔ ندیم کا رابطہ ناصر سے ہوگا اور ناصر راجا عمر دراز کو باخبر کر سکتا تھا۔ وہ ...رے لئے کچھ نہ کچھ کرتا۔ "تمہیں سب یاد ہو گیا نا؟" میں نے پوچھا۔

"کیوں نہیں؟" اس نے کہا اور سب فرفر سبق کی طرح دہرا دیا۔

"شاباش!" میں نے گہرا سانس لیا۔ "آشا، تم ذہین لڑکی ہو۔ تم نے سب یاد کر لیا ہے لیکن خیال رکھنا کہ ...ی کے سامنے بات مت کرنا۔ سب سے چھپ کر بات کرنا اور کسی ایسے فون سے کرنا جو ڈائریکٹ ڈائل کرتا ... موبائل ہے تمہارے پاس؟"

اس نے سر ہلایا۔ "ہے، پر یہاں کام نہیں کرتا۔"

مجھے ذرا مایوسی ہوئی تھی، اگر موبائل کام کرتا تو میں اس لڑکی سے موبائل لے کر خود رابطہ کر سکتا تھا۔

"ٹھیک ہے، اب تم جاؤ۔ کسی نے تمہیں آتے تو نہیں دیکھا؟"

"نہیں، میں چھپ کر آئی ہوں۔" اس نے جواب دیا، وہ جانے کے لئے دروازے کی طرف بڑھی تھی کہ ...ازہ کھلنے کی آواز آئی اور میں نے فوراً آنکھیں بند کر لیں اور گہری نیند کے انداز میں ذرا سا منہ کھول لیا تھا۔

"آشا! تم...... یہاں؟" مجھے راج کنور کی آواز آئی۔

"بھیا! میں ایسے ہی ادھر آ گئی، مجھے کیا پتا...... یہ آدمی ادھر ہے۔"

"احمق! اِدھر نہیں آنا تھا، چل جا اور خبردار جو پھر اِدھر آئی۔"

"جی بھیا!" آشا نے سہمے انداز میں کہا اور کمرے سے نکل بھاگی۔ مجھے راج کنور کے یہاں آنے سے ...ل ہو رہی تھی۔ بڑے کنور یعنی ارجن نے اس سے بچانے کے لئے مجھے محل کے اس کمرے میں رکھا تھا اور ...سلی دی تھی کہ میری پوری حفاظت کی جائے گی مگر لگ رہا تھا دوسرے معاملات کی طرح اس نے اس معاملے ...ی بھی جھوٹ بولا تھا۔ راج کنور اس کا بھائی تھا اور سارے انتظامات عملاً اسی کے ہاتھ میں تھے۔ یہ کیسے ممکن تھا ...سے مجھ سے دور رکھا جاتا۔ جیسے ہی آشا گئی وہ دروازہ بند کر کے میرے پاس آیا، اس نے میرے بازو پر کوئی ...ری۔

"اٹھ جا...... نوٹنکی!"

میں نے آنکھ کھولی، اس کے ہاتھ میں بید کی چھوٹی سی چھڑی تھی جو عام طور سے صاحبِ اختیار لوگ ...ری کی علامت کے طور پر رکھتے ہیں، اس نے اسی سے وار کیا تھا۔ "گویا تم نے سب سن لیا ہے؟"

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے تجھے کھلا چھوڑ دیا جائے۔'' اس نے حقارت سے کہا۔'' آشا کی وجہ سے ہم کچھ کہا نہیں۔ وہ ہے بے وقوف لڑکی!''

''بے وقوف نہیں، معصوم۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔'' مجھے حیرت ہے، وہ اس جگہ کیسے۔ شاہ کمل کے پھول کی طرح جو ہمیشہ گندی جگہ اگتا ہے۔''

راج کنور نے اس بار قوت سے وار کیا تھا لیکن میں کروٹ لے کر بچا گیا۔ غصے سے اس کے نتھنے پھول گئے تھے۔ ''تیرا انجام قریب ہے۔'' اس نے پھنکار کر کہا۔

''تمہارے بڑے بھیا نے وعدہ کیا ہے کہ مجھے آزاد کر دیا جائے گا۔''

''تجھے آزادی ضرور ملے گی، پر زندگی سے۔''

''مجھے یہی امید تھی۔'' میں نے کسی قدر مایوسی سے کہا۔ مجھے پہلے ہی اس کا خیال رکھنا چاہئے تھا کہ کمرے میں ہونے والی گفتگو کہیں سنی جا رہی ہوگی۔

''بس تیری زندگی کے چند دن اور ہیں، مزے کر لے۔'' اس نے مجھ سے ذرا فاصلے سے کہا تھا۔

''گویا میری قسمت کا فیصلہ تم لوگوں نے اپنے طور پر کر لیا ہے؟''

''ہاں اور تیرے ساتھ ایسا ہی ہوگا۔''

''راج کنور، تم سے پہلے بھی کئی افراد نے ایسے ہی دعوے کئے اور وہ تم سے کہیں زیادہ طاقتور اور اثر والے لوگ تھے مگر آج وہ زیرِ زمین ہیں اور میں زندہ ہوں۔ ممکن ہے مجھ سے پہلے تمہاری موت آ جائے، یم راج تم کو لے جائے، جیسا کہ تم سے پہلے تمہارے پُرکھوں کو لے گیا ہے۔''

''یہ سب باتیں تیری موت کو نہیں ٹال سکتیں۔'' اس نے نفرت سے کہا۔''میں وعدہ کرتا ہوں، تجھے بڑا ذلت سے ماروں گا۔''

''بائی داوے اتنی نفرت کی وجہ؟''

''میرا نام راج کنور ہے اور تُو نے میرے سامنے آنکھ اٹھا کر بات کی تھی۔''

''میں نے تمہاری بے عزتی نہیں کی تھی۔''

''تُو مسلمان ہے، پاکستانی ہے، یہ بھی کافی ہے۔''

''تو یہ بات ہے۔'' میں نے گہری سانس لی۔''تم اندر سے کٹر ہندو ہو۔ بال ٹھاکرے اور ایسے لوگوں کے پیروکار ہو۔''

''ایسا ہی سمجھ لے۔ جب میں کسی مسلمان کو دیکھتا ہوں تو میرا خون کھولنے لگتا ہے۔''

میں نے افسوس سے سر ہلایا۔''اس اکیسویں صدی میں بھی تمہاری یہ سوچ ہے۔ یہ نفرت تم لوگوں کو ڈوبے گی۔ منفی سوچوں کے ساتھ کوئی قوم عروج حاصل نہیں کر سکتی۔''

''جب ہم مسلمانوں کا خاتمہ کر دیں گے تو ہم ایک قوم بن کر بھارت ماتا کو دنیا کا سب سے طاقتور بنا دیں گے۔'' اس نے بڑہانکی۔

''اگر تم نے ہسٹری پڑھی ہو تو تمہیں معلوم ہوگا، یہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے ہندوستان کو ایک

ملک بنایا تھا۔ اسے متحد کیا تھا، ورنہ مسلمانوں سے پہلے تو راجواڑے تھے۔ محمود غزنوی کا مقابلہ کرنے کے لئے پچاس سے زیادہ راجے مہاراجے اپنی فوجیں لائے تھے۔ اگر مسلمانوں کو ہندوستان سے خارج کر دیا جائے تو وہی پچاس سے زیادہ ریاستوں یا ملکوں والا ہندوستان بچے گا۔"

"اب وقت بدل گیا ہے۔" اس نے کمزور سے لہجے میں کہا، میرے مدلل انداز نے اسے بوکھلا دیا تھا۔

"وقت بدل گیا ہے لیکن کیا تم لوگوں کی ذہنیت بدلی ہے، ذات پات کا نظام بدلا ہے؟ بھارت میں ساٹھ کروڑ اچھوت ہیں جن کو تم نے مسلم دشمنی کے نام پر دبا رکھا ہے۔ جب مسلمان نہیں رہیں گے تو تم ان کو کس بہانے سے دباؤ گے۔ ان کے لئے وقت بدل چکا ہے۔ اگر انہوں نے اعلیٰ ذات کے ہندوؤں سے آزادی کا فیصلہ کر لیا تو تم ان کو کیسے روکو گے، سکھ الگ ہیں۔"

"تم بکواس کر رہے ہو، اپنی جان بچانا چاہتے ہو۔"

"میں ہنسا۔" راج کنور، مجھے تم پر اور تم جیسی ذہنیت رکھنے والے لوگوں پر ترس آتا ہے۔ وقت واقعی بدل گیا ہے مگر تم نہیں بدلے۔"

"بھونک مت کتے!" اس نے چیخ کر کہا اور کمرے سے چلا گیا۔ میں نے عقب سے ایک قہقہہ لگایا تھا۔

یہ حقیقت تھی بھارت میں انتہا پسند ہندو جماعتوں نے اس ملک کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا۔ ملک کی تقریباً بیس فی صد آبادی کو عضوِ معطل بنا کر ترقی کے خواب دیکھنا اور چین جیسی طاقت کا مقابلہ کرنے کی سوچنا حماقت نہیں تو اور کیا تھی، یہ درست ہے کہ فی الحال بھارت ترقی کر رہا ہے اور ترقی کے تمام انڈیکس اوپر کی طرف جا رہے ہیں مگر یہ ساری ترقی ملک کے ایک محدود طبقے کے حصے میں آ رہی ہے جسے بھارتی مڈل کلاس کا نام دیا گیا ہے۔ تیس بتیس کروڑ افراد ہیں جو اوپر کے سارے فوائد سمیٹ رہے ہیں۔ تعلیم، ملازمتوں اور صنعت و تجارت میں یہی چھائے ہیں۔ شائن انڈیا کے نعرے کی چمک یہی کلاس ہے اور اس چمک دمک کے پیچھے وہ بے پناہ غریب کسی کو نظر نہیں آ رہے ہیں جن کی تعداد ایک ارب ہونے کو ہے۔ جس ملک میں ایک ارب آبادی کا گزارہ روزانہ ایک ڈالر سے بھی کم رقم سے ہوتا ہو اس کے مستقبل کو روشن کہا جا سکتا ہے؟ اس ایک ارب کی آبادی میں سارے ہی مسلمان، اچھوت اور ذیلی ذاتیں ہیں۔ جو بدترین قسم کی زندگی جی رہے ہیں۔

پاکستان میں صورتِ حال اتنی خراب نہیں ہے مگر بظاہر بدترین نظر آتی ہے اس کی وجہ پالیسیوں میں تسلسل کی کمی اور ملکی مفاد سے زیادہ ذاتی مفاد کو ترجیح دینا ہے۔ عالمی منظر نامے میں اس ملک کے کھٹکتے وجود پر نظر رکھنے والی طاقتیں، آئے دن اسے ختم کرنے (خدانخواستہ) کے نت نئے منصوبوں اور پیشین گوئیوں کا اعلان کرتی ہیں اور مفاد کی خاطر بکے غدار حالات کو ان کی مرضی کے مطابق خراب کر رہے ہیں اور خراب تر کر کے پیش کر رہے ہیں۔ اس کے برعکس بھارتی سیاست دان اور اسٹیبلشمنٹ اپنی بدصورتی چھپانے کیلئے شائن انڈیا کا نعرہ لگا کر دنیا کو بے وقوف بنا رہے ہیں۔

اس رات مجھے معمولی قسم کا لیکن قوت بخش کھانا دیا گیا تھا۔ ان کا بس چلتا تو مجھے یہ بھی نہ دیتے مگر ان کو میرے خون کی ضرورت تھی اور خون بنانے کے لئے ضروری تھا کہ میرے کھانے پینے کا خیال رکھا جائے۔ سندھو اب خود سوپ نہیں لاتا تھا۔ کسی کے ہاتھ بھجوا دیا کرتا تھا۔ مجھے اوشا کے بارے میں نہیں پتا تھا کہ وہ کہاں تھی؟

کھلوا بھی تھی یا کسی ہوس پیشہ کے بستر کی زینت بن چکی تھی۔ رات کا کھانا کھا کر میں بے خبر سویا تو میری آنکھ اگلی صبح خاصی تاخیر سے کھلی تھی۔ مجھے شبہ ہوا کہ کھانے میں کوئی خواب آور دوا بھی شامل تھی جس کی وجہ سے میں بے خبر سویا تھا۔ اس کی تصدیق یوں ہوئی کہ میں نے ناشتا کیا اور سوپ پیا اس کے چند منٹ بعد مجھے پھر نیند آنے لگی اور میں سو گیا۔

اگلے تین دن تک یہی ڈراما چلتا رہا، میں کھانا کھا کر سو جاتا تھا اور اس وقت آنکھ کھلتی تھی جب بھوک شدت اختیار کر جاتی تھی، اس لئے جب کھانا آتا تو میں ہاتھ روک نہیں پاتا تھا اور اس کا فائدہ بھی نہیں تھا۔ منشی دل جی پستول سمیت میرے سر پر سوار ہوتا تھا اور ظاہر ہے میں انکار کرتا تو مجھے جبراً کھلایا جاتا۔ پانچویں دن میں رات کے وقت بیدار ہوا تھا۔ میں جاگتا تھا اور ان لوگوں کو خبر ہو جاتی تھی اور وہ نیا کھانا لے کر حاضر ہو جاتے تھے۔ نہ جانے کیمرا تھا یا میری آہٹوں پر کسی کے کان لگے تھے؟ اس لئے بیدار ہونے کے باوجود میں ساکت لیٹا رہا۔ رفتہ رفتہ میرے حواس مکمل طور پر قابو میں آ گئے تھے اور میرے ذہن نے سوچنا شروع کر دیا تھا۔ اس طرح بے ہوش رکھنے کی دو وجوہات ہو سکتی تھیں۔ ایک تو یہ کہ میں کسی گڑبڑ کے قابل نہ رہوں دوسرے میں جاگ کر اپنی توانائی نہ خرچ کروں اور جو کھاؤں پیوں اس سے صرف میری صحت بنے۔ اگلے روز میرا پھر خون نکالا جانا تھا اور میری جو کیفیت ہو رہی تھی اس کے بعد میں زندہ بچ بھی جاتا تو زندہ لاش سے زیادہ نہ ہوتا۔ اس سے اگلی بار یہ لوگ یقینی طور پر میرا سارا خون نکال کر مجھے مار ڈالتے۔ مجھے زندہ رہنے کے لئے جو کرنا تھا وہ ابھی کرنا تھا۔ ورنہ مجھے مہلت نہیں ملتی۔ یہ سوچتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا کہ اب کھانا نہیں کھانا ہے اور اس کے لئے آسان سی ترکیب تھی میں سوتا بنا رہتا۔ سوتے میں یہ کھانا میرے منہ میں ڈالنے سے تو رہے۔ غالباً مجھے سوئے ہوئے پہلے ہی خاصی دیر ہو چکی تھی اور ان لوگوں کے خیال میں مجھے اب تک ہوش میں آ جانا چاہئے تھا۔ دروازہ کھلا تو میں نے آنکھیں بند کر لیں اور بالکل ساکت ہو گیا۔ اندر آنے والا منشی تھا۔ اس نے مجھے آواز دی۔

''اے...... اٹھ جا، بہت سو لیا۔'' ظاہر ہے میں نہیں اٹھا تو اس نے مجھے جھنجوڑنا شروع کر دیا۔ میں بے جان سے انداز میں ہلتا رہا۔ پھر میں نے راج کنور کی آواز سنی۔

''اسے کھانے میں نیند والی گولی زیادہ تو نہیں دے دی تھی؟''

''نہیں سرکار! میں نے خود دوا شامل کی تھی۔''

''پھر اب تک اسے ہوش کیوں نہیں آیا؟''

''نہ آئے...... صبح ویسے بھی اس نے......''

منشی دل جی کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے راج کنور نے اس سے کہا۔ ''نہیں، اسے ڈاکٹر کو دکھاؤ۔''

''مارے گئے۔'' میں نے دل میں کہا۔ ڈاکٹر ایک منٹ میں میری اداکاری بھانپ جاتا۔ منشی دل جی نے مزاحمت کی لیکن پھر راج کنور کے حکم پر روانہ ہو گیا۔ راج کنور وہیں رہا تھا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ میں نے آنکھوں کے خفیف سے گوشوں سے دیکھا، اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور یہ دیکھ کر میرے جذبوں پر اوس پڑ گئی تھی ورنہ میں اسے قابو کرنے کی سوچ رہا تھا۔ پستول کی موجودگی میں یہ کام ممکن نہیں تھا۔ جب تک میں بستر سے اٹھ کر اس تک پہنچتا، وہ مجھے کئی بار شوٹ کر سکتا تھا۔ منشی دل جی تقریباً پندرہ منٹ بعد آیا۔

"سرکار، وہ حرام زادہ نشے میں دھت پڑا ہے۔"
"لعنت ہو۔" راج کنور غرایا۔
"سرکار، پانچ بج چکے ہیں، چار گھنٹے بعد اسے لے جانا ہے۔"
"اس کی آواز پر کان رکھنا۔" راج کنور نے کمرے سے نکلتے ہوئے منشی کو ہدایت کی۔
دروازہ بند ہوتے ہی میں نے سکون کا سانس لیا۔ تو یہ مائیک کے ذریعے میرے حرکت کرنے، چلنے پھرنے اور باتھ روم جانے کی آوازوں سے جان جاتے تھے کہ میں ہوش میں آ گیا ہوں۔ اب میں نے بے آواز حرکت شروع کر دی۔ میں دنوں سے بند پڑے جسم اور اس کے جوڑوں کو وارم اَپ کر رہا تھا۔ یہ کام زیادہ مشکل نہیں تھا۔ میرا پیٹ خالی تھا اور تیز حرکت کرنے کے لحاظ سے یہ اچھی بات تھی۔ میں بے آواز اٹھا اور باتھ روم سے بھی ہو آیا۔ کمرے میں پانی نام کی کوئی شے نہیں تھی اس لئے میں نے واش روم کے نلکے سے منہ لگا کر پانی پی لیا۔ کمرے میں آ کر بے آواز طریقے سے پنجوں کے بل اچھلنے لگا۔ پندرہ منٹ میں میرے جسم کے تمام رگ پٹھے درست طور پر کام کرنے لگے تھے۔ اگرچہ میں کمزوری محسوس کر رہا تھا مگر یہ اتنی نہیں تھی کہ مجھے چکر آنے لگتے۔
ایک گھنٹے بعد میں نے بستر پر لیٹ کر ذرا آرام کیا۔ بھوک اب بڑھ گئی تھی اور میں نے اس پر سے توجہ ہٹا لی تھی۔ آدھے گھنٹے بعد میں نے پھر چلت پھرت کی تھی اور اس کے بعد بستر پر لیٹ گیا۔ وہ لوگ کسی وقت بھی مجھے لینے کے لئے آ سکتے تھے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ دروازہ کھلا تو میں آنکھیں کھولے چت پڑا ہوا تھا۔ راج کنور اور منشی کے ساتھ ایک مسلح شخص بھی اندر آیا تھا۔ اس نے گارڈ والی مخصوص وردی پہن رکھی تھی۔ "اٹھ گئے مہاشے جی!" راج کنور نے مخصوص طنزیہ انداز میں کہا۔
"ہاں، لیکن مجھ سے اٹھا نہیں جا رہا ہے۔" میں نے بے بسی سے جواب دیا اور ہانپنے لگا۔ "تم لوگوں نے میرے ساتھ کیا، کیا ہے؟"
"ابھی تو نہیں کیا، ابھی کرنا ہے۔" راج کنور بولا۔ "ناٹک بند کر، کھڑا ہو جا۔"
میں نے لرزتے ہاتھوں سے اپنے جسم کو اوپر کرنا چاہا مگر دوبارہ گر گیا۔ "مجھ...... سے نہیں...... اٹھا جاتا۔"
"تیرے ناٹک تجھے نہیں بچا سکتے، اٹھ جا۔"
"ہم ابھی اس کا ناٹک ختم کرتے ہیں سرکار!" منشی بولا اور میری طرف آیا، اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر کھڑا کیا اور میں اس پر اوندھا گیا۔ وہ گرتے گرتے بچا تھا۔
"میرا خیال ہے، اسے کھاٹ پر لے جانا پڑے گا۔" اس نے راج کنور سے کہا۔
"کلینک سے وہیل چیئر منگوا لو۔" راج کنور نے حکم دیا۔ میں دوبارہ بستر پر لیٹ گیا تھا، میں خود کو کمزور اور ناتواں ظاہر کرنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ پندرہ منٹ بعد وہیل چیئر آ گئی تھی اور مجھے لے کر وہ تینوں کلینک کی طرف روانہ ہوئے۔ جب ہم باہر آئے تو مجھے دیکھ کر حیرت ہوئی، آسمان پر ابھی تک تاریکی تھی یعنی وقت کے بارے میں میرا اندازہ غلط تھا۔ ابھی سورج نکلنے میں بھی وقت تھا۔ اس سے پہلے مجھے اتنی صبح کلینک کبھی لے جایا نہیں گیا تھا۔ ان لوگوں کے عزائم سے لگ رہا تھا کہ مجھے آخری بار لے جایا جا رہا ہے اور وہاں سے میری لاش ہی لے جائی جاتی یا وہ بھی نہ جاتی، ممکن ہے میرے ٹکڑے کر کے اندرونِ خانہ غائب کر دیئے جاتے۔ کلینک کی

عمارت بھی خاموشی میں ڈوبی تھی اور باہر ایک ہی لائٹ روشن تھی۔ اندر ڈاکٹر رشی اپنی دونوں نرسوں کے ساتھ میرا منتظر تھا۔ میں بے جان سا وہیل چیئر پر بیٹھا تھا۔ اس نے غور سے مجھے دیکھا۔

''اسے کیا ہوا؟''

''ناٹک کرتا ہے۔'' راج کنور نے منہ بنایا اور اس پر گرجنا برسنا شروع کر دیا۔ ''حرام زادے! پچاس ہزار تجھے نشہ کر کے پڑے رہنے کے دیتے ہیں۔''

''شما چاہتا ہوں سرکار!'' ڈاکٹر رشی نے مکاری سے کہا۔ وہ راج کنور کے غصے اور گالیوں سے ذرا بھی خائف نہیں تھا۔

''اسے ابھی میرے سامنے لے چلو۔ اس کا سارا خون نکال لو۔ میں اسے اپنے سامنے مرتے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''ایسا ہی ہوگا سرکار!'' ڈاکٹر رشی نے کہا اور ایک نرس سے بولا۔ ''اسے اندر لے چلو۔''

وہ وہیل چیئر کو دھکیل کر مجھے آپریشن روم تک لائی اور مجھے سہارا دے کر ٹیبل پر لٹانے لگی۔ برابر والی ایک میز پر آپریشن کے لئے مخصوص بے شمار اوزار موجود دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔ ان میں نازک سے چیرا لگانے والے آلات سے لے کر بھاری ہڈیاں کاٹنے والے اوزار تک سب شامل تھے۔ مسلح گارڈ میرے ساتھ آیا تھا۔ میری حالت دیکھنے کے باوجود وہ مجھ پر اعتماد کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ مسلح گارڈ میری طرف سے پوری طرح چوکنا تھا اور میں اس کی موجودگی میں کوئی حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ وقت میرے ہاتھ سے نکل رہا تھا۔ ایک بار میں میرے جسم سے خون نکالنے کا عمل شروع کر دیتے تو اس کے بعد میں بے دست و پا ہو کر رہ جاتا۔ چند منٹ بعد کنور کے ساتھ ڈاکٹر اندر آیا، اس نے گارڈ سے کہا۔

''اس کے سر پر کھڑے ہو جاؤ اور یہ حرکت بھی کرے تو اس کے سر پر رائفل کا دستہ مارنا۔''

ڈاکٹر رشی نے میرے بازو سے کینولا لگایا۔ یہ ایک چھوٹا سا سوئی والا آلہ ہوتا ہے جسے ایک بار نس میں داخل کر کے اسے فکس کر دیا جاتا ہے۔ اس کی مدد سے خون لیا جا سکتا ہے اور جسم میں ڈرپ یا کوئی اور شے داخل بھی کی جا سکتی ہے۔ عام طور پر جن مریضوں کو بار بار انجکشن یا ڈرپ لگتی ہے ان کو کینولا لگا دیا جاتا ہے۔ اس طرح بار بار نس ابھار کر انجکشن لگانے کی زحمت سے بھی نجات مل جاتی ہے اور مریض کو بھی ایک ہی بار تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ ''یہ اوزار کس لئے رکھے ہیں؟'' میں نے میز پر سجے اوزاروں کی طرف اشارہ کیا۔ ''میرے پوسٹ مارٹم کے لئے...... یا دل گردے نکالنے کے لئے؟''

ڈاکٹر رشی کا چہرہ جس طرح بدلا تھا اس سے مجھے اپنی بات کا یقین ہو گیا، میں نے تو ایسے ہی اسے چھیڑنے کے لئے کہا تھا۔ اس نے چور نظروں سے راج کنور کی طرف دیکھا۔ وہ دانت پیس رہا تھا۔ اس نے غرا کر کہا۔ ''زیادہ اسمارٹ بننے کی کوشش مت کرو۔''

ڈاکٹر تھیلی میز کے ساتھ لگا رہا تھا۔ جسم سے خون لینے کے لئے تھیلی کو نیچے رکھا جاتا ہے جبکہ جسم میں خون یا ڈرپس داخل کرنے کے لئے تھیلی کو اوپر رکھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر نے اسے کینولا سے منسلک کیا اور خون بے حد تیزی سے گیا تھا۔ آج اس نے خون کی رفتار کم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ اس رفتار سے تو دس پندرہ

منٹ میں یہ میرا سارا ہی خون نکال لیتے۔ گارڈ میرے سر پر مستعد کھڑا تھا۔ میں ذرا سی حرکت کرتا، وہ میرا سر پھاڑ دیتا۔

راج کنور مسکرا رہا تھا۔ ''کیسا لگ رہا ہے مہاشے جی! ابھی تو تھوڑا ہی لہو نکالا ہے۔''

''لگنا کیا ہے، اگر میرا آخری وقت آ گیا ہے تو اسے کوئی ٹال نہیں سکتا۔ تقدیر پر تو تم بھی یقین رکھتے ہو گے؟''

''ہاں، اور آج تیری قسمت کا فیصلہ ہے۔'' اس کی نظریں خون کی تھیلی پر مرکوز تھیں جو نصف بھر چکی تھی اور میرا سر چکرانے لگا تھا۔ ایک تھیلی کے بعد میری حالت خراب ہو جاتی اور میں ویسے ہی کچھ کرنے کے قابل نہ رہتا مگر میں کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ زندگی میں شاید پہلا موقع تھا کہ میں اتنی بری طرح پھنسا تھا اور کچھ کرنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ میں سخت بے بسی محسوس کر رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے تھیلی مکمل طور پر بھر گئی تھی اور میرا سر اتنی شدت سے چکرانے لگا تھا کہ پورا کمرا گھوم رہا تھا۔ ڈاکٹر رشی نے تھیلی نکالی تو نہ جانے میں نے کہاں سے اتنی ہمت کر لی کہ اچانک ہاتھ مارا اور اس کے ہاتھ سے تھیلی اُڑ کر دور جا گری اور پھٹ گئی۔

''حرام زادے!'' راج کنور چلایا، نہ جانے اس نے یہ خطاب کسے دیا تھا، میں نہیں جان سکا کیونکہ فوراً ہی میرے سر پر ضرب لگی۔ پھلجھڑیاں سی چھوٹیں اور میں نے پٹاخے چلنے اور راج کنور کے چلانے کی آواز بھی سنی تھی، اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

☆======☆======☆

چراغوں کی روشنی واپس آنے کے بعد بھی ٹمٹماتی رہی تھی۔ میرا سر ہل رہا تھا۔ سر کے اندر مغز ہل رہا تھا بلکہ میرا پورا جسم ہل رہا تھا۔ میں اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا لیکن اتنا تو میں سمجھ گیا تھا کہ میں مرا نہیں ہوں، ابھی زندہ ہوں، میرے اردگرد اجنبی اور نامانوس سی زبان بولی جا رہی تھی۔ میں سردی بھی محسوس کر رہا تھا۔ ایک بار میں نے آنکھیں بھی کھولی تھیں مگر سر اتنے زور سے چکرایا کہ میں آنکھیں بند کرنے پر مجبور ہو گیا۔ میں سب کچھ بھول کر اپنا ذہن قابو کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد میں اپنی اس کوشش میں اتنا کامیاب ضرور رہا تھا کہ میں نے اپنے ہلنے کی وجہ جان لی تھی۔ میں کسی اسٹریچر نما شے پر تھا جسے کچھ افراد نے اٹھا رکھا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں آزاد تھے مگر میں ان کو حرکت نہیں دے پا رہا تھا۔

تھکن اور کمزوری ایسی تھی کہ سوچتے ہوئے بھی کچھ ہو رہا تھا۔ دل جیسے ڈوب اور ابھر رہا تھا۔ ذرا دیر بعد کوشش کے باوجود میں اپنا ذہن قابو میں نہ رکھ سکا تھا۔ میں پھر ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم میں کتنی دیر بے ہوش رہا تھا لیکن اگلی بار مجھے ہوش آیا تو میں کسی نرم اور گرم شے پر لیٹا تھا۔ نزدیک ہی آگ جل رہی تھی اور یہ جگہ خوشگوار حد تک گرم تھی۔ مگر وہاں صرف ان انگاروں کی روشنی تھی۔ میرا سر اب نہیں چکرا رہا تھا مگر کمزوری قائم تھی۔ میں ساکت لیٹا جائزہ لیتا رہا۔ یہ تو طے تھا کہ میں کنور کے محل میں نہیں تھا۔ یہ جگہ کسی غار کا حصہ لگتی تھی۔ کھردری چٹانی دیواریں اور ترچھی چھت کسی غار کی ہی ہو سکتی تھی۔

آس پاس لوگ تھے، ان کی باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں لیکن زبان میرے لئے نامانوس تھی۔ یہ کچھ عجیب سی زبان تھی۔ جس میں اگڑ بگڑ اور تگڑ کے الفاظ زیادہ تھے۔ کچھ دیر بعد میں نے اٹھنے کی کوشش کی اور اٹھ بیٹھا۔ سر پر ہاتھ رکھا تو کوئی چپ چپی سی شے میرے ہاتھ پر لگی تھی لیکن یہ خون نہیں تھا بلکہ کوئی اور چیز تھی۔ شاید میرے زخم پر لگائی گئی تھی۔ میرے ہاتھ پاؤں آزاد تھے۔ کوئی پہرے دار سر پر مسلط نہیں تھا۔ ایک طرف دروازہ تھا جس پر کھال کا پردہ لٹک رہا تھا یعنی میں جن لوگوں کے پاس تھا، وہ دشمن نہیں تھے ورنہ مجھے اس طرح آزاد نہ چھوڑتے۔ میرے پاس ہی مٹی کے پیالے میں پانی رکھا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر چکھا۔ پانی صاف تھا، اس سے کوری مٹی جیسی اور نباتات کی مہک آ رہی تھی۔ میں نے ایک ہی سانس میں پیالہ خالی کر دیا۔ یہ میری غلطی تھی، خالی پیٹ اتنا پانی پیتے ہی مجھے متلی سی محسوس ہوئی اور پیا جانے والا سارا پانی نکل گیا۔ میں نے قے بستر کے ساتھ کی تھی، اس سے کپڑے اور بستر بھیگنے سے محفوظ رہا تھا۔ شاید باہر میرے قے کرنے کی آواز پہنچی تھی، کوئی

پردہ اٹھا کر اندر آیا۔

"صاب! تم ٹھیک ہے نا؟" میں نے سونا کی آواز سنی تو میں اچھل پڑا تھا۔

"تو ......! میں کہاں ہوں؟"

"یہ تو مجھے بھی نہیں پتا صاب!" اس نے سادگی سے کہا۔ "پر یہ اپنے لوگ ہیں۔"

"سونا، یہاں کھانے کو ملے گا؟ میں بھوک سے مرنے والا ہوں۔" میں نے کراہ کر کہا۔

"میں دیکھتی ہوں صاب!" اس نے کہا اور چلی گئی۔ اس کی واپسی دس پندرہ منٹ بعد ہوئی تھی۔ اس نے ایک دھاتی ڈونگا اٹھا رکھا تھا جس میں لکڑی کا چمچ تھا اور ڈونگے میں لئی نما ایک شے تھی۔ سونا اپنے ساتھ ایک مشعل بھی لائی تھی جو اس نے دیوار سے لگا دی۔ اس سے روشنی کی صورتِ حال بہتر ہوئی تھی۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے دہل کر کہا۔

"پتا نہیں صاب جی! میں نے کھانے کو مانگا تو یہ دے دیا۔"

مجبوری تھی بھوک سے میں ویسے ہی قریب المرگ تھا اور پھر یہ شے شاید آٹے سے بنی تھی میں نے لئی نما شے چمچ سے حلق میں اتارنا شروع کی۔ "سونا! یہ لوگ کون ہیں؟ ہمیں محل سے کیسے نکال لائے؟"

"انہوں نے محل پر حملہ کیا تھا۔ مجھے اور قبیلے سے تعلق رکھنے والے دوسرے مردوں اور عورتوں کو وہاں سے نکال لیا۔ مجھے نہیں معلوم وہ اندر کیسے آئے؟ بہت فائرنگ ہوئی، دس سے زیادہ لاشیں صرف ہمارے مکان کے سامنے پڑی تھیں۔"

"کنور خاندان کا کیا ہوا؟"

"مجھے نہیں معلوم صاب!" اس نے پھر نفی میں سر ہلایا۔

"یہ جگہ کہاں ہے؟"

"ہمیں بارہ گھنٹے تک چلا کر اس جگہ لایا گیا ہے۔" اس نے بتایا۔ "کوئی اونچا سا پہاڑ ہے۔ اس طرف آنے کے لئے دریا پر لکڑی کا پل ہے۔ انہوں نے پل کھول دیا ہے۔"

"تمہارے اور میرے علاوہ اور کتنے لوگ لائے ہیں یہ محل سے۔"

"بہت سارے ہیں۔ میں دیکھ نہیں سکی۔ ہمیں اس جگہ رکھا گیا ہے، ہمیں ابھی باہر جانے کی اجازت نہیں ہے۔"

میں نے بدمزہ لئی کا ڈونگا صاف کر دیا اور میری جان میں جان آئی تھی۔ "کوئی آدمی جس سے بات کی جا سکے؟"

"ابھی تک تو کوئی نہیں ہے۔ باہر جانے والے راستے پر مسلح قبائلی ہیں، وہ نہ بات سنتے ہیں اور نہ باہر جانے کی اجازت دیتے ہیں۔"

"یہ کون سے قبائل ہیں، ان کا کوئی نام تو ہوگا؟"

"یہ تری دیو قبائل کہلاتے ہیں۔ نچلی ذات کے ہیں۔"

"تمہیں ان کی زبان نہیں آتی؟"

''میں اور دوسری لڑکیاں بچپن سے ادھر سے لائی گئی تھیں، ہم اپنی زبان بھول گئے ہیں۔''
لئی بد مزہ سہی مگر اس میں غذائیت تھی اور یہ زود ہضم بھی تھی، میں نے فوری طور پر توانائی محسوس کی تھی۔
''ہمارے ساتھ کوئی مرد ہے؟'' میں نے سوچ کر کہا۔
''کئی ہیں۔''
''ان میں ترگیوری ہے؟''
''میں معلوم کر کے بتاتی ہوں صاحب!'' اس نے کہا اور ڈونگا لے کر باہر چلی گئی تھی۔
تھوڑی دیر بعد ترگیوری اندر آیا تھا، وہ مجھ سے گرم جوشی سے ملا۔ ''صاحب، کیسا ہے تم؟''
''اب ٹھیک ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''آؤ بیٹھو۔ مجھے بتاؤ وہاں کیا ہوا تھا؟''
''اُدھر بہت ہنگامہ رہا۔'' اس نے میرے پاس بستر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
''ترگیوری! قبائلی اندر کیسے گھسے؟ کنوروں نے حفاظت کے لئے اتنے سخت انتظامات کئے تھے۔ ایک لشکر جرار بھی اندر نہیں گھس سکتا تھا۔''
''ہم کو نہیں معلوم۔ پر یہ لوگ اچانک محل میں نمودار ہوئے اور آتے ہی مار دھاڑ شروع کر دی۔ ان میں سے بہت سارے قبائلی ملازموں والے حصے میں گھس آئے اور جتنے قبائل سے تعلق رکھنے والے ملازم تھے، ان کو لے گئے۔''
''اور دوسرے افراد کو؟''
''ان کو وہیں چھوڑ دیا۔ گارڈز مارے گئے تھے۔''
''کنور خاندان کا پتا چلا۔ خاص طور سے راج کنور اور بڑے کنور کا؟''
''کچھ پتا نہیں صاحب! میں اپنے کمرے میں تھا اور عام لباس میں تھا اس لئے بچ گیا ورنہ مارا جاتا۔ ہم سب کو ایک بڑے سے کمرے میں بند کر دیا تھا۔ آدھے گھنٹے تک فائرنگ اور لوگوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں آتی رہی تھیں۔''
مجھے معصوم آشا کا خیال آیا۔ قبائلی جوشِ انتقام میں بھرے محل میں داخل ہوئے تھے اور یہ مشکل ہی تھا کہ انہوں نے کنور خاندان کے کسی شخص کو معاف کیا ہو چاہے وہ عورت ہو یا بچہ۔ ''تم لوگ کس طرف سے نکلے۔''
''پتا نہیں، یہ ہمیں لے کر ایک سرنگ میں گھس گئے تھے اور پھر ہم محل سے دور نکلے تھے۔ کھلی فضا میں آنے کے بعد میں نے دیکھا تھا کہ محل اور مختلف عمارتوں میں کئی جگہ آگ لگی تھی۔''
''مجھے کون لایا تھا؟''
''تم کو سرنگ میں جانے سے کچھ پہلے دیکھا تھا۔ چار قبائلی تمہارا کھاٹ اٹھائے ہوئے تھے۔''
میں ڈاکٹر رشی اور منشی دل جی کا انجام جاننے کے لئے بے چین تھا۔ پھر مجھے خیال آیا۔ ''یہ بتاؤ جس سرنگ سے تم لوگ گزرے تھے، وہ کیسی تھی؟''
''ہم سمجھا نہیں صاحب!''
''میرا مطلب ہے تازہ کھودی گئی سرنگ تھی یا پہلے سے بنی تھی؟''

"پہلے سے بنی صاف ستھری سرنگ تھی صاحب۔"

اس کا مطلب تھا، یہ محل کی خفیہ سرنگ تھی۔ والیانِ ریاست بغاوت یا دشمن کے حملے کی صورت میں فرار کے لئے اس قسم کی سرنگیں تیار رکھتے تھے۔ اگر قبائلی اس کے ذریعے اندر آئے تھے تو حملہ صاف مخبری کا نتیجہ تھا۔ قبائلی اندر کے کسی آدمی یا گروہ کی مدد سے گھسے تھے۔ ان کو تمام جگہوں کا علم تھا اور وہ حفاظتی انتظامات سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ انہوں نے اندر گھس کر قتل و غارت گری مچائی اور محل میں موجود قبائل سے تعلق رکھنے والے تمام افراد کو نکال کر لے گئے تھے۔ البتہ یہ معما تھا کہ وہ مجھے کس خوشی میں لائے تھے جبکہ میں کسی صورت قبائلی نہیں لگ رہا تھا۔ "ترگیوری، جب یہ تمہیں آزاد کرا کے لائے ہیں تو خود کیوں قید میں ڈال دیا ہے؟"

"ہم ان کے ہم نسل ہیں مگر محل میں رہے ہیں، ہم میں سے بہت سارے محل والوں کے وفادار تھے یا وفادار اب بھی ہیں اس لئے یہ ہم پر جلد بھروسا نہیں کریں گے۔"

ترگیوری کی بات معقول تھی۔ "تم نے یہ جگہ دیکھی ہوگی محل سے کتنی دور ہے؟"

"بہت دور ہے۔ ہم سارا دن سفر کرتے رہے اور رات کے پچھلے سے یہاں پہنچے۔ چودہ گھنٹے سفر کیا ہے۔"

پہاڑی علاقوں میں ایک میل میدانی علاقوں کے تین میل کے برابر ہوتا ہے۔ اگر ہمارا سفر پیدل کیا گیا تھا تو یہ جگہ محل سے پندرہ سولہ میل سے زیادہ دور نہیں تھی۔ اتنی بڑی واردات کے بعد پولیس کا حرکت میں آنا لازمی تھا اور وہ قبائلیوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے یہاں تک آ جاتے اور اس میں اب زیادہ وقت نہیں تھا۔ کنور خاندان کے ریاستی حکام سے بہترین تعلقات تھے اور ان پر حملے نے حکام کو ہلا کر رکھ دیا ہوگا۔ میں نے بے چینی سے کہا۔ "ان لوگوں کو احساس نہیں ہے انہوں نے کتنا خطرناک کام کیا ہے اور اس کے بعد محل سے پندرہ بیس میل کے فاصلے پر بیٹھے ہیں، پولیس کسی بھی وقت یہاں آ سکتی ہے۔"

"پولیس یہاں نہیں آ سکتی۔ ہم خود اتنی مشکل سے آئے ہیں۔"

"احمق، پولیس کے پاس وسائل ہیں انہوں نے ہیلی کاپٹر استعمال کئے تو دس منٹ میں یہاں آ جائیں گے۔ انہوں نے اوپر سے گولیاں برسائیں تو ان لوگوں کو بھاگنے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔"

"صاحب، تم فکر مت کرو۔ انہوں نے اپنی حفاظت کا سوچ لیا ہوگا۔ یہ قبائلی ہیں پر کم عقل نہیں ہیں۔" ترگیوری نے مجھے تسلی دی۔ مگر میری تشفی نہیں ہوئی تھی۔ "تم نے دیکھا صاحب، انہوں نے کیسی ہوشیاری سے حملہ کیا تھا۔"

"اندر سے کسی نے ان کی مدد کی تھی۔ ترگیوری سچ سچ بتاؤ، تم قبائلیوں کے ساتھ نہیں ہو؟"

"میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا صاحب، ہمارا دل ان کے ساتھ ہے۔"

"اور اب تم خود ان کے ساتھ ہو۔" میں مسکرایا۔ "تم جانتے ہو کنور مجھے قید میں رکھ کر میرے ساتھ کیا سلوک کر رہے تھے؟"

"آپ کا خون نکالتا تھا۔" اس نے سر ہلایا۔ "اس سے دوا بناتا تا۔ اس حرامی سندھو کو ہم جانتا، وہ کتے کی موت مرا۔"

''سندھو مارا گیا؟'' میں چونکا'' کیسے اور اس کا ایک لڑکی بھی تھی...... اوشا!''

''وہ بلاوجہ بھاگا تھا، اسے پیچھے سے گولی مارا گیا۔ لڑکی کے بارے میں ہم نہیں جانتا۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔'' صاحب، اب ہم کو اجازت دو۔ ہم بہت تھک گیا ہے، اب سوئے گا۔''

ترگیوری کے جانے ے بعد میں خود بھی لیٹ گیا۔ پیٹ بھرنے کے بعد میں تھکن محسوس کر رہا تھا۔ مگر سونے سے پہلے میں نے پردہ ہٹا کر باہر دیکھا۔ یہ کسی گپھا نما غار کا ایک حصہ تھا جس میں قبائلیوں نے تراش خراش کر کے رہنے کے قابل کمرے بنا لئے تھے۔ بظاہر یہ سلسلہ خاصا بڑا تھا۔ اندر جا بجا چربی سے جلنے والی مشعلیں روشن تھیں جن کی بُو ناگوار تھی مگر اس سے کیڑے مکوڑے اور مچھر بھی بھاگ جاتے تھے۔ باہر سے آنے والی آوازیں معدوم ہوگئی تھیں یعنی وہاں موجود سب ہی افراد سو چکے تھے۔ میں نے مناسب سمجھا کہ میں بھی سو جاؤں۔ باوجود اس کے کہ مجھے پولیس ریڈ کا خطرہ تھا مگر میں کیا کر سکتا تھا؟ میں خود قبائلیوں کے ہاتھ میں تھا۔ وہ نہ جانے مجھے کیوں لائے تھے؟ مگر ایک طرح سے دیکھا جائے تو وہ میرے محسن بھی تھے۔ اگر وہ مجھے لانے کی زحمت نہ کرتے تو عین ممکن تھا میرا سارا خون نکال لیا جاتا اور نتیجہ میری وفات کی صورت میں برآمد ہوتا۔ دوسرے یہ کہ میں پولیس کے ہاتھ آجاتا اور ہندوستان کی پولیس پاکستانیوں کے حق میں کتنی سفاک ہے یہ ہم سب آئے دن ٹی وی چینلو اور اخبارات میں دیکھتے ہیں۔

میری دوبارہ آنکھ کھلی تو میرا دم گھٹ رہا تھا۔ اندر مشعل جلنے سے دھواں بھر گیا تھا اور ہوا میں آکسیجن کا تناسب کم ہوگیا تھا۔ میں اٹھا اور پردہ ہٹا کر باہر آیا۔ گھپا کے اندر مستقل تاریکی چھائی رہتی تھی اور باہر کے وقت کا پتا نہیں چلتا تھا۔ لوگ ابھی تک پڑے سو رہے تھے۔ میں نے ایک طرف دیوار سے لگی مشعل اتاری اور اس تاریک راستے کی طرف بڑھا جو مجھے ایک کونے میں نظر آیا تھا۔ مگر یہ بھی ایک کمرہ ثابت ہوا تھا۔ پردہ ہٹانے پر اندر درمیانی عمر کا مرد اور ایک نوجوان لڑکی خاصی ناگفتہ بہ حالت میں سوتے نظر آئے۔ میں لاحول پڑھ کر واپس آگیا۔

دو تین بار غلط جگہوں میں گھسنے کے بعد مجھے گھپا کے باہر جانے کا راستہ مل گیا تھا، یہ ایک طویل سرنگ تھی جس کے دائیں بائیں اور بھی وسیع گپھائیں تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا ان لوگوں نے پہاڑ کے اندر پورا شہر بسا لیا تھا۔ سرنگ کے دہانے کے قریب مجھے سرد اور تازہ ہوا کے ساتھ روشنی بھی ملی تھی۔ صبح ہو چکی تھی۔ دہانے پر دو عدد مسلح قبائلی کھڑے تھے۔ یہ کسی قدر سانولے رنگ کے لمبے تڑنگے اور تیکھے نقوش کے حامل افراد تھے۔ تبتی اتنے جسیم نہیں ہوتے جتنے کہ یہ تھے۔ بیشتر افراد نے کھال سے بنا لباس پہن رکھا تھا، اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہ گوشت کھاتے تھے اور ان کی جسمانی تنومندی کا راز بھی یہی تھا۔ پہرے داروں نے مجھے روک لیا۔ انہوں نے زبان سے اور اشارے سے بتایا کہ مجھے باہر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ ان کا انداز حاکمانہ تھا مگر درشت نہیں تھا۔ میں نے بھی اشارے سے سمجھایا کہ اندر میرا دم گھٹ رہا ہے اس لئے میں باہر آیا ہوں۔ اگر مجھے باہر جانے کی اجازت نہیں دے رہے تو دہانے پر بیٹھنے دیں۔ اس پر انہوں نے اعتراض نہیں کیا تھا، میں وہیں بیٹھ گیا۔

دہانے سے مجھے جو نظر آرہا تھا، یہ خاصا اونچا پہاڑی سلسلہ تھا اور ڈھلانیں تقریباً عمودی تھیں۔ گھنے جنگل کے ساتھ نیچے کوئی دریا بہہ رہا تھا اس کا شور یہاں تک سنائی دے رہا تھا۔ شاید اس دریا پر پل تھا جسے توڑ کر یہ لے

چارے سمجھ رہے تھے کہ اب پولیس ان تک نہیں آسکتی حالانکہ یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا، پولیس کے خیال نے مجھے مضطرب کر دیا تھا اور میں نے پہرے داروں کو زبان اور اشاروں سے کہنا شروع کیا کہ مجھے ان کے کسی لیڈر سے ملنا ہے۔ پانچ دس منٹ کی محنت کے بعد نہ جانے ان کی سمجھ میں کیا آیا، ایک پہرے دار نے اپنے ساتھی سے کچھ کہا اور مجھے بازو سے پکڑ کر غار کے اندر لے جانے لگا، مجھے مایوسی ہوئی۔ وہ میری بات نہیں سمجھا تھا اور مجھے میرے حصے میں واپس لے جا رہا تھا۔

مگر اس کا رخ گھپا کے ایک اور حصے کی طرف تھا۔ اس جگہ بھی خاصے غار تھے مگر ان میں سارے ہی مرد تھے جو پڑے بے خبر سو رہے تھے۔ اس جگہ ہتھیار بھی تھے۔ ان میں جدید خودکار ہتھیار کم تھے، زیادہ تر پرانی ساخت کی رائفلیں تھیں جن کو ایک فائر کے بعد لوڈ کرنا پڑتا تھا۔ وہ مجھے ایک غار میں لے گیا، اندر ایک نوجوان اور دلکش مرد بیٹھا تھا۔ اس کے پاس ایک عدد رائفل تھی اور تعجب انگیز بات کہ اس کے ہاتھ میں ایک موٹا سا انگریزی ناول تھا جو وہ لیمپ کی روشنی میں پڑھ رہا تھا۔ میرے ساتھ آنے والے پہرے دار نے اپنی زبان میں اس سے کچھ کہا۔ نوجوان نے میری طرف دیکھا۔ ''تم انگریزی سمجھتے ہو؟'' اس نے انگریزی میں کہا۔

میں نے سر ہلایا۔ ''ہاں۔''

''گڈ، میرا نام کمار ہے، کمار رائنا!''

''شہباز ملک!'' میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا جو اس نے تھام لیا۔ ہینڈ شیک کے بعد اس نے پہرے دار سے کچھ کہا اور وہ سر جھکا کر چلا گیا۔

''بیٹھو۔'' اس نے سامنے اشارہ کیا، وہ خود چٹائی پر بیٹھا تھا۔

''شکر ہے کوئی شخص تو ایسا ملا جو میری زبان سمجھتا ہو۔''

''تمہیں ہمارا شکر گزار ہونا چاہئے۔ ہم بروقت پہنچے جب وہ شیطان ڈاکٹر تمہارے جسم سے خون نکالنے والا تھا۔''

''اس نے ایک تھیلی خون لے لیا تھا۔'' میں نے تصحیح کی۔ ''میں نے مزاحمت کی اور خون ضائع کر دیا اس کی پاداش میں مجھے سر پر ضرب کھانی پڑی۔''

''وہ بہت خبیث آدمی ہے۔ میں خاص طور سے اسے قتل کرنے گیا تھا۔''

''وہ تو محض ایک ملازم ہے، کنور خاندان کا۔''

''وہ محض ملازم نہیں ہے، ان کا بزنس پارٹنر بھی ہے۔''

''کس بزنس میں پارٹنر؟''

''انسانی جسم کے اجزاء کا بزنس!'' اس نے انکشاف کیا۔ ''یہ خبیث ڈاکٹر ہم قبائلیوں کے جوان لوگوں کے جسم سے دل، گردے، جگر اور آنکھیں نکال لیتا ہے۔ یہ سارے اعضا بیرونِ ملک مہنگے داموں بیچے جاتے تھے۔''

میں سن رہ گیا، مجھے وہ منظر یاد آیا جب مجھے آپریشن روم میں لے جایا گیا تھا۔ وہاں میز پر سرجری کے اوزار سجے تھے۔ یقیناً جب میرے جسم سے سارا خون نچوڑ لیا جاتا تو میرے کارآمد اعضا بھی نکالے جاتے اور

بیش قیمت پر خریداروں کو بیچے جاتے۔ میں نے سنبھل کر پوچھا۔ ''تم لوگوں کے اعضا کیوں نکالے جاتے تھے؟''

''ہم نے کنور خاندان کی غلامی قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اس لئے وہ ہمارے دشمن ہو گئے، پولیس اور کنور کے آدمیوں نے حملہ کر کے ہمیں ہماری بستیاں چھوڑنے پر مجبور کیا۔ ہماری فصلیں اجاڑ دیں۔ جنگل اور چراگاہوں پر قبضہ کر لیا۔ اس پر ستم کہ ہمارے لوگوں کو اغوا کیا جانے لگا۔ ان کو مار کر ان کے جسم سے اعضا نکال لئے جاتے ہیں اور لاشیں غائب کر دی جاتی ہیں۔'' اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

''وہ تمہارے ہاتھ لگا؟''

اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے سر ہلایا۔ ''نہیں، وہ چھپ گیا تھا۔ کلینک میں تم تھے اور ایک لڑکی تھی باقی سب فائرنگ کی آواز سن کر بھاگ گئے تھے۔ وہاں تم بے ہوش پڑے تھے۔ سرجری کے اوزار دیکھ کر میں سمجھ گیا تھا کہ وہ تمہارے اعضا نکالنے کی تیاری کر رہے ہیں اور اس سے پہلے تمہارا خون نکال رہے تھے۔ وقت نہیں تھا اس لئے میں تم کو لے کر وہاں سے نکل گیا۔''

''مجھ پر یہ مہربانی کیوں؟''

''تم بھی ہماری طرح مظلوم ہو۔ مجھے معلوم تھا ہمارے جاتے ہی وہ ابلیس پھر آ کر تمہیں مار ڈالے گا۔ تمہاری حالت خاصی خراب تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ تم زیادہ دیر زندہ نہیں رہو گے۔ راستے میں بھی تم اکھڑے اکھڑے سانس لے رہے تھے۔ بہر حال یہاں لانے تک تم زندہ رہے اور تم نے اتنی تیزی سے ری کور کیا کہ میں حیران ہی رہ گیا تھا۔ اب تم بالکل ٹھیک لگ رہے ہو۔''

''میں خاصا سخت جان ہوں۔'' میں نے اعتراف کیا۔

''ان لوگوں کے ہاتھ کیسے لگے؟''

میں نے پہلے ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ میں اپنا وہی تعارف کراؤں گا یعنی دلی کا رہنے والا ہوں۔ کیونکہ یہ نچلی ذات کے ہندو تھے اس لئے ان سے مجھے تعصب کی امید نہیں تھی اسی وجہ سے میں نے اپنا اصل نام بتا دیا تھا۔ بس یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ میں پاکستانی ہوں۔ میں نے اسے یہی کہانی سنائی کہ میں دلی کا رہنے والا ہوں۔ دوستوں کے ساتھ شکار کھیلنے آیا تھا مگر راستہ بھٹک گیا تھا اور سندھو کے ہاتھ لگ گیا۔ وہ سپیرا تھا، اس کے ایک خطرناک سانپ نے مجھے ڈس لیا تھا اور علاج سے میں بچ گیا لیکن میرے خون میں کچھ ایسی خصوصیات پیدا ہو گئی تھیں جن سے بعض امراض کا علاج کیا جا سکتا ہے۔ وہ اس وجہ سے میرا خون نکال رہے تھے۔''

''یہ انسانیت سے عاری درندے ہیں۔'' کمار نے گہری سانس لی۔ ''لیکن ان کے حساب کا وقت آ گیا ہے۔''

''کنور برادران تمہارے ہاتھ لگے یا نہیں؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں، وہ بھی بھاگ گئے تھے۔''

''اس کا مطلب ہے انہوں نے اپنی حفاظت کا کوئی متبادل بندوبست کر رکھا تھا۔ ورنہ راج کنور تو میرے ساتھ تھا اور بے ہوش ہونے سے پہلے میں نے فائرنگ کی آواز سنی تھی۔''

''میں سمجھتا ہوں۔'' اس نے ایک طرف رکھی کیتلی سے چائے دو پیالیوں میں ڈالی، ایک اپنے سامنے رکھی

اور دوسری میرے سامنے رکھ دی۔ ''وہ بہت بزدل لوگ ہیں اور بزدل لوگ ہمیشہ اپنے تحفظ کے بارے میں سوچتے ہیں۔ میرے پاس وقت نہیں تھا ورنہ اس پورے محل کو آگ لگا دیتا۔ وہ جہاں بھی ہوتے جل کر مر جاتے۔''

''تم کو پولیس کا خطرہ تھا؟''

''پولیس کا بھی...... اور وادی میں آباد اُن کے وفاداروں کا بھی۔''

''محل کی سکیورٹی بہت سخت تھی، تم اندر کیسے آئے؟''

وہ مسکرایا۔ ''یہاں بھگوان نے مدد کی، ہمیں اندر چند ہمدرد مل گئے، ان کی مدد سے ہم نے حملہ کیا اور اپنے آدمیوں کو وہاں سے نکال لائے۔''

''اپنے آدمی! تمہارا مطلب ہے وہ قبائلی جو کسی بھی حیثیت سے محل میں رہ رہے تھے۔ بس یہی مقصد تھا تمہارا؟''

''اصل میں تو ہم راج کنور، ارجن کنور اور ان کے گرگوں کا خاتمہ کرنے گئے تھے مگر وہ سب غائب ہو چکے تھے۔''

''اندر کا آدمی کون تھا؟'' میں نے سوچ کر پوچھا۔

''یہ میں نہیں بتا سکتا۔''

''مسٹر کمار! مجھے لگ رہا ہے تم لوگوں کو ڈبل کراس کیا گیا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا تو وہ چونکا۔

''کیا مطلب؟''

''تم نے اتنی آسانی سے حملہ کیا۔ وہاں قتل و غارت گری کی، لیکن مارے کون گئے؟ مجھے یقین ہے ان میں کنور خاندان کا ایک فرد بھی نہیں ہوگا اور نہ ہی ان کا کوئی خاص آدمی ہوگا، وہ سب نکل گئے ہوں گے، کیسے......؟ کیا ان کو پہلے سے الہام تھا؟''

''شاید!'' اس نے غور کر کے کہا۔ ''لیکن میں نے اس آدمی پر پوری طرح اعتماد نہیں کیا تھا۔ ہم نے ایک دن پہلے حملہ کر دیا تھا۔''

''اوہ، اسی وجہ سے وہ اتنے سکون سے میرا خون نچوڑنے کی تیاری کر رہے تھے ورنہ ان کو حملے کا علم ہوتا تو یہ کام ایک دن پہلے کر لیا جاتا مگر میری بات لکھ کر رکھ لو۔ راج کنور اور اس کے بھائی کو اگلے روز ہونے والے حملے کا علم تھا۔''

اس نے الجھی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''تم احمقانہ باتیں کر رہے ہو۔ ان کو بھلا کیا فائدہ ہوا، ان کے اتنے آدمی مر گئے، محل کو نقصان ہوا۔''

''سب نقصان پورا ہو جائے گا۔ کرائے کے مرنے والے اور مل جائیں گے۔ محل کا نقصان انشورنس والے پورا کریں گے۔ اصل فائدہ وہ اب اٹھائیں گے۔''

''اور وہ فائدہ کیا ہے؟'' اس نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"تم لوگوں کے خلاف ریاستی آپریشن ہوگا، تم لوگ دہشت گرد قرار پاؤ گے اور ممکن ہے ریاست کی حکومت پیرا ملٹری حکام سے بھی مدد طلب کر لے۔ تم ان کا مقابلہ کر سکو گے؟...... وہ سب کو مار دیں گے اور مال بیچنے والوں کو گرفتار کر کے لے جائیں گے۔"

کمار کے چہرے پر فکر کے آثار نمودار ہوئے۔ "یہ امکان ہے۔"

"ممکن ہے امکان ہی ہو مگر کمار جی! مجھے اس حملے کی اور کوئی تک سمجھ نہیں آ رہی ہے۔ میرا خیال ہے حملے کا آئیڈیا بھی اندر کے آدمی نے دیا ہوگا ورنہ تمہارا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہوگا۔"

"ہاں، ایسا ہی ہے۔"

"اس سے اندازہ لگا لو۔" میں نے کہا۔

اس نے فکر سے مجھے دیکھا۔ "تم نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔"

"میں نے تمہیں خبردار کر دیا ہے۔ اگر تمہارا یہ ٹھکانا سب کے علم میں ہے تو پولیس کو یہاں آنے میں دیر نہیں لگے گی۔ خاص طور سے تمہارے اس مخبر کے علم میں ہو تو۔"

"میرے آدمی آگے تک ہیں اگر پولیس آئی تو مجھے اطلاع مل جائے گی۔"

"تمہارا کیا خیال ہے، پولیس پیدل آئے گی۔ وہ ہیلی کاپٹرز پر آ سکتے ہیں، ان کو اسلحے سمیت کسی پہاڑ کی چوٹی پر اتارا جا سکتا ہے، تم نیچے دیکھتے رہ جاؤ گے اور وہ اوپر سے نازل ہو جائیں گے۔"

"میں اپنے آدمی اس طرف بھی لگا تا ہوں۔"

"یہ بتاؤ، اگر باہر پولیس گھیرا ڈال دے تو نکلنے کا کوئی اور راستہ ہے؟"

"راستہ تو ہے...... پر......"

"اس شخص کے علم میں ہے جس نے محل میں گھسنے میں تمہاری مدد کی تھی؟"

"نہیں، اسے میں نے اتنا نہیں بتایا تھا بلکہ میرے علاوہ چند ہی افراد کو اس راستے کا علم ہے۔"

"کمار! اس جگہ کے علاوہ تمہارا کوئی ٹھکانا ہے؟"

اس نے سر ہلایا۔ "اس صورت میں مجھے اوپر پہاڑوں پر اپنے آبائی قبیلے کی طرف جانا ہوگا پھر وہیں پناہ مل سکتی ہے۔"

"کتنے لوگ ہیں تمہارے ساتھ...... ان کی تعداد کیا ہے؟"

"ویسے تو ساری بستیوں کے ملا کر دس ہزار سے زیادہ ہیں لیکن میرے ساتھ پندرہ سو ساتھی ہیں۔ ان میں ہزار لڑنے والے مرد ہیں، اس جگہ چھ سو ساتھی ہیں۔"

"تمہاری کیا حیثیت ہے ان میں؟"

"میرا باپ اس قبیلے کے دس ہزار افراد کا سردار تھا۔ وہ پچھلے حملے میں مارا گیا، اس کے ساتھ میرے بڑے بھائی تھے، وہ بھی واپس نہیں آئے۔ تب قبیلے کے بزرگوں نے مجھے سردار بنا لیا۔"

"اسلحہ کتنا ہے تمہارے پاس؟"

"کچھ خودکار رائفلیں ہیں۔ زیادہ تر پرانی ساخت کی رائفلیں ہیں۔ ہمارا اصل ہتھیار تیر کمان ہے۔"

ملے بتایا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ سادہ طبیعت کا آدمی تھا جو ہر ایک پر جلدی اعتبار کر لیتا تھا۔ ابھی اسے تجربہ نہیں تھا اس کی جگہ اس کا باپ ہوتا تو وہ مجھے یہ سب نہیں بتاتا۔

''تم کون ہو شہباز ملک!'' اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ ''تمہاری باتوں سے لگ رہا ہے، تمہیں ان سب معاملات کا خوب تجربہ ہے؟''

''ہاں، پچھلے کچھ عرصے سے گزر رہی ہے اسی دشت کی سیاحی میں۔'' میں نے سرد آہ بھری۔ ''دوست ایک مشورہ ہے۔ ابھی عورتوں اور بچوں کو یہاں سے روانہ کر دو صرف وہی لوگ رکھو جن کو لڑنے اور ضرورت پڑنے پر فرار کا تجربہ ہو۔''

''ہم قبائلی میدانِ جنگ سے بھاگنا بزدلی سمجھتے ہیں۔''

''دشمن تعداد میں زیادہ اور خطرناک اسلحے سے لیس ہو تو اسے مصلحت کہتے ہیں۔ بہادری کے نام پر اپنے آدمی کٹوا دینا حماقت کہلاتی ہے۔''

وہ پڑھا لکھا آدمی تھا اس لئے میری بات برداشت کر لی۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''تم نے جن خدشات کا اظہار کیا ہے ان پر تمہیں کتنا یقین ہے؟''

''سو فی صد تو نہیں ہے لیکن یوں سمجھ لو کہ خاصی حد تک یقین ہے۔ جو لوگ خطرات میں گھرے رہتے ہیں، ان کو اپنی چھٹی حس سے کام لینا پڑتا ہے اور اس پر یقین بھی رکھنا ہوتا ہے۔''

''تم اسی جگہ رہو۔'' کمار نے مجھ سے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ صبح ہو چکی تھی اور میرا خالی پیٹ گڑگڑا رہا تھا۔ کمار کی واپسی نصف گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ اس نے میرے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اپنے آدمیوں کو چوکس کر دیا ہے۔ خاص طور سے اوپر کی جانب سے۔''

''اور خفیہ راستے کے بارے میں کیا، کیا؟''

''کچھ نہیں۔ اس کا پتا جن لوگوں کو ہے ان کی زبان سے کچھ نکل نہیں سکتا۔''

میں غور کر رہا تھا۔ ''کمار، جن لوگوں نے پہلے محل پر حملہ کیا تھا، ان میں کوئی ایسا فرد تھا جو خفیہ راستے سے واقف ہو؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''میرے باپ اور دو بھائیوں سمیت دس افراد تھے۔''

''فرض کرو، ان میں سے کوئی زندہ پکڑا گیا ہو؟''

''نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔''

''میں نے جو تجربہ حاصل کیا ہے، انسان پر بعض اوقات ایسا وقت بھی آتا ہے جب وہ مرنا چاہتا ہے، مگر اسے موت بھی نہیں آتی۔''

''یعنی ان لوگوں پر اس راستے کا راز کھل گیا ہے۔'' اس نے فکر مندی سے کہا۔

''اس کا امکان ہے۔'' میں بولا اور پھر اسی موضوع پر بات چلتی رہی جب کہ میں سوچ رہا تھا کہ صبح ہو گئی تھی مگر اب تک ناشتے کا کچھ پتا نہیں تھا۔ کمار بھی اس بارے میں خاموش تھا میں نے تنگ آ کر کہا۔ ''میاں کمار! تمہارے ہاں مہمانوں کی خاطر تواضع کا کوئی رواج ہے۔''

''معاف کرنا، میں بتانا بھول گیا ناشتا آنے والا ہے۔'' وہ شرمندہ ہو گیا۔
''محل سے تم لوگ کتنے افراد چھڑا کر لائے ہو؟''
''تم سمیت پچاس افراد۔ ان میں دو ہی ایسے ہیں جن کا ہمارے قبیلے سے تعلق نہیں ہے۔''
''ایک تو میں ہو گیا، دوسرا کون ہے؟''
''ایک لڑکی...... ہمیں تمہارے پاس سے ملی تھی۔''
''موٹی سی اور کالی سی...... نرس ہو گی۔''
''نہیں، وہ تو بہت پیاری سی لڑکی ہے۔'' اس نے بے ساختہ کہا۔
''پیاری سی لڑکی، کلینک میں تو ایسی کوئی شے نہیں پائی جاتی تھی۔'' میں نے سوچا۔ ''تم اسے دکھا سکتے ہو مجھے؟''
''ناشتا کر لو۔'' اس نے کہا۔ ''میں نے اسے دوسری عورتوں کے ساتھ تیار ہونے کو کہا ہے۔ وہ کچھ دیر میں روانہ ہو جائیں گی۔''
''یہ تم نے اچھا کام کیا ہے۔ کیا تم قبائل سے مدد لے سکتے ہو؟''
''میں ان لوگوں کو مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔
''اگر وہ صرف مدد ہی کر دیں جیسے راستے خراب کر دیں یا راستے میں آنے والے پلوں کو تباہ کر دیں۔''
''ہاں، یہ ہو سکتا ہے۔''
''اور یہ بھول جاؤ کہ آپریشن صرف تمہارے خلاف ہو گا۔ کنور خاندان نے شاید تمام قبائل کو نیست و نابود کرنے اور علاقہ بدر کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ وہ ان کی جگہ دوسروں کو آباد کریں گے جو ان کے حکم کی سرتابی نہ کر سکیں اور علاقے کے وسائل پر اپنا حق نہ جما سکیں۔''
''یہ اتنا آسان نہیں ہے۔'' اس نے بے یقینی سے کہا۔ ''دس ہزار افراد کو بے دخل کرنا۔''
''اگر انہوں نے تم پر قابو پا لیا تو یہ کام بہت آسان ہو گا۔ وہ صرف سو ٹرک لائیں گے اور تم سب کو اس میں بھر کر دور دراز مقامات پر چھوڑ آئیں گے۔ وہ تم کو اس طرح منتشر کر دیں گے کہ تم آپس میں مل بھی نہ سکو۔''
''تم تو ایسا کہہ رہے ہو جیسے یہ سب طے ہے۔'' وہ ہنسا تھا، خوف زدہ اور آسیبی سی ہنسی۔
''نہیں، ہو سکتا ہے ایسا نہ ہو لیکن ہنگامی حالات میں آدمی کو ہر چیز کے لئے تیار رہنا چاہئے۔''
ایک آدمی ناشتا لے کر آیا۔ کسی چیز کی کھیر تھی جو میٹھی تھی۔ مکئی کی روٹی اور مکھن تھا۔ اس کے بعد چائے۔ یہ قہوہ نہیں چائے ہی تھی اور شاید ان پہاڑوں پر اُگتی ہو گی کیونکہ کھانے میں کوئی چیز باہر کی نہیں تھی۔ کھانے کے بعد اس نے مجھ سے کہا۔
''آؤ میرے ساتھ میں تمہیں لڑکی دکھا دوں۔ اگر وہ بے قصور آ گئی ہے تو مجھے افسوس ہے۔''
وہ مجھے لے کر اس گپھا میں آیا جس میں، مَیں نے رات گزاری تھی۔ یہ شاید سب سے اندر کا حصہ تھا۔ اس لئے یہاں مستقل رات رہتی تھی۔ ایک غار میں صرف عورتیں تھیں، یہ زیادہ تر محل میں کام کرنے والی عورتیں اور لڑکیاں تھیں۔ ان میں ایک لڑکی نے پتلون اور قمیص پہن رکھی تھی، اس نے اوپر بھاری سوئٹر لیا ہوا تھا۔ کمار سلے

عورتوں سے اسے باہر لانے کو کہا۔ لڑکی نے منہ چھپا رکھا تھا۔ کمار کے اشارے پر اسے زبردستی باہر لایا گیا، جب اس کے چہرے سے چھوٹا سا کپڑا ہٹایا گیا تو میں دنگ رہ گیا۔ وہ آشا تھی، راج کنور اور بڑے کنور کی بہن۔

''تم اسے جانتے ہو؟'' کمار نے میرے تاثرات دیکھ کر کہا۔

''ہاں، شاید یہ محل میں کوئی کام کرتی ہے۔'' میں سنبھل کر بولا۔ ''میں نے دو تین بار اسے دیکھا تھا۔''

''مجھے شبہ ہو رہا ہے یہ کنور خاندان سے تعلق نہ رکھتی ہو۔''

''تم نے ان عورتوں سے معلوم نہیں کیا؟'' میں نے محل سے لائی جانے والی خادماؤں کی طرف اشارہ کیا۔

''معلوم کیا تھا۔ یہ اس کے بارے میں لاعلمی ظاہر کر رہی ہیں۔''

میں نے سکون کا سانس لیا۔ یعنی خادماؤں کو بھی اس سے ہمدردی تھی ورنہ اب تک اس کا پول کھل چکا ہوتا۔ ''کیا میں اس سے بات کر سکتا ہوں۔ ممکن ہے یہ اپنے بارے میں بتا دے۔''

''مجھے ہندی نہیں آتی ورنہ میں خود پوچھ لیتا۔'' اس نے سر ہلایا۔

یہ ایک اور اچھی بات تھی، میں آشا کے قریب آیا۔ ''تم نے مجھے پہچانا؟''

''تم شہباز ہو؟'' اس نے سر ہلایا۔

''ان کو نہیں پتا کہ تم کس خاندان سے ہو۔ ان خادماؤں نے بھی تمہارے بارے میں نہیں بتایا ہے۔ میں نے اس سے کہا ہے تم وہاں کام کرتی ہو۔''

''اگر اسے میرے بارے میں پتا چل گیا تو......؟'' وہ ڈر گئی تھی۔

''کچھ کہا نہیں جا سکتا، ویسے تو یہ اچھے لوگ ہیں، شریف اور کسی کو تکلیف نہ دینے والے لیکن تمہارے خاندان نے ان کا بہت نقصان کیا ہے، اگر ان کو تمہارے بارے میں پتا چل جائے تو نہ جانے ان کا کیا ردِعمل ہو۔ اس لئے ان کا بے خبر رہنا ضروری ہے۔''

''تم اس سے کیا کہہ رہے ہو؟'' کمار نے پوچھا، اس کے لہجے میں ہلکا سا شک تھا۔

''اُسے ہندی صحیح طرح نہیں آتی، اس لئے اس سے ہر بات کی وضاحت سے کر رہا ہوں۔ اس کا کہنا ہے یہ آرائش کرنے کی ماہر ہے اور اسی لئے محل میں آئی تھی۔''

''یعنی اس کا کنور خاندان سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہے؟''

''نہیں۔'' میں نے اس سے کہا اور اردو میں آشا سے کہا۔ ''میں نے اسے بتایا ہے تم آرائش کی ماہر ہو اور اس کام سے محل میں آئی تھیں، اس سے زیادہ کچھ مت بتانا۔''

''اور اپنا نام کیا بتاؤں؟''

''جو اصل نام ہے ورنہ گڑبڑ ہو سکتی ہے۔ تم کم سے کم بولنا، ٹھیک ہے؟''

''یہ ہمیں کہاں بھیج رہا ہے؟''

''اس جگہ پولیس کے چھاپے کا خطرہ ہے اس لئے تم سب عورتوں کو پیچھے پہاڑوں پر بھیجا جا رہا ہے۔''

''شہباز، مجھے ان سے بچا لو۔ یہ تمہیں کچھ نہیں کہہ رہے۔''

"تمہارے بھائیوں نے میری جان لینے کی کوشش کی تھی وہ میرے دشمن ہوئے اور یہ ان کے دشمن ہیں اس لئے ہم سب آپس میں دوست ہوئے اور تم فکر مت کرو، میں تم کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔ ویسے مجھے امید نہیں ہے یہ عورتوں سے بدلہ لیں؟"

"پھر بھی مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے، مجھے اپنے ساتھ رکھو۔"

میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ اسے ساتھ رکھنے کا مطلب تھا کہ وہ میری ذمے داری بن جاتی اس لئے میں نے انکار کر دیا۔ "تم وہاں زیادہ محفوظ رہو گی، یہ خادمائیں تمہاری حفاظت کریں گی، یہاں پر محل سے لائے جانے والے مرد بھی ہیں، ممکن ہے وہ تمہارے بارے میں بتا دیں۔"

میری دلیل نے اسے قائل کر لیا۔ "ٹھیک ہے، پھر تم میرے ساتھ رہو۔"

"یہ میری نہیں، اس کی مرضی ہے۔" میں نے کمار کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ ان قبائلیوں کا سردار ہے، اس کا باپ محل پر ہونے والے پہلے حملے میں مارا گیا تھا۔ اس کے دو بھائی بھی مارے گئے تھے۔"

آشا ڈر گئی تھی۔ اس نے سہمی ہوئی نظروں سے کمار کی طرف دیکھا۔ "پھر اسے میرے بارے میں مت بتانا ورنہ یہ مجھے مار ڈالے گا۔"

"یہ میرے بارے میں کیا کہہ رہی ہے؟" کمار نے اندازہ لگا لیا تھا۔

"یہ تم سے ڈر رہی ہے۔" میں نے اسے آگاہ کیا۔ "اسے خوف ہے کہ محل سے تعلق کی وجہ سے تم اسے مار نہ دو یا کوئی سزا دو گے۔"

"اسے کہو، مجھ سے مت ڈرے، ہم عورتوں اور بچوں پر ہاتھ اٹھانے کے قائل نہیں ہیں۔" اس نے آشا کی طرف دیکھ کر کہا۔ "کیا اسے انگریزی آتی ہے؟"

"یہ پوچھ رہا ہے تمہیں انگریزی آتی ہے۔ اگر آتی بھی ہے تو نہیں میں سر ہلاؤ۔"

"آتی ہے۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"یعنی تم ہماری ساری باتیں سمجھ رہی ہو؟" میں نے کہا اور کمار سے بولا۔ "اسے انگریزی بہت معمولی سی آتی ہے۔ مشکل سے سمجھ لیتی ہے، بول نہیں سکتی۔"

"اسے کہو تیار ہو جائے۔ کچھ دیر میں ان لوگوں نے روانہ ہونا ہے۔ بہت لمبا سفر ہے۔ شام سے پہلے ان کو اس جگہ پہنچنا ہو گا ورنہ کھلے میں رات بسر نہیں کر سکتے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے، وہ جگہ پولیس اور پیرا ملٹری کی پہنچ سے دور ہے؟"

"بہت دور ہے۔ وہ ایک بڑی وادی ہے، جس میں داخلے کا ایک ہی راستہ ہے۔" اس نے بتایا۔ "اگر تمہیں موقع ملا تو تم دیکھ لو گے۔"

"خدا نہ کرے۔" میں نے دل میں کہا۔ میں پہلے ہی خاصا دور آ چکا تھا اور اب میں مزید دور نہیں جانا چاہتا تھا۔ عورتیں بچے اور معمر افراد جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ جن کے پاس سامان تھا وہ اسے باندھ رہے تھے۔ آشا کو یہاں دیکھ کر میرے ذہن میں ایک خیال آیا تھا۔ اگر محل پر حملہ کنوروں کی سازش تھی تو اب تک جوابی حملہ نہ ہونے کی واحد وجہ آشا تھی جو غلطی سے قبائلیوں کے ہاتھ آ گئی تھی۔ کمار چلا گیا تھا، اس نے مجھ سے ساتھ

چلنے کو نہیں کہا تھا اس لئے میں وہیں رک گیا۔ موقع پاتے ہی میں آشا کو ایک طرف لے گیا تھا۔ ''تم کلینک کیوں آئی تھی؟''

''میں تمہیں دیکھنے آئی تھی۔ ابھی میں کلینک کے پاس پہنچی تھی کہ فائرنگ ہونے لگی، میں ایک درخت کے نیچے چھپ گئی تھی۔ میرے سامنے راج بھیا، منشی جی اور ڈاکٹر نرسوں کے ساتھ اندر سے نکلے اور محل کی طرف چلے گئے تھے۔ میں کلینک میں آ گئی اور انہوں نے مجھے آ کر پکڑ لیا۔ تم اندر بے ہوش پڑے تھے۔''

''محل میں اس ہنگامے سے پہلے کوئی سرگرمی ہوئی تھی؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''تمام عورتوں اور بچوں کو ایک خاص تہہ خانے میں پہنچایا گیا تھا، میں چھپ گئی تھی۔ میں تمہارے پاس آنا چاہتی تھی۔''

''تم نے دیکھ لیا تھا مجھے کلینک لے جایا جا رہا ہے؟''

''ہاں، میں جانتی تھی۔ میں نے راج بھیا کو کہتے سنا تھا۔'' اس نے بتایا۔

میں نے گہری سانس لی۔ ''آشا تم نے خود کو بہت بڑی مشکل میں پھنسا لیا ہے اور یہ بھی ممکن ہے تم اس مشکل سے نکلنے کا راستہ بن جاؤ۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب بھی سمجھ میں آ جائے گا۔ تم خود کوشش کرنا کہ راستے میں اور منزل پر پہنچنے کے بعد خود کو ذرا چھپا کر رکھنا۔ ان عورتوں میں رہنا اور کوشش کرنا تمہیں ان کے جیسا لباس مل جائے۔''

''میں ایسا ہی کروں گی۔'' اس نے یقین دلایا۔

کمار کچھ دیر میں واپس آیا، اس کے ساتھ ایک درجن مسلح افراد تھے۔ وہ ان سے اپنی زبان میں بات کرنے لگا۔ شاید وہ ان کو عورتوں اور بچوں کے ساتھ بھیج رہا تھا کیونکہ وہ بار بار عورتوں کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ آخر میں اس نے مجھ سے کہا۔ ''ان عورتوں کو کہہ دو، ان مردوں کے ساتھ جائیں اور ان کی بات مانیں۔ کسی نے بھاگنے کی کوشش کی تو اسے سزا ملے گی۔ بات نہ ماننے والی کو بھی سزا ملے گی۔''

میں نے یہی بات اردو میں ان سے کہہ دی۔ یہ ساری ہی محل سے تعلق رکھنے والی عورتیں تھیں اور ان میں سے شاید ہی کسی کو قبائلی زبان آتی تھی۔ وہ سب اردو بولتی تھیں جسے یہاں ہندی کہا جاتا ہے۔ میں نے وادی میں آباد دوسرے افراد کی زبان سنی تھی، وہ بھی کوئی مقامی زبان بولتے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ محل کی خادماؤں اور دوسرے ملازموں کو جن کا تعلق قبائل سے تھا، خاص طور سے اردو یا ہندی سکھائی گئی تھی، شاید کوئی خاص مقصد تھا۔

عورتیں اور بچے ان مسلح افراد کے ہمراہ روانہ ہوئے تھے۔ وہ سامنے والے راستے سے نکلے تھے یعنی کمار نے ان کے لئے خفیہ راستہ استعمال نہیں کیا تھا۔ وہ راستہ صرف ہنگامی حالات کے لئے مخصوص تھا۔ میں باہر نکلا اور غار کی مختلف گپھاؤں میں گھومنے لگا۔ بعض میں قبائلیوں کی عورتیں بھی تھیں مگر میں نے اندازہ لگایا کہ ان کو صرف مخصوص وجہ سے رکھا گیا ہے۔ کھانا بنانا اور دوسرے امور جو عورتیں بہتر طور پر نمٹا سکتی تھیں ورنہ ان قبائلیوں کے گھرانے اس جگہ نہیں تھے، یہاں نہ بچے تھے اور نہ بوڑھے جو ایک خاندان کا لازمی جزو ہوتے ہیں۔ یہاں صرف جوان مرد تھے جو جنگجو بھی تھے۔ میرا خیال تھا تمام قبیلے میں یہی لڑنے والے مرد تھے۔

اب مجھ پر سے کسی بھی جگہ جانے کی پابندی ختم کر دی گئی تھی۔ میں باہر آیا، اس پہاڑ پر غار کے دہانے سے ذرا ہی فاصلے پر ایک پل تھا جو ایک گہرے پہاڑی دریا پر قائم تھا اور اس پر قائم لکڑی کا پل توڑ دیا گیا تھا مگر اس طرح کہ بوقت ضرورت اس کی مرمت کر کے اسے قابلِ استعمال بنایا جا سکتا تھا۔ پل کے ساتھ ایک جگہ چند بوتلیں رکھی تھیں اور چند مشعلیں روشن تھیں۔ میں نے قریب جا کر دیکھا۔ بوتلوں میں مٹی کا تیل تھا۔ یعنی بوقت ضرورت پل کو مکمل طور پر تباہ کرنے کے لئے یہ بندوبست کیا گیا تھا تاکہ دشمن کسی طرح یہاں تک آ بھی جائے تو پل مرمت کر کے بھی استعمال نہ کر سکے۔

اس جگہ سردی شدید تھی اور مجھے ذرا بلندی پر برف بھی نظر آ رہی تھی۔ دن میں جب تک دھوپ ہوتی تھی تو کچھ گزارہ ہو جاتا تھا لیکن رات کو کھلی فضا میں زیادہ دیر رکنا ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ مجھے ان عورتوں کا خیال آیا جو اس سے بھی زیادہ کسی بلندی کی طرف گئی تھیں۔ اگر ان کو راستے میں رات ہو جاتی تو ان کو خاصی مشکل ہو جاتی۔ میں واپس اندر آیا۔ کمارا اپنے مخصوص حجرے میں تھا۔ اسے حجرہ کہنا مناسب ہوگا۔ یہ کمرا پتھر کا بنا ہوا تھا۔ میں اجازت لے کر اندر آیا اور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ''کمار، میرے بارے میں تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟''

''کس قسم کا فیصلہ؟'' وہ انجان بنا۔

''یہی کہ مجھے جانے کی اجازت دے دی جائے، میرا اس معاملے سے بس اتنا ہی تعلق تھا۔''

''سوچا تو میں نے بھی یہی تھا۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن......؟''

''لیکن کیا؟''

وہ مسکرایا۔ ''تم نے خود کو ایک اہل مشیر ثابت کیا ہے۔ ہنگامی حالات میں تمہارا ذہن حیرت انگیز کام کرتا ہے۔''

''یعنی کام کر کے مارا گیا۔'' میں نے سر پر ہاتھ مارا۔ ''شہزادہ عالم مجھے جانے دو۔ مجھے اور بھی بہت سارے کام ہیں۔ میرے گھر والے میری راہ دیکھ رہے ہوں گے۔''

''مجھے...... ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔''

''جتنی مدد کرنی تھی میں کر چکا ہوں۔''

''ابھی تمہاری مزید مدد کی ضرورت ہے اور تمہارا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ میرے آدمیوں نے اوپر کی طرف پہاڑوں میں ہیلی کاپٹر کی پروازیں دیکھی ہیں۔''

''یعنی وہ آ رہے ہیں؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''ایسے میں تمہارا کہیں جانا ٹھیک نہیں ہے، تم اس علاقے سے ناواقف ہو آسانی سے بھٹک جاؤ گے۔''

''اور یہاں رہا تو پولیس مقابلے میں مارا جاؤں گا۔''

''یہاں تک آنا اتنا آسان نہیں ہے۔''

''یہاں کون کم بخت آئے گا، اگر انہوں نے دور سے گولہ باری شروع کر دی تو......؟''

''میرا خیال ہے ان پہاڑوں پر گولہ باری بے سود ہوگی۔''

''اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا، پیراملٹری آ گئی اور انہوں نے گن شپ استعمال کئے تو تمہیں پریشانی ہو گی۔''

''تمہارا کیا مشورہ ہے۔''

''تمہارے لئے مشورہ ہے کہ یہاں سے نکل جاؤ اور میرے بارے میں مشورہ ہے، مجھے جانے دو۔ میں اپنے رسک پر یہاں سے نکل جاؤں گا۔''

''فی الحال تم نہیں جا سکتے اس لئے اب دوبارہ مت کہنا۔'' یک لخت اس کے لہجے میں رکھائی آ گئی تھی۔ ''اور ہم بھی یہاں سے نہیں جا سکتے۔ اس جگہ ہمارا اسلحہ اور دوسری اہم چیزیں ہیں۔ ان کو ہم کہیں اور منتقل نہیں کر سکتے۔''

میں مشورے دے کر پھنس گیا تھا، مجھے اپنی بے مہار زبان پر غصہ آ رہا تھا جو جا بے جا چل کر مجھے چکر میں ڈال دیتی تھی۔ ''اور کرو ہمدردی ملک صاحب!'' میں نے خود سے کہا۔ ''اب بھگتو۔'' وہ غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

''غالباً تم میری مدد کر کے پچھتا رہے ہو؟''

''ظاہر ہے۔'' میں نے سرد آہ بھری۔ ''اردو میں ایک محاورہ ہے، نیکی کر اور دریا میں ڈال۔ آج کل نیکی کرنے والے کو دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔''

''نیکی کر اور دریا میں ڈال۔'' اس نے محاورے کے انگریزی ترجمے پر تعجب کیا۔

میں نے اسے محاورے کا مفہوم سمجھایا۔ ''مطلب کسی کے ساتھ نیکی کرو اور اسے بھول جاؤ۔ اس کا صلہ مت چاہو...... لیکن آج کل دوسرے نہیں بھولتے۔''

وہ زور سے ہنسا۔ ''دریا بھی ساتھ ہے۔''

''کمار، اگر میں جانا چاہوں تو تم کیا کرو گے؟ مجھے زبردستی روکو گے؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں ایسا کوئی کام نہیں کروں گا مگر تم جاؤ گے کیسے؟ دریا کا پل توڑ دیا ہے، یہی نہیں آگے کے جتنے دریا تھے، سب کے پل توڑ دیئے گئے ہیں۔ اوّل تو دریا قابلِ عبور نہیں ہیں اور اس موسم میں ان کو تیر کر عبور کرنا بھی ناممکن ہے۔''

میں واقعی پھنس گیا تھا۔ مجھے اندازہ تھا۔ آگے پولیس کی چیکنگ کتنی سخت ہو گی اور میں وہاں سے آسانی سے نہ نکل سکوں گا۔ کنور خاندان کے کتے بھی ہوں گے اور دونوں میں سے کسی ایک کے ہاتھ آنے کا مطلب ایک ہی ہوتا یعنی میری وفات۔ اس صورت میں بہتر یہی تھا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ رہتا اور جب حالات مناسب ہوتے تو واپسی کی کوشش کرتا۔ کمار غور سے مجھے دیکھ رہا تھا اس نے تسلی دینے کے انداز میں کہا۔ ''شہباز، تم فکر مت کرو۔ تم میرے مہمان ہو اور ہم قبائلی اپنے مہمان کی جان دے کر بھی حفاظت کرتے ہیں۔''

''او کے، شہزادہ عالم!'' میں نے سرد آہ بھری۔ ''میں تمہاری بات ماننے پر مجبور ہوں۔''

''یہ تم مجھے کیا کہہ رہے ہو؟ شہزادہ عالم!'' اس نے دریافت کیا۔

''پرنس، بلکہ پرنس آف ویلز۔''

''اچھا!'' وہ خوش ہو گیا۔ ''تب تم کہہ سکتے ہو۔''

دوپہر کے کھانے میں مکئی کی روٹی اور مکھن تھا ساتھ میں ابلے انڈے تھے جو مرغی کے لگ رہے تھے۔ اس پُرتکلف لنچ کے بعد میں نے دریا کا منرل واٹر پی کر خدا کا شکر ادا کیا۔ ابھی تک میں خالی ہاتھ تھا، میں نے کمار سے کہا۔ "مجھے کوئی ہتھیار مل سکتا ہے؟"

"کیسا ہتھیار چاہئے؟"

"کوئی پستول یا ریوالور مل جائے گا۔"

"تمہیں ہتھیار چلانے آتے ہیں؟" اس نے غور کیا۔ "اس کا مطلب ہے تم لڑنے میں ہماری مدد کر سکتے ہو۔"

"میں پستول یا ریوالور بہتر طور پر استعمال کر سکتا ہوں۔ خودکار ہتھیار میں نزدیک سے استعمال کر سکتا ہوں۔ رائفل سے میرا نشانہ درمیانہ سا ہے، نہ اچھا نہ برا۔"

اس نے مجھے ایک پستول منگوا دیا۔ یہ اعشاریہ چالیس کا لمبی نال والا روسی پستول تھا اس کی مار خاصی تھی۔ بھاری بھرکم ہونے کے ساتھ یہ استعمال میں بھی ذرا مشکل تھا لیکن اس کی ہلاکت خیزی میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ شام کے قریب میں اور کمار باہر نکلے اور دس بارہ گز اوپر ایک چٹان پر چڑھ گئے۔ مغرب میں سورج تیزی سے روپوشی اختیار کرنے جا رہا تھا۔ "آج کا دن بھی نکل گیا۔" میں نے کہا۔

کمار نے سر ہلایا۔ "اب وہ کل حملہ کریں گے۔"

"میری ایک بات مانو۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "اس جگہ مقابلہ کر کے تم اپنے ساتھیوں کو مروا دو گے۔ بہتر ہے یہاں سے نکل جاؤ۔"

"نکل جاؤں، کہاں......؟"

"یہ تم خود سوچو۔ مگر تمہارے لئے کیا چیز قیمتی ہے، تمہارے ساتھی یا یہ جگہ؟ ایک بات کو یقینی سمجھو کہ انہوں نے حملہ کیا تو اس جگہ کو تباہ کئے بغیر اور تمہیں مارے بغیر نہیں جائیں گے۔ ان کے وسائل اور قوت کا تم مقابلہ کر ہی نہیں سکتے۔ بس اتنا کر سکتے ہو کہ جان بچاؤ۔ اس وجہ سے میں کہہ رہا ہوں اپنی قوت منتشر کر دو۔ یہ سب تین چار کر کے چھپ جائیں، پہاڑی ٹھکانوں پر چلے جائیں۔"

اس نے سوچا اور نفی میں سر ہلایا۔ "یہ بزدلی ہوگی۔ میرا ایک ایک جوان کم سے کم دو دشمنوں کو مار کر مرے گا۔"

"سرکار کے پاس مرنے کے لئے پولیس والوں اور پیرا ملٹری کی کوئی کمی نہیں۔ کشمیری جنگ میں وہ اپنے تیس چالیس ہزار جوان مروا چکی ہے۔ ایک مرتا ہے تو اس کی جگہ بھرتی کے لئے دس آجاتے ہیں لیکن تمہارے پاس یہی گنے چنے چند لوگ ہیں، یہ مر گئے تو تمہارے پاس کیا بچے گا۔ کنور خاندان بچ جانے والے قبائل کو اپنا غلام بنا لے گا۔"

"ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ ہمارا بچہ بچہ کٹ مرے گا۔" اس نے جوش سے کہا۔

میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "یہی تو وہ چاہتے ہیں اس علاقے کو تم سے خالی کرا لیں۔ کسی بھی طرح۔ اس کے لئے تمہیں مارنا پڑے یا یہاں سے نکالنا پڑے۔"

"تب ہم کیا کریں؟" وہ جھنجلا گیا تھا۔

"پولیس آپریشن میں الجھنے کے بجائے اپنی قوت بچاؤ۔ بھاگ جاؤ اور انفرادی طور پر پہاڑوں میں چھپ کر رہو۔"

"تا کہ وہ ہماری بستیوں کو تاراج کر دیں؟"

"کچھ نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔ چند لوگ مارے جائیں گے۔ اگر تم مزاحمت نہیں کرو گے تو ان کو بھی بھرپور قوت استعمال کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔"

"میں ان لوگوں پر اعتماد نہیں کر سکتا۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ جنگلوں اور پہاڑوں میں ہمارا پیچھا کریں گے اور چن چن کر ماریں گے۔ اس سے بہتر ہے ہم ایک جگہ جمع ہو کر ان کا مقابلہ کریں اور ان کو مار کر مریں۔"

میرے لیے اس سنکی سولجر کو سمجھانا مشکل ہو رہا تھا پھر مجھے ایک نکتہ سوجھا۔ "یہاں بیٹھ کر تم اپنی بستیوں کی حفاظت بھی نہیں کر سکتے۔ وہ تمہارا یہاں محاصرہ کریں گے اور آرام سے جا کر ان بستیوں کو برباد کر دیں گے۔ ان کو تمہاری طرف سے کوئی خوف نہیں ہوگا۔ اس کے برعکس اگر تم ان کے ہاتھ نہیں آئے تو وہ پریشان ہوں گے اور تمہارے خوف سے بستیوں کو تاراج کرنے سے گریز کریں گے۔"

اس کے چہرے پر غور و فکر کے آثار نمایاں ہوئے تھے۔ "میں تمہاری بات سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"تمہاری دشمنی کنور خاندان سے ہے، تم ان کا مقابلہ کر سکتے ہو۔ مگر انہوں نے سازش کر کے اس میں سرکار کو بھی تمہارے خلاف شامل کر لیا ہے اس لئے تمہیں جوابی چالاکی کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔"

"ہم کیا کر سکتے ہیں؟" اس نے تلخ لہجے میں کہا۔

"میرا خیال ہے تم میڈیا سے رابطہ کرو۔ اخبارات کو اپنی بپتا سناؤ۔ ان کو مراسلے لکھو۔ ٹی وی چینلز سے کہو کہ تمہاری حالت زار دکھائیں۔ فرضی اور اصلی مظالم کا واویلا کرو۔ کنور خاندان کے کرتوت بڑھا چڑھا کر بیان کرو۔ اس کا کچھ نہ کچھ اثر ہوگا۔"

"ان سے رابطہ کیسے کروں؟"

"آج کل موبائل اور سیٹلائٹ فون کا دور ہے، کسی سے کہیں بھی رابطہ ناممکن نہیں ہے۔ کیا تم لوگوں کے پاس موبائل نہیں ہیں۔"

"موبائل فون ہیں لیکن یہاں سگنل نہیں آتے ہیں۔"

"تب کسی ایسی جگہ جاؤ، جہاں سے سگنل مل سکیں۔ یہ کام کرو، دلی اور پنجاب کے دوسرے شہروں کے دس بارہ بڑے اخبارات سے بات کرو، ٹی وی چینلز والوں سے بات کرو۔"

"میں نہیں جا سکتا۔ میں پکڑا یا مارا گیا تو میرے لوگوں کا کیا ہوگا؟"

وہ نیا سردار چن لیں گے، میں نے دل میں کہا پھر اس کی طرف دیکھا۔ "کسی اور کو بھیجو جسے ہندی آتی ہو، اسے اچھی طرح رٹا کر بھیجنا کہ اس نے کیا کہنا ہے۔ وہ وہی بیان دے، اپنی مظلومیت کا تاثر ابھارو، محل پر حملے سے انکار کر دو اور کہو کہ تم کنور خاندان کے ہاتھوں جنگل بچانا چاہتے ہو، جس پر تمہارے خلاف کارروائی ہو رہی

ہے،اس طرح دوسرے لوگ بھی تمہاری حمایت کے لئے آجائیں گے۔"

"تم سیاست دان بھی ہو۔" اس نے سخت متاثر ہو کر کہا۔

"نہیں بابا، اللہ نہ کرے۔ یہ بڑی بدنام مخلوق ہے، ہمارے ملک کا اس نے حشر کر رکھا ہے۔"

"میں دیکھتا ہوں، کسے بھیجنا ہے۔"

"جلدی کرو، یہ کام جتنی جلدی ہو جائے تم لوگ اتنا ہی تباہی سے بچ جاؤ گے۔ میڈیا کے ملوث ہونے سے یہ بے گناہ عوام کے خلاف کھل کر کارروائی نہیں کرسکیں گے اور یہ مرکز خالی ملے گا تو وہ تمہیں جنگجو بھی ثابت نہیں کرسکتے۔ ورنہ ایک بار تم مل گئے تو وہ تمہیں مار کر یہاں اسلحے کا انبار بھی جمع کر سکتے ہیں۔ وہ میڈیا اور دنیا کو بتا سکتے ہیں کہ تم بھارت کے خلاف ایک اور علیحدگی پسند تحریک چلا رہے تھے۔"

"علیحدگی پسند تحریک!" وہ دنگ رہ گیا تھا۔

"ظاہر ہے تمہاری لاشیں تو اس الزام کی تردید نہیں کرسکیں گی۔"

"میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرتا ہوں۔" اس نے کہا، وہ قائل نظر آرہا تھا۔

"مشورہ مت کرو، فیصلہ کرو۔" میں نے کہا۔ "ورنہ صبح تک وقت تمہارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ اگر یہاں پر کچھ ایسی چیزیں ہیں جن کو لے جانا ممکن نہیں ہے اور ان کا پولیس کے ہاتھ آنا بھی مناسب نہیں ہے تو ان کو دفنا دو یا دریا میں پھینک دو۔ اسے صرف رہائشی غار ثابت کر کے نکل جاؤ۔"

"میں...... بات کرتا ہوں۔" اس نے کہا اور باہر چلا گیا۔

مجھے خدشہ تھا، اس کے ساتھی نہیں مانیں گے۔ وہ سب جاہل قبائلی تھے جو آن پر قربان ہونا اپنی شان سمجھتے ہیں اور اپنا علاقہ کسی صورت دوسرے کے حوالے نہیں کرتے ہیں۔ اگر کمار سردار بن کر ان کو حکم دے تو وہ مان جاتے مگر مشورے کی صورت میں بات خراب ہوتی تو بعد میں وہ اس کا حکم بھی نہیں مانتے۔ دونوں طرف سے فریق بن جاتے تو آپس میں جھگڑا شروع ہو جاتا۔ میں نے افسوس کیا، کمار نا تجربے کار شخص تھا جہاں فیصلے کا لمحہ آیا وہ مشورہ کرنے چلا گیا تھا، یہ کمزور لیڈر کی نشانی تھی۔ میں لیٹ کر آرام کرنے لگا اور پھر سو گیا تھا۔ میرے اعصاب حالات نے اتنے مضبوط کر دیئے تھے کہ میں آرام سے سو جاتا تھا۔ مجھے کمار نے بیدار کیا تھا۔ اس کی صورت پر نظر پڑتے ہی میں نے جان لیا، اس کے ساتھیوں نے یہاں سے نہ جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں اٹھ بیٹھا۔ "کمار جی! کیا ہوا، پنچوں نے فیصلہ ماننے سے انکار کر دیا، اب اسی جگہ رہنا ہے۔"

اس نے سر ہلایا اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ "ان کا کہنا ہے اس طرح بھاگ کر ہم پورے قبیلے کے چہرے پر کالک مل دیں گے۔"

"حالانکہ تم لوگ مارے گئے تو قبیلہ بھی کہاں بچے گا۔ وہ سب غریب اور کمزور لوگ ہیں وہ اپنی حفاظت نہیں کرسکتے۔"

"میں نے سمجھایا مگر کوئی نہیں سمجھا۔ بہرحال میں نے اپنے دو ساتھیوں کو موبائل دے کر اور سمجھا کر بھیج دیا ہے کہ انہیں کیا کرنا ہے؟"

"یہ تم نے اچھا کام کیا۔"

"اور بڑی مشکل سے کیا۔ میرے شیر ماننے کے لئے تیار نہیں تھے، مجبوراً مجھے اپنے سردار والے اختیارات استعمال کرنا پڑے تھے۔" اس نے گہری سانس لی۔ "یہ میرے باپ کی ہمت تھی جو ان لوگوں کو قابو میں رکھتا تھا، مجھے تو دو دن میں پتا چل گیا۔"

"کمار تم نے شادی کی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"عام طور سے ہمارے قبیلے میں لڑکے سولہ سال اور لڑکیاں چودہ سال کی عمر میں بیاہ دی جاتی ہیں مگر میں ذرا مختلف تھا۔ میں سات سال تک ایک کانوینٹ اسکول میں پڑھا ہوا ہوں۔"

میں حیران ہوا تھا۔ "تم کانوینٹ کے پڑھے ہو، اس وجہ سے اتنی صاف زبان بولتے ہو مگر تمہیں ہندی بالکل نہیں آتی؟"

"مجھے کبھی ہندی بولنے والوں سے واسطہ ہی نہیں پڑا، اسکول میں سب انگریزی بولتے تھے۔"

"تمہارا داخلہ کیسے ہوا؟"

"کیونکہ میں قبیلے کے سردار کا بیٹا تھا۔"

"کوئی لڑکی بھی پسند نہیں کی؟" میں نے پوچھا۔ "یا کسی نے تمہیں پسند نہیں کیا؟"

"میں قبیلے کی جس لڑکی کی طرف اشارہ کر دوں وہ ہنسی خوشی میری بیوی بننے کو تیار ہو جائے مگر مجھے کوئی پسند ہی نہیں آئی ہے اور ابھی تو میں ہنگامی حالات میں ہوں۔"

"ہمارے ہاں تو الٹا حساب ہے جب ملک وملت پر برا وقت آتا ہے تو حکمران زیادہ تندہی سے عیاشی میں لگ جاتے ہیں۔"

"ہمارے ہاں۔" اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

"میرا مطلب ملک کے حکمرانوں سے ہے۔" میں نے وضاحت کی۔ "خیر چھوڑو، یہ بتاؤ کہ ابھی یہاں کتنے افراد ہیں۔"

"چھ سو کے قریب ہیں۔"

"بہتر ہے ان میں سے صرف آتشیں اسلحہ رکھنے والوں کو رکھو اور باقی کو دوسرے مقامات کی حفاظت کے لئے بھیج دو۔"

"کن مقامات کی حفاظت کے لئے۔"

"تمہاری بستیوں کی حفاظت کے لئے۔ یہ باہر رہ کر آنے والے حملہ آوروں کو دیکھیں اور اگر ان کے عزائم جارحانہ ہوں تو ان پر حملہ کر دیں۔"

"ان پر پہلے ہی حملہ کیوں نہ کر دیں؟"

"جارحانہ پالیسی تمہارے لئے نقصان دہ ثابت ہوگی۔"

"اگر اس جگہ آدمی کم ہو گئے تو ہمارا دفاع کمزور ہو جائے گا۔"

"تیرانداز اس جگہ ویسے ہی بے کار ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ تمہارے آدمی ان جنگلوں سے واقف ہیں؟"

''بہت اچھی طرح۔''اس نے جواب دیا۔
''بس تو اُن کو جنگل میں پھیلا دو۔ کسی بڑے حملے کی صورت میں یہ تمہارے لئے بہترین ہتھیار ثابت ہوں گے، ان سے کہو کہ جب تک تمہاری طرف سے اشارہ نہ ملے، کچھ نہ کریں اور جیسے ہی اشارہ ملے آنے والوں پر چھپ کر حملے کریں اور فرار ہو جائیں۔ یہ جنگی حکمتِ عملی ان کو بچائے گی اور دشمن کو شدید نقصان ہوگا۔''
''مشکل ہے یہ سیدھے قبائلی ہیں، تمہاری حکمتِ عملی ان کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔''
''سیدھے ذہن کے لوگ ہی بہترین جنگجو ثابت ہوتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''بشرطیکہ ان کو صحیح رہنمائی دی جائے۔ تم ایسا کرو، ان کو جمع کرو اور جو میں کہوں اس کا ترجمہ اپنی سرداروالی زبان میں ذرا تحکمانہ انداز میں کرنا پھر دیکھنا ان پر اثر ہوتا ہے یا نہیں؟''
''یہاں موجود چھ سو میں سے چار سو تیر انداز ہیں۔ ان کے جانے سے دو سو افراد رہ جائیں گے۔''اس نے گویا مجھے خبردار کیا۔
''یہ چار سو افراد یہاں بے کار ہیں۔ تیر انداز کو سامنے آکر حملہ کرنا پڑتا ہے اور سامنے آنے پر وہ مارا جائے گا۔ اس کے برعکس گھنے جنگلوں میں اونچائی سے حملہ کر کے یہ بڑی فوج کو بھی پریشان کر سکتے ہیں، گھنے جنگل میں ان کو نشانہ بنانا مشکل ہوگا۔''
کمار نے اپنے کسی نائب کو حکم دیا اور اس نے دہانے کے قریب بڑے سے ہال میں ان سب کو جمع کر لیا۔ حکمت عملی میں پہلے ہی واضح کر چکا تھا۔ ان لوگوں کو سمجھانے کے لئے کمار کی زبان نے زیادہ آسان اور سادہ جملوں میں وضاحت کی۔ آدھے گھنٹے کی تقریر کے بعد وہ لوگ قائل نظر آنے لگے اور کمار نے ان کو گروپس میں بانٹ کر مختلف علاقوں میں روانہ کر دیا۔ وہ سورج غروب ہوتے ہی روانہ ہو گئے۔ کیونکہ اس سرد علاقے کے رہنے والے تھے اس لئے سردرات میں کھلی فضا میں بھی گزارہ کر لیتے۔ وہ سب جوان اور سخت جان جنگجو مرد تھے۔ اب غار میں دو سو مرد اور ایک درجن عورتیں رہ گئی تھیں۔ یہ ادھیڑ عمر مگر صحت کے لحاظ سے بہتر عورتیں تھیں جو کھانا بنانے کے ساتھ صفائی ستھرائی کا کام بھی کرتی تھیں۔ گپھا کا ایک حصہ کھانا بنانے کے لئے مخصوص تھا۔ سورج غروب ہوتے ہی وہاں چولہے روشن ہو گئے تھے اور دیگچے چڑھا دیئے گئے تھے۔
میں باہر آیا، پہرے دار اب مجھے پہچاننے لگے تھے اور جان گئے تھے کہ میں ان کے سردار کا مشیر خاص بنا ہوا تھا، ممکن ہے ان میں سے کچھ ایسے بھی ہوں جو سمجھتے ہوں کہ اگر وہ مارے گئے تو اس کا ذمے دار میں ہوں گا۔ میری تجویز رد کیا جانا اس کا ثبوت تھا۔ تاریکی چھاتے ہی جیسے سردی سے باہر ہر شے منجمد ہو گئی تھی۔ پورے درخت سب ساکت تھے۔ ہوا بالکل نہیں چل رہی تھی صرف گہرائی سے دریا بہنے کا شور اوپر آ رہا تھا۔ مگر یہ آواز بھی اس سکوت پر بے اثر تھی جس نے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔
میں ایک درخت کے نیچے چٹان پر بیٹھ گیا۔ میرا ذہن گزشتہ چند دن کے واقعات میں الجھا ہوا تھا۔ میں بھٹک کر سرحد پار کر گیا تھا۔ امرتسر اور سرحد کے پاس دوسرے شہروں میں چوری چھپے عیاشی کے لئے جانے والے افراد بھی پکڑے جانے پر یہی جواز پیش کرتے ہیں، یہ اور بات ہے کہ بھارتی سرکار کے نزدیک ان کا یہی جرم کافی ہوتا ہے کہ وہ پاکستانی ہیں اور اس کی پاداش میں ان کو مار مار کر مار ڈالنا ہی نارمل سی سزا ہے۔ اس کا ثبوت

آئے دن سرحد پر پاکستانی حکام کو دیئے جانے والے پاکستانیوں کے لاشے ہیں جن کے بارے میں بھارتی حکومت کوئی وضاحت پیش کرتا اس لئے بھی ضروری نہیں سمجھتی کیونکہ ہماری روشن خیال سرکار کو اس کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ پاکستانیوں کے ساتھ دنیا بھر میں بدترین سلوک ہو، ان کو بلا جواز گرفتار کیا جائے، ان پر تشدد ہو، ان کے حقوق سلب کر لئے جائیں اور یہ کہ ان کو قتل کر دیا جائے مجال ہے جو کسی کے کان پر جوں بھی رینگ جائے۔

میں سوچتے ہوئے ذرا دور نکل گیا تھا۔ اس ساری سوچ بچار کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ میں کسی صورت بھی بھارتی حکام کے ہتھے چڑھنا نہیں چاہتا تھا۔ ورنہ میرے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا اور میں سفارت خانے کی مدد بھی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ پاکستانی پولیس کو میں ویسے ہی مطلوب تھا۔ میں سوچتے ہوئے سامنے بھی دیکھ رہا تھا۔ اچانک مجھے روشنی کا ایک نکتہ سا نظر آیا۔ اگرچہ یہ صرف ایک لمحے کے لئے تھا مگر وہ میرا وہم نہیں تھا۔ میں نے اسے واضح طور پر دیکھا تھا۔ میں چونکا۔ چند لمحے بعد وہ نکتہ پھر جھلملایا تھا۔ اس طرف کوئی روشنی تھی۔ کئی منٹ تک غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ کوئی برقی روشنی ہے جسے کوئی شخص یا اشخاص راستہ دیکھنے کے لئے ذرا دیر کو روشن کرتے ہیں اور پھر فوراً بجھا دیتے ہیں۔



میں اٹھ کر اندر آیا۔ کمار مجھے خاصی تلاش کے بعد ایک غار میں ملا تھا جہاں وہ اپنے مشیروں یا تدبیروں کے ساتھ میٹنگ کر رہا تھا۔ میں نے دخل در معقولات کیا جس کا مشیروں نے برا منایا تھا۔ مگر یہ وقت ان کی شکلیں دیکھنے کا نہیں تھا میں نے کہا۔

"شہزادہ عالم! میرا خیال ہے دشمن سپاہ آگئی ہے اور خاموشی سے اس جانب پیش قدمی کر رہی ہے۔" میں نے اسے آگاہ کیا۔

"تمہیں کیسے پتا چلا؟" وہ اچھل پڑا تھا۔

"میں نے روشنی دیکھی ہے۔ میرا خیال ہے میرے ساتھ آ کر تم سب بھی دیکھ لو۔" میں نے اسے دعوت دی۔ وہ سب باجماعت باہر نکل آئے۔ درخت تلے چٹان کے پاس پہنچ کر میں نے سیدھ میں اشارہ کیا۔ "روشنی اس طرف سے بار بار دکھائی دے رہی ہے۔"

سب نے ٹکٹکی باندھ کر اس طرف دیکھنا شروع کر دیا مگر جب ایک منٹ تک کچھ نہیں دکھائی دیا تو مشیران نے زیرلب اپنی زبان میں احتجاج شروع کر دیا اور جب دوسرا منٹ گزرا تو کمار نے بھی مجھ سے کہا۔ "یہاں تو کچھ نہیں ہے۔"

"اب نہیں ہے۔" میں نے اعتراف کیا۔ "لیکن جب میں تھا تو روشنی بار بار دکھائی دے رہی تھی اور مجھے یقین ہے وہ ٹارچ کی روشنی تھی جسے وہ راستہ دیکھنے کے لئے روشن کرتے تھے اور پھر بجھا دیتے۔"

میرا جملہ منہ میں رہ گیا کیونکہ اس بار دریا کے دوسری طرف خاصے نزدیک سے روشنی نمودار ہوئی اور یہ اتنی تیز تھی کہ سب نے اسے دیکھا۔ کم سے کم میں نے دو سائے بھی دیکھے تھے۔ اب اس میں شک کی گنجائش نہیں تھی کہ دریا کے دوسری طرف کچھ افراد تھے اور ان کے عزائم درست نہیں تھے ورنہ اتنے پرخطر راستوں پر بغیر روشنی کے کیسے سفر کرتے۔ روشنی وہ سیکنڈ کے لئے جلاتے تھے یہ دیکھنے کے لئے کہ آگے کھائی تو نہیں ہے۔

"اندر چلو۔" میں نے کمار سے کہا۔ "سب کو ہوشیار کر دو۔"

ہم اندر کی طرف لپکے تھے۔ دہانے پر مشعلیں روشن تھیں۔ کمار نے چلا کر ان بجھانے کا حکم دیا۔ اسی لمے دریا کے دوسری طرف سے گولیوں کی باڑھ آئی اور میں نے ایک پہرے دار کو اچھل کر گرتے دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی مشعلیں بجھادی گئی تھیں۔ ہم سب اندر گھس گئے۔ مشیران میں سے بھی چند زخمی ہوئے تھے۔ میں نے کل کراہیں سنی تھیں۔ اگر حملہ پولیس نے کیا تو غیر معمولی پھرتی دکھائی تھی مگر حرام خور پولیس سے یہ توقع محال تھی کہ وہ اتنی خاموشی سے اتنے دشوار گزار علاقے میں سفر کرے اور پھر فوراً ہی حملہ بھی کر دے۔ یہ انداز پیرا ملٹری فورس کا تھا۔ کمار کے دو آدمی مارے گئے تھے اور مشیروں میں سے ایک خاصا زخمی تھا۔ اس کا گھٹنا گولی نے توڑ دیا تھا جبکہ دوسرا معمولی سا زخمی تھا۔ کمار چیخ چیخ کر اپنے آدمیوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ وہ اسلحہ لے کر دہانے کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے کمار سے کہا۔ ان کو باہر جانے سے روکو۔ ان کے پاس یقیناً رات کو دیکھنے والے چشمے ہوں گے۔ وہ ان کو بالکل تاریکی میں بھی دیکھ کر مار دیں گے۔"

"پل کو تباہ کرنا ضروری ہے۔" کمار اضطراب سے بولا۔

"جو باہر جائے گا مارا جائے گا۔" میں نے اسے سمجھانا چاہا۔ "بلکہ جو لوگ اوپر ہیں ان کو بھی بلوا لو۔"

"مجھے بزدلی کے مشورے مت دو۔" کمار نے درشت لہجے میں کہا۔ اپنے دو آدمی مارے جانے کے بعد اس پر بھی خون سوار ہو گیا تھا اور وہ یقیناً مرنے مارنے کے احکامات دے رہا تھا۔ اس دوران میں دہانے کی طرف سے فائرنگ کی آواز آنے لگی تھی۔ میں پستول لے کر اس طرف بھاگا۔ دہانے کے پاس میں نے شعلوں کی روشنی میں دیکھا، وہاں چار لاشیں پڑی تھیں اور دو زخمی چیخ چلا رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے باہر سے کسی شارپ شوٹر نے ان کا نشانہ لیا اور وہ بھی فنا کے گھاٹ اتر گئے تھے۔

"میرے خدا!" میں نے کہا۔ پل کی طرف جانے والے قبائلیوں کی تعداد دو درجن سے زیادہ تھی اور ان میں سے نہ جانے کتنے زندہ تھے۔ ان میں سے کچھ نہ کچھ زندہ تھے جو پتھروں کی اور درختوں کی آڑ لے کر فائرنگ کر رہے تھے۔ میں نے ایک مرنے والے کی مشین گن اٹھائی۔ ان کے پاس خطرناک اسلحہ تھا اگرچہ تعداد میں کم تھے۔ میں نے اندازے سے دریا کے دوسری طرف برسٹ مارا اور مجھے کسی کی چیخ سن کر بے حد خوشی ہوئی تھی۔ حملہ آوروں میں سے بھی ایک کم ہوا تھا۔ جواب میں دوسری طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ آئی تھی مگر میں پیچھے ہو گیا تھا۔ باہر سے فائرنگ کی شدت میں بے پناہ تیزی آ گئی تھی اور فائرنگ دونوں طرف سے جاری تھی۔ میرے پیچھے کمار بھی آ گیا تھا۔ اس نے ایک ذرا بھاری مشین گن اٹھا رکھی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ "میرا خیال ہے ہمیں ذرا پیچھے جانا چاہئے۔ ان لوگوں کے پاس بڑے ہتھیار بھی ہوں گے۔"

"راکٹ!" کمار نے کہنا چاہا اور اسی لمحے کوئی شے دہانے سے ٹکرائی اور شدید دھماکے نے مجھے پیچھے اچھال دیا تھا۔ شعلے اور دھماکے سے اڑنے والے ریزے مجھے بھی لگے تھے لیکن اصل میں تو دھماکے نے میرے حواس مختل کر دیئے تھے۔ زمین آسمان گھوم گئے تھے اور مجھے ایسا لگا جیسے غار مجھ پر آن گرا ہو۔ مگر یہ محض ایک احساس تھا۔ میں براہ راست دھماکے کی زد میں نہیں آیا تھا ورنہ میرے بھی چیتھڑے اڑ جاتے۔ ان لاشوں کی طرح جو دہانے کے سامنے پڑی تھیں۔ میں نے چلا کر کمار کو آواز دی۔ "کمار، تم کہاں ہو؟"

وہ دھوئیں کے بادل سے نمودار ہوا تو سیاہ ہو رہا تھا اور چہرے پر خون نظر آ رہا تھا۔ ''میں ٹھیک ہوں، تم کیسے ہو؟''

''بچ گیا، اب اندر چلو۔ ورنہ دوسرا راکٹ خاتمہ ہی کر دے گا۔'' میں نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

''یہ......کون ہیں؟''

''مجھے یقین ہے یہ ملٹری والے یا پیرا ملٹری والے ہیں۔ پولیس میں اتنی صلاحیت نہیں ہے۔ کاش کہ تم میری بات مان لیتے۔ باہر موجود لوگوں میں سے شاید ہی کوئی بچا ہو۔''

''ابھی میرے پاس بہت سارے جنگجو ہیں۔ ہم ان کو اندر آنے نہیں دیں گے۔''

''تم ان کو نہیں روک سکتے۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''عافیت اسی میں ہے کہ رات کی تاریکی میں خفیہ راستے سے نکل جاؤ۔ اگرچہ ان کے پاس رات میں دیکھنے والے آلات ہیں۔ مگر دن کے مقابلے میں رات کو بچ نکلنے کے امکانات پھر بھی بہتر ہیں۔''

''میرے ساتھی نہیں مانیں گے۔'' اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''اتنی بڑی تباہی کے بعد بھی۔'' میں نے تلخی سے کہا۔ ''صرف چند منٹ میں درجنوں آدمی مارے جا چکے ہیں۔ ذرا غور سے سنو۔ باہر یک طرفہ فائرنگ ہو رہی ہے۔ انہوں نے ایل ایم جی استعمال کی ہے۔ مجھے لگ رہا ہے یہ سب کو مار ڈالنے کا سوچ کر آئے ہیں۔ غار کے اندر انہوں نے زہریلی گیس کے چند بم پھینک دیئے تو یہ جگہ ہم سب کا مشترکہ مقبرہ بن جائے گی۔''

کمار میری بات کا قائل نظر آنے لگا۔ ''میں اپنے ساتھیوں سے بات کرتا ہوں۔''

''اُف، پھر مشاورت۔'' میں نے سر پکڑ لیا۔ ''اچھا تم جا کر مشیروں سے صلاح مشورہ کرو اور یہ مشین گن مجھے دو۔''

''تم کیا کرو گے؟''

''ان کو پل کراس کرنے سے روکنے کی کوشش کروں گا۔ ورنہ وہ اس طرف آ گئے تو ہمیں بچ نکلنے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔''

''وہ تمہیں بھی مار دیں گے۔'' اس نے فکرمندی سے کہا۔ ''وہ پھر راکٹ مار سکتے ہیں۔''

''فی الحال ان کو جواب نہیں مل رہا ہے۔ اس لئے وہ حملہ نہیں کریں گے۔ اس طرف دھواں بھی ہے اس لئے رات میں دیکھنے والی عینک بھی کام نہیں کرے گی۔''

میں مشین گن لئے دہانے کی طرف بڑھا۔ وہاں دھواں تھا اور زمین پر لاشوں کے اعضا بکھرے پڑے تھے جو میرے پیروں تلے آ رہے تھے۔ میں دیوار سے چپکا آگے بڑھ رہا تھا۔ دھواں ناک اور حلق میں گھسا جا رہا تھا مگر یہ قابلِ برداشت ہی تھا۔ دہانے کے قریب پہنچ کر میں زمین پر گر گیا کیونکہ سامنے کچھ روشنی نظر آ رہی تھی۔ میں سرک کر آگے پہنچا۔ حسبِ توقع مجھے پل کے پاس سائے نظر آئے۔ وہ اسے مرمت کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔ ان کی تعداد دس کے آس پاس تھی۔ انہوں نے روشنی کر رکھی تھی۔ تاریکی میں مرمت کا کام ناممکن ہی تھا۔ مجھے جو کرنا تھا وہ چند سیکنڈ میں کرنا تھا ورنہ عین ممکن تھا میں مارا جاتا۔ میں نے مشین گن سامنے کی، سب سے پہلے

پل کے عقب میں موجود افراد کو نشانہ بنایا۔ ایک طویل اور لمبے برسٹ نے ان سب کو گرا دیا تھا۔ جو آگے تھے وہ واپس بھاگے مگر ان کو پل پار کرنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ پھر گولیوں نے پل کے رسے کاٹ دیئے اور پل خوف ناک آوازیں نکالتا دریا میں گرنے لگا۔ جو گولیوں کا نشانہ بننے سے بچ گئے تھے وہ پل کے ساتھ دریا میں گرنے لگے ان کی بھیانک چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ ساتھ ہی دوسری طرف سے خوف ناک فائرنگ شروع ہو گئی۔ میں نے اٹھ کر بھاگنے کی حماقت نہیں کی تھی ورنہ وہیں مارا جاتا۔ میں رینگتا ہوا واپس آیا۔ گولیاں مجھے چھوتی ہوئی گزر رہی تھیں۔

میں ذرا آگے آیا اور براہ راست فائرنگ سے ذرا محفوظ ہوا تو میں نے اٹھ کر دوڑنے میں دیر نہیں لگائی اور اسی چیز نے مجھے بچا لیا۔ میں ایک طرف مڑا تھا تو عین اسی جگہ آ کر راکٹ لگا جہاں میں لیٹا ہوا تھا۔ اس دھماکے نے غار کی چھت ہلا دی۔ گڑگڑاہٹ ایسی تھی کہ میں سمجھا پورے غار کی چھت بیٹھ رہی ہے مگر خیر رہی، چھت بس وہیں کی گری جہاں راکٹ گرا تھا۔ میں آگے بھاگا۔ اندر سے کمار اور اس کے ساتھی آ رہے تھے اور سب کی ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ "میں نے پل گرا دیا ہے۔" میں نے ان کو آگاہ کیا۔ "دس بارہ بندے مارے گئے جو پل کی مرمت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ خود میں مرتے مرتے بچا۔ راکٹ نے دہانے کی چھت ہلا دی ہے۔ اب یہاں سے نکلنے کی کرو۔"

"چھت گرا دی ہے۔" کمار نے مرے ہوئے انداز میں کہا۔ "اب ہم باہر کیسے نکلیں گے؟"

"خفیہ راستہ کس لئے؟"

"وہ راستہ!" کمار نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ "وہ تو نہیں کھل رہا ہے۔"

"نہیں کھل رہا ہے؟" میں نے دہرایا۔ "کیا مطلب ۔۔۔ اس کے قبضے جام ہو گئے یا اس کے تالے کی چابی نہیں مل رہی ہے۔"

"پہلا راکٹ گرتے ہی میرے ایک مشیر نے اس راستے سے فرار کی کوشش کی تھی مگر دروازہ کھلا نہیں۔ اس نے مجھے بتایا۔ ہم نے بھی کوشش کی۔"

صورتِ حال یک لخت ہی سنگین ہو گئی تھی۔ سامنے سے نکلنے کا راستہ بند ہو گیا تھا اور خفیہ دروازہ بھی نہیں کھل رہا تھا۔ سامنے کا تو یہ معاملہ تھا کہ راستہ نہ بھی بند ہوتا تب بھی نکلنا ناممکن تھا۔ دہانے کے عین سامنے دو ایل ایم جی نصب تھیں جو بے حد سرعت سے موت بانٹتی ہیں۔ "اب کیا ہوگا؟" میں نے کمار کی طرف دیکھا "کیا یہ غار ہماری قبر ثابت ہوگا جس میں ہم زندہ دفن ہو گئے ہیں؟"

اچانک ہی کمار کے ساتھی بلند آواز سے بولنے لگے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے جھگڑ رہے ہیں۔ کمار نے ان کی بک بک نظر انداز کی اور مجھ سے بولا۔ "شہباز میرے ساتھ آؤ۔"

وہ مجھے لے کر اپنے حجرے میں پہنچا۔ اس نے زمین پر بچھی چٹائی الٹ دی۔ نیچے ایک تقریباً دو فٹ قطر کا سوراخ تھا۔ اس نے ایک عدد ٹارچ برآمد کی اور اس سوراخ میں اتر گیا۔ "آ جاؤ، اندر۔" اس نے نیچے جا کر کہا "مگر دواحت دیتا" میں نے اس کی تقلید کی۔ سوراخ سے کوئی پانچ فٹ نیچے زمین تھی۔ میں نے سر جھکا لیا۔ کمار نے ٹارچ روشن کر لی تھی۔ یہ ایک محدود سی سرنگ تھی۔ کمار آگے چلنے لگا۔ ہمیں اپنا سر اوپر لگنے سے

دہانے کے لئے جھکا کر رکھنا پڑ رہا تھا۔ میں نے کمار سے پوچھا۔ ''ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''خفیہ راستے کے دہانے کی طرف؟'' اس نے جواب دیا۔

''کیا وہ کسی میکنزم کے تحت کھلتا ہے؟''

''بالکل! اس کا باقاعدہ ایک میکنزم ہے۔ نہ جانے کب سے ہم اسے استعمال کر رہے ہیں۔ آج تک ایسا نہیں ہوا۔''

''ہر چیز کبھی نہ کبھی پہلی بار خراب ہوتی ہے۔''

''میں نہیں مانتا۔ ابھی دو دن پہلے میں نے اس کی آزمائش کی تھی یہ بالکل درست کام کر رہا تھا۔ آج اچانک اس نے کھلنے سے انکار کر دیا۔''

''تمہارا مطلب ہے یہ کوئی سازش ہے؟''

''شاید، میں تمہیں اسی لئے لایا ہوں، تم اسے دیکھ لو۔''

سرنگ آگے جا کر کسی قدر کشادہ ہو گئی تھی اور اب ہم سر بلند ہو کر چل سکتے تھے۔ سرنگ خاصی طویل تھی۔ میرا خیال تھا، ہم کوئی پانچ چھ منٹ تک چلتے رہے تھے۔ اندر برائے نام سی گھٹن تھی، یہاں ہوا کی آمدورفت کا انتظام تھا۔ آخر ہم ایک گول کمرے میں پہنچے۔ وہاں مشعل روشن تھی۔ کمرا ایک طرف سے ذرا لمبا ہو رہا تھا اور اس طرف دیوار میں پتھر کا ایک حصہ کسی قدر باہر نکلا تھا۔ کمار نے ابھرے پتھر کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہی خفیہ دروازہ ہے۔''

میں نے معائنہ کیا، اس کا طول و عرض کوئی چار بائی سات تھا یعنی سات فٹ بلند اور چار فٹ چوڑا مگر اس میں کہیں رخنہ نہیں تھا اور یہ دیوار کا حصہ ہی لگ رہا تھا۔ میں نے کمار سے دریافت کیا۔

''اسے کھولنے کا طریقہ کیا ہے؟''

کمار نے ٹارچ کا رخ دیوار کے ساتھ فرش کی طرف کر دیا۔ زمین میں ایک گڑھا تھا۔ جس میں ایک عدد گول لٹو نما چیز نظر آ رہی تھی۔ ''اسے گھڑی کی سوئی کی طرح گھماؤ تو دروازہ کھل جاتا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''اور بند کرنے کے لئے کیا کرنا پڑتا ہے؟''

''اسے ہی الٹا گھماؤ۔'' اس نے جواب دیا۔

''دروازہ باہر سے کھولنے اور بند کرنے کا سسٹم ہے۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''باہر سے اس دروازے کو دھکیل کر بند کیا جا سکتا ہے، کھولنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔''

میں نے بیٹھ کر لٹو کو گھمایا۔ وہ بہت آسانی سے گھوم گیا تھا مگر اس کے جواب میں کچھ نہیں ہوا تھا یعنی کوئی دروازہ نہیں کھلا۔ لٹو جس طرح آسانی سے گھوم رہا تھا، ایسا لگ رہا تھا اس کا اندر کے میکنزم سے رابطہ ختم ہو گیا ہے۔ میں نے کمار سے پوچھا۔ ''پہلے بھی یہ اتنی آسانی سے گھوم جاتا تھا؟''

''نہیں، کسی قدر زور لگانا پڑتا تھا۔''

''کسی نے اسے خراب کر دیا ہے۔ اس کا تعلق اس کے میکنزم سے توڑ دیا ہے۔''

"ایسا کون کرسکتا ہے؟"

"ممکن ہے تمہاری صفوں میں کوئی غدار ہو؟"

"ہوسکتا ہے لیکن میں کیسے جان سکتا ہوں، وہ کون ہے؟"

"جان جائیں گے لیکن پہلے اسے کھولنے کا کوئی بندوبست کرنا ہوگا۔" میں نے لٹو کی ساخت پر غور کر ہوئے کہا۔

"اسے کس طرح کھولنا ہوگا؟"

"اوزار ہیں یہاں...... توڑ پھوڑ اور کھدائی کے؟"

"اوپر ملیں گے۔" اس نے بتایا۔

"کمار، تمہارے پاس کتنے آدمی رہ گئے ہیں؟"

"سو غار کے اندر ہیں اور اتنے ہی باہر تھے۔"

"باہر والوں کو بھول جاؤ۔ ان میں سے شاید ہی کوئی بچا ہو۔"

"اندر موجود افراد میں سے دو مارے جا چکے ہیں اور چار زخمی ہیں۔" کمار سوچتے ہوئے بولا۔ "اگر ہمارے درمیان کوئی غدار ہے تو اس نے یہ حرکت کیوں کی ہے؟"

"ہمیں روکنے کے لئے۔" میں نے جواب دیا۔ "اس طرف شاید فوج والوں کا گھیرا تنگ نہیں ہوا ہے۔"

"فوج!" کمار چونکا۔

"تو اور کیا...... تمہارے خیال میں اتنا منظم حملہ کون کرسکتا ہے؟"

"یہ ہماری فوج ہے، اپنے ہی لوگوں کو قتل کرنے آئی ہے؟" اس نے نفرت سے کہا۔

"اس خطے کی افواج اس قسم کے کارِ خیر انجام دیتی رہتی ہے۔"

"چلو واپس اوزار لاتے ہیں۔" کمار نے مجھ سے کہا۔

ہم واپس اوپر غار میں آئے۔ وہاں سب ہی کمار کے حجرے کے آس پاس جمع تھے، میں نے کمار سے کہا۔

"تم اعلان کرو کہ ہم نے میکنزم کی خرابی پکڑ لی ہے اور ہم اسے ٹھیک کرلیں گے۔"

"اس سے فائدہ؟"

"ممکن ہے غدار سامنے آجائے۔"

کمار نے سوچا اور اپنی زبان میں ان کو بتانے لگا کہ ہم نے دروازے کے میکنزم کی خرابی جان لی ہے اور اب اسے درست کرنے جا رہے ہیں۔ میں اس دوران میں لوگوں کے چہرے دیکھ رہا تھا مگر سب کے چہرے سپاٹ سے تھے۔ آخر کمار نے اوزار لئے اور ہم واپس نیچے آئے۔ نیچے آنے سے پہلے کمار نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ وہ دہانے کی طرف سے ہوشیار رہیں، ہوسکتا ہے حملہ آور اس طرف سے گھسنے کی کوشش کریں۔

"ملبے نے دہانہ بند کردیا ہے۔" میں نے اسے بتایا۔

"پھر بھی ہوسکتا ہے کوئی رخنہ رہ گیا ہو؟" میں نے اس سے اتفاق کیا اور ہم اندر آئے۔ پہلے میں نے فرش میں جہاں لٹو نصب تھا وہ حصہ توڑا۔ زمین پتھریلی تھی اور یہ کام خلاف توقع بے حد مشکل ثابت ہوا تھا۔ نہ جانے

اس میکنزم کو بنانے والوں نے زمین کیسے کھودی تھی۔ میں نے کمار سے پوچھا۔ اس نے بتایا کہ یہ مرکز اور یہ خفیہ دروازہ سب اس کے باپ نے بنوایا تھا، کیسے؟ یہ اسے بھی علم نہیں ہے۔

''لگتا ہے تم سچ مچ شہزادے تھے۔ راج پاٹ اور اس کے لوازمات سے تمہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔'' میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔ بھاری ہتھوڑے کی نوک سے زمین میں سوراخ ہو چلا تھا۔ میں تھکا تو ہتھوڑا کمار نے لے لیا۔ اس نے زیادہ بہتر انداز میں کام کیا۔

''ہاں، میں واقعی شہزادہ تھا۔'' اس نے تسلیم کیا۔

''بالآخر میکنزم کا اندرونی حصہ سامنے آ گیا۔ میری توقع کے مطابق کسی نے اسے خراب کر دیا تھا، یہ کام اس نے لٹو کو زیادہ ہی گھما کر کیا تھا۔ لوہے کی تاریں ٹوٹ گئی تھیں۔ ذرا سی محنت سے میں نے جان لیا کہ کس تار کو کھینچنے سے دروازہ کھل جاتا تھا اور کسے کھینچنے سے دروازہ بند ہو جاتا تھا۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور کمار سے کہا۔

''ہوشیار ہو جاؤ، میں دروازہ کھولنے جا رہا ہوں۔''

''ضرور!'' اس نے اپنا پستول اٹھاتے ہوئے کہا اور میں نے تار کھینچ لی۔

ہلکی سی گڑگڑاہٹ کے ساتھ پتھر کا دروازہ ایک طرف سے سرکنے لگا۔ ابھی دروازہ کھلا نہیں تھا کہ عقب سے مجھے روشنی کا احساس ہوا۔ کوئی سرنگ سے آ رہا تھا۔ اسی لمحے دروازہ پوری طرح کھل گیا اور میں نے عین اس کے سامنے ایک مسلح وردی پوش کو دیکھا۔ میں بے ساختہ چلایا۔

''کمار...... بچنا!''

اسی لمحے کمرا فائرنگ کے بے پناہ شور سے گونج اٹھا تھا۔

فائرنگ وردی پوش نے نہیں کی تھی۔ ہمارے عقب سے ہوئی تھی اور وردی پوش پر نہیں بلکہ ہم پر ہوئی تھی۔ یہ اور بات تھی کہ وردی پوش کو دیکھتے ہی میں اور کمار زمین پر گر گئے تھے اور گولیاں ہمارے اوپر سے گزر کر اسے لگی تھیں۔ اس نے ایک بھیانک چیخ ماری اور اچھل کر پیچھے گرا تھا۔ کمار نے لیٹے لیٹے گھوم کر سرنگ سے آنے والے کو گولی مار دی۔ اس کے مرنے کے بعد فائرنگ کا شور تھما تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا مرنے والا کمار کے مشیروں میں سے ایک تھا۔ میں کھڑا ہو گیا۔ ''تو یہ غدار تھا؟''

کمار نے مرنے والے کی خودکار رائفل لے لی۔ ''اسی نے دروازے کا میکنزم خراب کیا تھا۔''

میں نے دروازے سے باہر جھانکا۔ ''کمار، یہاں صرف ایک فوجی نہیں ہوگا۔ اس کے پیچھے اور بھی ہوں گے، اس سے پہلے کہ گھیرا تنگ ہو جائے، ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہئے۔''

''میں دوسروں کو بلاتا ہوں۔'' کمار نے کہا اور رائفل میرے سپرد کر کے سرنگ میں غائب ہو گیا۔ میری نظر باہر کی تاریکی پر مرکوز تھی۔ باہر شاید چاند نکل آیا تھا اس لئے ہلکی سی روشنی تھی۔ فوجی کی لاش ذرا فاصلے پر پڑی تھی۔ اسے کس نے یہاں کھڑا کیا ہوگا اور حیرت تھی، اب تک اس کی موت پر کوئی سامنے نہیں آیا تھا۔ حالانکہ فائرنگ کی آواز دور تک سنی گئی تھیں شاید وہ لوگ کہیں دور مورچوں میں سکون سے بیٹھے ہمارے باہر آنے کا انتظار کر رہے تھے۔

ایک غدار کی وجہ سے حالات خرابی کی انتہا کو جا پہنچے تھے اور فرار کا واحد راستہ بھی بند نظر آ رہا تھا۔ میں نے

بہتر سمجھا کہ دروازے کو کھلا رکھنے کے بجائے اسے بند کر دوں۔ کوئی اچانک باہر سے راکٹ داغ دے یا دستی بم ہی مار دے تو میرے پاس سوائے وفات پانے کے اور کوئی راستہ نہیں ہو گا۔ میں نے تار کھینچ کر دروازہ بند کر دیا۔ کمار اور اس کے ساتھی کوئی پندرہ منٹ بعد آئے تھے۔ وہ سب خوف زدہ اور پریشان لگ رہے تھے۔ ایک نے کچھ کہا۔ ''یہ کہہ رہا ہے دروازہ جلدی کھولو۔'' کمار نے ترجمہ پیش کیا۔

''اسے کہو، جلدی کا راستہ آدمی کو عام طور سے نرک پہنچاتا ہے اس لئے ذرا صبر کرے۔'' میں نے کہا۔ ''تم نے غور نہیں کیا، دروازے کے باہر دشمن موجود ہے۔''

''ہاں، میں سوچ رہا تھا مگر اب موجود ہے تو کیا کریں، اس جگہ سے نکلنا ہے۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ باہر گھات لگائے بیٹھے ہیں، جیسے ہی ہم باہر نکلے وہ فائر کھول دیں گے۔''

کمار نے ان خدشات کو ترجمہ کر کے اپنے ساتھیوں تک پہنچایا اور وہ حسبِ معمول ہنکارنے اور سینے پر ہاتھ مارنے لگے۔ وہ مرنے مارنے پر تلے ہوئے تھے۔

''یہ نہیں مانتے۔'' کمار نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔

''تو منواؤ...... تم سردار کس بات کے ہو۔ باہر جا کر...... یہ سب حرام موت مرنے کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں۔''

اس پر کمار کو غصہ آ گیا تھا، اس نے چیخ چیخ کر تقریر شروع کر دی تھی۔ آغاز میں اس کے آدمیوں کا انداز جارحانہ رہا تھا مگر آہستہ آہستہ وہ ڈھیلے پڑنے لگے تھے۔ آخر میں بالکل دم سادھ لیا تھا۔ کمار نے ان کو رام کر لیا تھا، یہ اس کی سرداری کا پہلا چیلنج تھا جس کا اس نے سامنا کیا تھا ورنہ اس سے پہلے وہ ان لوگوں کے ہاتھوں میں کھلونا بنا ہوا تھا۔ اس نے فاتحانہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ''مان گئے۔''

کمار نے بالآخر لیڈر شپ کا آغاز کر دیا تھا۔ جو تمام ہی لیڈر تقریروں سے کرتے ہیں اور جب عوام کو قائل کر کے ایک بار ان کے کندھوں پر سوار ہو جاتے ہیں تو پھر اسے اپنا موروثی حق سمجھ لیتے ہیں۔ حکم چلانے اور حکم نہ ماننے والوں پر ڈنڈا چلانے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ کمار اپنی بات منوانے کے بعد کسی قدر متفکر تھا۔ اس نے نصف درجن آدمی دروازے کی حفاظت کے لئے چھوڑ دیئے تھے اور ہم واپس غار میں آ گئے، یہاں کم سے کم گھٹن نہیں تھی۔

''اب میں کیا کروں؟'' کمار نے موقع ملتے ہی مجھ سے دریافت کیا۔ ''دونوں طرف کے راستے بند ہیں اور باہر انہوں نے گھیرا ڈال رکھا ہے؟''

''فی الحال صبر کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ بتاؤ کہ یہاں رہنا پڑا تو کتنے دن کا راشن پانی ہے؟''

''کئی دن کا ہے، میں معلوم کرواتا ہوں۔'' کمار نے کہا اور ایک عورت کو بلا کر اسے تخمینہ لگانے کی ذمے داری سونپی تھی۔ اس نے ایک گھنٹے بعد بتایا کہ کھانے کا سامان اتنا ہے کہ مہینے بھر تک چل سکتا ہے لیکن پانی اتنا نہیں ہے۔ بڑی مشکل سے دو تین دن گزارہ ہو سکتا ہے۔ کمار نے اسی وقت پانی پر پہرا لگا دیا۔ اس نے فیصلہ دیا کہ ایک آدمی کو دن بھر میں ایک گلاس پانی ملے گا۔ یہ پیتل کا بڑا سا گلاس تھا، جس میں ایک لیٹر پانی آ جاتا ہو گا،

اس موسم میں یہ مقدار کافی تھی، اس سے گزارہ ہو جاتا۔ البتہ عورت نے ایک تشویش ناک بات بتائی تھی کہ جلانے کے لئے لکڑیوں کی کمی تھی۔ کمار نے فالتو مشعلیں بجھانے کا حکم دیا۔ الاؤ بھی بند کر دیا گیا۔ غار اندر ہونے کی وجہ سے سردی کی شدت کم تھی۔

غار کا دہانہ بند ہونے سے گھٹن کا احساس ہوا تھا مگر یہ احساس ایک حد سے زیادہ نہیں ہونے پاتا تھا، اس کا مطلب تھا کہ مقدار میں کم سہی مگر کہیں سے تازہ ہوا اندر آ رہی تھی۔ الاؤ اور مشعلیں بجھانے سے گھٹن کم ہوئی تھی۔ میں نے کمار سے کہا۔ ''غار میں ہوا کی آمد و رفت کا انتظام ہے۔ کیا تمہیں وہ جگہ معلوم ہے۔ جہاں سے ہوا آتی ہے؟''

''نہیں، میرے علم میں نہیں ہے۔''

''اپنے آدمیوں سے معلوم کرو۔''

''فرداً فرداً کمار نے سب سے پچھوایا مگر کسی کو علم نہیں تھا کہ غار میں تازہ ہوا کہاں سے آتی ہے۔ میں نے کمار سے موم بتی کی فرمائش کی جو تلاش بسیار کے بعد مجھے مہیا کر دی گئی تھی۔ میں نے اسے جلایا اور سب سے پہلے دہانے کے سامنے بکھرے ملبے تک آیا۔ میں خاصی دیر یہاں چیک کرتا رہا مگر مجھے کہیں سے بھی ہوا کی آمد کا سراغ نہیں ملا۔ پھر میں موم بتی لے کر غار کی مختلف گپھاؤں میں جانے لگا۔ کمار میرے ساتھ تھا اور حیران تھا۔

''یہ کیا کر رہے ہو؟''

''دیکھ رہا ہوں، ہوا کس طرف سے آ رہی ہے؟''

''اس موم بتی کی مدد سے؟''

''ہاں۔'' میں نے کہا اور وضاحت کی۔ ''ہوا کی آمد سے اس کی لَو تھرتھرانے لگے گی، اس سے پتا چل جائے گا کہ ہوا کس طرف سے آ رہی ہے۔'' مصیبت یہ تھی کہ کمار کے آدمی ہمارے ساتھ ساتھ تھے، آگے پیچھے، دائیں بائیں اور ان کی وجہ سے مجھے خاصی دشواری پیش آ رہی تھی۔ وہ حرکت کرتے تھے تو موم بتی کی لَو از خود تھرتھرانے لگتی تھی۔ تنگ آ کر میں نے کمار سے درخواست کی کہ وہ اپنے آدمیوں سمیت سکون سے بیٹھے اور مجھے میرا کام کرنے دے۔ وہ سب سکون سے بیٹھے تو میں نے از سرِ نو اپنا کام شروع کیا۔ بالآخر مجھے ایک گپھا میں ہوا کی آمد محسوس ہوئی۔ میں نے تین چار مشعلیں منگوا لیں۔ اس کی دیواروں اور چھت کا معائنہ کیا۔ دیواروں کے اوپری حصے اور چھت میں بے شمار کھانچے تھے۔ ایسے کھانچے میں نے ان غاروں میں دیکھے تھے جن میں چمگادڑ رہتی ہیں۔

''یہاں پر چمگادڑیں تھیں؟'' میں نے کمار سے پوچھا، حسبِ معمول وہ لاعلم نکلا۔

اس جگہ گپھا کی چھت دس سے پندرہ فٹ اونچی تھی اور خاصی ٹیڑھی میڑھی تھی۔ اس کے بعض زاویے ایسے تھے کہ وہاں تک شعلوں کی روشنی جاتی ہی نہیں تھی۔ میرا خیال تھا ہوائی آمد و رفت کا کوئی سوراخ کسی ایسی ہی جگہ تھا۔ چمگادڑ ان غاروں میں بسیرا کرتی ہیں جہاں ان کے آنے جانے کے کئی راستے ہوتے ہیں۔ میں نے کمار سے سیڑھی کا پوچھا۔ سیڑھی تو نہیں تھی لیکن یہاں جلانے والی لکڑی پڑی تھی، اس جگہ دو دس بارہ فٹ لمبے بانس مل گئے۔ رسی کی مدد سے ان پر جلانے والی لکڑی اس طرح باندھ دی گئی کہ اس سے ایک سیڑھی تیار ہو گئی۔ میں چھ

سات قبائلیوں کے ساتھ اسے لے آیا اور ایک جگہ کھڑا کر کے ان لوگوں سے کہا۔ ''اسے مضبوطی تھام لیں۔'' اس جگہ چھت اوپر سے ترچھی تھی اور اس کا ایک حصہ نظر نہیں آتا تھا۔ میں مشعل لے کر اوپر چڑھ گیا۔ اس ہوم میڈ سیڑھی پر چڑھنا آسان کام نہیں تھا مگر میں کسی نہ کسی طرح چڑھ گیا۔ میں نے مشعل کی روشنی میں چھت کا معائنہ کیا مگر مجھے کوئی رخنہ نظر نہیں آیا۔

باری باری سیڑھی دوسری جگہوں پر لگوا کر میں نے تلاش کا عمل جاری رکھا اور بالآخر مجھے گپھا کی چھت کے وسط میں ایک سوراخ نظر آ گیا تھا۔ میں نے موم بتی اس کے سامنے رکھ کر تجربہ کیا اور موم بتی کی لو پھڑ پھڑانے لگی تھی۔ ہوا اس راستے سے آ رہی تھی۔ میں خوش ہو گیا تھا۔ تجربہ کامیاب رہا تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ سوراخ خاصا چھوٹا لگ رہا تھا۔ اس سے ایک اوسط جسامت کا آدمی بھی مشکل سے گزر سکتا تھا۔ میں نے کابینہ کے اجلاس کی صدارت فرماتے کمار کو اپنی دریافت سے آگاہ کیا تو وہ مع کابینہ کے اسے دیکھنے چلا آیا تھا۔

''سوراخ چھوٹا ہے، اس سے کوئی بچہ بھی مشکل سے گزرے گا۔''

''اسے بڑا کیا جا سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔

کمار نے اپنے آدمیوں میں سب سے مختصر اور دبلے پتلے آدمی کو تلاش کیا اور اسے اس سوراخ میں جانے کا حکم دیا۔ وہ سترہ اٹھارہ برس کا نوجوان لڑکا تھا۔ وہ پھرتی سے سیڑھی پر چڑھا اور اس نے سوراخ کا معائنہ کیا۔ پھر اپنی زبان میں اعلان کیا، کمار نے بتایا۔ ''یہ اس میں جا سکتا ہے۔''

''اس سے کہو کہ خاموشی سے اوپر جائے جہاں تک جا سکتا ہے اور سوراخ کو دیکھے، اسے بڑا کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ ممکن ہے یہی ہمارے لئے نجات کا راستہ بن جائے۔''

لڑکا تیز طرار تھا، وہ کسی نہ کسی طرح ٹارچ لے کر اس سوراخ میں گھس گیا۔ کمار نے اسے سمجھا دیا تھا کہ خاموشی سے جائے اور غیر ضروری آوازیں نکالنے سے گریز کرے۔ اوپر نکلنے کا موقع ملے تو یہ دیکھے کہ سوراخ کس جگہ نکل رہا ہے۔ اب ہم دم سادھے اس کے اوپر جانے کی آوازیں سن رہے تھے۔ اسے پتھروں اور ٹیڑھے میڑھے سوراخ سے رگڑ کھانا پڑ رہی تھی۔ کبھی کبھی اس کی کراہ بھی سنائی دیتے تھی۔ جب وہ اتنی آسانی سے نہیں گزر پا رہا تھا تو زیادہ جسامت والوں کا تو اور بھی مشکل تھا۔ بہر حال ایک راستہ نظر آیا تھا۔ لڑکا ایک گھنٹے بعد آیا، اس کی حالت بری تھیں پورا جسم مٹی اور خراشوں سے بھرا تھا، اسے پانی پلایا جب اس کے حواس ٹھکانے آئے تھے۔ اس نے جو بتایا اس کا ترجمہ کمار نے کیا اور اس کا لب لباب یوں تھا کہ یہ ایک سیدھا اور اونچائی پر نکلنے والا راستہ تھا جو بعض مقامات پر اتنا تنگ ہو گیا تھا کہ اس سے گزرنا ہی محال تھا۔ لڑکے کی حالت اس کی گواہ تھی۔ اس کی ہمت تھی جو وہ اوپر چلا گیا اور واپس بھی آ گیا۔ اس نے بتایا کہ راستہ ایک چٹان کے نیچے جا کر نکل رہا ہے، یہ جگہ غار کے دہانے سے کوئی سوفٹ کی بلندی پر ہے۔

''بس ہم یہیں سے نکلیں گے۔'' کمار نے فیصلہ کیا۔

''کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی ہم اس راستے کو وسیع کریں گے، اس کے بعد اس سے نکلنا آسان ہو جائے گا۔''

''میں اس کی تجویز کی افادیت پر غور کرنے لگا۔'' اس طرح ہم گھات میں بیٹھے دشمنوں کو جل دے کر نکل

جائیں گے۔''

''ہم ان پر اچانک حملہ کر سکتے ہیں۔'' کمار نے جوش سے کہا۔

''اس پرسکون سے غور کر نا فی الحال تو راستے کی توسیع کا حکم دو۔''

اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ ''تم حملے والی بات سے متفق نہیں ہو؟''

''ایسا ہی ہے۔'' میں نے سر ہلایا۔ ''دراصل ان لوگوں کے پاس تباہ کن ہتھیار اور ان کو استعمال کرنے کی تربیت ہے۔ اس لئے ان سے مقابلہ مشکل ہے۔ دیکھو، انہوں نے غار میں ہونے کے باوجود ہمیں کتنی آسانی سے بے بس کر دیا۔ مجھے یقین ہے! اگر دہانے کی چھت نہ بیٹھ جاتی تو یہ اب تک ہمیں گیس کے بم کی مدد سے مار چکے ہوتے یا بے بس کر کے گرفتار کر لیتے اس لئے مقابلے کے بجائے نکلنے کی سوچو۔ تمہارا ایک ایک آدمی قیمتی ہے۔ اگر کوئی مر گیا تو تمہیں اس کا متبادل نہیں ملے گا۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' اس نے آزردگی سے کہا۔ ''میرے تیں ساتھی اپنی جان گنوا چکے ہیں۔ مجھے اعتراف ہے میں ان کو درست طریقے سے کنٹرول نہیں کر سکا تھا۔''

''تم نے کوشش نہیں کی تھی، اب تم نے کوشش کی تو کامیاب بھی رہے۔ ان کے جذباتی پن کو اپنے قابو میں رکھو۔ کوئی حکم عدولی کرے تو اسے ہلکی پھلکی سزا دینے سے بھی مت چوکو۔''

''میں ایسا ہی کروں گا۔'' کمار نے سر ہلایا اور اپنے آدمیوں کو حکم دینے لگا کہ اس راستے کو وسیع کیا جائے اور اس میں ایسے کھانچے بنائے جائیں جن پر ہاتھ پاؤں رکھ کر آدمی بہ آسانی اوپر چڑھ سکے۔

''ان سے کہو کہ کام کرتے وقت کم سے کم آواز نکالیں۔ ہتھوڑے پر کپڑا یا کوئی چیز لپیٹ کر ماریں ورنہ آواز اوپر کسی نے سن لی تو یہ راستہ کھلنے سے پہلے ہی بند ہو جائے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی وجہ سے ہم مارے جائیں۔''

''وہ کیسے؟'' کمار نے غور کیا۔

''اس سوراخ سے دو تین دستی بم یا گیس کے بم اندر لڑھکا دیں تو ہمارا کیا ہوگا؟''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' کمار نے مجھ سے اتفاق کیا

''اس کے علاوہ بھی ایک خیال میرے ذہن میں آ رہا ہے۔ اگر ہم یہ کام کرنے سے پہلے اس لڑکے کو دوبارہ اوپر بھیج دیں۔ یہ نگرانی کرے اور کوئی خطرہ دیکھے تو نیچے کام کرنے والوں کو خبردار کر دے کہ وہ فی الحال ہاتھ روک لیں۔''

''یہ ٹھیک رہے گا۔'' اس نے جوش سے کہا۔ ''مگر فی الحال نیچے کا راستہ بڑا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔'' اس نے اپنے آدمیوں کو احکامات جاری کرنا شروع کر دیئے۔

میں نے لڑکے کو تلاش کیا۔ پانی پی کر اور کپڑے پہن کر وہ تازہ دم ہو گیا تھا۔ میں نے اس سے اشارے سے پوچھا کہ کیا اسے پستول یا رائفل چلانی آتی ہے، اس نے فخریہ انداز میں سر ہلایا اور اپنی نشانے بازی کے بارے میں کچھ فرمایا جو میرے سر سے گزر گیا۔ میں نے اس کا امتحان لیا، اس نے کامیابی اور تیزی سے پستول، رائفل لوڈ اور ان لوڈ کر کے دکھائے، اس کے بعد فرضی نشانے بازی کا مظاہرہ کیا۔ اس کی شست کا انداز بھی تقریباً

درست تھا، میں نے اسے اوکے کر دیا تو وہ مارے خوشی کے پھولے نہیں سما رہا تھا۔ کمار کے علاوہ دوسرے قبائیلیوں کا رویہ میرے ساتھ معاندانہ تھا۔ مگر جب میں نے پل تباہ کیا، خفیہ راستہ کھولا اور ان کو باہر نکل کر بے موت مرنے سے روکا، اس کے بعد جب باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں مل رہا تھا تو یہ راستہ دریافت کیا تب سے ان کے انداز میں میرے لئے ایک احترام آ گیا تھا۔

رات کا کھانا کب کا تیار ہو گیا تھا مگر حملے کے بعد اتنے ساتھی مارے جانے اور خود اپنی جان کے لالے پڑنے کے بعد کسی کو بھوک کا خیال بھی نہیں رہا تھا۔ خود مجھے کمار نے کھانے کے لئے کہا تو خیال آیا کہ میں خاصا بھوکا تھا۔ ہم نے کمار کے حجرے میں کھانا کھایا۔ اس کے بعد کمار تو کام کا معائنہ کرنے چلا گیا اور میں لیٹ گیا۔ نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس لئے سونے کے بجائے سوچنے لگا۔ یہاں سے بحفاظت نکلنے کا ایک راستہ نظر آیا تھا، میں نے فیصلہ کیا کہ یہاں سے نکلتے ہی اپنا راستہ الگ ناپوں گا۔

پھر مجھے کنوروں کا خیال آیا، یہ سخت بے غیرت تھے۔ ان کو پتا تھا کہ ان کی بہن قبائیلیوں کے قبضے میں ہے پھر بھی انہوں نے اپنے منصوبے پر عمل کیا تھا۔ شاید ان کو بہن کی پروا نہیں تھی جو عقل کے لحاظ سے ویسے ہی اپنی عمر سے پیچھے تھی۔ ان کے لئے اپنا مفاد زیادہ اہم تھا۔ قبائلی ایک بار ان کے قابو میں آ جاتے اور وہ ان جنگلوں اور پہاڑوں پر قابض ہو جاتے تو یہاں سے بے حساب پیسا کما سکتے تھے۔ ان کی بے ضمیری کا اندازہ اس واقعے سے ہو جاتا تھا کہ وہ اپنے ہی جیسے انسانوں کے جسمانی اعضا نکال کر بیچ رہے تھے۔ نہ جانے کتنے انسان ان کی ہوس کی بھینٹ چڑھ چکے تھے۔ پولیس قبائیلیوں کو دبا دیتی تو ان کا مذموم کاروبار اور چمک جاتا۔ یہاں چند افراد کے پاس گھڑیاں تھیں، ان میں ایک کمار تھا۔ وہ بارہ بجے واپس آیا۔ ”نیچے کا حصہ میرے آدمیوں نے توڑ کر کشارہ کر دیا ہے۔“

”لیکن خیال رہے، راستہ اتنا کشادہ بھی نہ ہو کہ اس پر اوپر جانا مسئلہ بن جائے۔“

”ہم اس چیز کا خیال رکھ کر کام رہے ہیں۔“ کمار بولا۔ اس نے انگاروں پر رکھی قہوے کی کیتلی سے اپنے اور میرے لئے چائے نکالی۔

وہ لڑکا اوپر چلا گیا۔ ”کیا نام ہے اس کا؟“

”بیتو، بیتو ہرن!“ کمار نے کہا۔

”کام کا لڑکا ہے۔“ میں نے کہا۔

”بہت ہوشیار...... پڑھا لکھا ہے۔ ہندی جانتا ہے۔“

”ہندی جانتا ہے!“ میں نے سر پر ہاتھ مارا۔ ”بلاوجہ اس سے آدھے گھنٹے اشاروں کی زبان میں مغز ماری کرتا رہا۔ پہلے نہیں بتا سکتے تھے۔“

”تم نے پوچھا کب تھا۔“ اس نے سادگی سے کہا۔

”اوہ ہاں اچھا، خیر یہ بتاؤ یہاں سے نکل کر کہاں جاؤ گے؟“

”اپنی آبائی وادی کی طرف۔“ اس نے کہا۔ ”پتا نہیں، میرے لوگوں پر کیا گزر رہی ہو گی۔ انہوں نے بالکل درندوں کی طرح حملہ کیا ہے۔“

''بستیوں پر وہ اس طرح حملہ نہیں کر سکتے، انہیں کسی نہ کسی کو جواب دینا ہوتا ہے۔ تم لوگ کیونکہ ان کے مجرم ہو اسی لئے براہِ راست حملہ کیا ہے۔'' میں نے اس کو تسلی دی حالانکہ مجھے خدشہ تھا فوج نے ان کی بستی پر بھی حملہ کیا ہوگا۔

''کمار نے غصے سے دانت پیسے۔ ''میں کنور خاندان کو چھوڑوں گا نہیں، اس کے بچے بچے کا نام ونشان مٹا دوں گا۔''

''یہاں تم زیادتی کر رہے ہو۔ قصور صرف دو افراد کا ہے اس کی سزا پورے خاندان کو دینا اچھی بات نہیں ہوگی۔''

''اور جو میرے آدمیوں کے ساتھ ہو رہا ہے اور جو میری بستیوں کے ساتھ ہوگا؟'' اس کا لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔

''اس کے ذمے دار بھی یہی دو افراد اور ان کے چند گرگے ہیں۔ خیر...... تمہارے قبیلے کی کتنی بستیاں ہیں؟''

''تین...... اوپر والی...... جو اوپری کہلاتی ہے۔ درمیان والی جو درمیانی کہلاتی ہے اور نیچے والی......''

''جو نچلی کہلاتی ہے۔'' میں ہنسا تو وہ جھینپا تھا۔

''ہمارے پُرکھوں کے وقت سے یہ نام چلے آ رہے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''ان میں سب سے نزدیکی بستی کون سی ہے۔''

''نچلی بستی ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''یہاں سے دو گھنٹے کی پیدل مسافت پر ہے۔''

''اس وقت ٹھنڈ شدید ہے۔ سب لوگ نچلی بستی میں ہوں گے۔'' میں نے اندازہ لگایا۔

''درست ہے۔ اس وقت سارے ہی لوگ نچلی بستی میں ہیں۔ درمیانی اور اوپری بستی میں چند ایک دیکھ بھال کرنے والے ہیں۔''

''گویا پولیس یا پیرا ملٹری سیدھا اس بستی کا رخ کرے گی۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''وہ سب مارے جائیں گے یا پکڑے جائیں گے۔''

''اس کا امکان ہے اگر تم پہلے نکل جاتے اور ان کے ہاتھ نہ آتے تو پھر بھی امکان تھا۔ اب تو انہوں نے تمہیں یہاں محصور کر لیا ہے اور وہ بے فکری سے بستی پر ٹوٹ پڑیں گے۔ اپنی دہشت بٹھانے اور تمہیں سزا دینے کے لئے ان لوگوں پر تشدد کریں گے۔ ان کو قتل کریں گے اور عورتوں کی بے حرمتی کریں گے۔''

''نہیں۔'' اس نے خوف زدہ ہو کر کہا۔ ''وہ ایسا نہیں کر سکتے۔''

''یہ تو تمہیں کنور خاندان کے خلاف قدم اٹھانے سے پہلے سوچنا چاہئے تھا کہ اس کے کیا نتائج نکل سکتے ہیں۔ تم لوگ کمزور ہو، کنور طاقتور ہے، ان کے نقصان کا ازالہ ہو جائے گا مگر تم لوگوں کے نقصان کی تلافی کیسے ہوگی۔''

کمار ساکت بیٹھا دیوار کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے تصور کا ٹی وی اسے وہ سب دکھا رہا تھا جو اس کے لوگوں پر گزری تھی۔ ان ایک بربادی کے مناظر اور ان کی چیخیں اسے سنائی دے رہی تھیں، دکھائی دے رہی تھیں۔ اس نے بڑی دیر بعد دانت پر دانت جما کر کہا۔ ''اگر انہوں نے ایسا کیا تو میں ایک ایک سرکاری بندے کو چن چن کر

ماروں گا۔"

"فائدہ...... وہ سب عام غریب لوگ ہیں۔ پولیس والے اور پیراملٹری کے لوگ بھی عام ہیں۔ بدلہ لینا ہے تو کنور خاندان کے مردوں سے لو۔ وہ اصل مجرم ہیں جنہوں نے ریاستی حکام کو خرید لیا ہے۔ ان ریاستی حکام سے لو جو تمہاری بربادی اور تمہارے ساتھیوں کی ہلاکت کے ذمے دار ہیں۔ عام لوگوں کو مار کر تم خود کو ایک بے مقصد جنگ میں الجھا لوگے جس کا انجام تمہارے خاتمے پر ہوگا۔"

"مگر میرے سینے میں جو آگ لگی ہے۔"

"اس آگ کو محفوظ رکھو۔ یہی آگ تمہارے کام آئے گی۔ اگر انتقام لینا ہی ہے تو اصل ذمے داروں سے لو، یہ بات اپنے آدمیوں کو بھی سمجھاؤ۔"

"یعنی جو ہمارے گھروں کو برباد کرنے آئے ہیں، ان کو کچھ نہ کہیں؟" اس نے کڑوے لہجے میں کہا۔

"نہیں۔ اب ان کو جھٹکا دینا لازمی ہے۔ اس جگہ ان کے کم سے کم ایک درجن آدمی مارے جا چکے ہیں۔ تم نے بستی کی طرف جو تیرانداز روانہ کئے تھے، انہوں نے مزاحمت کی ہوگی اور جنگل میں چھپ کر انہوں نے آنے والے لشکر کو نقصان پہنچایا ہوگا۔ تم بھی یہاں سے نکل کر ان کی سرکوبی کرنا۔ مگر اسے اپنی پالیسی مت بناؤ۔ یہ سب چھپا نہیں رہے گا۔ میڈیا پر اس کا چرچا ہوگا۔ اس کے بعد سرکار محتاط ہو جائے گی۔ مگر تمہاری جانب سے کوئی غلطی ہوئی تو اسے جواز بنا کر یہ تم پر چڑھ دوڑیں گے۔"

اس کے چہرے پر اطمینان نظر آنے لگا۔ "میرے تیس ساتھی مارے گئے ہیں تو ان کے بھی بارہ آدمی مرے ہیں۔ اسکور برا نہیں ہے۔"

میں اسے سمجھا نہیں سکتا تھا، اس کے تیس آدمی بہت قیمتی تھے کیونکہ ان کا کوئی متبادل نہیں تھا۔ سرکار کے پاس مارے جانے والوں کے کئی متبادل تھے۔ آدمیوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ اسے سرکار کے نقصان پر خوشی کا اظہار کرنے کے بجائے اپنے آدمیوں کی بے فائدہ موت کا ماتم کرنا چاہئے تھا جو اس کے مشیروں کی احمقانہ ضد کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔ وہ رات بھر چمگادڑوں کے بنائے اس سوراخ کی توسیع کرتے رہے تھے، یہ کام آسان نہیں تھا کہ یہ پوری کی پوری چٹان تھی۔ اس میں نہ جانے کیسے یہ دراڑ وجود میں آ گئی تھی۔ ہزاروں لاکھوں برس سے چمگادڑیں اس راستے کو وسیع کرتی رہی تھیں اور انہوں نے اپنے گزرنے کے قابل بنا لیا تھا۔ میں رات کسی وقت سو گیا تھا، میری آنکھ کھلی تو دیوار میں لگی مشعل بجھ گئی تھی، اٹھ کر باہر آیا۔ حوائج ضروریہ کے لئے ایک گھا مخصوص کر دی تھی اور وہاں موجود بدبو سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہمیں ایک دو دن اور یہاں رکنا پڑا تو بو سے ہی دماغ خراب ہو جائے گا۔

ناشتا وہی تھا جو تین وقت کھانا ہوتا تھا یعنی دلیا نما کوئی شے، مکئی کی روٹی اور ایک لئی جیسی شے۔ مکئی کی روٹی پر مکھن رکھا تھا۔ یہ کھانا بے حد سادہ لیکن غذائیت سے بھرپور تھا۔ اس کا اندازہ مجھے اپنی بے حد تیزی سے بحال ہو جانے والی توانائی سے ہوا تھا۔ ان دو دنوں میں، مَیں خود کو تقریباً فٹ محسوس کرنے لگا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا جس نے ان لوگوں کو فرشتہ بنا کر بھیجا اور میرا ان منحوس لوگوں سے پیچھا چھوٹا جو میرا خون نچوڑنے پر تلے ہوئے تھے۔ ناشتے کے بعد میں نے کمار کو تلاش کیا۔ وہ مجھے اس کمرے میں ملا جس کی چھت میں راستہ تھا۔

راتوں رات ایک سیڑھی نما پلیٹ فارم بنالیا گیا تھا، اس پر چڑھنا اترنا آسان تھا۔ چند افراد اوپر کام کر رہے تھے اور کچھ اوپر سے گرنے والا ملبا ایک طرف کر رہے تھے۔ کمار رات بھر کا جاگا ہوا تھا مگر اس کے چہرے سے نہیں لگ رہا تھا۔

''نصف راستہ بن چکا ہے۔'' اس نے مجھے دیکھ کر کہا۔ ''آج رات تک راستہ بن جائے گا۔''

''اوپر کوئی نگرانی کر رہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بیتو ہے۔'' وہ بولا۔

''کمار! غار سے تو نکل جائیں گے اس کے بعد اس علاقے سے کیسے نکلیں گے۔ پانچ دس افراد ہوں تو تاریکی میں چھپ بھی جاتے ہیں۔ اتنے افراد کا چھپنا ممکن نہیں ہے۔''

''میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔'' اس نے کہا۔

''مجھے اس علاقے کا نقشہ بتا سکتے ہو؟ میں نے کہا۔

اس نے ایک بجھ جانے والی مشعل کا جلا ہوا ٹکڑا اٹھایا اور اس سے دیوار پر ایک نقشہ بنانے لگا، پہلے اس نے پہاڑی کو واضح کیا جس کے اندر ہم تھے۔ اس نے سمتیں واضح کیں۔ ''ہمیں پہاڑی کے عقب میں جانا ہے۔ خفیہ راستہ بھی اسی طرف کھلتا ہے لیکن وہ نشیب میں ہے۔ یہ راستہ اوپر ہے۔ ہم اوپر ہی سے عقب کی طرف چلے جائیں گے۔''

''یہ راستہ آغاز میں دریا کے پار سے بالکل واضح نظر آئے گا۔'' میں نے غور کیا۔

''بالکل درست!'' اس نے سر ہلایا۔ ''لیکن ذرا آگے جا کر راستہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ ہم اس پر بلا خطر سفر کر سکتے ہیں۔''

''بہتر ہو گا، پہلے لڑنے والے اوپر جا کر مورچہ سنبھال لیں، اس کے بعد لوگوں کو دس دس کی ٹولیوں میں بانٹ کر آگے روانہ کیا جائے۔'' میں نے تجویز دی۔

''اس نے رشک سے مجھے دیکھا۔ ''تمہارے ذہن میں کسی بھی مسئلے کا اتنی جلدی حل کیسے آ جاتا ہے؟''

''مشق!'' میں نے اسے بتایا۔ ''میں گزشتہ کچھ عرصے سے یہی کام رہا ہوں۔''

''میں ایسا ہی کروں گا۔ اب تمہاری ہر بات مانوں گا۔ کاش میں نے تمہاری پہلی بات مان لی ہوتی، میرے اتنے سارے ساتھی نہ مرتے۔'' اس نے حسرت سے کہا۔ ''یہ سب بہت قیمتی لوگ تھے، اپنے گھروں کے مرد تھے۔ میں ان کے گھر والوں کو کیا بتاؤں گا۔''

''یہ کام اپنے مشیروں کو سونپ دینا۔ وہ خود ہی کوئی نہ کوئی وضاحت کر لیں گے۔''

سوراخ سے مسلسل ریزے اور پتھر گر رہے تھے۔ ہتھوڑے اور دوسرے اوزار چلنے کی آوازیں نیچے تک آ رہی تھیں۔ اس وقت چھ افراد کام کر رہے تھے۔

''سرنگ والے دروازے پر کتنے آدمی ہیں۔'' میں نے کمار سے پوچھا۔ ''مجھے اس طرف سے حملے کا خدشہ ہے۔''

''اُدھر میں نے بیس افراد لگا رکھے ہیں۔ اوّل تو دروازہ ہی بہت مضبوط ہے۔ چھ فٹ سے زیادہ موٹی

چٹان ہے اسے نہ جانے کس ترکیب سے دروازہ بنایا گیا ہے۔"

"وہ راکٹ مار سکتے ہیں۔"

کمار نے نفی میں سر ہلایا۔"اس پر ہلکا پھلکا راکٹ بھی اثر نہیں کرے گا۔ اسے اڑانے کے لئے بہت بڑا بم چاہئے۔"

"وہ بڑا بم بھی مار سکتے ہیں۔ بارود سے بھی اڑا سکتے ہیں مگر وہ مطمئن ہیں کہ اندر موجود لوگ خود ہی بھوک پیاس اور دم گھٹنے سے مر جائیں گے۔"

"ہم اتنی آسانی سے نہیں مریں گے۔" اس نے غرا کر کہا۔

"تم نے اپنے ساتھیوں کو سمجھایا ہے، ایسا نہ ہو باہر نکلتے ہی یہ سب بھول کر دشمن پر ٹوٹ پڑنے کی کوشش کریں۔"

"میں نے ان کو سمجھا دیا ہے۔ یہاں سے نکل کر ہمیں جلد از جلد نچلی بستی تک پہنچنا ہے، جہاں ہمارے گھر والے ہیں ان سب کے گھر والے ہیں، اب یہ سیدھے وہاں جائیں گے۔"

"گڈ، تم نے اچھا نکتہ ان کے سامنے رکھا ہے۔"

"اگر بستی میں امن و امان ہوا تو ہم جنگلوں میں روپوش ہو جائیں گے۔"

میں اسے مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا مگر مجھے ان قبائلیوں کی بستی کی عافیت خطرے میں لگ رہی تھی۔ تیر انداز جنگجو کسی قدر مزاحمت کر سکتے تھے مگر وہ پیرا ملٹری پر کھل کر حملہ نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی جانب کئے جانے والے حملوں کا خمیازہ بھی بستی کے بے گناہ لوگوں کو بھگتنا پڑتا۔ آزادی کی تحریکوں کے خلاف سب سے جارحانہ رویہ بھارتی فوج کا رہا ہے۔ وہ بے گناہ اور عام لوگوں پر جنگی حربے آزمانے سے بھی نہیں ہچکچاتی۔ آسام سے لے کر کشمیر تک اس کا کردار اس بات کا گواہ ہے۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"یہی کہ مجھے یہاں سے نکلنے کے بعد کس طرف کا رخ کرنا چاہئے۔"

اس کے چہرے پر مایوسی نظر آئی تھی۔ "تم چلے جاؤ گے؟"

"ظاہر ہے مجھے جانا تو ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

اس نے کچھ دیر سوچا اور پھر سرد آہ بھری۔ "ٹھیک ہے دوست! میں ابھی تمہیں روک نہیں سکتا مگر مجھ سے وعدہ کرو، اگر میں زندہ رہا تو تم مجھ سے رابطہ ضرور کرو گے۔"

"میں وعدہ نہیں کرتا، لیکن کوشش ضرور کروں گا۔ بات یہ ہے میرے سامنے بھی بعض کنور ہیں، ابھی مجھے ان سے نمٹنا ہے۔"

"ابھی تو خود مجھے جان کا خطرہ ہے۔ مگر میں وعدہ کرتا ہوں، میں اس چکر سے نکلا تو تمہارے دشمن بھی میرے دشمن ہوں گے۔" اس نے پُر خلوص لہجے میں کہا۔

"فی الحال میں تمہارے خلوص کا شکریہ ادا کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔

شام تک کام جاری رہا تھا اور راستہ تقریباً بن گیا تھا۔ بس آخری چند فٹ باقی تھے کیونکہ دہانہ بالکل پاس

تھا اس لئے توسیع کا کام بے حد احتیاط سے ہو رہا تھا کہ آواز باہر نہ جانے پائے۔ سب نے روانگی کی تیاری شروع کر دی تھی۔ سارا اسلحہ ساتھ لے لیا تھا۔ اس کے علاوہ کھانے پینے کا سامان اور پانی بھی تھا۔ کمار نے دس دس افراد کے گروپ بنا دیئے تھے۔ ہر گروپ میں ایک عورت تھی جس کے ذمے کھانے کا سامان اٹھانا تھا اور ایک آدمی پانی کا مشکیزہ لے کر چلتا اور باقی اسلحہ سنبھالتے۔ یہ اس نے عقل مندی کی تھی۔ عورتوں کو تقسیم کر دیا تھا۔ اس طرح ان کا کمزور حصہ بٹ گیا تھا اور اکیلا پن عورت کو مجبور کرے گا کہ وہ ہمت سے مردوں کا ساتھ دے۔ میں کمار کے گروپ میں تھا جسے سب سے آخر میں روانہ ہونا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ میں اولین گروپ کے ساتھ نکل جاؤں گا میں نے انکار کر دیا۔ ''نہیں، میں تمہارے ساتھ نکلوں گا اور راستے میں کسی مناسب جگہ تم سے الگ ہو جاؤں گا۔''

مگر شام کو سب سے پہلے میں اور کمار اوپر گئے تھے۔ اس کے بعد کمار نے اپنے دس ساتھی اس چٹان کے اردگرد تعینات کر دیئے جہاں یہ راستہ نکلتا تھا۔ یہ پوزیشن ایسی تھی کہ اس سے تین اطراف نظر رکھی جا سکتی تھی اور کسی بھی حملے کا مؤثر جواب دیا جا سکتا تھا۔ چوتھی سمت وہ تھی جس سمت ہمیں جانا تھا۔ یہ ایک پل نما راستہ تھا جو چٹان سے لے کر دوسرے پہاڑ تک تھا اور یہ راستہ ذرا خطرناک تھا کیونکہ نیچے سے کی جانے والی فائرنگ کی زد میں تھا۔ ایک آدمی کا گھٹنا گولی سے زخمی تھا اسے پہلے گروپ میں بھیجا گیا۔ اسے ایک آدمی نے اپنی پشت پر اٹھا لیا تھا، اس گروپ کے ارکان باری باری اسے اٹھاتے۔ جب یہ گروپ بحفاظت پل عبور کر گیا تو دوسرا گروپ روانہ کیا گیا۔

کمار نے سب طے کر دیا تھا، گروپ ترتیب سے باری باری اوپر آ رہے تھے اور روانہ ہو رہے تھے۔ ایک گھنٹے کے اندر تین گروپ جا چکے تھے۔ اس کے بعد ان لوگوں کو اعتماد ہوا تو اگلے ایک گھنٹے میں پانچ گروپ جا چکے تھے۔ ابھی اتنے ہی گروپ اور باقی تھے۔ اس کے بعد چاند نکل آیا۔ یہ بارہویں کا چاند تھا اور اس کی روشنی میں پہاڑ صاف نظر آ رہے تھے، خود ہمیں دریا کے پار نقل و حرکت محسوس ہو رہی تھی۔ کمار نے کہا۔ ''میرا خیال ہے اب گروپ کے بجائے افراد کو ایک ایک کر کے بھیجا جائے۔''

''اس میں دیر لگے گی۔'' میں نے خدشہ ظاہر کیا۔ ''ہمیں صبح سے پہلے اس علاقے سے نکل جانا چاہیے۔''

''گروپ کے مقابلے میں ایک فرد کے نظر میں آنے کا امکان کم ہے۔'' اس نے اصرار کیا۔

''جیسے تم چاہو۔'' میں نے شانے اچکائے۔ ''احتیاط بری چیز نہیں ہے۔''

کمار نے ایک ایک کر کے اپنے آدمیوں کو اس فطری پل کے پار بھیجنا شروع کر دیا۔ اس نے ان سے کہا کہ وہ ہر ممکن احتیاط کریں۔ نظروں میں نہ آنے پائیں۔ اس طرح دو گروپ اور نکل گئے۔ مگر تاخیر ہونے لگی تھی، ان دو گروپوں کو محفوظ علاقے تک جانے میں سوا گھنٹا لگا تھا۔ اس رفتار نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس میں جتنی دیر ہوتی، دشمن کی نظروں میں آنے کے امکانات زیادہ تھے۔ اگر پیراملٹری کو پتا چل جاتا کہ اندر مقید افراد فرار ہو رہے ہیں تو نہ صرف ہماری فرار کی راہ مسدود ہو جاتی بلکہ آگے جانے والوں کا بھی تعاقب شروع ہو جاتا۔ اگلے ایک گھنٹے میں مزید دو گروپ چلے گئے۔ ابھی بھی پچاس پچپن افراد باقی تھے۔ اگلے گروپ کا ساتواں جا رہا تھا کہ اچانک فائر ہوا اور کسی کی چیخ گونجی۔ میں نے ایک شخص کو اچھل کر نیچے گرتے دیکھا۔ اس کی

بھیانک چیخ نے سب کو دہلا دیا تھا۔ وہ جتنی بلندی سے نیچے گرا تھا اگر اسے کسی غیر خطرناک جگہ گولی لگی تھی تب بھی اس کے بچنے کا سوال نہیں ہوتا تھا۔ فوراً ہی کسی نے جواب دیا اور دریا کے دوسرے کنارے سے فائر کرنے والے کو اڑا دیا۔ اس کے فوراً بعد دونوں طرف سے قیامت خیز فائرنگ شروع ہو گئی۔

میں اور کمار جلدی سے چٹان کی آڑ میں ہو گئے۔ ہمارے ساتھ جانے والے گروپ میں تین افراد تھے اور ہم سب کے لئے یہ جگہ کم تھی۔ گولیاں آس پاس لگ رہی تھیں۔ کمار نے چیخ کر دوسروں کو اوپر آنے سے منع کیا اور ان تینوں کو بھی نیچے جانے کا حکم دیا۔ الفاظ میری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے مگر انداز سے میں سمجھ گیا تھا۔ تینوں مردوں نے پھرتی سے حکم کی تعمیل کی تھی۔ وہ یکے بعد دیگرے نیچے اتر گئے تھے۔ کمار نے چیخ کر مزاحمت کرنے والوں کو کچھ کہا اور ان کی طرف سے کی جانے والی اندھا دھند فائرنگ میں کمی آ گئی۔ ان کے پاس ضائع کرنے کے لئے ایمونیشن جو نہیں تھا۔ میں نے چلا کر کہا۔ ''کمار! پل کراس کرنے والوں کو دریا کے کنارے موجود لوگوں سے خطرہ ہے۔ اپنے آدمیوں سے کہو کہ ان کو نشانہ بنانے کی کوشش کریں تاکہ دوسرے پار جا سکیں۔''

کمار اپنے ساتھیوں کو ہدایات دینے لگا۔ میں رائفل لے کر رینگتا ہوا چٹان کے کنارے تک آیا۔ میں نے ذرا سا سر نکال کر نیچے جھانکا۔ مجھے دریا کے ایک طرف سے بار بار شعلے لپکتے نظر آئے۔ وہاں کوئی بھاری مشین گن لگی تھی جس سے تواتر سے گولیاں برسائی جا رہی تھیں۔ میں نے اس کا نشانہ لیا اور لگاتار تین چار گولیاں چلائیں اور شعلے چمکنا بند ہو گئے تھے۔ نشانہ کارگر رہا تھا۔ میرا نشانہ اتنا اچھا نہیں تھا مگر مشین گنر کی قضا آئی تھی۔ مجھے اپنے پاس سے کمار کی سرگوشی سنائی دی۔ ''شاندار''

''اپنے لوگوں سے کہو پار جائیں۔ دیر مت کریں۔'' میں نے کہا۔

''میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے۔'' کمار نے مجھ سے ذرا فاصلے پر پوزیشن سنبھال لی۔ اس کے پاس ہائی بور کی رائفل تھی۔ ذرا دیر میں اس نے اپنا ہدف تلاش کر لیا۔ ایک اور ایل ایم جی خاموش ہو گئی۔

''واہ کیا نشانہ ہے؟'' میں نے بے ساختہ داد دی۔

اب حملہ آوروں کو لینے کے دینے پڑ گئے تھے۔ بلندی کی وجہ سے ہم ان کو بہتر طور پر نشانہ بنا رہے تھے اور وہ پسپا ہو رہے تھے۔ دریا کا کنارہ اس مقام سے زد میں تھا اس لئے غیر محفوظ تھا۔ پولیس اور پیرا ملٹری کے لوگ پیچھے ہٹ رہے تھے۔ دوسرے لوگ آہستہ آہستہ پل کراس کر رہے تھے۔ کمار کے ساتھیوں کی ہمت اتنی بڑھ گئی تھی کہ وہ کنارے پر آ کر فائرنگ کر رہے تھے۔ ایسے میں ایک گولیوں کا نشانہ بن گیا۔ میں نے کمار سے کہا۔ ''ان سے کہو اپنی جگہ رہ کر فائرنگ کریں، آگے نہ جائیں۔''

کمار پہلے ہی ان پر گرج برس رہا تھا۔ کنارے سے سارے سرکاری اہلکار پیچھے ہٹ گئے تھے۔ اسی دوران سے کمار کے آدمی آرام سے پل کراس کر رہے تھے۔ میں نے دائیں طرف ڈھلانوں کا معائنہ کیا اور مجھے اس طرف درختوں کے درمیان حرکت کا احساس ہوا۔ میں نے کمار کو متوجہ کیا۔ ''یہ کہاں جا رہے ہیں؟''

اس نے غور کیا اور اچھل پڑا۔ ''یہ گھوم کر اس طرف جا رہے ہیں جہاں سے میرے لوگ گزر رہے ہوں گے، ان کو روکنا ضروری ہے۔''

''یہ دریا کیسے عبور کریں گے؟'' میں نے پھر پوچھا۔

اس نے مجھے دیکھا جیسے میں نے کوئی احمقانہ بات کی ہو۔ "تم نہیں جانتے، ملٹری والے دریا کیسے عبور کرتے ہیں، پل کے بغیر؟"

میں شرمندہ ہو گیا تھا۔ "میرے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ اب یہاں سے جلدی نکلو، اس سے پہلے وہ گھوم کر ہمارا راستہ روک لیں۔"

ہنگامی حالات میں سب نے نصف گھنٹے میں قدرتی پل عبور کر لیا تھا، سب سے آخر میں، مَیں اور کمار گئے تھے۔ ہمارے گروپ کے علاوہ سب جا چکے تھے، ہم نے اپنے ہتھیار سنبھالے اور ہر ممکن تیزی سے چل پڑے۔ سب ہی چوکنا تھے اور دائیں بائیں عقب میں نظر رکھے ہوئے تھے کہ کسی طرف سے دشمن نہ نکل آئے۔ مجھے امید تھی کہ قبائل ان راستوں کو بہتر طور پر جانتے تھے اور ان پر سفر کرنے کے عادی تھے۔ اس کا ثبوت فوراً ہی مل گیا جب کمار سمیت باقی افراد پر توجہ کی، وہ سب ایسے چل رہے تھے گویا ہموار سڑک پر چل رہے ہوں اور مجھے پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑ رہا تھا۔ ہم پل کراس کرنے کے بعد ایک پتلی سی پگڈنڈی پر محوِ سفر تھے جس کے بائیں طرف اِھلان تھی اور دائیں جانب بلند ہوتا پہاڑ تھا۔ مجھے ہر لحہ ایک لگ رہا تھا کہ ابھی میں نیچے لڑھک جاؤں گا۔ میں نے ہانپتے ہوئے کمار سے کہا۔ "تم لوگ...... کیسے اتنے مزے سے چل رہے ہو؟"

"ہم عادی ہیں۔" کمار ہنسا۔ "بچپن سے ان پہاڑوں پر سفر کرتے رہے ہیں۔ تم بھی کچھ دیر میں عادی ہو جاؤ گے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "جو لچک اور توازن تمہیں قدرتی طور پر ملا ہے اس سے میں محروم ہوں، اس لئے میرا عادی ہونا محال ہے۔ پہاڑ میرے لیے اجنبی نہیں ہیں میں بہت سفر کر چکا ہوں۔ یہ بتاؤ کہ بستی تک پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا۔"

"کم سے کم چھ گھنٹے!"

"اور مجھے جنوب کے میدانوں کی طرف جانا ہو تو کون سا راستہ موزوں رہے گا۔"

"راستہ بستی سے ہو کر جاتا ہے۔"

"یعنی مجھے بستی تک جانا ہی ہوگا۔" میں نے موسم کی مناسبت سے ٹھنڈی سانس لی تھی۔

"راستہ تو یہاں سے بھی جاتا ہے مگر اس وقت سرکاری کارندے وہاں موجود ہوں گے۔ تم پکڑے جاؤ گے۔" کمار نے کہا۔

پکڑے جانے کا امکان اس راستے پر بھی تھا اور بستی میں بھی۔ مجھے یقین تھا بستی والوں کے ساتھ جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہوگا اور پولیس وہاں اب بھی ڈیرے ڈالے بیٹھی ہوگی۔ کمار نے اپنے ساتھیوں سے کہا تھا کہ وہ بستی تک جا کے براہِ راست داخل ہونے کی کوشش نہ کریں بلکہ پہلے سن گن لیں اور اگر بستی میں پولیس موجود ہو تو سب مدھوموہن کے مندر میں جمع ہوں، یہ قدیم مندر بستی سے کچھ فاصلے پر تھا۔ یہ مندر اجاڑ ہو چکا تھا۔

"میرا خیال ہے پہلا گروپ بستی کے قریب ہوگا۔" میں نے کہا۔

کمار نے گھڑی دیکھی۔ "ہاں، اسے روانہ ہوئے چھ گھنٹے ہو چکے ہیں۔"

اب تک سفر خیریت سے جاری تھا۔ اچانک آگے کہیں فائرنگ ہوئی، اس کی آواز گونجی تھی۔ پھر تواتر سے

فائرنگ ہونے لگی۔

''پولیس نے گھیرا ڈال دیا ہے۔'' کمار وحشت سے بولا۔

''شاید اس طرف ان کا کوئی دستہ پہلے سے موجود ہے۔'' میں نے غور کیا۔''ان کا سامنا تمہارے کسی گروپ سے ہو گیا ہے۔ دریا کی طرف سے وہ اتنی جلدی نہیں آسکتے۔''

یہ بات کمار کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ اس کی وحشت ذرا کم ہوئی تھی۔ ہم ہر ممکن تیزی سے سفر کر رہے تھے اگرچہ پہاڑی راستوں پر سفر کرنا آسان نہیں ہوتا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا سانس مستقل پھولا ہوا ہے۔ بلندی پر آکسیجن کم ہوتی ہے۔ خاص طور سے پانچ ہزار فٹ کی بلندی کے بعد اس میں کمی آنے لگتی ہے اور ذرا سا مشقت کا کام کر کے آدمی کی سانس پھول جاتی ہے۔ میں تو دشوار ترین پہاڑی راستے پر سفر کر رہا تھا جو کبھی بلندی کی طرف جاتا تھا اور کبھی نشیب کی طرف مڑ جاتا تھا۔ دونوں صورتوں میں مشقت ہی مشقت تھی۔ سردی شدید تھی، اوپر سے رات کا وقت تھا۔ درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے نیچے ہی تھا اور جیسے جیسے ہم بلندی کی طرف جاتے یہ اور بھی کم ہوتا جاتا۔ ہمارے گروپ میں بچ جانے والے تمام افراد شامل تھے، ان کی تعداد دو درجن تھی اور سب مسلح تھے اس لئے یہ اطمینان تھا کہ کسی سے مڈبھیڑ ہوئی تو ہم کمزور نہیں پڑیں گے۔

ایک گھنٹے بعد ہم اس جگہ پہنچے جہاں فائرنگ ہوئی تھی۔ وہاں پر چھ افراد کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ یہ ہم سے پہلے روانہ ہونے والا گروپ تھا۔ اس کے چار ارکان بشمول عورت کے غائب تھے۔ اپنے ساتھیوں کی لاشیں دیکھ کر قبائلیوں کا غصے سے برا حال ہو گیا تھا۔ وہ سرکاری اہلکاروں کے تعاقب میں جانا اور اپنے ساتھیوں کو ان سے چھڑانا چاہتے تھے۔ کمار نے بمشکل ان کو سمجھا بجھا کر روکا۔ انہوں نے اپنے مردہ ساتھیوں کو راستے سے ہٹا کر ایک طرف رکھا کہ ان کی لاشیں بعد میں اس جگہ جلائی جائیں گی اور ہم نے دوبارہ سفر کا آغاز کر دیا۔

''کمار!'' میں نے اچانک کہا۔''بہتر ہو گا ہم عام مروجہ راستوں سے ہٹ کر سفر کریں۔''

''کیوں؟'' اس نے پوچھا۔

''مجھے خدشہ ہے ان راستوں پر اور بھی شکاری ہوں گے، میری مراد سرکاری آدمیوں سے ہے۔''

''کیا؟'' وہ چونکا۔

''کمار، یہ تو طے ہے تمہارے خلاف آپریشن آرمی کر رہی ہے اور ان کا طریقہ کار ایسا ہی ہوتا ہے۔ انہوں نے راستوں میں اپنے گروپس چھوڑے ہوں گے جو تمہارے آدمیوں کا شکار کر رہے ہوں گے۔ اس لئے ہمیں عام راستوں سے ہٹ کر سفر کرنا ہو گا۔''

''عام راستوں سے ہٹ کر...... مگر اس طرح تو بستی تک جانے میں دیر ہو جائے گی۔'' کمار پریشان ہو گیا تھا۔

''دیر سے پہنچنا بہتر ہے، بہ نسبت کبھی نہ پہنچنے کے۔''

اس نے سر ہلایا۔''ٹھیک ہے۔''

کمار نے اپنے آدمیوں سے بات کی اور ایک شخص ہماری رہنمائی کرنے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ پہاڑی راستے دشوار ہوتے ہیں لیکن ان میں بھٹک جانے کا امکان کم ہوتا ہے کیونکہ راہ کے نشانات آنکھوں کے سامنے

ہوتے ہیں کہ آدمی آرام سے سر اٹھا کر دیکھ لیتا ہے۔اس شخص نے جو راستہ اختیار کیا، وہ پہلے سے بھی زیادہ دشوار تھا مگر اس کا دعویٰ تھا کہ یہ شارٹ کٹ بھی تھا اور سُست رفتاری کے باوجود ہم اتنی ہی دیر میں بستی پہنچ جاتے جتنی دیر مروجہ راستے پہنچنے میں لگتی۔ مروجہ راستے پر چاند کی روشنی تھی اور یہاں جنگل میں اندھیرا تھا۔ اس وجہ سے ہم ٹوکریں کھا رہے تھے اور ہر قدم پھونک پھونک کر رکھ رہے تھے۔ مشعل جلانے کا مطلب دشمنوں کو آپ اپنی موجودگی کی اطلاع دینا تھا۔

رہنمائی کرنے والے شخص کا کہنا تھا کہ ایک بار ہم بلندی پر پہنچ گئے تو راستہ صاف ملے گا اور روشنی بھی ہو گی مگر یہ بلندی خاصی دیر بعد آئی تھی، سب کا تھکن سے برا حال ہو گیا تھا اس لئے فیصلہ ہوا کہ کچھ دیر آرام کیا جائے۔ ایک شخص نے ڈول میں چائے تیار کی، اس نے جھٹ پٹ آگ جلائی اور لکڑیوں پر ڈول رکھ کر پانی ابالا۔ گلاس صرف دو تھے اس لئے سب نے باری باری سیاہ بغیر چینی کی چائے پی جس نے ہمیں تازہ دم کر کے ازسرِ نو سفر کے قابل بنا دیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کمار سے بات کروں۔ ہمیں بستی سے دور ہی رہنا چاہئے تھا۔ پیرا ملٹری وہاں لازی موجود ہو گی اور ممکن ہے انہوں نے اپنی بربریت کا مظاہرہ کر دیا ہو۔ مگر میں فی الحال خاموش رہا۔ صورتِ حال کچھ دیر میں سامنے آجاتی۔

سب خاموشی سے سفر کر رہے تھے، اب وہ مرحلہ آگیا تھا جب جسمانی توانائی کا گراف زیرو پر آگیا تھا اور جسم کا انجن ریزرو پر چل رہا تھا۔ سب سر جھکائے اپنے حوصلے کو استعمال کرتے اور خود کو چلتے رہنے پر قائل کرتے سفر کر رہے تھے۔ خود میرا یہ حال تھا، ایک ایک قدم اٹھانا دشوار محسوس ہو رہا تھا۔ وقت کا اور سردی کا احساس بھی فنا ہو گیا تھا۔ ممکن ہے میں اکیلا ہوتا تو ہر شے پر لعنت بھیج کر وہیں لیٹ جاتا۔ بے شک اس کے بعد فرشتہ اجل آ کر اٹھاتا۔ اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ کمار سے پوچھ سکوں کہ ابھی کتنا سفر باقی ہے؟ نہ ہی آسمان کی طرف دیکھنے کی ہمت تھی کہ صبح کی آمد کا سراغ لگا سکوں۔ اچانک کمار کے آدمیوں نے زور و شور سے بولنا شروع کر دیا۔ میں چونکا۔ وہ ایک طرف اشارہ کر رہے تھے۔ میں نے غور سے دیکھا تو مجھے اس طرف شعلے سے لپکتے نظر آئے۔ کہیں آگ لگی تھی۔ میں نے کمار کی طرف دیکھا۔ ''کمار! کیا یہ جنگل میں آگ لگی ہے؟''

''نہیں بستی میں آگ لگی ہے۔'' اس نے بوجھل سے لہجے میں کہا۔

''بستی!'' میں نے دور چمکنے والے شعلے دیکھے۔ ''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''میں اس علاقے کو اپنے ہاتھ کی لکیروں کی طرح جانتا ہوں۔ ابھی بستی دور ہے ہمیں وہاں تک جانے یں دو گھنٹے اور لگ سکتے ہیں۔''

میرے خدشات درست ثابت ہوئے تھے، یہ بہت بڑی آگ تھی جو اتنے فاصلے سے بھی نظر آرہی تھی۔ ایدساری بستی کو نذرِ آتش کر دیا گیا تھا۔ شعلے دیکھ کر ان لوگوں نے رفتار تیز کر دی تھی۔ راستہ دشوار اور خطرناک نہ ہتا تو یہ بھاگنا شروع کر دیتے، چلتے ہوئے وہ اپنے غم و غصے کا اظہار کر رہے تھے۔ میں نے کہا۔ ''کمار ہمیں بستی ے بجائے مندر کی طرف جانا چاہئے۔''

''یہ نہیں مانیں گے، ان کے گھر جل رہے ہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''ان کے ساتھ جو ہونا تھا، وہ ہو چکا ہے۔ اب اس طرف جانا خود کو سرکاری قاتلوں کے سامنے پیش

کرنے کے برابر ہوگا، ان کو روکو...... ورنہ یہ سب بھی مارے جائیں گے۔''

''میں...... کوشش کرتا ہوں۔'' اس نے بوجھل لہجے میں کہا، اس کی قوتِ فیصلہ متاثر ہو رہی تھی۔ اسے ا
لوگوں کے جذبات کو بھی دیکھنا پڑ رہا تھا۔ اس نے اپنے لوگوں سے بات کی، حسبِ توقع انہوں نے انکار کر دیا
انکار ان کے لہجے اور ان کے چہروں سے چھلک رہا تھا۔ وہ مرنے مارنے پر تلے ہوئے تھے۔ ڈھلان سے
اترتے ہوئے انہوں نے باقاعدہ دوڑنا شروع کر دیا تھا۔ اب بستی سے اٹھنے والے شعلے صاف دکھائی دے رہے
تھے۔ یہ آگ خاصے وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔

''کمار، ہم سب مارے جائیں گے۔'' میں نے ایک بار پھر کوشش کی۔

''تم ہم سے الگ ہو سکتے ہو۔'' اس نے بے تاثر لہجے میں کہا۔ ''تم بچ جاؤ گے۔''

''خدا کے لئے، بات سمجھنے کی کوشش کرو، میں اپنی بات نہیں کر رہا۔ میں سب کی بات کر رہا ہوں۔ میرا تم
سے کوئی خون کا رشتہ نہیں ہے۔ مذہب کا اور قوم کا بھی نہیں ہے۔ یہ صرف ہمدردی کا رشتہ ہے۔ میں تم سب کو
خودکشی کرتے نہیں دیکھ سکتا۔''

اس بار کمار کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ ''معاف کرنا، میرے منہ سے ذرا غلط نکل گیا مگر دوست، اب ہم نہیں رک
سکتے۔''

''اچھا، اتنا تو کر سکتے ہو کہ اس طرح منہ اٹھا کر دشمن کے سامنے جانے کے بجائے احتیاط سے جاؤ،
اچانک ان کے سر پر پہنچ جاؤ، تم ان سے انتقام لینے جا رہے ہو یا خود بھی مرنے جا رہے ہو؟''

اس مرتبہ بات کمار کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے اپنے آدمیوں کو تحکمانہ انداز میں کچھ کہا اور وہ رک گئے، ان
میں سے بعض نے خوں خوار نظروں سے مجھے دیکھا تھا۔ کمار ان سے بات کرنے لگا۔ شروع میں ان کے تاثرات
میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ مگر رفتہ رفتہ وہ نرم پڑنے لگے۔ کمار انہیں سمجھانے میں کامیاب ہو رہا تھا۔ اس بار سفر
کا آغاز کیا تو راستہ بدل لیا تھا اور انداز بھی محتاط تھا۔ وہ جھاڑیوں اور درختوں کی آڑ لے کر بستی کی طرف جا رہے
تھے۔ اب سارا منظر واضح تھا۔ وسیع و عریض رقبے میں پھیلی اس آبادی میں ہر طرف آگ لگی تھی۔ اس کے مکینوں
کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ وہ زندہ ہیں یا مارے جا چکے ہیں، زندہ ہیں تو آزاد ہیں یا قید میں ہیں۔
آگ پوری شدت سے بھڑک رہی تھی اور لگ رہا تھا کہ اسے لگائے دو تین گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں ہوا
ہے ورنہ یہ آگ اب بجھنے کی طرف مائل ہوتی۔ شدتِ جذبات سے چند افراد نے رونا پیٹنا شروع کیا تھا مگر کمار
نے ان کو سختی سے ڈانٹ کر چپ کرا دیا تھا۔ میں نے بستی کے جنوب کی سمت میں چند گاڑیاں دیکھیں۔ ان کی
تعداد درجن بھر تھی۔ اکثر درمیانے سائز کے ٹرک تھے۔ کمار اور دوسرے لوگوں نے بھی ان کو دیکھ لیا تھا اور اب
خوف زدہ اور چپ تھے۔

''یہ پیرا ملٹریز کی گاڑیاں ہیں۔'' میں نے کمار سے کہا۔ ''کیا بستی تک آنے کا کوئی ایسا راستہ ہے جس
سے یہ گاڑیاں آ سکیں۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''میں تم سے اسی راستے کے بارے میں کہہ رہا تھا۔ تم اس سے جنوب میں جا سکتے ہو۔''
گاڑیوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ کم سے کم ڈھائی تین سو مسلح فوجیوں نے بستی کو گھیرا ہوگا اور اس کے

بعد لوگوں کا قتل عام کیا یا ان کو بستی بدر کیا اور پھر اس میں آگ لگا دی۔ اس کا اندازہ قریب جا کر ہو سکتا تھا۔ کمار کے ساتھی فوجیوں پر حملہ کرنے کے لئے بے تاب ہو گئے تھے مگر کمار نے ان کو روک لیا تھا۔ اوّل تو کانوائے ایک کھلے میدان میں تھا وہاں تک رسائی حاصل کرنا دشوار تھی۔ دوسرے ان کے پاس کم تر ہتھیار تھے جبکہ دشمن کے پاس بھاری ہتھیاروں کی موجودگی لازمی تھی۔ اسی لمحے مجھے اور شاید دوسروں کو بھی عورتوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں آئی تھیں۔ کانوائے کے پاس ہی جنگل تھا اور یہ آوازیں وہاں سے آ رہی تھیں۔ ان آوازوں کو سن کر میرا خون رگوں میں ٹھوکریں مارنے لگا تھا۔ نہ جانے ان لوگوں کا کیا حال تھا جن کی یہ ناموس تھیں۔ اس سے پہلے وہ بے قابو ہوتے، میں نے کمار سے کہا۔ ''سنو...... یہ عورتیں نہ جانے کب سے درندگی کا شکار ہو رہی ہیں۔ ان کے ساتھ جو ہونا تھا، وہ ہو چکا ہے۔''

''تو ہم ان کو بھول جائیں۔'' وہ بھڑک گیا تھا۔

''نہیں۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''میں ایک غیرت مند خاندان کا فرد ہوں اور تم بھی مجھے غیرت مند نظر آتے ہو۔ ہمیں بدلہ لینا ہے اور اس کے لئے سب سے پہلے ہمیں ہتھیار چھیننا ہوں گے۔''

''کہاں سے؟'' اس نے سوال کیا۔

''ان ٹرکوں سے۔'' میں نے کانوائے کی طرف اشارہ کیا۔ ''میرا خیال ہے اکثر فوجی جنگل میں ہیں ٹرکوں کی حفاظت پر بس چند ایک آدمی ہوں گے۔''

''میں ان کو دانتوں سے ادھیڑ دوں گا۔'' کمار نے دانت پیسے۔

''اپنے آدمیوں کو پلان سمجھاؤ۔ ہمیں چند وردیاں حاصل کرنی ہیں۔ کم سے کم دو اور ان کا اسلحہ بھی تا کہ ہم ٹرکوں تک جا سکیں۔''

''وردیاں جنگل میں ملیں گی۔'' اس نے کہا۔

''رائٹ ہمیں وہیں جانا ہے اور ان کو ہوشیار کئے بغیر یہ کام کرنا ہے۔ جب ہم اسلحہ حاصل کر لیں گے تو اگلی کارروائی کریں گے۔''

کمار دوسروں کو سمجھانے لگا اور اسے خاصی دقت پیش آئی۔ کیونکہ قبائلیوں کا انداز فوری طور پر کچھ کر گزرنے والا تھا مگر بات بہرحال وہ سمجھ گئے۔ ان کو بدلہ لینا تھا، اپنی عورتوں کی بے حرمتی کا، اپنے لوگوں کے مارے جانے کا اور اپنی بستی کو نذر آتش کرنے کا۔ ہم بائیں طرف سے درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان سے ہوتے جنگل میں اس طرف بڑھے جہاں سے عورتوں کی فریادی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔

''ان لوگوں کے پاس خنجر یا چاقو ہیں۔'' میں نے کمار سے پوچھا۔

''ہمارا اصل ہتھیار یہی ہے۔'' کمار نے کہا۔

''ان سے کہو کہ خنجر استعمال کریں، فوجی اس وقت بے خبر ہوں گے۔ ان کو آسانی سے قابو کیا جا سکتا ہے۔ اپنے آدمیوں سے کہو ان کے گلے کاٹ دیں تا کہ آواز نہ نکل سکے۔''

آوازوں سے لگ رہا تھا کہ دسیوں عورتیں جبر کا شکار تھیں۔ بدمست مردانہ قہقہے بھی سنائی دے رہے تھے۔ ایک جگہ پہنچ کر کمار نے رکنے کا اشارہ کیا۔ اس نے اپنا خنجر نکالا اور تین آدمیوں کو اور اشارہ کیا۔ پھر مجھ سے

بولا۔ ''باقی لوگوں کو قابو میں رکھنا۔''

میں نے سر ہلایا۔ ''یہ بات ان لوگوں کو بھی بتا دو۔''

کماران کو سمجھا کر اپنے تین ساتھیوں کے ہمراہ جنگل میں داخل ہو گیا۔ ہم جھاڑیوں میں دبکے رہے۔ صبح کی سفیدی نمودار ہونے لگی تھی۔ میں اور دوسرے بے تابی سے کمار اور اس کے تین ساتھیوں کا انتظار کر رہے تھے اور اگر وہ ناکام ہوتے تو ہمیں بھی اپنی جانیں بچانے کی کوشش کرنی تھی۔ کوئی نصف گھنٹے کے صبر آزما انتظار کے بعد جھاڑیوں سے چند عورتیں اور ان کے عقب میں کمار اور اس کے ساتھی نمودار ہوئے۔ عورتیں زخمی اور نچی ہوئی تھیں۔ ان کے ساتھ وہ سب ہو چکا تھا جو مظلوم عورتوں کے ساتھ فاتحین کر سکتے ہیں۔

''چھ کی گردنیں اڑا دی ہیں۔'' کمار نے کسی قدر مسرور لہجے میں کہا۔

''ان کی لاشیں؟''

''وہ ہم نے ایسے چھپا دی ہیں کہ دن میں بھی نظر نہیں آئیں گی۔'' اس نے کہا۔

''وقت کم ہے جلدی وردیاں نکالو۔''

ہم نے چند منٹ میں وردیاں بدل لیں۔ کمار سمیت ہم چھ افراد تھے۔ اوپر جیکٹیں بھی تھیں اور جوتے بھی جن کے سائز مختلف تھے لیکن ہم نے کسی نہ کسی طرح چڑھا لئے۔ جیکٹوں سے یہ فائدہ ہوا کہ ان کے اٹھے ہوئے کالر میں سب کے لمبے بال چھپ گئے۔ فوجیوں کا اسلحہ بھی تھا۔ یہ بی ایس ایف کی کوئی کمپنی تھی۔ ہم عورتوں کو سامنے رکھ کر ٹرکوں کی طرف بڑھے، باقی قبائلیوں کو کمار نے سمجھا دیا تھا کہ جب فائرنگ ہو اور فوجی گاڑیوں کی طرف آئیں تو اس وقت فائرنگ نہ کی جائے جب تک فوجی درمیان میں نہ آ جائیں۔

حسبِ توقع ٹرکوں میں صرف ایک دو افراد تھے۔ وہ بھی عورتوں کو دیکھ کر نیچے اتر آئے۔ میں کیپٹن کی وردی میں تھا، میں نے اکھڑ لہجے میں سب کو گاڑیوں سے نیچے آنے کا حکم دیا۔ میرے دو بھائی فوج میں تھے فوجی لہجہ اور احکامات کے مخصوص الفاظ مجھے ازبر تھے۔ پندرہ افراد اتر کر میدان میں آئے اور کمار نے اپنے ساتھیوں سمیت ان پر فائر کھول دیا۔ میں پہلے ٹرک کی طرف بھاگا۔ یہ خالی تھا اور دوسرے میں مجھے ایک عدد ایل ایم جی اور اس کا ایمونیشن بکس نظر آیا۔ فائرنگ نے بھارتی فوجیوں کو چونکا دیا تھا اور وہ چند منٹ میں یہاں آنے والے تھے۔ میں نے چلا کر کہا۔ ''کمار دوسرے ٹرکوں میں دیکھو، ان میں بھی بھاری مشین گنیں ہوں گی۔''

اس پہلی فائرنگ کے بعد جنگل کی طرف سے فائرنگ اور فوجیوں کے چلانے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ جب تک میں نے ترپال ہٹا کر ایل ایم جی نکالی اور ٹرک کے کیبن کی چھت پر فٹ کر دی۔ جنگل سے فوجی نکل کر ٹرکوں کی طرف آنے لگے تھے۔ صبح کی روشنی نمودار ہو رہی تھی اور انہوں نے مجھے دیکھ لیا مگر وردی کی وجہ سے دھوکا کھا گئے۔ کمار اور اس کے ساتھی دوسرے ٹرکوں کی تلاشی لے رہے تھے۔ ایل ایم جی بس یہی ایک تھی مگر دوسرے ہتھیار موجود تھے۔ میں نے فوجیوں کے نزدیک آنے کا انتظار کیا۔ جنگل میں موجود کمار کے ساتھیوں نے قبل از وقت ہی فوجیوں پر حملہ کر دیا تھا اور ان میں سے شاید ہی کوئی زندہ بچا تھا کیونکہ جتنی تیزی سے ان کی طرف سے فائرنگ شروع ہوئی تھی۔ بھارتی فوجیوں کی کارروائی کے بعد اتنی ہی تیزی سے ختم بھی ہو گئی تھی۔

میں نے اندازہ لگایا کہ جنگل سے نکلنے والے فوجیوں کی تعداد سو کے قریب تھی۔ وہ نصف میدان تک آ

جاتے تو میں ان میں سے کسی کو واپس جانے نہیں دیتا مگر کمار کے کسی احمق اور جذباتی ساتھی نے بدترین حماقت کر دی جس کے بعد جیتی ہوئی بازی ہاتھ سے نکل گئی۔ اس نے فوجیوں پر فائرنگ کر دی تھی۔ آگے آنے والے دو گرے اور باقی پلٹ کر بھاگ اٹھے تھے۔ اب انتظار بے کار تھا میں نے ان سے آغاز کیا جو جنگل میں واپس گھسنے والے تھے، پہلے ہی برسٹ نے چھ سات کو مار گرایا۔ اس کے بعد والے فائرنگ کی زد میں آئے۔ وہ تربیت یافتہ فوجی تھے اس لئے بکھر کر آڑے ترچھے بھاگے۔ ایک منٹ میں وہ اپنے پیچھے تیس کے قریب لاشیں چھوڑ کر جنگل میں داخل ہو گئے اور دوسرے ہی لمحے ان کی طرف سے ٹرکوں پر فائرنگ کی جانے لگی۔ میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا ایم جی سمیت نیچے اترا۔ ایمونیشن بکس سمیت اس کا وزن کوئی بیس کلوگرام تھا۔

''یہ کیا حماقت تھی، کس نے فائر کیا تھا؟'' میں نے دہاڑ کر پوچھا۔

''اس نے۔'' کمار نے ایک نوجوان کی طرف اشارہ کیا۔

میرا غصے سے برا حال تھا، میں نے اسے نصف درجن گالیاں دیں اور کمار سے کہا۔ ''تم احمق! تم سرداری کے لائق ہو؟ تم سے چار آدمی قابو نہیں ہوتے۔''

''سوری دوست! میں کیا کروں۔'' وہ شرمندہ تھا۔

''اب یہاں سے نکلو۔ اپنے آدمیوں اور ان مظلوم عورتوں پر فاتحہ پڑھ لو۔ وہ سب سے پہلے ان کو ختم کریں گے۔''

''ہم ان کو بچا نہیں سکتے۔'' کمار پریشان ہو گیا تھا۔

''بھجوا اپنے ان سور ماؤں کو۔'' میں نے طنز کیا۔

اس اثنا میں جنگل کی طرف سے عورتوں کا شور سنائی دیا۔ میں نے ٹرک کی آڑ سے جھانک کر دیکھا۔ بدحال عورتیں اور لڑکیاں گرتی پڑتی چلی آ رہی تھیں اور ان کے عقب میں بھارتی فوجی تھے، وہ ان کی آڑ میں ہماری طرف آ رہے تھے۔ تاکہ ہم ان پر گولی نہ چلا سکیں، میں نے کمار سے کہا۔

''اپنے آدمیوں سے کہو، خنجر مار کر ٹرکوں اور جیپوں سے پیٹرول ٹینک پھاڑ دیں۔ ہری اَپ!''

''وہ کیوں؟'' اس نے الجھی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''سوال مت کرو وقت نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں اُن ٹوٹی ہوئی دیواروں تک جا رہا ہوں۔ تم یہ کام کر کے اپنے اسلحے کے ساتھ وہاں آ جاؤ۔''

کمار حرکت میں آ گیا۔ میں نے تھکن کے باوجود ایل ایم جی سمیت دوڑ لگائی اور ان کھنڈر تک پہنچ کر دم لیا تھا۔ یہ بستی کا کوئی متروک مکان تھا جس کی چھتیں بھی گر چکی تھیں، صرف تین دیواریں سلامت تھیں۔ میں نے ایک مناسب جگہ ایل ایم جی کا ٹرائی پوڈ رکھا۔ کمار اور اس کے ساتھی بھی دوڑے چلے آ رہے تھے۔ بھارتی فوجی عورتوں کو ڈرانے اور بھگانے کے لئے ہوائی فائرنگ کر رہے تھے اور بعض عورتوں پر ہی فائرنگ کر رہے تھے۔ میں نے چند عورتوں کو گولیاں کھا کر گرتے دیکھا۔ میں نے ایسے ہی ایک بدذات کا سر اڑا دیا، اگرچہ رسکی کام تھا درمیان میں کوئی بے گناہ عورت بھی آ سکتی تھی۔ میں نے رائفل استعمال کی تھی ایل ایم جی کی فائر پاور بے پناہ ہوتی ہے ایک بار انگلی رکھ کر ہٹا لینے میں بھی پندرہ بیس گولیوں کا برسٹ چل جاتا ہے۔

کمار نے ہانپتے ہوئے میرے برابر میں لیٹ کر کہا۔ ''ہم نے کام کر دیا ہے، اب کیا کرنا ہے؟''

''یہ کرنا ہے۔'' میں نے ایم جی کا رخ گاڑیوں کی طرف کر کے ایک برسٹ مارا۔ حسبِ توقع بہتے ایندھن نے آگ پکڑ لی تھی۔ شعلے بلند ہوئے، جب یہ ایندھن کی ٹنکیوں تک پہنچے تو دھماکے شروع ہو گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورا کانوائے شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا تھا، اس میں رکھے دستی بم اور راکٹ بھی پھٹ رہے تھے۔ عورتوں کو ہنکانے والے بھارتی فوجی اب پلٹ کر بھاگ رہے تھے۔ البتہ عورتوں نے اس طرف بھاگنا جاری رکھا۔ میں نے دیکھا، ان کی تعداد تیس سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ بھارتی فوجیوں کے ہاتھ زیادہ عورتیں نہیں آئی تھیں۔ شاید پچاس ہو گی ان کی تعداد۔ کچھ عورتیں یقیناً ماری جا چکی تھیں۔ تین تو میرے سامنے بھارتی فوج کی گولیوں کا نشانہ بنی تھیں۔ جب ان کو احساس ہوا کہ عورتیں ان کے ہاتھ سے نکل رہی ہیں تو انہوں نے پلٹ کر ان پر فائرنگ شروع کر دی۔ کمار اور اس کے ساتھی عورتوں کے تحفظ کے لئے بھاگے۔ میں نے ایک سمت میں چند فوجیوں کو دیکھا۔ وہ راکٹ لانچر تیار کر رہے تھے اور ان کو چند سیکنڈ اور مل جاتے تو وہ راکٹ مار کر ہمیں اس کھنڈر سمیت اڑا دیتے، میں نے مشین گن کا رخ ان کی طرف کر کے ٹریگر دبا دیا۔ وہ سب لمحوں میں چھلنی ہو گئے تھے، ایک گولی راکٹ پر لگی اور رہی سہی کسر پوری ہو گئی۔ دھماکے نے ان سب کے چیتھڑے اڑا دیئے تھے۔ اس کے بعد بھارتی فوجیوں کا حوصلہ جواب دے گیا اور وہ پلٹ کر جنگل میں گھس گئے۔

روتی دھوتی، چیخیں مارتی اور اپنی بربادی پر آنسو بہاتی عورتیں کھنڈر میں آ گئی تھیں۔ کچھ درمیان میں رہ گئی تھیں۔ ان کو کمار اور اس کے ساتھی لا رہے تھے۔ وہ زخمی اور بے ہوش ہو گئی تھیں۔ زخمی عورتوں کو گولیاں لگی تھیں، ایک کی کمر میں دو گولیاں جبکہ دوسری کے پاؤں میں ایک گولی لگی تھی۔ وہ معمولی زخمی تھی۔ مگر ان سے بڑا مسئلہ وہ عورتیں تھیں، جو بچ گئی تھیں۔ وہ اب ہسٹریا کا شکار تھیں۔ ان کی چیخیں اور واویلا میرے اعصاب کو متاثر کر رہا تھا۔ میں نے کمار سے کہا۔ ''خدا کے لئے ان کو چپ کراؤ۔ ورنہ میں بھی جنگل میں بھاگ جاؤں گا۔''

کمار نے بے بسی سے مجھے دیکھا۔ ''میں ایسا نہیں کر سکتا۔''

''او بھائی، تم سردار کس بات کے ہو؟''

وہ بھنا گیا تھا۔ ''میں سردار ہوں، ہر بات کا ذمے دار نہیں۔''

''مہربانی ہے تمہاری کہ اتنی ذمے داری لیتے ہو۔'' میں نے سرد آہ بھری۔ ''ورنہ ہمارے ملک کے سردار تو صرف سردار ہیں کسی بھی قسم کے ذمے دار نہیں ہیں۔''

بہرحال کسی نہ کسی طرح کمار نے ان عورتوں کو چپ کرا دیا اور ان سے بستی پر گزرنے والے حالات جاننے لگا۔ اس دوران میں، مَیں نے اس کے ساتھیوں کو دائیں بائیں درختوں کے پیچھے پوزیشنیں سنبھالنے کا حکم دیا۔ بھارتی فوجیوں کی تعداد خاصی تھی اور ٹرک تباہ ہونے کے باوجود ان کے پاس اچھا خاصا اسلحہ تھا۔ وہ ذرا سی ہمت سے کام لیتے تو بہ آسانی ہمیں گھیر سکتے تھے مگر ان میں حوصلہ ہی تو نہیں تھا ورنہ کمزوروں پر یہ ظلم کیوں کرتے۔ میں نے افسوس سے ان عورتوں کو دیکھا جو اپنی متاعِ عزت گنوا چکی تھیں، ان میں سے بیشتر کے لباس پھٹ گئے تھے۔ وہ اپنی برہنگی چھپانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ ان سے بات کرتے ہوئے کمار کے چہرے پر کسی قدر اطمینان نظر آنے لگا تھا یعنی کوئی اچھی خبر تھی اس کی تصدیق بھی ہو گئی، اس نے مجھے

بتایا۔

"ان عورتوں کا کہنا ہے کہ جب فوج کی آمد کے آثار نظر آئے تو ان کے گھر والوں نے ان کو جنگل میں چھپا دیا۔ فوج نے آتے ہی بے تحاشا فائرنگ شروع کر دی تھی پھر لاؤڈ اسپیکر پر بستی والوں کو حکم دیا کہ ایک گھنٹے کے اندر بستی سے نکل جائیں اس کے بعد جو بستی میں ہوا اسے گولی مار دی جائے گی۔ بستی کے لوگ افراتفری میں نکل بھاگے۔ فوجیوں نے اندر گھس کر پیچھے رہ جانے والوں کو قتل کیا اور بستی کو آگ لگا دی۔"

"یہ عورتیں کیسے ان کے ہاتھ آئیں؟"

"ان کی تعداد ساٹھ تھی۔ بدقسمتی سے چند فوجی جنگل کی طرف آئے۔ انہوں نے عورتوں کو دیکھ لیا۔ سب کو بلا لیا اور اس کے بعد......" کمار کا لہجہ دھیما ہو گیا۔

"فکر مت کرو۔ ہم نے ان کو صحیح ضرب لگائی ہے۔ میرا خیال ہے ان میں سے نصف تو مارے جا چکے ہیں۔"

"آدھے ابھی باقی ہیں۔" وہ تلخی سے بولا۔

"وہ ہمارے لئے خطرہ ہیں، ان کی تعداد اتنی ضرور ہے کہ وہ ہمیں گھیر سکتے ہیں۔ کاش تمہارا آدمی فائر کرنے میں جلدی نہ کرتا تو ان میں سے کوئی بچ کر نہ جاتا۔"

"اب کیا کر سکتے ہیں؟" وہ پھر شرمندہ ہو گیا۔

"یہاں سے نکلو۔ اس سے پہلے کہ وہ ہمیں گھیر لیں۔ بستی والے کس طرف گئے ہیں؟"

"عورتوں نے بتایا ہے نصف سے زیادہ لوگ پہلے اوپری بستی کی طرف جا چکے تھے، باقی بھی اس طرف گئے ہوں گے۔"

ان عورتوں کے گھر والے؟" میں نے پوچھا۔ "کیا وہ ان کو ایسے ہی چھوڑ کر چلے گئے؟"

"شاید یا وہ منتظر ہوں کہ فوجی جائیں تو اپنی عورتوں کو لے جائیں۔"

"وہ اپنے اس فیصلے پر ساری عمر پچھتائیں گے۔" میں نے عورتوں کو گنتے ہوئے کہا۔ "یہ تو کل چھتیں عورتیں ہیں، باقی چوبیس کہاں گئیں؟"

"ان میں سے بارہ تیرہ کی لاشیں میدان میں بکھری ہیں اور باقی جنگل میں فوجیوں کے ہاتھوں ماری گئیں۔ انہوں نے آبرو گنوانے سے انکار کر دیا تھا۔"

"کس طرف ہے دوسری بستی؟"

اس نے شمال کی طرف اشارہ کیا۔ "بستی کے اس پار۔"

"چلو، سب وہیں ہوں گے، مدھو موہن کا مندر کس طرف ہے؟"

"وہ بھی اُسی طرف ہے۔"

"بس تو چلو دیر مت کرو۔ اپنے آدمیوں کو بلا لو۔ ان میں سے ایک ایمونیشن بکس اٹھا لے۔ عورتوں سے کہو زخمی اور بے ہوش عورتوں کو اٹھائیں۔"

کمار نے ہنگامی روانگی کے احکامات جاری کئے۔ روشنی پھیل چکی تھی اور اب ہم چھپ بھی نہیں سکتے تھے۔

چند منٹ کے اندر ہم اس کھنڈر سے روانہ ہو چکے تھے۔ بیتو ہمارے ساتھ تھا اس نے مستعدی سے ایمونیشن بکس اپنی کمر پر اٹھالیا تھا۔ مرد پہرا دیتے ہوئے ساتھ چل رہے تھے جبکہ عورتوں نے بے ہوش اور زخمی عورتوں کو اٹھا رکھا تھا۔ وہ اس طرح کہ چھ عورتوں نے ایک عورت کو اٹھا رکھا تھا۔ ویسے ان کو عورتیں کہنا مناسب نہیں تھا۔ وہ سب چودہ سے بیس برس کے درمیان کی تھیں، ان میں سے چند ایک ہی پچیس سے اوپر کی تھیں اور دو عمر رسیدہ لگتی تھیں۔ سختی حالات کی وجہ سے یہاں عورت شاید تیس برس کے بعد بوڑھی شمار ہوتی ہوں گی۔

جلتی بستی کے شعلے اب بجھ رہے تھے اور دن کی روشنی میں دھواں واضح ہونے لگا تھا۔ بستی پر کامیابی سے شب خون مارنے والوں نے اپنی ایک غلطی سے اس کامیابی کو غارت کر دیا تھا اور ان میں سے کم سے کم نصف موت کے گھاٹ اتر چکے تھے۔ انہوں نے بستی والوں کو ہانک کر بستی کو آگ لگانے کو مشن کی تکمیل سمجھا۔ نہ جانے دوسرے دستوں نے ان کو کیوں ان قبائلیوں کے بارے میں نہیں بتایا تھا جو مسلح تھے اور بستی کی طرف آ رہے تھے۔ ممکن ہے کہ بتایا ہو مگر طاقت کے نشے میں چور بدمست رنگ رلیاں مناتے ہوئے انہوں نے اس خبر کو کوئی اہمیت نہ دی ہو اور اس کا خمیازہ بھگتا تھا۔ ہم ذرا آگے بڑھے تو زیادہ پیچیدہ پہاڑی سلسلہ سامنے آ گیا تھا۔ کمار نے بلندی کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہ تیسرے پہاڑی سلسلے کے پیچھے دوسری بستی ہے۔“

دوسری اور تیسری پہاڑی دیوار مکمل طور پر برف سے ڈھکی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”مدھوموہن کا مندر کہاں ہے؟“

”اس پہلی دیوار کے عقب میں۔“

”اور یہ مدھوموہن صاحب تھے کون؟“

”اس علاقے کا ایک راجا تھا، انگریزوں کے دور سے پہلے کا۔ اپنی راجدھانی کے لئے لڑتے ہوئے مارا گیا تھا۔ تب عوام نے اس کے نام کا مندر بنا دیا تھا۔“

”پھر مندر کے ساتھ کیا ہوا؟“

”یہاں پاپ کے کام ہونے لگے تھے، ایک دن زلزلہ آیا اور مندر آن واحد میں ڈھیر ہو گیا۔ جو اندر تھے وہ سب مارے گئے۔ صرف دو دیوداسیاں بچی تھیں جو نزدوش تھیں۔“

”دیوداسیاں، ان کا کیا ہوا؟“

”پتا نہیں، کہیں چلی گئی ہوں گی۔“ کمار نے کہا۔ ”میں نے کہانی اتنی ہی سنی ہے اور امکان ہے کل اتنی ہی کہانی ہے۔“

”جب مندر ملبے کا ڈھیر بن گیا ہے تو وہاں پناہ کیسے لی جائے گی۔“

”تم دیکھنا، لے جانے والے اینٹیں لے گئے ہیں دیواریں کھڑی ہیں، جن پر کسی نے لکڑی کی چھت ڈال دی تھی۔ وہ اب چرواہوں کی پناہ گاہ ہے۔“

پہلی دیوار عبور کرنے میں ہمیں ایک گھنٹا لگا تھا لیکن مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں نے ہمالیہ سر کر لیا ہو۔ بھوک اور تھکن سے میرا برا حال تھا۔ میں چاہتا تھا کہ مجھے کھانے کو کچھ مل جائے اور میں پڑ کر چند گھنٹے کے لئے سو جاؤں۔ اگرچہ مجھے معلوم تھا، میری یہ خواہش شاید ہی پوری ہو۔ ابھی بھارتی فوج اس علاقے میں موجود تھی اور

امکان یہ تھا کہ ہمارے تعاقب میں بھی ہو۔ مندر پناہ گاہ بنا ہوا تھا۔ اس کے اندر ہزاروں افراد بھرے تھے۔ جا بجا الاؤ جل رہے تھے۔ مندر کے صحن میں بھی بے شمار افراد تھے اور یہ سارے مرد تھے۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جو مرکز سے اس طرف آئے تھے۔

ایک بات مشترک تھی کہ ریاستی دہشت گردی کے خلاف سب مشتعل تھے اور انتقام کی قسمیں کھا رہے تھے۔ کمار کو دیکھتے ہی انہوں نے اسے گھیر لیا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر اسے اپنی بپتا سنا رہے تھے۔ راستے میں ہمیں کوئی پہرے دار نہیں ملا تھا۔ اس کا مطلب تھا، وہ اپنی حفاظت کے خیال سے بے خبر تھے۔ تھکن کے باوجود میں نے تلاش کر کے بیتو سے کہا۔ ''سنو، اگر تم میں کچھ ہمت ہے تو دس پندرہ مسلح ساتھی لو اور کسی بلند جگہ سے چاروں طرف کی نگرانی کرو۔ ممکن ہے بھارتی فوجی اس طرف آ رہے ہوں۔ تم جانتے ہو کہ وہ یہاں تک آ گئے تو کیا کریں گے؟''

''جی صاحب!'' اس نے مستعدی سے کہا۔

''بس تو بندے لو اور روانہ ہو جاؤ۔ اگر کوئی بات نہ مانے تو اسے کمار کا حوالہ دینا، یہ اس کا حکم ہے، تم لوگوں کو پوری طرح مسلح ہونا چاہئے لیکن کوئی اس طرف آتا دکھائی دے تو ازخود کارروائی نہیں کرنی ہے، ہمیں اطلاع دینی ہوگی۔''

''میں سمجھ گیا صاحب۔''

بیتو کے جانے کے بعد میں ایک طرف دو ستونوں کے درمیان بیٹھ گیا۔ کتنی ہی دیر بعد مجھے سکون سے بیٹھنا نصیب ہوا تھا۔ اس لئے بیٹھتے ہی میں سو گیا تھا۔ اردگرد بے شمار بچے تھے اور اتفاق سے نزدیک ہی ایک کمرا ان عورتوں کے لئے تھا جو اپنا کچھ نہ کچھ گنوا کے آئی تھیں۔ گھر، شوہر، ماں، باپ، بہن بھائی، اولاد یا آبرو اور اب اسے رو رہی تھیں، اس لئے بے پناہ شور تھا۔ اس کے باوجود میں سو گیا۔ جب میری آنکھ کھلی تو شام ہو رہی تھی۔ کسی نے مجھے جگایا نہیں تھا اور حیران کن بات تھی کہ کمار کو میری یاد نہیں آئی تھی۔ شاید اس لئے کہ کوئی نیا بحران نہیں آیا تھا۔ البتہ بھوک سے میں فوت ہونے کے قریب تھا اس لئے میں نے خود کمار کو تلاش کیا۔ وہ مجھے مندر کے اندر ملا اور مشیروں میں گھرا تھا۔

''شہباز!'' اس نے گرم جوشی سے کہا۔ ''کہاں تھے؟''

''یہیں تھا لیکن چند منٹ تک کھانے کو نہ ملا تو نہیں رہوں گا، کیا سمجھے؟''

''میں سمجھ گیا۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔ ''یہ بتاؤ، ابلے ہوئے انڈے، مکھن اور باجرے کی روٹی چلے گی؟''

''دوڑے گی، بشرطیکہ اس کے بعد مجھے ایک مگ چائے مل جائے۔ سیاہ، گرم اور ہلکی سی میٹھی؟''

بیس منٹ بعد میں آسودہ سا بیٹھا تھا۔ چائے کا دوسرا مگ لے کر میں نے کمار کی طرف دیکھا۔ جس نے اپنے مشیروں کو دفع ہو جانے کو کہا۔ ''میرے خدا! یہ میرا دماغ کھا گئے ہیں، اپنی تجویزوں سے۔''

''مثلاً کیسی تجویزیں؟''

''ان کا کہنا ہے ہمیں مقابلہ کرنا چاہئے۔''

''اور جب مقابلے کا وقت تھا تو بستی چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔'' میں نے سر ہلایا۔

”میں نے بھی یہی کہا۔“

”اور ابھی بھی موقع آیا تو یہ فرار ہونے والوں میں آگے ہوں گے۔“

”میں پریشان ہوں، اب کیا کروں؟ سرکار کا رویہ تم نے دیکھ لیا۔ انہوں نے ہمیں دیوار سے لگا دیا ہے۔ ہمارے پاس فوج سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔“

”یہ دونوں نتائج درست ہیں۔“

”میں پریشان ہوں کیونکہ کوئی حل سمجھ میں نہیں آ رہا۔“

”تم نے جن دو آمیوں کو میڈیا والوں سے رابطہ کرنے بھیجا تھا، ان کا کچھ اتا پتا؟“

”نہیں، ان میں سے کوئی آیا اور نہ ہی کوئی خبر ہے۔“

”ممکن ہے انہوں نے کسی سے رابطہ کیا ہو۔“ میں نے پُر امید لہجے میں کہا۔

”بھگوان کرے۔“ کمار نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”میں اپنے لوگوں کو راضی کر رہا ہوں کہ ہمیں اپنی آبائی وادی کا رخ کرنا چاہئے۔“

”وہ جگہ محفوظ ہے؟“

”وہ جگہ ایک قلعہ ہے۔“ اس نے فخر سے کہا۔

”آج کل جدید ترین ہتھیاروں کے سامنے قلعوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔“

”ہاں، مگر وہ جگہ بہت محفوظ ہے۔ بس ایک پل ہے، اسے تباہ کر دیا جائے تو وادی میں آمد و رفت رک جاتی ہے۔ ایک سو آدمی پوری فوج کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔“

”وادی میں دوسرے لوگ آباد ہیں، کیا وہ تمہاری آمد پسند کریں گے؟“

”ان میں اور ہم میں خون کا رشتہ ہے اور مشکل وقت میں ہم ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔ ان کی خوراک کی ساری ضروریات ہم پوری کرتے ہیں، اپنے برے وقتوں کے لئے ہم وہیں اناج جمع کرتے ہیں، تم کہہ سکتے ہو کہ وہ جگہ ہمارا گودام بھی ہے۔“

”باقی لوگ جو اوپر کی بستی میں گئے، ان کا کیا کرنا ہے؟“

”ان کو ان کی جگہ رہنے دو۔“

”میں اس کے برعکس مشورہ دوں گا۔ درجنوں فوجیوں کی ہلاکت ایسی بات نہیں ہے جسے حکام نظر انداز کر دیں۔ وہ پھر آئیں گے، بھرپور طاقت اور انتقام کے جذبے سے سرشار ہو کر آئیں گے اور تم سوچ سکتے ہو کہ وہ تمہارے لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ بہتر ہے سب کو لے کر وادی کی طرف چلے جاؤ اور موسم سرما وہاں پر گزارو۔ اس وقت تک یہاں معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا۔“

”دس ہزار افراد!“ وہ پریشان ہو گیا۔ ”وہاں اتنے لوگ کیسے آئیں گے، نہ خوراک ہے اور نہ جگہ؟“

”تم لوگ گوشت کھاتے ہو؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”ہاں، ہم گوشت کھاتے ہیں۔“

”تب اپنے مویشی بھی لے چلو۔ ان کو کاٹ کر اسٹور کر لو اور سرما میں ان سے گزارہ کرو۔“

''سارے جانور!'' وہ اور پریشان ہوگیا تھا۔''یہ تو ہماری معاش ہیں۔''

''او بھائی، جان گنوانے سے بہتر ہے بندہ بے روزگار ہو جائے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو مگر یہ بات ان لوگوں کی سمجھ میں مشکل سے آئے گی۔''

''ان کو بتانے کی کیا ضرورت ہے۔ سب کو لے جاؤ مع ان کے جانوروں اور خوراک کے ذخیروں کے۔ جب وادی میں کھانے کو کچھ نہیں ہوگا تو خود جانور کاٹ کر کھائیں گے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔''

''ابھی وقت ہے، سکیورٹی فورس کے آنے میں وقت ہے۔ تم سب کتنے دن میں وادی تک جا سکتے ہو؟''

''اس سارے لاؤ لشکر کے ساتھ دو دن لگیں گے۔''

''سب کو ساتھ جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو سواریوں پر پہلے روانہ کر دو۔ جانور اور خوراک لے کر مرد پیچھے آئیں۔''

''اور مسلح افراد سب سے پیچھے رہ کر تعاقب میں آنے والوں کو روکیں۔'' اس نے میرا پلان مکمل کیا۔

''آنے والے موسم بہار تک زندہ رہنا چاہتے ہو تو یہی کرنا ہوگا۔''

اس جگہ کمارا کیلیے سارے فیصلے کرنے کا مجاز نہیں تھا، خاص طور سے جب فیصلہ پورے قبیلے کے بارے میں ہو۔ اس نے مشیروں کو طلب کر لیا اور میں باہر نکل آیا۔ سورج غروب ہونے کے قریب تھا، میں بیتو کو تلاش کرنے لگا۔ اچانک مجھے ایل ایم جی کا خیال آیا اور میں بھاگم بھاگ وہاں پہنچا تو بچے اس سے چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے اور ایک برخوردار اس کا ٹریگر دبا رہے تھے۔ شکر ہے میں نے گولیوں والا پٹا الگ کر دیا تھا۔ میں نے ڈانٹ کر ان کو بھگایا اور ایل ایم جی لے کر کمار کے پاس رکھ دی، واپس آ کر میں نے ایک بار پھر بیتو کو تلاش کیا۔ وہ مجھے مندر کے باہر ملا۔

''بیتو! کوئی سرکاری بندہ تو نظر نہیں آیا؟''

''نہیں صاحب!'' اس نے کہا۔ وہ اس وقت بھی مستعد نظر آ رہا تھا۔'' میں نے دو دو آدمیوں کی دس ٹولیاں آگے بھیج دی ہیں۔ وہ نظر رکھیں گے۔ جیسے ہی کوئی اس طرف آتا نظر آیا، مجھے اطلاع مل جائے گی۔''

''اطلاع مل جائے گی، وہ کیسے؟ جادو ہے تمہارے پاس؟''

''نہیں صاحب...... یہ دیکھو۔'' اس نے مجھے ایک چھوٹی سی بانس کی نلکی دکھائی۔ اس نے منہ میں رکھ کر پھونک ماری تو بہت تیز گونجتی آواز نکلی تھی۔ اس نے رک کر دوبارہ سیٹی بجائی۔ جیسے ہی اس کی گونج ختم ہوئی مجھے ویسی ہی سیٹی دو بار سنائی دی۔

''اس کی آواز دور تک جاتی ہے۔ وہاں میرے جو ساتھی سنیں گے وہ اسی طرح سیٹی بجا کر آگے والوں سے خیریت کا پوچھیں گے۔''

''وہ کس طرح؟'' میں نے دلچسپی سے کہا۔''میرا مطلب ہے سیٹی سے سوال کیسے کرتے ہو؟''

''دو بار آواز کا مطلب ہے کہ سب ٹھیک ہے نا؟''

''جواب کس طرح آتا ہے؟''

"اگر ایک بار سیٹی بجے تو مطلب ہے خیریت اور دو بار کا مطلب ہے خیریت نہیں ہے۔"

"اگر خطرہ فوری نوعیت کا ہو تو؟"

"تو ایک لمبی سی سیٹی بجائی جاتی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے خطرہ ہے۔"

"یہ سیٹی درجہ بہ درجہ ہوتی آخری آدمی تک جائے گی اور وہ جو جواب دے گا وہ اس طرح ہمیں سنائی دے گا۔" بیتو نے بتایا، چند لمحے بعد اس کا ثبوت بھی مل گیا جب ایک ہی سیٹی سنائی دی۔

"یعنی سب خیریت ہے۔" میں نے غور کیا۔

"جی صاحب!" اس نے سر ہلایا۔

"تم اچھے لڑکے ہو۔" میں نے اس کی تعریف کی۔ "اس طرح اپنا فرض انجام دیتے رہو۔"

"شکریہ صاحب!" وہ خوش ہو گیا تھا۔

میں واپس آیا تو کمار کابینہ کے اجلاس سے فارغ ہو چکا تھا۔ اس نے مجھے مطلع کیا۔ "طے ہوا ہے کل صبح سویرے سب کی روانگی ہے۔"

"سب کی، ایک ساتھ۔"

"ہاں ...... لیکن عورتیں، بچے اور بوڑھے آگے ہوں گے۔ تمام جانور رات کو جمع کر لئے جائیں گے اور درمیانی بستی والوں کی طرف میں نے آدمی روانہ کر دیئے ہیں۔"

"اور جو بے چارے جنگل میں بھٹک رہے ہیں؟"

"ان کو بھی تلاش کیا جا رہا ہے۔"

میں نے اپنے لباس پر بھارتی فوج کی جو وردی پہن لی تھی اسے میں نے بعد میں اتار دیا تھا مگر میری جیکٹ جنگل میں رہ گئی تھی اس لئے مجبوراً فوجی جیکٹ پہننا پڑ رہی تھی حالانکہ یہ میری جیکٹ سے کہیں بہتر اور گرم تھی مگر نہ جانے کیوں مجھے اس سے چڑ ہو رہی تھی شاید میری پاکستانیت کو یہ جیکٹ چبھ رہی تھی۔ میرے پاس بھارتی فوج کی جی تھری رائفل تھی۔ اس کے چار عدد میگزین جیکٹ کی جیبوں میں، مَیں نے رکھ لئے تھے۔ سب سے اہم چیز دو عدد دستی بم تھے جو اوپری جیب میں محفوظ تھے۔ رات کا کھانا میں نے کمار کے ساتھ کھایا، اس میں گوشت بھی تھا مگر ظاہر ہے وہ جھٹکا کرتے تھے۔ میں نے اس سے پرہیز کیا۔ صرف مکئی کی روٹی، مکھن اور پنیر لیا تھا۔ "تم گوشت کیوں نہیں کھا رہے؟"

"بس ایسے ہی دل نہیں چاہ رہا۔" میں نے بہانہ کیا۔

"چھپا رہے ہو۔" وہ مسکرایا۔ "میں نے سنا ہے تم مسلمان خاص طریقے سے جانور مار کر اس کا گوشت کھاتے ہو، اور کسی جانور کا گوشت نہیں کھاتے۔"

"یہی بات ہے۔" میں نے اعتراف کیا۔ "ہم اسے ذبح کرنا کہتے ہیں، جانور کے گلے کی تینوں نسیں کاٹ دیتے ہیں اور وہ خون بہنے سے مر جاتا ہے۔"

"ہم ایک جھٹکے سے اس کی گردن اڑا دیتے ہیں۔"

''اس سے خون جسم کے اندر رہ جاتا ہے اور وہ گوشت بھی خراب کر دیتا ہے۔''

''ممکن ہے۔'' کمار بولا۔ ''آج رات تم آرام کرلو۔''

''کمار!'' میں نے کپڑے سے ہاتھ صاف کئے۔ ''میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ میرا خیال ہے اب تمہیں کوئی بھی فوری خطرہ نہیں ہے اس لئے مجھے اجازت دو۔''

''تم میرے ساتھ نہیں رہ سکتے؟'' اس نے ہچکچا کر کہا۔

''یہ ممکن نہیں ہے۔ میں تمہارے ساتھ جتنا آگے جاؤں گا، میری واپسی اتنی ہی مشکل ہوتی جائے گی۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس لئے بہتر ہے مجھے جانے کی اجازت دو۔''

''دل تو نہیں چاہ رہا ہے مگر میں زبردستی تمہیں روکنا بھی نہیں چاہتا۔'' کمار نے سرد آہ بھری۔ ''تم نے ذرا سی دیر میں مجھے اپنا گرویدہ کرلیا ہے۔ میرے ساتھی بھی تمہارا احترام کرنے لگے ہیں۔''

''حالانکہ وہ ابھی بھی مجھے کینہ توز نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔''

''ان میں سے کچھ ہی ہیں جو خوش نہیں ہیں کہ میں تمہاری تجاویز پر کیوں عمل کر رہا ہوں۔''

''کمار مجھے نہ صلے کی تمنا ہے اور نہ ہی کسی کی تنقید کی پروا ہے۔ میں حالات کے دھارے پر بہتا سیلانی آدمی ہوں جو تمہارے پاس آ گیا۔ میں نے جو کیا اسے ایک طرح سے میری مجبوری بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ مجھے اپنی جان بچانی تھی، اس لئے میں نے تمہاری جان بھی بچائی اور جو ممکن ہو سکا کیا۔''

''کیا سکیورٹی والے تمہارے بھی پیچھے ہیں؟''

''کنور میرے بھی پیچھے ہے لیکن اس کی وجوہات دوسری ہیں۔ ان کو ایک خاص مرض کے علاج کے لئے میرا خون درکار ہے۔''

''بڑے کنور کے مرض کے علاج کے لئے۔'' اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

''تم جانتے ہو؟'' میں چونکا۔

اس کے بارے میں تو بچہ بچہ جانتا ہے۔ اسے سانپ نے ڈس لیا تھا، نہ جانے سانپ کا کیا حال ہوا ہو۔'' کمار نے نفرت سے کہا۔ ''یہ کہا جائے تو درست ہوگا کہ سانپ کو سانپ نے ڈس لیا اور وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔''

''یہ تم نے درست کہا۔ مگر راج کنور کو بھی کم مت سمجھو۔''

''درست کہا تم نے۔ وہ اپنے بھائی کا بھی باپ ہے حرامی پن میں۔ مجھے یقین ہے قبائل کے خلاف سازش اس نے کی ہے۔ وہ جنگلوں پر قبضے کے لئے بے تاب ہے۔''

''ان جنگلوں میں کوئی اور شے بھی پائی جاتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''جنگل کٹائی کا ٹھیکہ تو وہ سرکار سے بھی لے سکتا ہے اس کے لئے اتنی بڑی سازش کرنے کی کیا ضرورت ہے۔''

''ان پہاڑوں سے قیمتی پتھر نکلتے ہیں۔''

''ہیرے!'' میں نے سوال کیا۔

''نہیں، ہیرے ہوتے تو اس پر سرکار کا پہرا ہوتا۔ دوسرے درجے کے قیمتی پتھر ہیں۔ جو ویسے ہی پڑے

مل جاتے ہیں۔'' اس نے بتایا۔'' چرواہے شہر سے آنے والے بیوپاریوں کو بیچ دیتے ہیں۔ اچھے پتھر کے بیس تیس روپے مل جاتے ہیں۔''

''بیس تیس روپے!'' میں نے حیرت سے کہا۔'' دوسرے درجے کے اچھے پتھروں کی قیمت بھی ہزاروں میں ہوتی ہے۔''

''تم جانتے ہو پیدا کرنے والے کو سب سے کم ملتا ہے۔ ہمارے جانوروں کے خریدار وہ ہیں جو مال دبئی بھیجتے ہیں۔ میں جانتا ہوں، وہ ہمیں اس قیمت کا دسواں حصہ دیتے ہیں جو اُن کو دبئی سے ملتی ہے۔''

''مقامی مارکیٹ میں صورت حال اور بری ہوگی؟''

اس نے سر ہلایا۔''تبھی میرے آدمی دبئی والوں کو ترجیح دیتے ہیں۔''

''تب ممکن ہے کہ ان پہاڑوں میں اوّل درجے کے جواہر موجود ہوں۔ تبھی کنور خاندان تم لوگوں کو یہاں سے نکال کر ان پر قبضے کے لئے بے تاب ہے۔''

''ہوسکتا ہے۔ وہ اپنی کوشش میں اس حد تک ضرور کامیاب ہو گئے ہیں کہ انہوں نے ہمیں اس علاقے سے نکال دیا ہے۔ ہم وہاں جانے پر مجبور ہو گئے ہیں، جہاں سے آئے تھے۔''

''کمار تمہاری کامیابی کی ایک ہی صورت ہے تم کسی طرح سرکار سے تصادم سے بچ جاؤ۔''

''بہت مشکل ہے۔ تم نے دیکھا، سرکار خود تصادم پر تلی ہوئی ہے۔''

''ہاں مگر سرکار پر دباؤ ڈالنے کے بھی طریقے ہیں۔ یہ بتاؤ تم لوگ انتخابات میں ووٹ ڈالتے ہو۔''

اس نے سر ہلایا۔'' عام طور سے رائے بہادر لبیر سنگھ ٹھاکر اس علاقے سے ایم این اے بنتا ہے۔ اس کا اہل کوئی گرگا ایم پی اے بنتا ہے۔ وہ ایک نیشنلسٹ پارٹی کا لیڈر ہے۔''

''کنور خاندان سے اس کے کیسے تعلقات ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ گزشتہ الیکشن میں کنور خاندان نے اس کی حمایت نہیں کی تھی ان کا رجحان بی جے پی کی طرف ہو گیا ہے۔''

''یعنی ایم این اے لبیر سنگھ ہے۔ تم اس کے پاس جاؤ، عورتوں اور بچوں کو لے کر جاؤ۔ اس کے سامنے واویلا کرو۔ پھر ہوشیاری سے اپنے ووٹوں کے ذریعے بلیک میل کرو۔''

''میں سمجھ گیا۔'' اس نے پُر جوش لہجے میں کہا۔''تم نے مجھے اس مسئلے سے نکلنے کی ایک راہ دکھا دی۔ میں ایسا ہی کروں گا اور میں اسے منا بھی لوں گا۔ گزشتہ بار وہ خود پتاجی سے ملنے آیا تھا ووٹ مانگنے کے لئے۔''

''اسے اتنا آسان مت سمجھو۔ اس ریاست کا تو مجھے نہیں پتا...... لیکن مرکز میں بی جے پی کی حکومت ہے۔ اس لئے لبیر سنگھ بھی صرف احتجاج کرسکتا ہے۔''

''ریاست میں ایک اتحاد حکومت کر رہا ہے۔ جس میں لبیر سنگھ کی پارٹی بھی شامل ہے۔''

''تو اسے استعمال کرو۔ میرا خیال ہے پولیس کے بجائے فوج اس وجہ سے آپریشن میں ملوث ہے کہ کنور خاندان کا تعلق بی جے پی سے ہے اور وہ مرکز میں اقتدار رکھتی ہے اور فوج اس کے قابو میں ہے۔''

''درست...... اس وجہ سے پولیس ہمیں نظر نہیں آئی ہے۔''

''مگر یہ تشویش ناک بات ہے۔ اگر اس میں مرکزی حکومت ملوث ہے تو وہ تم لوگوں کو دہشت گرد یا علیحدگی پسند بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کرے گی۔''

''مگر ہم نہ تو دہشت گرد ہیں اور نہ علیحدگی پسند۔''

''یار، بات تو ان کی ہے، حکومت اور میڈیا پر ان کا کنٹرول ہے اور بھارت ویسے بھی علیحدگی کی تحریکوں کے لئے مشہور ہے۔ کشمیر سے آسام تک کم وبیش پندرہ تحریکیں چل رہی ہیں۔ تم لوگوں کے بارے میں یقین کرلیا جائے گا اور تم لوگ یک دم عوام اور میڈیا کی ہمدردیوں سے محروم ہو جاؤ گے۔''

''یہ بھی ہے۔''

''اس لئے جو کرنا ہے فوراً کرو۔ میرا خیال ہے اپنے آدمیوں کا ایک وفد ابھی بھیج دو۔ چار پانچ ہوشیار سفارت کار بعض اوقات وہ کام کر جاتے ہیں جو ہزاروں کی فوج بھی نہیں کر سکتی ہے۔''

کمار اس کام میں لگ گیا اور میں نے سو جانا مناسب سمجھا۔ کل تک میں نے جو بھاگ دوڑ کی تھی، اس سے مجھے تھکن ضرور ہوئی تھی لیکن کسی بھی مرحلے پر مجھے کمزوری کا احساس نہیں ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا خون لگانے سے مجھ میں جو کمزوری پیدا ہوئی تھی وہ دور ہو چکی تھی۔ اندر مندر کے ایک مردانے کمرے میں، مَیں نے بھی اپنے لئے جگہ بنائی اور سونے کے لئے لیٹ گیا۔ میرا ارادہ صبح سویرے یہاں سے نکل جانے کا تھا۔ میں دن میں سفر کر کے یہاں سے کسی محفوظ جگہ نکل جاتا اس کے بعد آگے کسی پبلک ٹرانسپورٹ سے بھی سفر کر سکتا تھا۔ میں امرتسر تک پہنچ جاتا تو وہاں سے سرحد عبور کرنے کی کوئی سبیل نکال سکتا تھا۔

☆======☆======☆

میری آنکھ دھماکے سے کھلی، ایسا لگ رہا تھا جیسے قیامت آ گئی ہو، ایسا شور تھا۔ سب بیک وقت اٹھے۔ باہر عورتوں، مردوں اور بچوں کے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں مجھے پہلا خیال یہی آیا کہ فوج نے حملہ کر دیا ہے۔ مگر باہر نکلتے ہی مجھے ہیلی کاپٹر کی آواز آئی۔ مندر کے ایک طرف سے شعلے اور دھواں اٹھ رہا تھا۔ صبح نمودار ہو رہی تھی۔ بچے، عورتیں اور مرد دیوانہ وار نکل کر بھاگ رہے تھے۔ دھماکے نے مندر کی کمزور دیواروں کو ہلا دیا تھا۔ ان سے اینٹیں جھڑ رہی تھیں۔ اس اثنا میں ایک اور راکٹ آ کر عورتوں اور بچوں کے درمیان گرا تھا۔ میں نے اُن کے ٹکڑے فضا میں بلند ہوتے دیکھے اور اندھا دھند کمار کے کمرے کی طرف بھاگا۔ وہاں ایل ایم جی رکھی تھی۔ اس ہیلی کاپٹر کو اسی گن سے نشانہ بنایا جا سکتا تھا۔ یہ روسی ساختہ گن شپ تھا جو بھارتی فوج استعمال کرتی ہے۔

کمار اور دوسرے لوگ غائب تھے البتہ ایل ایم جی وہیں رکھی تھی۔ ہیلی کاپٹر گن شپ تھا اور اس میں رات کو دیکھنے کا نظام تھا۔ ورنہ حملہ کیسے کرتا؟ تو کیا پائلٹ کو عورتیں اور بچے نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس نے کیسے راکٹ مار دیا۔ یہ درندگی کی انتہا تھی۔ عام شہریوں پر کون اس طرح کے جنگی ہتھیاروں سے حملے کرتا ہے۔ مگر آج کل یہ کار خیر ان ملکوں کے حصے میں آ رہا ہے جو خود کو انسانی حقوق اور جمہوریت کا چمپئن قرار دیتے نہیں تھکتے ہیں۔ میں ایل ایم جی اور اس کے ایمونیشن بکس کو اٹھائے باہر آیا، اس اثنا میں دو دھماکے اور ہو چکے تھے۔ میں نے وسیع صحن کے ایک چبوترے پر ایم جی کا ٹرائی پوڈ رکھا۔ ہیلی کاپٹر میری نظروں سے اوجھل تھا۔ پھر میں نے آواز سے اندازہ لگایا، یہ دو ہیلی کاپٹر تھے۔ پھر میں نے بھاری مشین گن کی تڑتڑاہٹ سنی۔ راکٹ کے بعد اب ان لوگوں پر گولیاں برسائی جا رہی تھیں۔ مرنے والوں کی چیخیں الگ سے سنائی دے رہی تھیں۔

میں نے ایل ایم جی تیار کر لی تھی اور مجھے انتظار تھا کہ کوئی گن شپ نظر آئے۔ ایک بار پھر میرا خون کھول رہا تھا۔ ان لوگوں نے درندگی کی حد کر دی تھی۔ بے گناہ لوگوں کا ایسا قتل عام۔ وہ بھی ایک فیوڈل خاندان کی فرمائش پر۔ کاش کنور میرے سامنے ہوتا تو میں اس کو بتاتا۔ دھماکے، گولیوں اور انسانوں کے چلانے کی آواز براہ راست میرے اعصاب پر لگ رہی تھی۔ ایک طرف روشنی کا دائرہ لہرایا اور میں ہوشیار ہو گیا تھا۔ یہ کسی گن شپ کی سرچ لائٹ تھی۔ عقبی صحن کی جانب سے ایک بڑا سا سیاہ پرندہ میرے سامنے آیا۔ سرچ لائٹ کی دھار اس کے منہ سے نکلنے والی زبان جیسی لگ رہی تھی۔ وہ ابھی سامنے نہ تھا اور میں اس کے پہلو کو نشانہ بنانا چاہتا تھا جہاں اس کا انجن اور ایندھن کا ٹینک ہوتا ہے۔ پھر کاپٹر ذرا سا گھوما اور میں نے ٹریگر دبا دیا۔ اتنے قریب سے نشانہ خطا جانے

کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ گولیاں اس کے دھاتی جسم میں پیوست ہوئیں اور یک دم گن شپ اوپر اٹھا۔ مجھے افسوس ہوا، میں نے سامنے کے رخ سے کیوں فائر نہیں کیے۔ اس طرف شیشہ اور اس کے نیچے کنٹرول پینل ہوتا ہے۔ انسان یا پینل میں سے کسی کو بھی نقصان ہوتا تو کاپٹر ناکارہ ہو جاتا۔ میں نے فرار ہوتے گن شپ پر عقب سے بے شمار راؤنڈز چلا دیئے اور اس کی دم کے پاس سے دھواں نکلتے دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی تھی۔

میں اسے نشانہ بنانے میں مصروف تھا۔ مجھے پتا نہیں چلا کب عقب سے دوسرا گن شپ گھوم کر آ گیا۔ اس کی مشین گن نے گولیوں کی بوچھاڑ کی تو میں بال بال بچا تھا۔ میں نے چھلانگ لگائی اور چبوترے کے پیچھے دبک گیا۔ یہ کوئی چار فٹ اونچا اور اتنا ہی لمبا چوڑا سنگ مرمر کی اینٹوں سے بنا تھا۔ میں اس کے عقب میں محفوظ تھا۔ گولیاں اب بھی برس رہی تھیں اور انہوں نے ایل ایم جی کا بیڑا غرق کر دیا تھا۔ اس کے ٹکڑے اُڑ کر میرے سامنے گرے تھے۔ اس لمحے کسی اور طرف سے خودکار رائفلوں سے ہیلی کاپٹر پر گولیاں برسائی جانے لگی تھیں اور وہ فوراً ہوا میں بلند ہو گیا تھا اچانک پہاڑوں کی طرف سے ایک زوردار دھماکا سنائی دیا۔ میں نے دیکھا بہت بڑا شعلہ بلند ہو رہا تھا۔ پہلا گن شپ شاید کریش ہو گیا تھا کیونکہ اس کے بعد دوسرے نے فوری طور پر راہِ فرار اختیار کی تھی۔ میں نے اسے اکیلے ہی جاتے دیکھا تھا۔

"کمار مجھے مندر کے دروازے پر ملا تھا اس کا چہرہ خون سے سرخ تھا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ "اب بولو، ان حرام زادوں سے بات کروں؟"

"تم نے لوگ بھیج دیئے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ رات کو ہی چلے گئے تھے۔" اس نے جواب دیا۔ "دوسری اطلاع یہ ہے کہ آرمی کے دستے اس طرف آ رہے ہیں، ہمیں فوری طور پر نکلنا ہے۔"

قبائلی تہذیب اور تعلیم سے نا آشنا تھے مگر ان میں ایک قبائلی ڈسپلن تھا۔ ذرا سی دیر میں انہوں نے مرنے والوں کی لاشیں ایک طرف جمع کیں اور زخمیوں کو الگ کیا۔ لاشیں مندر کے احاطے میں رکھ دی تھیں۔ ان کو جلانے یا دفنانے کا وقت نہیں تھا۔ زخمیوں کو جانوروں پر سوار کیا گیا۔ عورتیں اور بچے بھی جس حد تک ممکن ہوئے گھوڑوں پر سوار کر دیئے گئے تھے۔ باقی افراد پیدل چلنے کو تیار تھے، کمار نے مجھ سے کہا۔ "شہباز! تم ہمارے ساتھ چلو، پیچھے ابھی خطرہ ہے۔"

وہ درست کہہ رہا تھا۔ عقب میں بھارتی پیرا ملٹریز پیش قدمی کر رہی تھی اور یہ کہنا دشوار تھا کہ وہ کہاں ہیں؟ میں غلطی سے بھی ان کے ہاتھ آ سکتا تھا۔ اس کے بعد میرا انجام کیا ہوتا۔ یہ جاننے کے لئے کسی خاص ذہانت کی ضرورت نہیں تھی۔ پھر ایسا لگ رہا تھا کہ قدرت بھی مجھے ان کے ساتھ ہی رکھنا چاہتی تھی۔ میں نے کمار کی تجویز قبول کر لی۔ وہ خوش ہو گیا تھا۔ ہم بھی پیدل چلنے والوں میں شامل تھے۔ کمار اس حملے پر حیران تھا۔ میں نے تلخی سے کہا۔ "اس میں حیرت کی کیا بات ہے، اب تم لوگ باغی ہو اور باغیوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک ہوتا ہے۔ کشمیر میں کیا ہو رہا ہے؟"

"ہم نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی ہے۔"

"بات صرف اتنی ہے کہ تم کمزور ہو۔ اور تمہارا وجود بعض طاقتوروں کو کھٹکنے لگا ہے اس لئے تمہیں صفحۂ ہستی

سے نابود کرنے کی تیاری کی جا رہی ہے۔"

"تب ہم لڑ کر کیوں نہ مریں؟" اس نے جوش سے کہا۔

"بظاہر اب اس کے سوا کوئی راستہ نہیں رہا ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ "حالانکہ اس میں بھی صرف تمہارا نقصان ہے۔"

"ہم سرکار کو بتائیں گے، ہم نے چوڑیاں نہیں پہن رکھی ہیں؟"

"سرکار ان باتوں کو سمجھتی تو نوبت یہاں تک کیوں آتی۔ تم کن کو مارو گے، اپنے جیسے عام اور غریب انسانوں کو۔"

"ہاں اوپر بیٹھے اصل ذمے دار محفوظ رہیں گے۔"

میں سوچ رہا تھا کہ جب گن شپ نے مندر میں چھپے افراد کو تلاش کر لیا تھا تو کیا ان کو دوسری بستی میں موجود افراد کا علم نہیں ہوگا۔ میں نے اس خدشے کا اظہار کمار سے کیا تو وہ یک دم پریشان نظر آنے لگا تھا۔ "ممکن ہے، ان درندوں سے اب کچھ بعید نہیں ہے۔"

"اللہ کرے وہ پہلے نکل گئے ہوں۔"

کمار نے نفی میں سر ہلایا۔ "ان کو ہمارے بعد نکلنا تھا تاکہ راستے میں ہم مل جائیں۔"

"مندر تو پھر بھی درختوں اور جھاڑیوں کی وجہ سے کسی قدر محفوظ تھا، بستی کا کیا حال ہے؟"

"وہی جو تم نے پچھلی بستی کا دیکھا تھا۔"

"پھر تو ان کا خدا ہی حافظ ہے۔"

مندر پر حملہ بظاہر خوف ناک تھا مگر مرنے والوں کی تعداد تیس سے زیادہ نہیں تھی۔ زخمی سو کے قریب تھے، ان میں جن کی حالت نازک تھی وہ بیس بائیس تھے۔ باقی معمولی زخمی تھے۔ سورج نکلا تو ہم مندر سے کافی دور نکل آئے تھے، سب کو پھر سے فضائی حملے کا خوف تھا اس لئے سب کی نظریں بار بار آسمان کی طرف جا رہی تھیں، جو لوگ خچروں پر سوار تھے، وہ جلد ہم سے آگے نکل گئے۔ ان کے چہروں سے خوف و ہراس ابھی تک نمایاں تھا۔ میرا دل دکھ سے بوجھل ہو گیا۔ چند دن میں، مَیں نے کتنی قتل و غارت گری دیکھ لی تھی اور دکھ یہ تھا کہ سب کے سب مرنے والے عام انسان تھے، غریب اور نچلے طبقے کے۔ دو گھنٹے بعد ہمیں دائیں طرف ڈھلان سے ایک قافلہ اوپر آتا دکھائی دیا، یہ خاصا بڑا تھا۔ میں نے کمار کی طرف دیکھا۔ "یہ درمیانی بستی کے لوگ ہیں۔"

"ہاں۔" اس نے سر ہلایا۔ "ان میں زخمی بھی نظر آ رہے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے درمیانی بستی پر بھی حملہ ہوا ہے۔"

کمار نے سرکار کو چند کلاسیکل انگریزی کی گالیاں دی تھیں۔ "انہوں نے یقیناً حملہ کیا ہے۔"

گن شپ ہیلی کاپٹروں کی مدد لینے کی وجہ شاید یہی تھی کہ پیدل دستوں کو آنے میں دیر لگتی اور ان کو علم تھا کہ اتنی دیر میں قبائلی روپوش ہو جائیں گے۔ میں نے کمار سے کہا۔ "میرا خیال ہے سرکار کو اس وادی کا علم ہے جہاں تم پناہ لے سکتے ہو اور پہلی بستی پر حملے کے بعد تم وہاں کا رخ کرو گے یہ بھی ان کے علم میں تھا اس لئے انہوں نے فضائی حملہ کیا تاکہ تمہاری رفتار سست ہو جائے اور فوج کے پیدل دستے تمہیں پکڑ لیں۔"

اس بار کمار نے اپنی زبان میں کوئی گالی دی۔ "ان کا باپ بھی اس جگہ ہم کو نہیں پکڑ سکتا۔ اگر یہ کوئی گاڑی نہ استعمال کریں اور اس جگہ گاڑی کا استعمال ممکن نہیں ہے۔"

"اگر انہوں نے ہیلی کاپٹر سے دستے آگے اتار دیئے۔" میں نے ایک اور امکان پر غور کیا۔

"ہاں، یہ ہو سکتا ہے اگر ان کو علم ہو کہ ہم کس راستے سے جائیں گے۔ سامنے نظر آنے والے درے سے نکلنے کے بعد وادی کی طرف جانے کے تین راستے ہیں۔"

دوسری بستی کے لوگ اب قریب آ گئے تھے، ان کی اور ہماری ملاقات درے کے سامنے ہوتی نظر آ رہی تھی۔ کمار کی بات درست تھی ان میں بے شمار زخمی تھے۔ خچروں، گھوڑوں اور گدھوں پر سوار تھے۔ زخمی بلند آواز سے چلا رہے تھے اور جن کے عزیز مر گئے تھے، وہ رو رہے تھے۔ درے کے سامنے یہ قافلہ ملا۔ آہ وزاری کا ایک طوفان اٹھا تھا۔ کمار بستی کے اہم افراد سے رپورٹ لینے لگا۔ چلنے والوں میں بھی کئی زخمی نظر آ رہے تھے، ان کی حالت بتاتی تھی کہ ان پر بری گزری تھی۔ ہم مشکل سے دس منٹ رکے ہوں گے۔ وقت نہیں تھا۔ دشمن تعاقب میں تھا اس لئے ماتم کرنے کی مہلت بھی نہیں تھی، کمار مشتعل واپس آیا تھا۔ "بہت برا ہوا، کم سے کم سات سو افراد مارے گئے ہیں۔"

"میرے خدا!" میرے منہ سے نکلا تھا۔ "اپنے چند فوجی مرنے کا ایسا بھیانک انتقام۔"

"انتقام تو اب ہم ان سے لیں گے۔" اس نے چلا کر کہا۔

بھارت ایک وسیع و عریض ملک ہے جس میں درجنوں مذاہب کو ماننے والی اقوام رہتی ہیں، صرف ہندومت کی درجنوں ذیلی کاسٹ ہیں اور جہاں تک دیوی دیوتاؤں کا تعلق ہے تو ان کی تعداد بھی تقریباً انسانوں کے مساوی ہے۔ حشرات الارض سے لے کر جمادات، نباتات اور حیوانات تک سب دیوتاؤں میں شمار ہوتے ہیں۔ انسان کی حیثیت ان سب میں کم ہے۔ برہمن اور کھتری کو اونچی ذات کے انسانوں کا درجہ حاصل ہے جبکہ شودر جو تعداد میں ہندومت کا ستر فی صد سے بھی زیادہ بنتے ہیں، ان کو سرے سے انسانیت سے خارج کر دیا گیا ہے۔ جبکہ یہ بھارت کی کل آبادی کا نصف ہیں۔ شہروں اور دیہاتوں میں شودر کاسٹ برائے نام ہی آباد ہیں۔ درحقیقت ان کو صرف چند مخصوص کاموں کے لئے یہاں رکھا گیا ہے ورنہ ان کی اکثریت دور دراز جنگلوں اور پہاڑی علاقوں میں رہتی ہے۔ بنیادی زندگی کی سہولتوں سے دور، ان کے پاس تعلیم اور روزگار کے مواقع نہ ہونے کے برابر ہیں۔ سخت مشقت کے بعد ان کو اتنا بھی نہیں ملتا ہے کہ دو وقت پیٹ بھر کر کھا سکیں۔ بعض علاقوں میں یہ چوہے اور سانپ کھا کر گزارہ کرتے ہیں۔ جانوروں کی کھالیں اتارنے کا پیشہ بھی کرتے ہیں مگر ان کو گائے کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں ہے۔

بدقسمتی سے جن علاقوں میں آزادی کی تحریکیں چل رہی ہیں سوائے کشمیر کو چھوڑ کر، وہ سب شودر کاسٹ کے علاقے ہیں اور ان میں سے بیشتر علاقوں کی سرحدیں تبت یعنی چین سے ملتی ہیں۔ چین سے ان کو آزادی اور اشتراکیت کے نظریات اور افکار ہی نہیں مادی وسائل بھی ملتے ہیں جن کے بل بوتے پر ان کی تحریکیں چل رہی ہیں۔ صدیوں سے ظلم و جبر کی چکی میں پستے اس مظلوم طبقے نے بھارت کے سیکولر آئین سے امیدیں وابستہ کر لی تھیں مگر ان کی امیدیں جلد چکنا چور ہو گئیں۔ برسوں سے رائج استحصالی نظام نے صورت ضرور بدلی تھی مگر ان

کے لئے عرصۂ حیات اور بھی تنگ ہو گیا تھا۔ مجبور ہو کر انہوں نے ہتھیار اٹھا لئے۔ آج کا انسان بے شک جاہل اور جنگلوں میں رہتا ہو مگر نئی دنیا کی روشنی اس تک کہیں نہ کہیں سے پہنچ جاتی ہے۔

جو قومیں آزادی کا راستہ اپناتی ہیں، وہ خوشی سے ایسا نہیں کرتیں، بلکہ مجبور ہو کر اس راستے پر آتی ہیں۔ سیاسی اور معاشی جبر کے ساتھ مذہبی جبر بھی اس میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ جب ایک حد آ جاتی ہے تو یہ محکوم اقوام ہتھیار اٹھا لیتی ہیں۔ مجھے کمار کا قبیلہ بھی اسی طرف گامزن لگ رہا تھا۔ ممکن ہے وہ اکیلے تحریک چلانے کے بجائے پہلے سے جاری کسی تحریک کا حصہ بن جائیں۔ تبت اور نیپال کی سرحدوں کے ساتھ ہماچل پردیش کا پہاڑی علاقہ ہے، یہ کشمیر سے بھی لگتا ہے اور یہاں ایک مضبوط تحریک چل رہی ہے۔ اگرچہ یہ بہت زیادہ پُرتشدد نہیں ہے لیکن اس نے خاصے بڑے علاقے پر اپنا اثر قائم کر لیا ہے اور یہ جگہ کمار کے قبیلے کے علاقے سے زیادہ دور نہیں تھی۔

مجھے اس بات کا خدشہ بھی تھا کہ پیرا ملٹریز کو ہیلی کاپٹرز کی مدد سے آگے اتار دیا گیا ہو اور وہ ہماری گھات میں بیٹھے ہوں۔ راستہ دیکھنے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ بلندی سے سب نظر آتا ہے اور اتنے سارے افراد کو چھپانا ناممکن ہی تھا۔ قدرت ہماری مدد کرتی تو کرتی۔ اگر بادل آ جاتے تو پھر ہم کسی قدر محفوظ ہو جاتے اور اس وقت نکھری دھوپ نکلی تھی۔ میں نے کمار سے کہا۔ ''برف باری کا امکان نہیں ہے۔''

اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ''ہونے کو ہو بھی سکتی ہے۔ پہاڑی علاقے میں موسم ہمیشہ ناقابلِ اعتبار ہوتا ہے۔ ابھی تو کوئی امکان نظر نہیں آ رہا۔''

درے سے نکل کر ہم جس راستے پر گامزن ہوتے تھے، اس پر جابجا برف پڑی تھی۔ مگر برف باری کو واضح طور پر کئی دن گزر چکے تھے اور اب برف پگھلنا شروع ہو گئی تھی۔ یہ علاقہ اتنا بلند نہیں تھا کہ دن میں بھی درجہ حرارت نقطۂ انجماد سے نیچے رہتا اس لئے دن میں کچھ نہ کچھ برف پگھل جاتی تھی۔ البتہ اوپر دور پہاڑوں پر برف کی سفیدی کہیں زیادہ تھی اور صرف وہی جگہیں برف سے خالی تھیں جہاں برف ٹک نہ سکتی تھی۔ میں نے کمار سے پوچھا۔ ''وادی کہاں ہے اور یہ جگہ سمندر سے کتنی بلند ہے؟''

''اس کا تو نہیں پتا لیکن میں تمہیں ایک سادہ سا حساب بتاتا ہوں۔ سب سے نچلی بستی میں ایک ڈیڑھ مہینے سے زیادہ برف نہیں پڑتی ہے۔ دوسری بستی میں چار مہینے برف رہتی ہے اور تیسری بستی میں اس سے کچھ زیادہ دنوں تک رہتی ہے لیکن یہ وادی چھ مہینے برف سے ڈھکی رہتی ہے۔ وہاں برف مارچ کے آخر میں پگھلنا شروع ہوتی ہے۔ بعض اوقات وہاں اپریل میں بھی برف باری ہو جاتی ہے۔''

''میں سمجھ گیا۔'' میں نے کہا۔ ''میرے حساب سے وادی سطح سمندر سے کم سے کم آٹھ ہزار فٹ کی اونچائی پر تھی اور اس کے گرد برف پوش پہاڑ ہوں گے اس لئے اس کی برف چھ مہینے سے زیادہ رہتی ہے۔ میں نے کمار سے ایک سوال اور کیا۔ ''رات کو ہم کہاں رکیں گے؟''

''جنگل میں۔ اس طرف غار ہیں لیکن اتنے افراد کے لئے وہ ناکافی ہوں گے۔ ان میں صرف بیمار، بوڑھے اور بچے رکیں گے۔''

''اور باقی؟''

''وہ کھلے میں الاؤ جلا کر رات گزارنے کی کوشش کریں گے۔'' اس نے کہا۔ ''بھگوان نے چاہا تو کل رات سے پہلے ہم وادی میں ہوں گے۔''

''وہاں اتنے افراد سما جائیں گے۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''وہاں بڑے بڑے قدرتی غار ہیں۔ مکانات بھی ہیں مگر کم ہیں صرف خاص لوگوں کے لئے ہیں ورنہ باقی افراد غاروں میں رہتے ہیں۔''

''یعنی غریب غربا۔'' میں نے لقمہ دیا۔

وہ مسکرایا۔ ''ہر جگہ ایسا ہی ہوتا ہے، غریب کو ایسی ہی چیزیں ملتی ہیں مگر ان غاروں میں ایک خصوصیت ہے۔ سردی میں ہی اندر سے اتنے گرم ہوتے ہیں کہ بعض اوقات تو اندر آگ جلانے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی ہے۔''

واقعی یہ حیران کن بات تھی کہ اتنی بلندی پر بھی آدمی بغیر آگ کے گزارہ کر لیتا ہے۔ شام تک ہم خیریت سے سفر کرتے رہے، اس کے بعد ایک جنگل میں رکے۔ شاید وادی کی طرف جاتے ہوئے یہ جگہ ان لوگوں کا مستقل پڑاؤ تھی کیونکہ وہاں جا بجا ایسے آثار تھے جیسے وہاں انسان مسکن کرتے رہے ہوں۔ ایک طرف ڈھلان کے ساتھ غار بھی تھے عورتوں، زخمیوں اور بوڑھوں کو ان میں ٹھہرایا گیا تھا۔ مرد اور جوان عورتیں جو سردی برداشت کر سکتے تھے وہ باہر تھے۔ درختوں تلے آگ جلائی جانے لگی۔ آگ جلانے کے بعد کھانے کی فکر شروع ہوئی۔ کچھ سامان تھا جسے سب نے مل بانٹ کر کھالیا۔ بستی سے کچھ لے کر نکلنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

دوسری بستی کی بربادی کی کہانی مجھے کمار نے الاؤ کے گرد بیٹھ کر سنائی۔ چار اور گن شپس وہاں پہنچے اور ان سے بلا وارننگ اندھا دھند شیلنگ شروع ہوگئی۔ راکٹ گرے، مکانات تباہ ہوئے اور ان میں آگ لگ گئی۔ بچنے والے بھاگے اور زخمی پڑے مدد کے لئے چلاتے رہے۔ چالیس پچاس راکٹ فائر کرنے کے بعد جب بستی میں جا بجا شعلے بھڑک اٹھے تھے تو ان کی روشنی میں بھاگنے والوں پر مشین گنوں سے فائرنگ کی گئی۔ بے شمار موقع پر ہی لقمہ اجل بن گئے اور کئی ایک نے صبح دم توڑا۔ نصف گھنٹے بعد گن شپس واپس چلے گئے تھے مگر اپنے پیچھے تباہی و بربادی کی ایک داستان چھوڑ گئے تھے۔ کم سے کم سات سو افراد ہلاک اور اتنے ہی زخمی تھے۔ شدید زخمی سو کے قریب تھے اور ان میں سے بھی نصف نے راستے میں دم توڑ دیا۔

''یہ سارے راستے لاشیں چھوڑتے رہے۔'' کمار نے بوجھل لہجے میں کہا۔

''حالات اب بھی اچھے نہیں تھے۔ رات بھر میں چند اور زخمیوں نے دم توڑ دیا تھا۔ جب کوئی مرتا تھا تو اس کے لواحقین کی جانب سے رونے دھونے کا ایک شور اٹھتا تھا۔ میں ساری رات نیند سے چونکتا رہا۔ ویسے بھی اس سردی میں نیند کہاں آ رہی تھی۔ بس کبھی کبھی ذہن پر اونگھ سی آ جاتی تھی۔ صبح سویرے سب چلنے کے لئے تیار تھے کیونکہ ابھی پورے دن کا سفر باقی تھا تب کہیں جا کر قافلہ وادی میں داخل ہوتا۔ مجھے خیال آیا گزشتہ چند دن میں ایک ہزار سے زیادہ افراد ہلاک ہو چکے تھے اور کسی کے کان پر جوں بھی نہیں رینگی تھی۔ دراصل دور دراز پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے دنیا کو ان ہلاکتوں کا علم نہیں تھا۔ حکومت جانتی تھی مگر وہ اسے چھپانے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھیں اتنی ہلاکتیں اگر بمبئی یا کلکتہ جیسے بڑے شہر میں ہوتیں تو ایک تہلکہ مچ جاتا۔ ساری دنیا سے میڈیا

اس طرف دوڑ پڑتا اور یہاں کسی مقامی اخبار کا پرچہ نولیس بھی نہیں آیا تھا۔ بے خبری سی بے خبری تھی۔ جیسا تیسا ناشتا کر کے سب چل پڑے تھے۔ تھکے جسموں اور اس سے بھی زیادہ بوجھل ذہنوں کے ساتھ۔ سب ہی گم صم تھے۔ کمار نے مجھے بتایا گزشتہ رات بائیس مزید زخمی دم توڑ گئے تھے اور اب بھی سو کے قریب افراد کی حالت خطرے میں تھی۔

"ہم ان کے لئے کچھ نہیں کر سکتے؟" میں نے پوچھا۔

"کوشش کر سکتے ہیں۔" اس نے سرد آہ بھری۔ "مقامی طریقے سے علاج کرنے والے کوشش کر رہے ہیں البتہ وادی میں ان کو علاج کی اچھی سہولتیں مل سکتی ہیں۔"

"بشرطیکہ وادی تک پہنچیں تو۔" میں نے دل میں سوچا۔

ہم ایک درے سے گزر رہے تھے، اس کے دونوں جانب اونچے درختوں والا جنگل تھا جس پر برف کی سفیدی نمایاں تھی۔ یہ پہاڑ بہت اونچے تھے، ان کی چوٹیوں پر صرف برف کا راج تھا۔ عام طور سے نو دس ہزار فٹ کی بلندی کے بعد بڑے درخت نہیں ملتے ہیں صرف چھوٹے درخت اور جھاڑیاں ملتی ہیں، اس کا مطلب تھا کہ ان پہاڑوں کی چوٹیاں دس ہزار فٹ سے زیادہ بلند تھیں۔ ہم دو گھنٹے بعد اس درے سے نکلے اور ایک وسیع و عریض ڈھلانی میدان پر چڑھنے لگے۔ یہاں برف زیادہ تھی اور سختی سے جمی تھی اس پر بعض اوقات پاؤں پھسلنے لگتا تھا۔ اس لئے خچروں کو آگے کیا گیا۔ ان کے سموں سے برف ٹوٹ جاتی تو اس پر چلنا آسان رہتا۔

میں کمار سے ذرا پیچھے تھا، اچانک میں نے جیتو کو اپنے برابر میں چلتے پایا۔ اس کا بازو زخمی تھا۔ اس پر پٹی بندھی تھی۔ "یہ کیا ہوا؟"

"جب اوپر سے پرندے نے حملہ کیا تھا تو میرا بازو بھی گھائل ہوا صاب!" اس نے بتایا۔

"تم اس وقت کہاں تھے؟"

"تھک گیا تھا صاب اس لئے سو گیا تھا۔" اس نے ندامت سے کہا جیسے حملہ اس کی غفلت کی وجہ سے پیش آیا تھا۔ میں نے اس کا شانہ تھپکا۔

"تم بہت اچھے ہو اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔"

اس کا مرجھایا چہرہ کسی قدر چمک گیا تھا۔ "سچ صاب! سردار تو ہم کو گالیاں دیتا ہے۔"

"تم فکر مت کرو اسے میں سمجھا لوں گا۔"

"میں آپ کا شکر گزار ہوں صاب!" اس نے ممنونیت سے کہا تھا۔

"جیتو، جو آرمی والے ہمارے پیچھے آ رہے تھے، وہ کتنی دور تھے؟"

"اس وقت ایک گھنٹا پیچھے تھے، اب پتا نہیں۔"

میرے حساب سے فوج خاصی پیچھے رہ گئی تھی۔ اگرچہ قبائلیوں کا قافلہ تھا اس کے باوجود ان کی رفتار خاصی تیز تھی۔ اب ان لوگوں کو وادی سے پہلے پکڑنے کی ایک ہی ترکیب تھی کہ پیرا ٹروپرز کو آگے اتار دیا جاتا اور وہ چھپ کر حملہ کرتے۔ میں نے کمار سے کہا تھا کہ وہ کچھ مسلح افراد آگے بھی رکھے تاکہ حملہ ہو تو جواب دیا جا سکے۔ اس نے کچھ جنگجو آگے رکھے تھے۔ ویسے یہ قبائلی لڑنے کے ماہر تھے۔ ان کو تیر اندازی آتی تھی۔ خنجر چلانے کے

ماہر تھے۔ میں نے دیکھا، ہر نوجوان اور مضبوط مرد تیر کمان سے مسلح تھا۔ بعض افراد ٹولیوں کی صورت میں ذرا دور جنگلوں میں سفر کر رہے تھے کہ وہاں کوئی حملہ آور چھپا ہو تو پیشگی اطلاع مل جائے۔

☆=====☆=====☆

دوپہر کو ذرا دیر کے لئے رکے، میں نے مٹھی بھر مکئی لی تھی، اسے کچا چبا کر حلق سے اتارا اور خدا کا شکر ادا کیا۔ اس علاقے میں پانی کی کمی نہیں تھی جابجا چشمے بہہ رہے تھے۔ جن کا پانی آب حیات سے کم نہیں تھا۔ میں نے جب پانی پیا جسم و جان میں ایک نئی تراوٹ آ گئی تھی۔ سہ پہر کو جب ہم ایک ڈھلان عبور کر رہے تھے میں نے اس سیٹی کی آواز سنی جو میں نے جیتو کے پاس دیکھی تھی، یہ لمبی سیٹی تھی اور اس کا مطلب تھا شدید خطرہ ہے سب یک دم رک گئے تھے۔ کمار نے چیخ کر قافلے والوں کو درختوں اور پتھروں کی آڑ میں زمین پر لیٹ جانے کا حکم دیا۔

میں خود بھی اپنی گن سنبھالتا ایک پتھر کی آڑ میں ہو گیا۔ خطرہ نہ جانے کس طرف سے تھا۔ میں نے قافلے میں سے اس سیٹی کی آواز سنی، وہ رہ رہ کر گونج رہی تھی شاید یہ سوال تھا اس کا جواب گونج ختم ہونے کے بعد آیا۔ پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے یہ مصیبت تھی سیٹی دو سیکنڈ کے لئے بجاؤ تو دس سیکنڈ تک اس کی گونج سنائی دیتی تھی۔ جواب آتے ہی سب نے سامنے کی طرف رخ کر کے آڑ لے لی۔ گویا خطرہ سامنے کی جانب سے تھا اس کے ساتھ اوپر کی طرف جنگل کے اندر ڈھلان پر فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ مگر یہ فائرنگ ہم پر نہیں ہو رہی تھی۔

میں تیزی سے آگے بڑھا اور کمار سے کہا۔ "قافلے والوں کو بائیں طرف درختوں کے پیچھے لے جاؤ۔"

میرے ساتھ دس پندرہ مسلح افراد آگے بڑھ رہے تھے۔ میں نے ان سب کو اشارے سے پھیل جانے کو کہا پھر مجھے جیتو نظر آیا، میں نے اسے اپنے پاس بلا لیا تا کہ وہ میری بات کا ترجمہ کر سکے۔ "اپنے ساتھیوں سے کہو درخت کی آڑ میں رہیں اور ایک ایک کر کے آگے بڑھیں، سب ایک ساتھ مت بھاگیں۔"

اوپر سے سیٹیوں کی آواز مسلسل آ رہی تھی اور فائرنگ کا شور بڑھ گیا تھا۔ جیتو نے میرا حکم قبائلیوں کو پہنچا دیا تھا۔ آتشیں ہتھیاروں سے مسلح قبائلی اس طرف آ رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کی تعداد پچاس سے زیادہ ہو گئی تھی۔ میں نے دوسرا حکم دیا۔ "ایمونیشن ضائع نہیں کرنا ہے ہر گولی سوچ سمجھ کر چلانی ہے۔ ہمارے پاس گولیاں زیادہ نہیں ہیں۔"

کمار نے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آتشیں اسلحے سے لیس افراد کو میرے چارج میں دے دیا تھا اور خود وہ تیر کمان سے لیس افراد کی کمان کر رہا تھا۔ اہل قافلہ تیزی کے ساتھ بائیں طرف کے جنگل میں غائب ہو رہے تھے اور وہیں سے کمار اور اس کے تیر انداز ساتھی پوزیشن سنبھال کر دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو مزید پھیلنے اور اوپر تک جانے کا حکم دیا۔ جیتو کی وجہ سے مجھے اشارے کرنے سے نجات مل گئی تھی۔ وہ مزید پھیلنے لگے اور اوپر تک جانے لگے۔ اوپر سے فائرنگ کی آوازیں آنا بند ہو گئی تھیں۔

"جیتو! جب تک میں فائر نہ کروں، کوئی فائر نہ کرے۔ ہمیں آنے والوں کو گھیرنا ہے۔ ان سے کہو کہ دائرے میں پھیل جائیں اور دشمن کو آگے آنے دیں۔"

وہ سب ایک کمان کی صورت میں پھیلنے لگے۔ مجھے خدشہ تھا کہ جنہوں نے آنے والوں کو دیکھ کر اطلاع

دی تھی اور مزاحمت کی تھی وہ مارے جا چکے تھے۔ کوئی پندرہ منٹ بعد اوپر سے نقل و حرکت نظر آنے لگی۔ "سب چھپ جائیں، بالکل ساکت رہیں، اپنی موجودگی کا احساس نہ ہونے دیں۔" میں نے حکم دیا۔

آنے والے سیاہ پوش تھے اور بہت ماہرانہ اور تربیت یافتہ انداز میں آرہے تھے، ان کی حرکت اتنی تیز تھی کہ ان کو نشانہ بنانا دشوار تھا۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ ایک خاص حد سے قریب آتے۔ وہ ایک کے بعد ایک حرکت کر رہے تھے۔ وہ مجھے کمانڈوز لگ رہے تھے۔ اچانک مجھے خیال آیا، میں نے کہیں بلیک کیٹ کمانڈوز کے بارے میں پڑھا تھا ان کو خاص طور سے بھارت میں جاری آزادی کی تحریکوں کو کچلنے کے لئے تشکیل دیا گیا تھا۔ یہ لوگ قتل و غارت گری کے ماہر اور بے حد سفاک ہوتے ہیں۔ چھلاوے کی طرح آتے اور اپنا کام کر کے غائب ہو جاتے ہیں۔ بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کسی پر رحم نہیں کرتے ہیں۔ خاص طور سے کشمیر میں ان کی سفاکی کی داستانیں عام تھیں، کچھ عرصہ پہلے امریکی صدر کی آمد کے موقع پر کشمیر میں سکھوں کے قتل عام میں بھی اسی تنظیم کو ملوث بتایا جا رہا تھا۔

اگر یہ بلیک کیٹ کمانڈوز تھے تو ان کا مقابلہ یہ بے چارے قبائلی کسی صورت نہیں کر سکتے تھے ان کو بس رائفل اور پستول چلانا آ گیا تھا اور گوریلا جنگ کے نام سے بھی نا آشنا تھے۔ ان کمانڈوز نے جتنی پھرتی سے آگے موجود افراد کو ختم کیا تھا اس سے ان کی پیشہ ورانہ مہارت کا اچھی طرح اندازہ ہوتا تھا۔ ان کو کسی ہیلی کاپٹر نے پہاڑ کی چوٹی پر اتار دیا ہوگا اور وہاں سے یہ ہمارا راستہ روکنے کے لئے آئے تھے۔ بلیک کیٹ کے میدان میں آنے سے واضح تھا کہ بھارت سرکار نے ان بے گناہ قبائلیوں کو پوری طرح کچلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ دس ہزار افراد کے ایک قبیلے کا صفحہ ہستی سے نابود ہو جانا اتنی اہم بات نہیں خاص طور سے اس لئے کہ وہ ذات کے شودر تھے۔ "بیتو، اوپر والوں سے کہو اور اوپر جانے کی کوشش کریں۔ جہاں سے وہ ان لوگوں کو بہتر طریقے سے نشانہ بنا سکیں۔"

بیتو نے میرا حکم اوپر تک پہنچایا، آنے والے اب دو سو گز سے ذرا اوپر تھے۔ ان کے انداز میں اعتماد اور پھرتی تھی۔ ان کو پتا تھا کہ نیچے مسلح افراد ان کے منتظر ہیں اس کے باوجود ان کی بے فکری قابلِ رشک تھی۔ میں نے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ ان کی تعداد کتنی تھی۔ وہ خاصا پھیل کر آرہے تھے۔ اس لئے یہ اندازہ خاصا دشوار ثابت ہوا تھا۔ بہرحال میں نے اندازہ لگایا کہ ان کی تعداد تیس سے چالیس تک تھی۔ وہ ایک پلاٹون تھی۔ ہماری تعداد ان سے دوگنا ضرور تھی۔ اس کے باوجود میرا اب بھی یہی خیال تھا کہ ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ میں ان کے سو گز کے اندر آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ میں اس کمان کے بائیں پہلو پر تھا جو اوپر سے نیچے پھیلی تھی۔ میں نے ایک درخت اور اس کے ساتھ چٹان کے درمیان پوزیشن سنبھال رکھی تھی۔ سورج ابھی اوپر تھا اور اس کی روشنی کافی تھی مگر دو گھنٹے بعد سورج ڈوبتے ہی تاریکی چھا جاتی۔ آنے والوں کے پاس نائٹ وژن گاگلز کی موجودگی لازمی تھی، اندھیرے میں ان کے لئے یہ جنگ جیتنا بہت آسان ہو جاتا پھر وہ دن کی روشنی میں کیوں اترے؟

اس سوال کا جواب الہام کی طرح آیا تھا۔ تاریکی پھیلنے تک قافلہ وادی تک پہنچ جاتا اور وہاں اس پر حملہ کرنا دشوار ہو جاتا۔ اس لئے یہ کمانڈوز اتارے گئے تھے۔ ممکن ہے ان کا کام قافلے کو آگے جانے سے روکنا ہو تاکہ رات ہو جائے اور اس کے ساتھ ہی عقب سے عام فوج بھی آجاتی پھر اہل قافلہ دو طرف سے مار کی زد میں آ

جاتے، میں نے اوپر دیکھا چالاک کمانڈوز نے اپنی پیش قدمی روک دی تھی۔ صاف ظاہر تھا وہ دیکھتے آئے تھے اور انہوں نے ہماری پوزیشنیں دیکھ لی تھیں۔ اس لئے اب وہ مزید آنے سے گریز کر رہے تھے۔ ان کی حکمت عملی وہی تھی جو میں نے سوچی تھی ہ۔ ہمیں روکنا اور رات ہونے کا انتظار کرنا۔

کمار دوسری طرف ڈھلان کے جنگل میں تھا اور درمیان میں ایک برساتی نالا تھا جس میں ہم سفر کر رہے تھے، یہ تیس چالیس گز چوڑا تھا مگر اس میں کوئی جھاڑی یا درخت نہیں تھا جو رکاوٹ فراہم کرتا۔ جو بھی اسے عبور کرنے کی کوشش کرتا، وہ لازماً اوپر والوں کی زد میں آ جاتا مگر کمار تک یہ پیغام پہنچانا لازمی تھا۔ میں نے اپنے برابر میں لیٹے بیتو سے کہا۔

''سنو، تمہیں سردار تک ایک پیغام لے کر جانا ہے۔''

''میں ابھی جاتا ہوں صاب!'' اس نے مستعدی سے کہا۔ ''کیا کہنا ہے سردار سے؟''

''اسے بتاؤ کہ یہ لوگ ہمیں دھوکا دے رہے ہیں، یہ حملہ کرنے نہیں بلکہ ہمیں روکنے آئے ہیں تاکہ رات ہو جائے اور ہمارا تعاقب کرنے والی فوج آ جائے۔ کمار سے کہو، یہاں سے نکلنے کی کوشش کرے۔''

''میں ابھی جاتا ہوں۔'' وہ کھڑا ہوا تھا کہ میں نے اسے بازو سے پکڑ کر گرا لیا۔

''احمق اس طرح نہیں۔ چھپ کر زمین سے لگ کر جاؤ اور یہ نالا پیچھے جا کر عبور کرنا۔ اِدھر تو یہ گولی مار دیں گے۔'' اس نے سر ہلایا اور غائب ہو گیا۔ چند لمحے بعد مجھے دائیں طرف موجود شخص کی چیخ سنائی دی، وہ زمین پر گر کر ایڑیاں رگڑ رہا تھا اور اسی لمحے فائر کی آواز گونجی۔ گرنے والے کے سر سے خون کا فوارہ بلند ہو رہا تھا اسے اوپر سے کسی شاپ شوٹر نے نشانہ بنایا تھا۔ کمانڈوز عام طور سے اسنائپر رائفل استعمال کرتے ہیں، میں چلایا۔ ''سب درختوں کے پیچھے ہو جاؤ، سر مت نکالنا۔''

میری بات ان کی سمجھ میں آئی ہو یا نہ آئی ہو لیکن وہ مرنے والے کے انجام سے سمجھ گئے تھے، سب درختوں اور پتھروں کی آڑ میں دبک گئے۔ میرے پاس جی تھری رائفل تھیں یہ خودکار تھی مگر مینول موڈ پر بھی کام کرتی تھی۔ میں نے اسے سنگل شاٹ پر کیا اور احتیاط سے اس کی نال درخت اور چٹان کے درمیان میں رکھی۔ اس سے ذرا آگے چٹان کی جڑ سے ایک پودا نکلا ہوا تھا۔ سردی میں یہ خشک اور بے جان ہو رہا تھا۔ میں نے اس کی شاخیں دائیں بائیں کرتے ہوئے اس کے درمیان سے نال نکالی۔ اصولاً تو مجھے یہ حماقت نہیں کرنی چاہئے تھی۔ کیونکہ اوپر کئی اور نشانے بازوں کی موجودگی عین ممکن تھی جو اپنی رائفلوں پر لگی دوربینوں سے نیچے دیکھ رہے ہوں گے اور کسی کا ذرا سا سر نظر آیا اور انہوں نے اڑا دیا مگر مجھے حماقت کی عادت پڑ چکی تھی۔ میں نے آنکھوں کی مدد سے اوپری جنگل کھنگالنا شروع کر دیا۔ میرا سر ساکت تھا اور میں صرف آنکھوں کو گردش دے رہا تھا۔ بالآخر مجھے کوئی ڈیڑھ سو گز اوپر ایک درخت کے عقب سے جھانکتی رائفل نظر آئی۔ رائفل کیا نظر آئی اس پر لگی دوربین کے شیشوں کی چمک نے مجھے سراغ دیا تھا۔ اوپر درختوں سے چھن کر آتی دھوپ کبھی پڑتی تو چمک نمایاں ہوتی تھی۔ میں نے نال بتدریج اس طرف کی۔ میں چمک کا نشانہ لینا چاہ رہا تھا جب مجھے یقین ہو گیا تو میں نے انتظار کیا اور چمک نظر آتے ہی فائر کر دیا۔ اوپر سے نشانہ بننے والے نے چیخ ماری۔ جب وہ اچھلا تو مجھے اس کی سیاہ وردی نظر آئی تھی، فوراً ہی اوپر سے کئی گولیاں دوسری طرف آئیں اور میں آڑ میں ہونے کی وجہ سے بچ گیا۔

بیتو نہ جانے کہاں تھا، وہ بچ گیا تھا یا نہیں؟ اس کا کمار کے پاس پہنچنا لازمی تھا۔ سورج تیزی سے مغرب کی طرف گامزن تھا۔ پہاڑوں میں سورج کی روشنی ویسے ہی جلدی غائب ہو جاتی ہے۔ مجھے یقین تھا کہ اندھیرا ہونے کے بعد ہم ان کے رحم و کرم پر ہوں گے۔ ہمیں جو کرنا تھا اس سے پہلے ہی کرنا تھا۔ قبائلی اس بار ہوش سے کام لے رہے تھے اور سوائے ایک آدمی کے کسی نے کوئی حماقت نہیں کی تھی۔ ہم جس جگہ تھے وہ مغرب کی طرف تھی اور دشمن مشرق کی طرف تھے۔ اچانک مجھے خیال آیا۔ ابھی سورج غروب ہوتے وقت روشنی ان کی طرف ہو گی اور ہم اس سے محفوظ ہوں گے تو کیا اس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے؟ ذرا دیر غور کے بعد میرے ذہن میں ایک پلان آیا تھا۔ مگر اس کے لئے ضروری تھا میں اپنے آدمیوں کو سمجھاتا اور وہ اردو نہیں سمجھتے تھے۔ مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا، مجھے بیتو کے بجائے پیغام دے کر کسی اور کو بھیجنا چاہئے تھا۔ بیتو میرے پاس ہوتا تو میں ان کو اپنی بات سمجھا سکتا تھا۔ پھر بھی میں نے ان کو اشاروں سے کہا کہ جیسے ہی سورج عقب میں آئے، انہوں نے پیچھے ہٹنا تھا اور چند افراد کو آگے موجود رہنا تھا تا کہ کمانڈوز کو کچھ دیر روکیں۔ ان کے بچنے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا مگر ان کو یہ قربانی دینا تھی۔

میرا پلان بہت سادہ تھا جب سورج کی ڈوبتی کرنیں بلیک کیٹس کی آنکھوں میں پڑ رہی ہوتیں تو اس سے فائدہ اٹھا کر ہمیں یہاں سے فرار ہو جانا تھا اور خشک نالا پار کر کے جنگل کے دوسرے حصے کی طرف چلے جانا تھا۔ ابھی میں انتظار کر رہا تھا کہ مجھے سنسناتی ہوئی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے جب درخت کی اوٹ سے ذرا سا جھانکا تو مجھے نالے کے پار والے جنگل سے بے شمار تیر نکل کر دوسری طرف جاتے دکھائی دیئے، اس طرف کمانڈوز موجود تھے۔ خاص بات یہ تھی کہ تیروں کے سروں پر آگ لگی تھی۔ یہ تیر سیکڑوں کی تعداد میں تھے اور ان کی بارش نے یقیناً بلیک کیٹس کو بوکھلا دیا تھا۔ ابھی پہلی باڑھ اپنی منزل پر نہیں پہنچی تھی کہ تیروں کی دوسری باڑھ نے جنگل کا رخ کیا، اس بار میں نے کسی قدر رسک کے ساتھ جھانکا اور مجھے دو عدد سیاہ پوش اپنے جسموں میں گڑے تیر نکالنے کی جدوجہد کرتے دکھائی دیئے، نیچے سے کئی رائفلیں ایک ساتھ گرجیں اور دونوں زمین پر گر گئے۔ ''وہ مارا!'' میں نے جوش سے نعرہ لگایا۔ جنگل کے اندر کا حصہ خشک تھا۔ سرما نے گھاس پودوں کو جلا دیا تھا۔ جب ان خشک پودوں اور گھاس پر جلتے تیر گرے تو انہوں نے آگ پکڑ لی تھی۔ دوسری باڑھ نے زیادہ تباہی پھیلائی تھی۔ بلیک کیٹس جو سکون سے ہماری گھات میں بیٹھے تھے اچانک خود نشانے پر آ گئے تھے۔ وہ ہماری طرف توجہ دیتے یا ان تیروں کی طرف جو موت کے نامہ بر بن کر آ رہے تھے۔ تیسری باڑھ نے چند کمانڈوز کو نشانہ بنایا تو ان کی ہمت جواب دے گئی۔ ان کے کمانڈر نے چیخ کر پسپائی کا حکم دیا۔ وہ سب اٹھ کر اوپر بھاگے۔ وہ اکیلے نہیں تھے، انہوں نے اپنے زخمی اور مرنے والے ساتھی بھی اٹھا رکھے تھے۔ ان کے چند کمانڈوز کور دے رہے تھے، میں نے دہاڑ کر فائر کا حکم دیا لفظ فائر وہ سمجھتے تھے اس لئے فوراً ہی رائفلیں گرجنے لگیں۔ دو کور دینے والے گرے تو باقیوں کو اپنے لالے پڑ گئے۔ تیر اندازی کرنے والے اور ان کا کمانڈر دونوں ماہر تھے۔ ان لوگوں کی حرکت کے ساتھ ساتھ آنے والے تیروں کا رخ بھی بدلتا جا رہا تھا۔ جب بلیک کیٹس اوپر کی طرف غائب ہوئے تو ان میں سے کم سے کم ایک درجن اپنی جان گنوا چکے تھے۔

میرے ساتھی ان کے تعاقب میں جانا چاہتے تھے مگر میں نے ان کو روک دیا۔ اس اثنا میں ہانپتا بیتو بھی آ

گیا۔اس کی مدد سے میں نے ان سب کو واپسی کا حکم دیا۔کمانڈوز کا تعاقب کرنا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہوتا ہمیں جلد از جلد روانہ ہو جانا تھا۔ یہ بات میں نے نالے کے دوسری طرف کمار کے پاس پہنچتے ہی کہی۔اس نے کہا۔''تم فکر مت کرو، میں نے دوسروں کو پہلے ہی بھیج دیا ہے۔میرے پاس یہ تیرانداز تھے۔''

''تم لوگوں نے کمال کر دیا۔''

''اب یقین آیا کہ ہم بھی لڑ سکتے ہیں؟'' کمار مسکرا رہا تھا۔

''ہاں بابا، اب چلو، ایسا نہ ہو آگے بھی ان لوگوں نے کمانڈوز اتار رکھے ہوں۔''

''کمانڈوز!'' کمار چونکا۔

''ہاں، اس بار بھارتی سینا اپنے بدنام زمانہ بلیک کیٹ کمانڈوز میدان میں لائی ہے۔جن کا کام اپنے لوگوں کو قتل کرنا ہے۔'' میں نے اسے بتایا۔''یہ بہت خوف ناک اور سفاک ہوتے ہیں، اگر تم نے جلتے تیروں کی بارش نہ کی ہوتی تو ان سے جان بچانا بہت مشکل ہو جاتا۔''

ہم آگے روانہ ہو گئے تھے۔اکیلے مردوں کے لئے اپنے قدموں پر تیز چلنا آسان ہوتا ہے ہم جلد ہی آگے جانے والے قافلے کے پاس پہنچ گئے۔کمار نے تیراندازوں کو دائیں بائیں اور آگے پیچھے پھیلا دیا تھا۔میں نے اس سے پوچھا۔''تمہیں اس آتش بازی کا خیال کیسے آیا؟''

''بیتو نے مجھے بتایا تھا۔تم کس طرح گھر گئے، جو بھی اپنی اوٹ سے نکلتا مارا جاتا۔تم لوگوں کو بچانے کے لئے ان کی توجہ ہٹانا ضروری تھی، جب ہم نے دشمنوں کو بدحواس کرنا ہوتا ہے تو ہم آگ والے تیروں کی بارش کرتے ہیں۔''

''میں نے دو کمانڈوز کو آتشیں تیر کھا کر رقص کرتے دیکھا تھا۔اس آفت کا تو انہوں نے سوچا بھی نہیں ہو گا۔'' میں ہنسا۔

''شہباز، ہم امن پسند لوگ ہیں۔اس حال میں بھی ہم نہیں چاہتے کہ تصادم ہو۔''

''تمہارے چاہنے سے کیا ہوتا ہے اصل بات تو سرکار کے چاہنے کی ہے۔''

''یقین کرو، اگر ہم لڑنے پر اتر آئیں تو کم تعداد اور بغیر اسلحے کے بھی فوج کو تگنی کا ناچ نچا سکتے ہیں۔''

کمار نے ابھی کچھ دیر پہلے جو کامیابی حاصل کی تھی اس پس منظر میں بڑھکیں مارنا خاص بات نہیں تھی۔ میں ابھی بھی فکرمند تھا۔جب تک یہ قافلہ وادی تک نہ پہنچ جاتا ہم خود کو محفوظ نہیں سمجھ سکتے تھے۔میں نے کمار سے پوچھا۔''وادی، ابھی کتنی دور ہے۔''

''دو گھنٹے کی مسافت ہے بشرطیکہ کوئی اور نہ روک لے۔'' اس نے جواب دیا گویا اس کے ذہن میں بھی خدشہ تھا۔

''وادی کا کوئی نام تو ہو گا۔''

''ہاں، وادی ترجا۔'' اس نے بتایا۔''ہماری زبان میں ترجا دیوتاؤں کے دیوتا کو کہتے ہیں، ہمارے پرکھوں کا عقیدہ رہا ہے کہ یہ وادی ترجا کا مسکن ہے۔''

''میرا خیال تھا کہ تم ہندو ہو۔''

''ہاں، وہ تو ہیں لیکن ہمارے اپنے دیوتا ہیں۔ ہندومت میں ذاتی دیوتا رکھنا یا دوسرے دیوتاؤں کو ماننا لازمی یا منع نہیں ہے۔''

''ہاں، یہ تو ہے۔'' میں نے قائل ہو کر کہا۔ ''میرا خیال ہے سوائے ذات پات کے نظام کے کوئی بھی بات لازمی نہیں ہے۔''

''ہاں، یہ نظام دیوتاؤں کو ماننے سے بھی زیادہ ضروری اور مقدس ہے۔'' اس نے تلخی سے کہا۔

سورج غروب ہونے کے قریب تھا اور نچلے جنگل میں اندھیرا چھا گیا تھا۔ قافلے کے لئے خطرات بڑھ رہے تھے۔ مگر رفتار میں اضافہ ممکن نہیں تھا۔ اہل قافلہ پہلے ہی اپنی ممکنہ رفتار سے چل رہے تھے۔ کم سے کم ایک گھنٹا تاریکی میں سفر کرنا تھا۔ کسی حادثے سے بچنے کے لئے پہلے ہی مشعلیں روشن کر لی گئی تھیں۔ اس وقت ہم ایک تنگ گھاٹی سے گزر رہے تھے۔

کمار نے دونوں طرف دیکھا۔ ''بس یہاں سے نکل جائیں تو پھر خطرہ کم ہو جائے گا۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے، یہ گھاٹی چھپ کر حملہ کرنے کے لئے بڑی موزوں لگ رہی ہے۔''

میں نے اس کی تائید کی۔ ''چند مشین گن بردار پوری فوج کو تہس نہس کر سکتے ہیں۔''

''یہ بے چارے تو عام سے لوگ ہیں۔'' کمار نے کہا۔ ''کاش یہ حرام زادے اس کا خیال کر لیں۔''

ابھی کمار نے جملہ پورا ادا بھی نہیں کیا تھا کہ پہلا برسٹ ہم سے ذرا آگے جانے والے چار افراد کو لگا اور وہ لمحوں میں چھلنی ہو کر لاشوں میں بدل گئے تھے۔ اس کے بعد گھاٹی کے دونوں جانب بلندی سے ہم پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ یہ کم سے کم چار بھاری مشین گنیں تھیں جو چنگھاڑ رہی تھیں اور لوگوں کو مار رہی تھیں۔ ''بھاگو!'' کمار چند لمحے سکتے میں رہنے کے بعد چلایا۔ ''رکو مت، بھاگو۔''

لوگ اس کے حکم سے پہلے سر پر پاؤں رکھ کر گھاٹی سے دوسرے سرے کی طرف بھاگ رہے تھے۔ اس دفعہ فوج نے چالاکی سے کام لیا تھا۔ انہوں نے دوبدو مقابلے کے بجائے جس میں وہ دوبار ہزیمت اٹھا چکے تھے اس بار اس موزوں ترین مقام کی بلندیوں پر قبضہ کر کے وہاں دونوں جانب دو دو بھاری مشین گنیں نصب کیں اور جیسے ہی قافلہ گھاٹی کے وسط میں پہنچا، انہوں نے حملہ کر دیا تھا۔ ایک منٹ کے اندر اندر پچاسوں افراد اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے اور اس سے کہیں زیادہ زخمی ہو کر بے یار و مددگار پڑے ہوئے تھے۔ فائرنگ کے شور سے گھاٹی اس طرح گونج رہی تھی کہ کوئی اور آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ قافلے میں شامل مسلح افراد جواب دے رہے تھے مگر فائرنگ کرنے والے اپنے مورچوں میں بالکل محفوظ تھے۔ یہ جوابی کارروائی ان کا کچھ بگاڑنے سے قاصر تھی۔

لوگ بھاگ رہے تھے مگر فائرنگ سے کہیں جائے اماں نہیں تھی۔ دونوں طرف سے ہونے والی فائرنگ سے گھاٹی کا کوئی گوشہ محفوظ نہیں تھا۔ اگر زندہ رہنا تھا تو اس گھاٹی سے نکل جانا لازمی تھا۔ اس لئے سب بھاگ رہے تھے۔ جان کے خوف سے لوگ اپنے بچے چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ کمار چیخ چیخ کر ان کو تیز بھاگنے کو کہہ رہا تھا۔ میں اس کے ساتھ تھا اور ہم دونوں بھی بھاگ رہے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر جلد کچھ نہ کیا گیا تو اہل قافلہ مارے جائیں گے اور ان میں سے بہت خوش نصیب ہی زندہ بچیں گے۔

''کمار تمہارا تیر سے نشانہ کیسا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس وقت تیر کمان کا کیا کرنا ہے؟'' وہ چڑ گیا تھا، اپنے لوگوں کا قتل عام دیکھ کر اس کا غم و غصے سے برا حال تھا۔

''ہم ان کو روک سکتے ہیں۔''

''تیر کمان سے۔'' اس نے طنز کیا۔

''ہاں، مگر تمہارا نشانہ درست ہونا چاہئے۔''

''میں سو گز دور کھڑے ہرن کے سر میں تیر مار سکتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے اِدھر آؤ۔'' میں اسے گھسیٹ کر دو چٹانوں کے درمیان لے گیا جو فائرنگ سے کسی قدر محفوظ تھی۔ میں نے اپنی جیکٹ کی جیب سے ہینڈ گرینیڈ نکالا۔ ''اسے تیر کے سرے پر باندھ کر پھینکا جائے تو ان کے مورچے کو اڑایا جا سکتا ہے۔''

اس نے سوچا اور سر ہلایا۔ ''آئیڈیا برا نہیں ہے۔''

''بس تو شروع ہو جاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے تیر اور گرینیڈ باندھنے کے لئے کچھ دو۔''

اس نے مجھے ایک تیر اور اس پر باندھنے کے لئے پتلی سی رسی دی۔ ''اس سے کام چل جائے گا۔''

''کوشش کرتا ہوں۔'' میں نے کہا اور گول لمبوترے گرینیڈ کو اس رسی کی مدد سے تیر کی نوک سے باندھنے کی کوشش کرنے لگا مگر یہ کام خاصا دشوار تھا۔ اپنی گولائی کی وجہ سے گرینیڈ اس کی گرفت میں نہیں آ رہا تھا۔ کم سے کم اسے مضبوطی سے باندھنا ممکن نہیں تھا۔ کمار نے میری کوششوں کو دیکھتے ہوئے گرینیڈ مانگا اور اس کا بغور معائنہ کیا۔ اس نے چابی کا رنگ پکڑ کر ہلایا۔ ''یہ کیا ہے؟''

''خدا کے لئے یہ اس کی چابی ہے اسے نکال دیا تو پانچ سیکنڈ بعد ہم دونوں مرحوم ہو جائیں گے۔''

''یہ چابی نکالنے کے پانچ سیکنڈ بعد پھٹتا ہے۔'' اس نے پوچھا۔ میں نے اثبات میں جواب دیا تو اس نے دوسرا سوال کیا۔ ''اس چابی کو نکال دیا جائے تو اندر سوراخ ہوتا ہے؟''

''ظاہر ہے۔'' اب کے میں چڑ گیا تھا۔ ''تم نے اس کا کیا کرنا ہے؟''

''سنو اگر اس سے چابی نکال کر تیر کی نوک پر لگا دیا جائے تو میں اسے پانچ سیکنڈ سے پہلے نشانے پر پھینک سکتا ہوں۔'' اس نے یقین سے کہا۔

''اور اگر نہ پھینک سکے تو ہم دونوں مارے جائیں گے۔''

''نہیں، بس تم مجھے اتنا بتا دو کہ سوراخ کتنا ہو گا؟''

''تقریباً دو انچ کا۔'' میں نے کہا۔ ''چابی کی لمبائی اتنی ہی ہوتی ہے۔''

''کافی ہے، میں تیر ویسے بھی اوپر کر کے پھینکوں گا۔ تم چابی نکالتے ہی اسے تیر کی نوک پر لگا لینا۔ میں تیر پھینک دوں گا۔''

میں نے اس کی تجویز پر غور کیا، یہ قابلِ عمل تھی اور فرض کیا جائے کہ گرینیڈ تیر کی نوک میں صحیح سے نہیں بیٹھتا تو پانچ سیکنڈ سے پہلے ہم اسے دور پھینک سکتے تھے۔ میں نے سر ہلایا۔ کمار نے اپنی کمان نکالی اور اس میں

ایسا تیر لگایا جس کی نوک سیدھی اور دھات کی بنی تھی۔ اس نے کمان پوری طاقت سے کھینچی اور اس سے ایک مورچے کا نشانہ لیا۔ اپنے طور پر درست نشانہ لینے کے بعد اس نے کہا۔ "گرنیڈ لگادو۔"

ہمارے چاروں طرف گولیاں برس رہی تھیں۔ لوگ مر رہے تھے۔ زخمی ہو رہے تھے مگر اس طرف توجہ دینے سے ہماری توجہ اس کام سے ہٹ جاتی اس لئے ہم آنکھ اور کان بند کئے اپنا کام کرتے رہے تھے۔ میں نے تیر کی نوک کے پاس کھڑے ہو کر خدا سے دعا کی۔ کلمہ پڑھا اور پن کھینچ کر اس میں سوراخ والی جگہ میں تیر کی نوک داخل کر دی۔ وہ اس میں اتنی اچھی طرح فٹ ہو گئی جیسے اسی کام کے لئے ڈھالی گئی تھی۔

"فائر کرو۔" میں نے آہستہ سے کہا اور کمار نے تیر چھوڑ دیا۔ گرینیڈ کا وزن کم وبیش سوا کلوگرام تھا اور یہ کمار کے بازوؤں کی طاقت تھی جس نے اسے بلندی کے سفر پر روانہ کر دیا تھا۔ ہماری نظریں تیر پر مرکوز تھیں کم سے کم میں اسے صاف دیکھ رہا تھا اور مجھے لگ رہا تھا کہ میں تیر کو سلوموشن میں جاتے دیکھ رہا ہوں۔ ہمارے دل دھڑک رہے تھے، تیر اگر نشانے پر نہ گرتا یا گرینیڈ راستے میں پھٹ جاتا تو ہماری کوشش بے کار جاتی۔ میں سوچ رہا تھا کہ وقت پانچ سیکنڈ سے اوپر ہو گیا تھا اور گرینیڈ کسی لمحے بھی پھٹ سکتا تھا۔ مگر تیر نہ تو نشانے سے بھٹکا اور نہ ہی گرینیڈ قبل از وقت پھٹا۔ وہ سیدھا مورچے میں جا کر گرا اور اگلے ہی لمحے دھماکا ہوا۔ میں نے مشین گن چلانے والے کو گن سمیت پُرزے پُرزے ہو کر بکھرتے دیکھا۔ اس کے بعد مورچے میں لگاتار دھماکے ہونے لگے شاید وہاں پر بھی بم وغیرہ تھے۔

اس غیر متوقع حادثے نے دوسرے حملہ آوروں کو چونکا دیا تھا اور پھر خوف زدہ کر دیا۔ میں نے جلدی سے دوسرا گرینیڈ نکالا اور کمار نے کمان پر تیر چڑھالیا۔ اس نے اس طرف کے دوسرے مورچے کا نشانہ بنانے کا فیصلہ کیا تھا اور یہ درست فیصلہ تھا۔ ہم کم سے کم ایک طرف کی فائرنگ سے تو محفوظ ہو جاتے۔ اس نے مورچے کا نشانہ لیا اور کمان پوری طاقت سے کھینچ لی۔ "گرنیڈ لگاؤ۔" اس نے بھنچی آواز میں کہا۔

میں نے چابی کھینچ کر گرینیڈ تیر میں فٹ کیا اور کمار نے اسے بھی پھینک دیا۔ تیر زاویہ قائمہ بناتا ہوا کسی بیلسٹک میزائل کی طرح دوسرے مورچے پر گرا اور اس کے بھی پرزے بکھر گئے تھے۔

"کمال کر دیا۔" میں نے چلا کر کہا اور کمار کو گلے سے لگا لیا مگر اس کے چہرے پر کوئی خوشی نہیں تھی۔ اس کی نظریں چاروں طرف بکھری اپنے لوگوں کی لاشوں پر مرکوز تھیں۔ میں بھی سنجیدہ ہو گیا اور ندامت سے کہا۔ "مجھے افسوس ہے دوست!"

"میں نے برا نہیں مانا۔ اب تو یہ ہمارے لئے کھیل ہو گیا ہے۔"

بچ جانے والے مرد، عورتیں اور بچے اب اس طرف سے آڑ میں چل رہے تھے جس طرف سے فائرنگ بند ہو گئی تھی۔ جنگجو مردوں کو دم لینے کا موقع ملا تو انہوں نے اپنے سردار کا حربہ آزمایا۔ ان کے پاس بم نہیں تھے اس لئے انہوں نے آگ والے تیروں کی مشین گن کے مورچوں پر برسات کر دی۔ اس کا بھی خاطر خواہ ردِعمل ہوا۔ کئی ایک تیر مورچوں میں جا گرے جس سے ان میں افراتفری مچ گئی تھی اور میں نے ایسے ہی ایک موقع پر مورچے سے نکلنے والے دو کمانڈوز کو اپنی رائفل سے نشانہ بنا لیا۔

"شاندار!" کمار نے بے ساختہ میری پیٹھ ٹھونکی اور جب میں چپ رہا تو وہ کھسیا گیا تھا۔

"معاف کرنا، میں بھی بھول گیا تھا۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے سر ہلایا۔

اچانک اوپر کی طرف دھما کا ہوا۔ ایک اور مورچہ شعلوں کی لپیٹ میں تھا کہ جلتے تیر نے کام کر دکھایا۔ جو گولا بارود وہ ان لوگوں کی موت کے لئے لائے تھے اب وہ خود ان کے لئے سامانِ مرگ بن گیا تھا۔ چوتھے مورچے سے فائرنگ رک گئی اور اس سے کمانڈوز نکل کر بھاگے۔ قبائلی ان کو رائفلوں اور تیروں سے نشانہ بنا رہے تھے۔ دس بارہ افراد میں سے ایک دو کو ہی بچ کر نکلنے کا موقع ملا تھا۔ حملہ آور تقریباً سارے ہی اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے مگر اس گھاٹی میں بھی کم و بیش ہزار افراد کی لاشیں بکھری تھیں اور اتنے ہی زخمی تھے۔

جب فائرنگ کا خطرہ ٹلا تو لوگوں نے زخمیوں کی مدد شروع کر دی۔ لوگ اپنے مرنے والوں کو رو رہے تھے اور ان کا نام لے لے کر دہائیاں دے رہے تھے۔ میں نے کمار سے کہا۔ "وقت ضائع کرنے کے لئے بالکل نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو کہ زمینی کارروائیوں میں پے در پے ناکامیوں کے بعد وہ پھر فضائیہ کی مدد مانگ لیں۔ اس لئے لوگوں کو چلنے پر آمادہ کرو۔"

کمار بمشکل ان کو آمادہ کر سکا تھا کہ لاشیں اور شدید زخمیوں کو چھوڑ کر ان کو فوری روانہ ہو جانا چاہئے ورنہ حملہ آور پھر آ سکتے ہیں۔ خوف نے بھی کام کیا اور لوگ چل پڑے۔ نئے زخمیوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں تھی اس لئے صرف وہ ساتھ ہوئے جو زخمی ہونے کے باوجود خود چل سکتے تھے۔ کمار نے ان کو حکم دیا تھا کہ کوئی کسی کی پروا نہ کرے جو جتنا تیز چل سکتا ہے وہ چلے اور وادی تک پہنچنے کی کوشش کرے۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا جانوروں پر سوار افراد کو آگے رکھنے سے ہی اتنا جانی نقصان ہوا تھا۔ انسانوں کے ساتھ بے شمار جانور بھی مارے گئے تھے۔ انسان بڑا سخت جان ہے، سارے زخم اور سارے غم جھیل جاتا ہے، جن عزیزوں کے مرنے پر دکھ سے غور کر رہا ہوتا ہے کچھ دیر بعد ان کو بھول جاتا ہے۔ اب سب مرنے والوں کو بھول کر اپنی جان بچانے کی فکر میں تھے۔ تیز تیز چل رہے تھے۔ ہر فرد دوسرے سے آگے نکل جانا چاہتا تھا۔ خدا خدا کر کے اس خونیں گھاٹی سے نکلے تو سامنے ایک تہہ در تہہ پہاڑی سلسلہ تھا اور اس کے سامنے نسبتاً مشرق میں برف پوش چٹانوں کا ایک قلعہ کھڑا تھا۔ کمار میرے پاس تھا اس نے اشارے سے قلعے کو دکھایا۔

"وہ رہی وادی تر جا۔"

اپنے محلِ وقوع کے لحاظ سے یہ وادی واقعی ناقابلِ تسخیر لگ رہی تھی۔ اس کا دروازہ فی الحال نظر نہیں آ رہا تھا۔ قافلہ اس طرف رواں تھا، منزل سامنے نظر آئی تو لوگوں کے قدموں میں تیزی آ گئی تھی۔ اب مجھے بھی اطمینان تھا، ہم خطرے کی حد سے نکل آئے تھے۔ اگرچہ ان لوگوں نے بے پناہ قربانی دی تھی۔ دس ہزار میں سے بمشکل سات ہزار افراد وادی کے قریب تھے۔ تین ہزار لوگ مارے جا چکے تھے۔ کہا جاتا ہے دوسری جنگ عظیم میں بیلجیم کی بائیس فی صد آبادی موت کے گھاٹ اتر گئی تھی۔ اس قبیلے کے تیس فی صد لوگ دو دن سے بھی کم وقت میں مارے جا چکے تھے۔

یہ وسیع میدان جو برف پگھلنے پر گھاس اور دوسری نباتات سے ڈھک جاتا ہوگا، برف سے سفید ہو رہا تھا۔ کمار اپنے آدمیوں کو کسی قسم کی ہدایات جاری کر رہا تھا۔ میں نے ساتھ چلتے بیتو سے پوچھا۔

''کمار کیا کہہ رہا ہے؟''

''سردار آگے جانے والوں کو بغیر رکے پل عبور کرنے کا حکم دے رہا ہے۔ پل تنگ اور خطرناک ہے، اس پر سے ایک وقت میں دس سے زیادہ لوگ نہیں جا سکتے۔''

''دس لوگ!'' میں نے پریشانی سے ان ہزاروں افراد کو دیکھا۔ ''اس طرح تو پل کراس کرنے میں بہت دیر لگ جائے گی۔''

''وہ تو ہے۔''

''اور پیچھے سے لشکر آ گیا تو؟''

''کیا، ہم سمجھا نہیں صاب!''

''تعاقب میں آنے والے فوجی درندے۔''

بیتو کا چہرہ ست گیا تھا۔ صاب! اب ہم ان کو نہیں چھوڑے گا۔ جب تک زندہ رہے گا، ان کو مارتا رہے گا۔ ہماری ماں، دو بھائی، چاچا، سب مارا، ان لوگوں نے......''

''کل کے حملے میں؟'' میں دنگ رہ گیا تھا۔

بیتو کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے تھے۔ ''ہاں، ان کا لاش ادھر ہی چھوڑا۔ اب جانور ان کو کھائے گا۔ دیوتا ترجا کا سوگند، ہم ان کو نہیں چھوڑے گا۔''

میں نے مستقبل کے اس انقلابی کو دیکھا۔ ظلم کرنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ ان کے ظلم سے ہی سر پھرے انقلابی جنم لیتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آگے جا کر بیتو ان ظالموں کو کیا نقصان پہنچائے گا مگر اس کے الفاظ پر مجھے کوئی شبہ نہیں تھا۔ وہ جب تک زندہ رہے گا، ان سے لڑتا ہی رہے گا۔ اس سے رسمی تعزیت بے کار تھی۔ یہاں سب ہی دکھی تھے، میں نے اس کے شانے پر ہاتھ مارا اور آگے بڑھ گیا۔ تاریکی کی وجہ سے قبائلیوں نے پھر مشعلیں جلا لی تھیں۔ پیچھے سے بھاگتے قدموں کی آواز آئی۔ میں چوکنا ہو گیا۔ میں قافلے کے سب سے پچھلے حصے میں تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا، دو قبائلی بھاگے آ رہے تھے اور ان کا رخ کمار کی طرف تھا، اس کے پاس جا کر انہوں نے تیز لہجے میں کچھ کہا۔ کمار نے سوال کرنے کے انداز میں پوچھا۔ اور پھر وہی سیٹی نکال کر بجائی، میں اس کی طرف لپکا۔ ''کیا ہوا ہے؟''

''عقب میں کچھ لوگ آ رہے ہیں، وہ اجنبی ہیں۔''

''وہ فوج کے آدمی ہیں۔'' میں نے یقین سے کہا۔ ''اپنے آدمیوں کو بھاگنے کا حکم دو۔ جو جتنی دور جا سکتا ہے چلا جائے۔''

کمار نے اپنے لوگوں کو حکم دیا۔ یہ سن کر کہ موت کے ہرکارے تعاقب میں ہیں، انہوں نے ہراساں ہو کر بھاگنا شروع کر دیا۔

''کمار، بیتو نے بتایا کہ پل سے صرف دس آدمی گزر سکتے ہیں؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''یہ درست ہے۔''

''کسی کو پل کی طرف لگا دو ورنہ یہ بدحواس ہجوم پل ہی نہ توڑ دے۔''

''اس کی فکر مت کرو۔ اس کے محافظ الگ ہیں۔ وہ پل کی حفاظت کرنا جانتے ہیں۔''

''ہمیں آنے والوں کو روکنا ہوگا۔'' میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا۔ ''اس میدان میں کہیں مورچہ بھی نہیں بنایا جاسکتا۔''

''یہ تو ہے۔'' کمار نے فکرمندی سے کہا۔ ''یہاں نہ تو درخت ہیں اور نہ چٹانیں۔''

''پتھر تو ہیں۔'' میں نے اِدھر اُدھر بکھرے مکعب فٹ سائز کے پتھر دیکھے۔ ہمالیہ اور اس سے ملا ہوا کئی ایک پہاڑوں کا سلسلہ زیرزمین لاوے کے سمندر پر تیرتی براعظمی پلیٹوں کے ٹکراؤ کے عمل سے وجود میں آیا تھا۔ براعظم ایشیا اور آسٹریلیا کی پلیٹیں جب اس مقام سے ٹکرائیں تو اس ٹکراؤ کے نتیجے میں زمین اوپر اٹھ گئی اور یہی الٹا ہوا حصہ آج ہمالیہ کہلاتا ہے۔ اس جگہ آتش فشاں بھی تھے جو اب مردہ ہو چکے ہیں لیکن لاوے کی باقیات ان میدانوں میں بکھرے پتھروں کی صورت میں آج بھی موجود ہیں۔

''کمار اپنے آدمیوں کو جمع کرو۔ جو لڑنے والے ہیں، ان سے کہو، پتھر جمع کر کے مورچے بنائیں ایک دائیں جانب اور دوسرا بائیں جانب۔ پھر سو قدم پیچھے اسی طرح دو مورچے بنائیں۔''

''اس سے کیا ہوگا؟''

''فوج کی پیش قدمی کی رفتار سست کی جاسکتی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ پل کے پار جاسکیں۔''

بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے چیخ چیخ کر اپنے آدمیوں کو حکم دینا شروع کر دیا۔ یہ ویسے تو جاہل اور جذباتی قسم کے لوگ تھے مگر ان کے اندر ایک خاص قسم کا قبائلی ڈسپلن تھا۔ جب ان کا سردار کوئی حکم دیتا تھا تو یہ دل وجان سے اس پر عمل کرتے تھے۔ اس وقت بھی انہوں نے بے پناہ تھکن کے باوجود حیرت انگیز پھرتی اور نظم و ضبط سے کام شروع کر دیا۔ کمار نے نو دستے بنائے جن میں دس دس افراد تھے۔ یہ دس افراد سو گز کے دائرے میں سے پتھر چن کر لائے اور ایک جگہ جمع کرنے لگے تھے۔ مشکل سے پندرہ منٹ میں پہلے تین مورچے بن گئے تھے اور ہر ایک کے درمیان سو گز کا فاصلہ تھا۔ کمار نے مورچوں میں جو پتھروں کی تین فٹ اونچی نصف دائرے کی دیوار تھی، دو افراد کو تعینات کیا۔ ان کے پاس رائفلیں تھیں اس اثنا میں پیچھے کے تین مورچے بھی تیار ہو گئے اور اس سے پیچھے کے بھی۔ ہر قطار کے درمیان سو گز کا فاصلہ تھا۔ پتھر جمع کرنے والے اور پیچھے چلے گئے تھے۔ ہر مورچے میں دو افراد تھے۔ لگاتار دس قطاریں بنائی گئیں جن میں کل تیس مورچے تھے۔ یہ قطاریں ایک کلومیٹر لمبی اور تین سو میٹرز چوڑی تھیں۔ کمار نے اچھی دفاعی لائن بنائی تھی۔ ان مورچوں میں کل ساٹھ افراد تھے اور یہ جنگجو افراد پامردی سے مقابلہ کرتے تو فوج کو دیر تک روک سکتے تھے۔ جب اگلے مورچوں پر دباؤ زیادہ ہو جاتا تو وہ پچھلے مورچوں کی طرف آسکتے تھے۔ ان سب سے پیچھے کمار تین جگہوں پر پتھروں سے بڑے مورچے بنوا رہا تھا۔ اب سوائے جنگجوؤں کے سب پیچھے جاسکتے تھے۔ تقریباً دو سو افراد تھے۔ ان میں سے نصف آتشیں ہتھیاروں سے مسلح تھے اور نصف کے پاس تیر کمان تھے۔ میں نے ذرا پیچھے آکر کمار سے پوچھا۔

''ان مورچوں کا کیا کرنا ہے؟''

''ان میں تیرانداز ہوں گے۔'' اس نے بتایا۔ ''جب شروع کے مورچے خالی ہو جائیں گے اور میرے آدمی پیچھے آئیں گے تو ان سے آتشیں تیر پھینکیں گے۔''

''بشرطیکہ انہوں نے اس کی مہلت دی۔'' میں نے سر ہلایا۔

''کیا مطلب؟''

''اس بار وہ بڑے ہتھیار استعمال کریں گے۔ ہمیں مزاحمت کا موقع دیئے بغیر کچل ڈالیں گے۔ وہ راکٹ اور میزائل بھی استعمال کر سکتے ہیں۔''

''تب، ہم کیا کریں؟''

''اپنا یہ مؤثر حربہ پہلے ہی استعمال کرو۔ ورنہ کیا فائدہ ایک راکٹ اس کمزور مورچے کو بکھیر کر رکھ دے گا۔'' میں نے کہا۔ ''شروع میں آتشیں تیر برسانے کے دو فائدے ہیں۔ ایک تو اس طرف کا ماحول روشنی میں نظر آئے گا۔ دوسرے وہ حرارت پر لپکنے والے راکٹ استعمال نہیں کر سکیں گے۔''

''مگر اس جگہ سے اتنی دور تیر نہیں پھینکے جا سکتے۔''

''آگے والے مورچوں کو مزید پتھر لگا کر بڑا کرو۔ ابھی ہمارے پاس وقت ہے، آتشیں ہتھیاروں سے مسلح لوگ پیچھے آ جائیں گے۔''

کمار نے فوری طور پر تیر اندازوں کے مورچے آگے لانے کا حکم دیا۔ بغیر کسی احتجاج یا چوں چرا کے وہ سامنے والے حصے میں پتھر جمع کرنے لگے تھے۔ ان کے جسم مضبوط اور اسٹیمنا قابلِ رشک تھا۔ نصف گھنٹے کے اندر سامنے تین عدد بڑے مورچے بن چکے تھے۔ ان کے پیچھے مٹی کے تیل کے ڈبے رکھ دیئے گئے تھے اور پاس ہی مشعل جل رہی تھی۔ باقی سب مورچوں میں بھی قبائلیوں نے پوزیشنیں سنبھال لی تھیں۔ قافلہ خاصا دور جا چکا تھا اور قلعے کے پاس تھا۔

''میرا خیال ہے اتنے لوگوں کو پل عبور کرنے میں دو گھنٹے تو لگیں گے۔'' میں نے کہا۔

''ہمیں ان کو دو گھنٹے تک روکنا ہے۔'' کمار نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

چاند نکل آنے سے سامنے کا منظر نظر آنے لگا تھا۔ یہ چودھویں کا چاند تھا جیسے جیسے بلند ہو رہا تھا روشنی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے کمار کی طرف دیکھا۔ ''کاش کہ ایک دوربین ہوتی۔''

''یہ لو۔'' اس نے اپنی جیب سے ایک دوربین نکال کر مجھے دے دی۔

''کاش میں کچھ اور مانگ لیتا۔'' میں نے سرد آہ بھری۔

''تم کچھ اور کیسے مانگ سکتے تھے جبکہ میرے پاس صرف دوربین تھی۔'' وہ ہنسا۔

''یہ بھی ٹھیک ہے۔'' میں نے دوربین کا معائنہ کیا۔ یہ کوئی ایک فٹ لمبی اور ایک نلکی والی دوربین تھی۔ ''یہ عام طور سے دور مار رائفلوں پر ہوتی ہے۔'' میں نے کمار کو بتایا۔

''یہ رائفل پر ہی لگی تھی۔ رائفل میرے ایک آدمی کے پاس ہے دوربین سے اسے الجھن ہو رہی تھی اس لئے اس نے اسے اتار دیا۔''

''بہت خوب، وہ دور مار رائفل ہو گی۔ اس سے فوراً رائفل منگواؤ۔''

''وہ یہیں ہے۔'' کمار نے کہا اور اس آدمی کو آواز دی۔ وہ ایک مورچے سے دوڑتا ہوا آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک جدید ترین رائفل تھی۔ میں نے رائفل لے کر اس کا معائنہ کیا۔

"یہ اس نے کہاں سے لی ہے؟"

کمار نے اس سے پوچھا اور مجھے بتایا۔ "اس نے جنگل میں مارے جانے والے ایک بھارتی فوجی کے پاس سے اٹھائی تھی۔"

میں نے میگزین چیک کیا۔ یہ تیس گولیوں والا میگزین تھا اور اس میں صرف دو گولیاں تھیں۔ میں نے مایوسی سے کمار کی طرف دیکھا۔ "اس میں صرف دو گولیاں ہیں اور اس میں کسی اور رائفل یک گولی نہیں لگے گی۔ یہ اس کا مخصوص کارتوس ہے۔"

کمار نے اس آدمی سے پوچھا اور میں خوشی سے اچھل پڑا جب اس نے اپنے لباس سے دو عدد میگزین نکالے۔

"اب مزہ آئے گا۔" میں نے اس سے میگزین لے لئے۔ رائفل پر دوربین فٹ کی، شکر ہے اس قبائلی نے اسے توڑ کر نہیں نکالا تھا۔ میں نے دوربین ایڈجسٹ کی اور ذرا دور میدان میں پڑے ایک سیاہ پتھر کا نشانہ لیا اور گولی چلا دی۔ دھماکا ہوا اور گولی بالکل درست جگہ لگی، میں نے پتھر سے کرچیاں اڑتی دیکھیں۔ پتھر مجھ سے کوئی چار سو گز کے فاصلے پر تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس رائفل کی مار کم سے کم ایک ہزار گز ہوگی اس کی لمبی نال اور پتلے لمبی کارتوس سے ایسا ہی لگ رہا تھا۔

"وہ لوگ فائر کی آواز سے چوکنا نہ ہو جائیں؟"

"وہ چوکنا ہی ہوں گے۔" میں نے جواب دیا۔ "کمار! اب میرے لئے مورچہ بنانا ہے، یہ دائیں طرف جو نسبتاً بلند جگہ ہے اس میں پتھر رکھ کر اور ان کے آگے خشک جھاڑیاں جمع کر کے مورچہ بناؤ، میں وہاں سے آنے والوں کو نشانہ بناؤں گا۔"

"نہیں، یہ خطرناک ہے۔ تم آسانی سے ان کا نشانہ بن جاؤ گے۔"

"وقت آ گیا تو میں کہیں بھی نہیں بچ سکوں گا۔" میں نے جواب دیا۔ "اس لئے بحث مت کرو جو کہا ہے، وہ کرو ورنہ وہ آ گئے اور میرا مورچہ پہلے ہی دیکھ لیا تو میں ضرور مارا جاؤں گا۔"

"وہ کیسے دیکھ لیں گے؟"

"یار، عقل استعمال کرو۔ ان کے پاس اس سے کہیں زیادہ جدید دوربینیں ہیں۔ وہ رات کی تاریکی میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔"

کمار نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا اور وہ میرے لئے مورچہ تیار کرنے میں لگ گئے۔ دس منٹ میں انہوں نے ایسا مورچہ تیار کر دیا تھا جس میں، مَیں محفوظ تھا اور اس میں جھاڑیوں سے ایسی مہارت سے آڑ لگائی گئی تھی کہ یہ کوئی قدرتی جھاڑی نظر آتی تھی۔ میں اس میں چھپ کر لیٹا تو میرے اوپر مزید جھاڑیاں ڈال دی گئی تھیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ دور سے جھاڑیوں کا یہ انبار کیسا لگ رہا تھا مگر مجھے قبائلیوں کی مہارت پر یقین تھا۔ میں نے رائفل کی نال پر مٹی لگا دی تھی تاکہ وہ چمک نہ دے اور دوربین ویسے ہی جھاڑیوں تلے تھی۔ میری پوزیشن ایسی تھی کہ میں درّے سے نکل کر آنے والے کو بہ آسانی دیکھ سکتا تھا۔ میں نے دوربین گھما کر آنے والوں کی تلاش شروع کی مگر دور دور تک میدان صاف تھا اور کہیں بھی کوئی حرکت نہیں تھی۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ اب تک ان لوگوں کو کم

سے کم اس میدان تک آ جانا چاہئے تھا۔ اگر وہ تاخیر کر رہے تھے تو اپنا ہی نقصان کر رہے تھے اور ہمارے لئے یہ اطمینان بخش بات تھی مگر یہ ان کی طرف سے دھوکا بھی ہو سکتا تھا۔ ممکن ہے وہ کوئی ایسی چال چل رہے ہوں جس کا ہمیں بھی علم نہ ہو۔

میں نے دوربین سے تلاش جاری رکھی۔ چاند کے بلند ہونے سے سارا منظر واضح نظر آ رہا تھا۔ میں نے سردی سے سن ہو جانے والا پہلو بدلا۔ اگرچہ جھاڑیوں سے کسی قدر تحفظ ملا تھا اس کے باوجود سردی رگ و پے میں گھسی جا رہی تھی۔ میں کچھ دیر کے لئے ساکت ہو کر لیٹا تو پتا چلا تھا سردی کا۔ شکر ہے ان جھاڑیوں میں کیڑے مکوڑے نہیں تھے ورنہ دشمن سے پہلے وہی مجھے باہر آنے پر مجبور کر دیتے۔ معاً مجھے لگا جیسے کوئی مکھی بھنبھنائی ہو، اتنی بلندی اور اتنی سردی میں مکھیاں۔ میں نے سوات اور کالام کے علاقوں میں دس ہزار فٹ کی بلندی پر بھی عام مکھیاں دیکھی تھیں مگر وہ سردی میں بلوں میں گھس جاتی ہیں۔ اسی طرح وہ خوفناک سرما میں اپنا بچاؤ کرتی تھیں۔ وہ صرف گرمیوں میں باہر نکلتی ہیں۔

میں نے مکھی بھنبھنانے کی آواز کو وہم سمجھا تھا مگر چند لمحے بعد آواز زیادہ واضح ہو کر سنائی دی تھی اور پھر یہ آواز تیز ہوتی چلی گئی اور میں کچھ دیر بعد تو اچھل پڑا تھا۔ یہ آواز ہیلی کاپٹر کی تھی۔ میں نے درّے سے ایک پرندہ برآمد ہوتے دیکھا۔ وہ بتدریج بڑا ہونے لگا۔ کمار اور اس کے ساتھیوں کو خبردار کرنا بے کار تھا۔ انہوں نے مجھ سے پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ میں نے کمار کی آواز سنی۔ وہ اپنے ساتھیوں کو چلا چلا کر کچھ کہہ رہا تھا اور میں نے اس کا فوری نتیجہ دیکھا۔ جلتے تیروں کی ایک باڑھ فضا میں ہوئی، یہ بات کمار نے سمجھ لی تھی کہ جب ہیلی کاپٹر آ رہے تھے تو پیدل دستے بھی آس پاس تھے اور اس نے اپنے آدمیوں کو تیر اندازی کا حکم دے دیا تھا۔ درجنوں تیر درمیان میں گرے، ہیلی کاپٹر اب نمایاں تھا اور میں نے درّے سے ایسے ہی دو پرندے اور آتے دیکھے۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ تین گن شپ ہم پر قیامت برپا کر سکتے تھے۔ میں نے دوربین سے دیکھا۔ یہ ایم آئی پچیس قسم کے گن شپ ہیلی کاپٹر تھے۔ ان کے نیچے راکٹ اور سامنے والے حصے میں چھ نالی والی مشین گن نصب تھی۔ روسی فوج نے افغانستان میں بے دریغ ان کا استعمال کیا تھا اور بلاشبہ لاکھوں بے گناہ افغانیوں کا خون ان کے پروں پر تھا۔ انہیں عرف عام میں ہند کہا جاتا ہے۔ یہ امریکی کوبرا گن شپ کا روسی جواب تھے۔

میں نے عقبی ہیلی کاپٹرز کو دیکھنے کی کوشش کی مگر وہ ابھی دور تھے۔ اچانک سامنے والا گن شپ بلند ہونے لگا۔ وہ شاید رائفلوں کی مار سے دور محفوظ بلندی پر رہ کر حملہ کرنا چاہتا تھا۔ خاصی بلندی پر جا کر اس نے زاویہ بنایا اور راکٹ فائر کر دیئے۔ دور راکٹ میدان میں گرے۔ یہ مورچوں سے دور تھے اس لئے کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کمار کے آدمیوں نے ہیلی کاپٹر پہ جوابی فائرنگ کی مگر وہ ان کی پہنچ سے دور اور محفوظ بلندی پر تھا۔ اس نے پھر راکٹ فائر کئے۔ اس بار ایک مورچہ راکٹ کی زد میں آ گیا اور مورچے کے ساتھ اس میں موجود افراد کے بھی ٹکڑے ہو گئے تھے۔ اس کے بعد تو اس نے بے پناہ راکٹ باری کی۔ کئی مورچے تباہ کر دیئے۔ باقی جان بچانے کے لئے اپنی جگہوں پر دبک گئے تھے۔

اس اثنا میں دوسرے گن شپس بھی آ گئے اور انہوں نے بھی حملے کی پوزیشن سنبھال لی۔ وہ کوئی پانچ سو میٹرز کی بلندی پر اُڑ رہے تھے اور اتنی بلندی پر رائفل کی گولی بے ضرر ہو جاتی تھی۔ کمار کے ساتھی ان پر فائرنگ کر

رہے تھے جو قطعی بے سود تھی اس کے مقابلے میں ان کے وار کارگر جا رہے تھے۔ راکٹ عام لوگوں کے لئے خاصا خوفناک ہتھیار ہے۔

پہلے حملہ کرنے والے ہیلی کاپٹر نے اب اپنی چھ نالی والی مشین گن استعمال کرنا شروع کر دی تھی اور وہ ہوا میں ساکت رہ کر نیچے گولیاں برسا رہا تھا۔ مشین گن تین سو ساٹھ ڈگری کے زاویے پر گھوم سکتی تھی اس لئے گن شپ کو گھمانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے دوربین سے جائزہ لیا۔ ذرا ترچھا ہونے کی وجہ سے گن شپ کا کیبن میری نظروں سے دور تھا البتہ اس کا عقبی حصہ میرے سامنے تھا جس میں پیٹرول ٹینک ہوتا ہے۔ میں نے پیٹرول ٹینک کا نشانہ لیا اور سانس روک کر گولی چلا دی۔ میں نے پیٹرول ٹینک میں سوراخ ہوتے اور اس سے تیل کی دھار نکلتے دیکھی۔ فوراً ہی میں نے دوسری گولی چلائی اور ایندھن نے آگ پکڑ لی۔ گن شپ نے فوری طور پر اوپر اٹھنا شروع کر دیا تھا۔ مگر اسے زیادہ دور جانا نصیب نہیں ہوا۔ آگ نے ایندھن کے ذخیرے تک رسائی حاصل کی اور دھماکے سے فضا میں گن شپ کے پُرزے بکھر گئے۔ اس کے پائلٹ اور کو پائلٹ کو نکلنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس کے اثر سے دوسرے گن شپ بھی بلند ہوئے اور میدان سے دور جانے لگے۔ میں نے رائفل کو چوم لیا۔ یہ بھارتی فوج کی رائفل تھی اور اب اسی کے خلاف استعمال ہوئی تھی گویا جس کا جوتا تھا اسی کے سر پر پڑا تھا۔ میں نے دوسروں کا نشانہ لینے کا ارادہ ترک کر دیا۔ میں نے درّے کی طرف رائفل گھمائی اور اس بار مجھے درجنوں سیاہ پوش کمانڈوز نظر آئے، وہ گھاس اور جھاڑیوں میں چھپے گن شپس کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ نمودار ہوئے اور پیش قدمی کرنے لگے۔ میں نے سامنے والے ایک کمانڈو کا نشانہ لیا۔ وہ ایک کلومیٹر کی حد میں تھا۔ میں نے اسے اڑا دیا۔ فوراً ہی دوسرے کو نشانہ بنایا اور اس کے بعد باقی زمین پر گر گئے تھے مگر وہاں چھپنے کی جگہیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ میں نے دو کو اور نشانہ بنایا تو وہ اٹھ کر بھاگے تھے۔ ان کا رخ درّے کی طرف تھا۔ جاتے جاتے میں نے تین کو اور مار گرایا تھا۔ اس کے بعد وہ غائب ہو گئے۔

اب وقت ضائع کرنا بے کار تھا۔ میں اپنی پناہ گاہ سے نکلا اور مورچوں کی طرف دوڑا۔ سامنے کے تینوں مورچے تباہ ہو گئے تھے اور ان میں موجود تیر اندازوں کی لاشیں چاروں طرف بکھری ہوئی تھیں۔ کمار کو زندہ اور سلامت دیکھ کر میں نے سکون کا سانس لیا۔ وہ اپنے تیر اندازوں کو دوبارہ پیچھے کی طرف تیر اندازی کرنے کا حکم دے رہا تھا۔ اس بار تیر بغیر آگ کے پھینکے جا رہے تھے تاکہ بے خبری میں دشمن کو نشانہ بنا لیں۔

"کمار نکلو یہاں سے، گن شپ پھر حملہ کرنے آئیں گے، سب پھیل کر چلو۔"

"تم نے کمال کر دیا ورنہ مجھے اپنے بچنے کا یقین نہیں تھا۔" اس نے بھرائی آواز میں کہا۔

"دیر مت کرو ایسا نہ ہو وہ دوسرے لوگوں پر حملہ کریں یا پل تباہ کر دیں۔"

کمار دم بخود رہ گیا تھا اس نے کہا۔ "یہ خیال تو مجھے آیا ہی نہیں تھا۔"

"بس اب چلو۔ پیچھے آنے والے کمانڈوز پسپا ہو گئے ہیں مگر ذرا دیر سے سہی وہ پھر آئیں گے۔"

زخمیوں کو سنبھال کر سب نے وادی کی طرف سفر شروع کر دیا۔ البتہ تیر انداز دستہ ذرا پیچھے رہ گیا تھا۔ وہ برابر تیر پھینک رہا تھا تاکہ بھارتی فوجیوں کو آگے آنے کی جرأت نہ ہو۔ تیر اَن دیکھی موت کی طرح تھے۔ اچانک ہی نازل ہوتے۔ فی الحال یہ گولی سے زیادہ خطرناک ثابت ہو رہے تھے کیونکہ یہ میزائل کی طرح اوپر سے نیچے

آ تے تھے اور کہیں چھپے بھارتی فوجی بھی ان سے محفوظ نہیں تھے۔ کمار نے ان کو پیچھے چھوڑ کر درست فیصلہ کیا تھا۔ تیس کے قریب تیر انداز ہر بیس سیکنڈ میں ایک تیر پھینک رہے تھے اور وہ سب ایک ساتھ پھینکتے تھے۔ بس ذرا زاویہ بدل لیا کرتے تھے۔ تا کہ کوئی جگہ تیروں کی مار سے محفوظ نہ رہے۔

ہم وادی کی طرف روانہ ہوئے تھے۔ ابھی ہم نے بھاگتے ہوئے ایک کلومیٹر کا سفر طے کیا تھا کہ گن شپس دوبارہ نظر آئے۔ وہ عقب سے چکر کاٹ کر اچانک دائیں طرف سے نمودار ہوئے تھے اور اسی وقت میں نے وادی میں داخلے کا دروازہ اور اس کے سامنے گھاٹی پر بنے پل کو دیکھ لیا۔ چٹانوں کے نیچے پتھروں میں سرنگ بنا کر یہ دروازہ بنایا گیا تھا۔ کیونکہ اس کے اوپر کئی سوفٹ اونچی چٹانی دیوار تھی۔ دروازے کے سامنے مختصر سا چھجا تھا جو گھاٹی کے اوپر معلق تھا اور اس سے رسیوں کی مدد سے جھولنے والا پل بنا کر گھاٹی کے آر پار جانے کا راستہ نکالا گیا تھا۔ پل مختصر سا لگ رہا تھا اور اس کے سامنے پار جانے والوں کا ہجوم تھا۔ ہیلی کاپٹر دیکھتے ہی کمار نے چلا کر کچھ کہا۔ اس کے ساتھی اور دور دور ہونے لگے تھے، آس پاس ہو کر ہم گن شپس کے لئے اچھا نشانہ بن سکتے تھے۔

شہباز! تم پھر ان کو نشانہ بنا سکتے ہو؟'' کمار نے مجھے دیکھا۔

''کوشش کر سکتا ہوں۔ بشرطیکہ ایک جگہ ساکت ہوں اور ان کے پیٹرول ٹینک بھی میرے نشانے پر ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اس میں میری نشانہ بازی سے زیادہ تقدیر کا عمل دخل ہے ورنہ اس دوربین لگی رائفل سے تو ایک بچہ بھی نشانہ لے سکتا ہے۔''

''تم کوشش کرو۔'' اس نے کہا۔

میں ایک نسبتاً بڑے پتھر کے عقب میں دبک گیا تھا۔ گن شپس کے پائلٹوں نے دیکھ لیا تھا کہ ان کا نشانہ بکھر گیا ہے تو انہوں نے راکٹ مارنے کے بجائے مشین گنوں سے کام لیا اور گولیاں برساتے ہماری طرف آنے لگے تھے۔ میں جس جگہ تھا وہیں آڑ سے رائفل کی نال نکالی اور آگے والے گن شپ کی ونڈ اسکرین کا نشانہ لیا۔ اس کے سیاہ رنگ کے پیچھے مجھے پائلٹ نظر نہیں آ رہا تھا اس لئے میں نے اندازے سے کام لیا۔ عام طور سے طیاروں یا ہیلی کاپٹرز کی ونڈ اسکرین شفاف شیشے کی ہوتی ہے تا کہ پائلٹ کو باہر دیکھنے یا طیاروں اور ہیلی کاپٹرز کی تعداد زیادہ ہو تو ان کے پائلٹوں کو ایک دوسرے کو دیکھنے اور اشارے سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ جب یہ کسی مشن پر ہوتے ہیں تو اپنا ریڈیو اور دوسرے مواصلاتی آلات بند رکھتے ہیں تا کہ دشمن سراغ نہ لگا سکے۔ حملے کی حکمت عملی اور دوسری بات چیت اشاروں کی زبان میں ہوتی ہے مگر ان گن شپس کے شیشے سیاہ تھے، شاید کسی خاص وجہ سے۔

میں نے دیکھا، گن شپ کی مشین گن گولیاں برساتی میری طرف ہی آ رہی تھی، میں نے اسے نظر انداز کیا اور سانس روک کر فائر کر دیا۔ گولی کی رفتار کو سامنے سے برق رفتاری سے آتے گن شپ کی رفتار نے اور بھی قوت دی اور میں نے دوربین سے شیشہ تڑختے دیکھا۔ اس میں سوراخ ہو گیا تھا۔ گن شپ ڈگمگایا۔ میں نے دوسرا فائر کیا اس بار بھی شیشے میں ایک اور جگہ سوراخ ہوا۔ یہ کہنا دشوار تھا کہ گولی پائلٹ یا اس کے ساتھی کو لگی یا نہیں؟ بہر حال گن شپ کی مشین گن رک گئی اور اس نے فوری طور پر بلند ہونا شروع کر دیا۔ اس کے پیندے میں گولی مارنا بے کار تھا کیونکہ نیچے موٹی دھاتی چادر ہوتی ہے جو گن شپ کو نقصان سے بچاتی ہے۔

دوسرا گن شپ ذرا سا پیچھے سے اور میرے بائیں طرف سے گولیاں برساتا گزر گیا، مجھے موقع ہی نہیں ملا کہ اس پر فائر کر سکتا۔ اس نے نہ جانے کتنا نقصان کیا میں نہیں دیکھ سکا تھا کیونکہ اوپر اٹھ جانے والا گن شپ واپس گیا اور اس نے تقریباً ایک کلومیٹر سے محفوظ فاصلے سے میری طرف گولیاں برسانی شروع کر دی تھیں۔ ظاہر ہے پائلٹوں نے دیکھ لیا تھا کہ میں کہاں سے گولی چلا رہا تھا۔ اگر ان کو کوئی نقصان ہوتا تو پائلٹ اور کو پائلٹ دونوں فوری طور پر واپس اپنے ائربیس کا رخ کرتے۔ میرے اطراف میں گولیوں کی برسات جاری تھی لیکن میں پتھر کی آڑ میں محفوظ تھا۔ پھر میں نے کمار کے چلانے کی آواز سنی۔

"بچو! دوسرا ہیلی کاپٹر آ رہا ہے۔"

تب میں نے چونک کر دیکھا۔ دوسرا ہیلی کاپٹر اپنی مشین گن سے فائرنگ کرتا میری طرف آ رہا تھا۔ میں نے رائفل کا رخ اس کی طرف کیا اور اس کی بھی ونڈ اسکرین کا نشانہ لیا۔ اس کی اسکرین بھی سیاہ تھی۔ میں نے اس بار نسبتاً دائیں طرف کا نشانہ لیا اور وقت بالکل نہیں تھا اس لئے یکے بعد دیگرے کئی بار فائر کئے۔ میں نے ونڈ اسکرین کو بکھرتے دیکھا۔ اس کے عقب میں موجود پائلٹ نے جھٹکا لیا وہ پہلے پیچھے گیا اور پھر آگے جھکا تو شاید فلائنگ اسٹک بھی سامنے جھکی اور گن شپ بھی زمین کی طرف یوں آیا جیسے اسے کسی نے تھپکی دے کر زمین کی طرف دھکیل دیا ہو۔ وہ زمین سے ٹکرایا اور پلک جھپکنے میں ایک آتشیں گیند بن گیا۔ یہ گیند لڑھکتی ہوئی میری طرف آنے لگی۔ اٹھ کر بھاگنے کا وقت نہیں تھا۔ عقب سے گولیاں برس رہی تھیں مگر سامنے سے یقینی موت آ رہی تھی۔ میں نے پیروں کے بل اٹھتے ہوئے الٹی چھلانگ لگائی اور اس بڑے سے پتھر کے دوسری طرف جا گرا۔ میرے ساتھ رائفل گری اسے سمیٹتے ہوئے میں نے خود کو پتھر کی جڑ میں گھسا لیا۔

ایک خوف ناک گڑگڑاہٹ کے ساتھ آتشیں گیند چٹان سے ٹکرائی۔ چٹان یوں لرزی جیسے ابھی الٹ کر مجھ پر آن گرے گی مگر ایسا ہوا نہیں وہ صرف لرز کر رہ گئی تھیں شعلے میرے دائیں بائیں سے گزرے تھے۔ گن شپ خوف ناک آوازیں نکالتے ہوئے اوپر دائیں بائیں سے گزر رہے تھے۔ اس کا بڑا روٹر بلیڈ بائیں طرف سے چٹان سے ٹکرایا اور اس میں دھنس گیا۔ میں بال بال بچا تھا بلیڈ میرے سر سے چند انچ کے فاصلے پر رکا تھا۔ اس کا چھو جانا بھی میرے سر کے کئی ٹکڑے کرنے کے لئے کافی ہوتا۔ اس کا چھوٹا عقبی پنکھا اڑتا ہوا دور جا گرا تھا۔ اس دوران میں جب کہ یہ سارا طوفان گزر رہا تھا، سامنے سے گن شپ گولیاں برساتا رہا اور اس چھ نالی والی ہلاکت خیز مشین گن کا نشانہ صرف میں تھا اور یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آ سکی کہ ان میں سے کوئی گولی مجھے کیوں نہیں لگی اور اس کی صرف ایک ہی وجہ میری سمجھ میں آئی ہے کہ میرا وقت قضا نہیں آیا تھا۔ وہ گولی ان گولیوں میں شامل نہیں تھی جس پر میرا نام لکھا ہو۔ یہ ایسا ہی تھا کہ طیارہ کریش ہو اور اس میں کوئی ایک شخص بچ جائے۔ گولیاں میرے آس پاس برس رہی تھیں اور موت میری زندگی کی حفاظت کر رہی تھی۔

جب میں نے رائفل سیدھی کی تو غصے سے پاگل ہو جانے والے پائلٹ کا حوصلہ جواب دے گیا۔ اس نے ایک دم گن شپ اوپر اٹھا لیا۔ باقی سب نے تو نہیں اس نے دیکھ لیا تھا کہ میں زندہ ہوں اور اسے پھر رائفل سے نشانہ بنا سکتا ہوں۔ اس نے جان لیا ہوگا کہ تباہ ہونے والے گن شپ کی تباہی میں بھی میرا ہاتھ ہوگا۔ یہ بات عجیب سی لگتی ہے کہ ایک معمولی سی رائفل کے خوف نے ایک خوفناک اسلحے سے لیس گن شپ ہیلی کاپٹر کے

پائلٹ کو فرار پر مجبور کر دیا تھا لیکن یہ رائفل کی دہشت نہیں تھی، ان ہاتھوں کی دہشت تھی جس میں رائفل تھی۔ وہ گن شپ اس کے سامنے تباہ ہوئے تھے اور وہ اپنا نام اس فہرست میں نہیں لکھوانا چاہتا تھا۔

اس نے منہ موڑا اور اپنا ہیلی کاپٹر لے کر دائیں طرف کی پہاڑیوں میں غائب ہو گیا۔ چٹان کے عقب میں ابھی تک گن شپ کا ملبہ جل رہا تھا اور اس کے شعلے اتنے بلند تھے کہ دور سے دیکھنے والوں کو لگ رہا تھا کہ چٹان جس کے عقب میں، مَیں تھا، ان شعلوں میں گھری ہے۔ کمار اور اس کے ساتھیوں نے مجھے اپنے طور پر مرحوم سمجھ لیا تھا اس لئے جب میں لڑکھڑاتا ہوا نکلا اور گن شپ سے کسی قدر دوری سے ہو کر ان لوگوں کے پاس پہنچا تو کسی نے میری طرف توجہ نہیں دی تھی۔ کمار کے آس پاس اس کے ساتھی افسردہ کھڑے تھے اور دوسرے ساتھی نزدیک آ رہے تھے۔ کمار نے مجھے بھی ان میں سے ایک سمجھا۔

"کیا ہو رہا ہے؟" میں نے شگفتہ دلی دکھانے کی کوشش کی لیکن میرے حلق سے جو آواز نکلی تھی، وہ بے حد پھسپھسی اور خشک سی تھی۔ درحقیقت کچھ دیر پہلے تک ہونے والے واقعات نے مجھے دہلا دیا تھا۔ مجھے خود بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں بچ گیا۔ ایک تین فٹ اونچی اور اتنی ہی چوڑی چٹان نے مجھے تحفظ دیا تھا۔ کمار نے چونک کر میری طرف دیکھا اور چند لمحے دیکھنے کے بعد وہ یک دم مجھ سے چمٹ گیا۔

"شہباز، تم!" اس نے خوشی کے عالم میں چلاتے ہوئے کہا۔ "تم بچ گئے؟"

"حالات سے تو ابھی تک یہی ثابت ہوتا ہے۔" میں نے اعتراف کیا۔

"میرے خدا، تمہارا حال کیا ہو رہا ہے۔ چہرہ سیاہ ہو رہا ہے اور یہ بازو پر خون لگا ہے۔

کمار نے بتایا تب مجھے پتا چلا میرے بازو پر کوئی شے لگی تھی اور خون نکل رہا تھا بہرحال یہ خاص چوٹ نہیں تھی۔ قبائلی جو میری فوتگی کے خیال سے افسردہ تھے، مجھے زندہ پا کر خوشی سے نعرے لگانے لگے اور انہوں نے کوئی مختصر سا قبائلی رقص بھی کیا تھا۔ یہ فتح کا ابتدائی جشن تھا۔ مگر یہ موقع نہیں تھا۔ میں نے بیٹھی ہوئی آواز میں کہا۔ "کمار اس سے پہلے وہ بدبخت پھر آ جائیں، یہاں سے چلو۔"

"بس اب نکلو۔" کمار نے تیر اندازوں کو دیکھتے ہی کہا۔

"بلیک کیٹ کے کمانڈوز بھی آ رہے ہوں گے۔" میں نے عقب میں دیکھا۔

"میرا خیال ہے میرے آدمیوں کی تیر اندازی نے ان کو نقصان پہنچایا ہے، وہ اتنی جلدی پیچھے آنے کی ہمت نہیں کریں گے۔"

"چوٹ کھایا سانپ اور دشمن دونوں خطرناک ہوتے ہیں۔" میں نے کمار کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ میرے چہرے پر شعلوں سے نکلنے والی سیاہی جم گئی تھی اور بازو کے زخم میں ہلکا سا درد ہونے لگا تھا۔ میں نے اب تک زخم کا معائنہ نہیں کیا تھا۔ اس کی فرصت ہی نہیں ملی تھی۔ ہم وادی کے داخلی دروازے سے کوئی ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھے، مجھے پل کے سامنے ایک ہجوم دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے تشویش ہوئی، اب تک سب کو پار چلے جانا چاہئے تھا، ان کو خاصا وقت مل گیا تھا۔ میں نے کمار سے کہا۔ "یہ کیا چکر ہے، ان کو اب تک پار چلے جانا چاہئے تھا۔"

کمار بھی فکر مند ہو گیا۔ "میرا بھی یہی خیال تھا، آؤ دیکھتے ہیں۔"

کمار نے اپنے ساتھیوں کو عقب میں نگرانی کرنے کا حکم دیا اور خود میرے ساتھ پل کے پاس پہنچا۔ میرا اندازہ درست نکلا تھا۔ پل سے کوئی نہیں گزر رہا تھا۔ نصف کے قریب لوگ اندر جا چکے تھے اور نصف ابھی باقی تھے۔ کمار کے مشیر پل کے محافظوں سے جھگڑ رہے تھے۔ کماران کے پاس پہنچ کر دہاڑا۔ اس نے مقامی زبان میں بات کی تھی، چند لمحے تک پل کے محافظوں اور کمار کے درمیان تند و تیز جملوں کا تبادلہ ہوا۔ مجھے بیتو نظر آیا، میں نے اشارے سے اسے بلایا، وہ پہلے سے یہاں موجود تھا اور شاید صورتِ حال سے بہتر طور پر واقف تھا۔

''بیتو، یہاں کیا ہوا ہے، پل کیوں بند کر دیا گیا ہے؟''

''اندر سے حکم آیا ہے۔ عورتیں، بچے اور بوڑھے اندر جا چکے ہیں، زخمی بھی اندر ہیں مگر باقیوں کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔''

''کیوں؟''

''پتا نہیں۔ سب باری باری پل کے پار جا رہے تھے اچانک اندر سے حکم آیا اور پل بند کر دیا گیا۔ جو لوگ دروازے تک پہنچ گئے تھے ان کو بھی واپس بھیج دیا گیا۔''

میں نے لوگوں کا جائزہ لیا۔ یہ سب مرد تھے۔ جوان اور سولہ سال سے لے کر پچاس سال تک کے مضبوط مرد تھے۔ ان میں سے چند ایک ہی عورتیں تھیں۔ یہ شاید وہ عورتیں تھیں جنہوں نے اپنے پیاروں کے بغیر اندر جانے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ کم و بیش تین ہزار مرد تھے۔

''یہ کیا حماقت ہے۔'' میں نے برہمی سے کہا۔ ''لیکن ان کو علم نہیں ہے، ہمارے خون کے پیاسے ہمارے پیچھے ہیں اور ہم ہزاروں جانیں گنوا کر یہاں پہنچے ہیں۔''

''پتا نہیں اندر کیا ہو رہا ہے؟'' بیتو نے مایوسی سے کہا۔

میں کمار کے پاس پہنچا۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ کہہ رہے ہیں مردوں کو اندر جانے نہیں دیا جائے گا۔''

''کیوں...... ان کو معلوم نہیں ہے دشمن ہمارے پیچھے ہیں؟''

''معلوم ہے۔''

''پھر ہمیں کیوں نہیں اندر جانے دے رہے ہیں؟''

''میں نہیں جانتا۔ یہ محض پہرے دار ہیں، ان کو اندر سے حکم ملا ہے۔''

''تم اندر جا کر بات کرو۔'' میں نے اسے کہا۔

''میں نے یہ بھی کہا ہے لیکن یہ مجھے بھی اندر جانے کی اجازت نہیں دے رہے۔''

''پھر تم نے کیا سوچا؟''

''میں...... میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' اس نے بے بسی سے کہا۔

''کماران تین ہزار افراد کے سربراہ تم ہو اور تمہارے فیصلے پر ان کی زندگی و موت کا انحصار ہے، اب تم کیا فیصلہ کرتے ہو، کیا تم ان کو مرنے دو گے؟''

اس نے کچھ دیر سوچا پھر سر اٹھاتے ہوئے ایک عزم سے کہا۔ ''میں ان کو مرنے نہیں دوں گا۔''

وہ مضبوط قدموں سے پل کی جانب بڑھا۔ پل کے محافظوں نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر اس کے اشارے پر اس کے ساتھیوں نے لمحوں میں انہیں قابو کر کے بے بس کر دیا تھا، ان کا اسلحہ چھین لیا تھا۔ کمار اپنے چار مسلح محافظوں کے ہمراہ پل عبور کر کے وادی میں داخلے کے دروازے تک پہنچا۔ اس نے رسی کھینچ کر اندر کوئی گھنٹی بجائی۔ پل تقریباً پچاس گز لمبا تھا اور اتنی دور سے کمار اور ان لوگوں کی آواز نہیں آ رہی تھی جن سے وہ مصروف گفتگو تھا مگر اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ ان کے مابین ہونے والی بحث تند و تیز تھی۔ میں نے ذرا آگے ہو کر کھائی میں جھانکا۔ یہ بلاشبہ سیکڑوں میٹر گہری کھائی تھی اور چاند عین اوپر ہونے کے باوجود اس کی تہہ واضح نظر نہیں آ رہی تھی اگر پل ہٹا دیا جاتا تو اس وادی کو عبور کرنا ناممکن تھا۔ اس وادی کے چاروں طرف چٹانوں کی بلند و بالا قدرتی فصیلیں تھیں جن کو عبور کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ اسی وجہ سے یہ وادی بے حد محفوظ تھی۔ اچانک فائرنگ کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ کمار نے اشتعال کے عالم میں لوہے کے بھاری دروازے پر فائرنگ کر دی تھی جو قطعی بے سود تھی اور صرف اس کے غصے کا اظہار تھی۔

وہ تلملاتا ہوا واپس آیا۔ "یہ لوگ کسی صورت دروازہ کھولنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔"

"سنو اندر کا حکمران کون ہے؟"

"جتندر...... یہ موجودہ سردار کا نام ہے۔ اسے چند مہینے پہلے سرداری ملی ہے۔"

"تمہاری اس سے بات ہوئی تھی؟"

"نہیں، اس کا مشیر ہے۔ راج، وہی آیا تھا۔"

"کیا اسے خوف ہے کہ تم اس کی گدی پر قبضہ کر لو گے؟"

"مجھے بھی یہی خیال آ رہا ہے، میں نے راج لاما کو یقین دلایا کہ میں سردار کا اطاعت گزار ہوں اور میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ مگر وہ نہیں مانا، ہمیں قلعے کے سامنے مرنے کے لئے چھوڑ دیا۔" اس نے تلخی سے کہا۔

"کمار" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "ان سے دوبارہ بات کرو۔ ان سے کہو کہ بھارتی فوج ہمارے تعاقب میں ہے۔ اگر وہ یہاں تک آ گئی تو تم لڑ کر مرنے کے بجائے ہتھیار ڈالنے کو ترجیح دو گے اور اس کے بعد بھارتی فوج قلعے میں داخل ہو جائے گی۔"

"میں ایسا نہیں کر سکتا، اندر ہمارے لوگ ہیں۔"

"تم ایسا نہیں کرو گے مگر کہنے میں کیا حرج ہے؟" میں نے اسے سمجھایا۔ "ممکن ہے اس دھمکی سے ڈر کر وہ گیٹ کھول دیں؟"

کمار سر ہلاتا ہوا چلا گیا۔ اس نے دروازہ بجایا اور ذرا دیر بعد کھلنے والی ایک چھوٹی سی کھڑکی سے مذاکرات کرنے لگا، اندر نہ جانے کون تھا۔ راج لاما یا خود اس کا باس۔ تقریباً دس منٹ تک یہ مذاکرات جاری رہے تھے۔ اس کے بعد کمار نے اپنے ساتھ ایک محافظ کو کوئی حکم دیا اور وہ پل کراس کر کے اس طرف آنے لگا۔ نہ جانے کیا بات تھی۔ وہ سیدھا میری طرف آیا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر کچھ کہا۔

"سردار آپ کو بلا رہا ہے۔" بیتو نے اس کے کہے کا ترجمہ کیا۔

"مجھے، میرا وہاں کیا کام ہے؟" میں نے تعجب سے کہا۔

بیتو نے پوچھا اور بتایا۔ ''یہ تو اسے بھی نہیں معلوم ہے۔ بس سردار نے کہا کہ آپ کو لایا جائے۔''
''چلو۔'' میں نے کہا۔ ممکن ہے مذاکرات میں کہیں میری ضرورت پڑ گئی ہو۔
میں نے محافظ کے ہمراہ جھولتے پل پر قدم رکھا جس کی رسیوں میں لگے تختے کافی خستہ حال ہو گئے تھے دوران پر سنبھل کر قدم رکھنا پڑ رہا تھا۔ اگر کوئی تختہ نکل جاتا تو نیچے سیکڑوں فٹ کی گہرائی خوش آمدید کہنے کے لئے بے قرار تھی، میں سنبھل کر چل رہا تھا۔ اچانک مجھے عجیب سی گونج سنائی دی۔ یہ گونج میرے پیروں تلے گھاٹی سے آرہی تھی۔ بتدریج یہ گونج بڑھنے لگی اور پھر میں نے دائیں طرف سے گن شپ کو نمودار ہوتے دیکھا۔ وہ اتنا اچانک آیا تھا کہ میں چند سیکنڈ پہلے تک بے خبر تھا۔ اس وقت میں پل کے وسط میں تھا اور میں نے دیکھا، یہ وہی گن شپ تھا جس پر میں نے گولیاں چلائی تھیں۔ اس کا پائلٹ گیا نہیں تھا۔ اب یہ نہ جانے اتفاق تھا یا اس کی چالاکی، وہ عین اس وقت نمودار ہوا جب میں زمین و آسمان کے بیچ میں معلق تھا۔ میرے پاس کوئی جائے فرار نہ تھی اور اس جھولتے پل پر رائفل استعمال کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔
''برے پھنسے بیٹے!'' میں نے خود سے کہا۔
اسی لمحے گن شپ کے نیچے لگی چھ نالی مشین گن گھومی اور اس کا رخ میری طرف ہو گیا تھا۔ میں نے دل میں کلمہ پڑھنا شروع کر دیا۔ کوئی لمحہ جاتا تھا کہ فرشتۂ اجل کی آمد ہوتی۔ آدمی کی زندگی میں کئی بار ایسے لمحات آتے ہیں جب اسے لگتا ہے کہ اب تقدیر کا فیصلہ اٹل ہے۔ ایسا ہی کچھ یہ لمحہ تھا میں زمین اور آسمان کے درمیان معلق تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ یہاں سے میرا جسم تو نیچے جائے گا مگر روح اوپر چلی جائے گی لیکن ہم مسلمانوں کے لئے حکم ہے، جب تقدیر کا اٹل فیصلہ سامنے آجائے تب بھی اس خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہوں جو تقدیر کا مالک ہے، اسے لکھتا ہے، اسے بناتا ہے پھر مٹاتا ہے اور نئے سرے سے لکھ دیتا ہے۔ اس کی رحمت سے مایوسی کفر ہے اور اس کا انکار کرنے کے برابر ہے اور میں کافر ہو کر نہیں مرنا چاہتا تھا اس لئے بے ساختہ سر اوپر کی طرف اٹھا دیا۔
''اے میرے مالک!'' ابھی میرے منہ سے الفاظ نہیں نکلے تھے کہ اس نے دعا قبول کر کے میری بچت کا سامان کر دیا تھا۔ میں نے گن شپ کے پائلٹ کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنا ہیلمٹ اتار دیا تھا۔ وہ سانولے رنگ کا درشت چہرے والا شخص تھا جو گن شپ کے پائلٹ سے زیادہ کسی گروہ کا دادا لگ رہا تھا۔ حالانکہ اس نے آئی اے ایف کی وردی پہن رکھی تھی۔ مجھے ساکت دیکھ کر وہ اس بھیڑیے کی طرح مسکرایا تھا جس نے شکار کو گھیر لیا تھا اور اب اس کے بچنے کی کوئی راہ نہ رہی۔ میں ہنسا اور ہاتھ سے اسے اوپر دیکھنے کا اشارہ کیا۔ اس نے نہ سمجھنے والے انداز میں ذرا آگے ہو کر اوپر دیکھا۔ اگلے ہی لمحے اس نے بدحواسی کے عالم میں گن شپ کا تھروٹل کھینچا مگر مہلت نہیں تھی، اوپر سے موت نازل ہو چکی تھی۔
نہ جانے کس نے وہ بڑا سا پتھر اوپر فصیل سے پھینکا تھا۔ وہ سیدھا گن شپ کے پروں سے ٹکرایا۔ ایک دھماکا ہوا اور ایک پر ٹوٹ کر چکر کھاتا ہوا پل کی طرف آیا۔ خطرہ بھانپ کر میں پہلے ہی پل کی رسیوں سے چمٹ گیا تھا۔ گن شپ میری طرح ڈگمگایا۔ اسی لمحے ٹوٹنے والا پر آ کر پل سے ٹکرایا اور اس نے رسوں اور تختوں کو یوں کاٹ دیا جیسے گرم چھری مکھن کاٹ دیتی ہے۔ پل دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ میں قلعے والی طرف تھا۔ پل نیچے گرا اور میں بھی اس کے ساتھ ساتھ چمٹا ہوا نیچے گیا۔ میں نے اپنی ساری قوت رسوں سے چمٹے رہنے میں لگا دی

مجھے معلوم تھا، پل جا کر گھاٹی کی پتھریلی دیواروں سے ٹکرائے گا اور اس تصادم سے میری ہڈی پسلی ایک ہو جانے کے روشن امکانات تھے اور اگر بچ بھی جاتا تو جھٹکے کی وجہ سے کھائی میں بھی گر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اس خستہ حال پل کے اس دھچکے کو برداشت نہ کرتے ہوئے ٹوٹ کر کھائی میں گرنے کا بھی پورا امکان تھا اور یہ سب اتنی تیزی سے ہوا کہ مجھے دعا مانگنے یا اس کے بارے میں سوچنے کی فرصت بھی نہیں ملی تھی۔ میری ساری توجہ جان بچانے پر تھی۔

پل کے تختوں نے مجھے بچایا اور میں براہِ راست گھاٹی کی پتھریلی دیوار سے ٹکرانے سے محفوظ رہا۔ پھر پل کے تختے ٹکرائے اور پرزے پرزے ہو کر بکھر گئے۔ زبردست جھٹکے کے باوجود میں نے رسے پر اپنی گرفت اور حواس بحال رکھے۔ میں کوئی تیس فٹ کی گہرائی میں لٹکا ہوا تھا۔ گن شپ یوں جھوم رہا تھا جیسے اس نے شراب پی رکھی ہو۔ پائلٹ اسے سنبھالنے اور اوپر اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کوشش میں گن شپ میرے نزدیک آ رہا تھا۔ اس کے خونی پر ابھی تک گھوم رہے تھے۔ میں نے جلدی سے دوسرا رسا تھام کر اس سے دور ہونے کی کوشش کی مگر وہاں گنجائش کہاں تھی۔ پر لگنے سے ایک طرف کا رسا کٹا تو پل اور بھی جھول گیا تھا۔ گن شپ کے پر مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر گھوم رہے تھے اور کوئی لمحہ جاتا تھا کہ وہ دوسرا رسا بھی کاٹ دیتے اور میں پل کے ملبے کے ہمراہ نیچے نامعلوم گہرائی میں جا گرتا۔

گن شپ کی سرچ لائٹ آن تھی۔ مجھ پر اس کی روشنی پڑی تو پائلٹ نے مجھے دیکھ لیا اور اس حالت میں بھی اس نے مجھے مارنے کی کوشش کی۔ چھ نالی مشین گن سے برسٹ مارا مگر مشین گن اپنی فٹنگ سے الگ ہو جانے کے بعد سر کے بل لٹکی ہوئی تھی اس لئے ساری گولیاں کھائی کی تہہ کی طرف گئیں۔ میں نے مسکرا کر اشارے سے اسے جہنم میں جانے کو کہا، میں دیکھ رہا تھا کہ ایک پر کم ہونے سے گن شپ قوتِ پرواز سے محروم ہو گیا تھا اور پائلٹ کی اسے گھاٹی سے باہر لے جانے کی کوشش ناکام رہی تھی اور گھاٹی کی تہہ اس کا مقدر بن گئی تھی۔ یہ بات پائلٹ نے بھی محسوس کر لی تھی حالانکہ وہ چاہتا تو ایک بٹن دبا کر اجیکٹ کر جاتا، سیٹ کے نیچے لگا راکٹ اسے اتنی بلندی پر لے جاتا جہاں سے وہ بحفاظت زمین پر پیراشوٹ کے ذریعے اتر سکتا تھا۔

مگر اس پر جیسے جنون طاری ہو گیا تھا اور اس نے مجھے ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا، اس نے جان بوجھ کر گن شپ میرے نزدیک لانے کی کوشش کی تاکہ اس کے گھومتے پر میرے چیتھڑے اُڑا دیں یا اس رسی کو کاٹ دیں جس کے سہارے میں لٹکا ہوا تھا، دونوں صورتوں میں میرا انجام موت ہوتی۔ میں گھاٹی کی دیوار پر قدم جماتے ہوئے پیچھے ہٹا لیکن میں جتنا پیچھے جاتا تھا، گن شپ کے پر اتنا ہی آگے آتے تھے۔ اب پائلٹ پاگل ہو گیا تھا آنے والی موت کو بھول کر وہ میری بے بسی پر قہقہے لگا رہا تھا۔ کھردری چٹانی دیوار مجھے قدم جمانے کا موقع دے رہی تھی لیکن اس طرح میں گن شپ سے کتنا دور جا سکتا تھا؟ اچانک گن شپ کے پر دیوار سے ٹکرائے اور پتھر ٹکڑے اُڑے۔ گن شپ بے قابو ہو کر ذرا دور چلا گیا۔ میں نے موقع غنیمت جان کر گھاٹی کی دیوار کا جائزہ لیا چاند کی روشنی میں مجھے چند گز نیچے دیوار میں ایک خلا نظر آیا تھا۔ یہ نہ جانے کتنا کشادہ تھا یا محض سائے کی وجہ سے ایسا تاثر دے رہا تھا جیسے خلا ہو؟

پاگل ہو جانے والے پائلٹ نے ایک بار پھر اپنے زخمی پرندے کو سنبھالا اور اسے فیصلہ کن انداز میں

میری طرف لایا۔ وقت نہیں تھا، میں ایک لمحے کی تاخیر کرتا تو گن شپ مجھے دیوار کے ساتھ پیس دیتا یا رسا کٹ جانے سے میں سیکڑوں فٹ کی گہرائی میں جا پڑتا۔ میں نے رسا ڈھیلا چھوڑا اور پھسلتا ہوا نیچے گیا۔ اسی لمحے پر رسے سے ٹکرایا اور اسے کاٹ دیا۔ یک دم میرے گرنے کی رفتار تیز ہوئی تھی مگر میں نے اوسان بحال رکھے اور خلا سامنے آتے ہی اس پر چھلانگ لگا دی۔ ایک لمحے کو مجھے لگا جیسے میں ٹھوس چٹان سے ٹکرایا ہوں مگر میں خلا میں تھا۔ میں نے ہاتھ پھیلائے اور خود کو تصادم سے بچایا ورنہ میں تاریکی میں دیوار سے ٹکرا کر اپنا منہ ناک ایک کروا لیتا۔ یہاں تاریکی اتنی زیادہ تھی کہ ٹھوس دیوار کی طرح محسوس کی جا سکتی تھی۔

عقب میں گن شپ کے اور اس کے پروں کے چٹان سے ٹکرانے کی سمع خراش آوازیں آ رہی تھیں۔ تصادم نے چٹانی دیوار کو ہلا دیا تھا۔ میں نے خوف زدہ تھا کہ ابھی گن شپ کا پیٹرول ٹینک یا اس کا گولہ بارود پھٹے گا اور میں بھی مارا جاؤں گا مگر دھماکے کی آواز نہیں آئی۔ اس کے بجائے گن شپ دیوار سے رگڑ کھاتا نیچے گھاٹی کی تہہ کی طرف جانے لگا۔ میں خلا میں ممکنہ حد تک اندر گھسا اور شاید اس وجہ سے میری جان بچی۔ گن شپ کا عقبی چھوٹا پنکھا گھومتا ہوا آیا اور اس کا بلیڈ سنگی دیوار میں میرے جسم سے صرف چند انچ کے فاصلے پر پیوست ہو گیا تھا۔ میں پھر بچ گیا تھا، محض اس لئے کہ کاتب تقدیر نے میری موت کا جو وقت لکھا تھا وہ ابھی نہیں آیا تھا۔ گن شپ کے تہہ میں گرنے کی آواز اور اس کے بعد دھماکا چند لمحوں بعد سنائی دیا تھا۔ ایک کے بعد دوسرا دھماکا ہو رہا تھا۔ گن شپ کے ایندھن کے ٹینک کے بعد اس کا گولہ بارود بھی پھٹ رہا تھا۔ اچانک آگ کا فوارہ سا اس خلا کے سامنے سے گزرا اور میں جو نیچے جھانکنے جا رہا تھا، بے ساختہ پلٹ کر دیوار سے چمٹ گیا۔ مجھے اپنی پشت پر تپش کا احساس ہوا تھا۔ اگر میرا منہ سامنے کی طرف ہوتا تو یقیناً جھلس جاتا۔ جب شعلے ختم ہوئے تو میں احتیاط سے کنارے تک گیا۔ نیچے گھاٹی کی تہہ میں اب بھی شعلے بھڑک رہے تھے۔ بارود کی بو کے ساتھ ایک اور بو بھی میری حس شامہ نے محسوس کی، یہ گوشت جلنے کی کراہت انگیز بو تھی۔

ایک نامعلوم بھارتی پائلٹ مجھے ختم کرنے کے جنون میں خود فنا کے گھاٹ اتر گیا تھا اور اب اس کا ڈھانچا گن شپ کی چتا میں پڑا تھا۔ گوشت پوست آگ چاٹ گئی تھی اگر وہ ہندو تھا تو اسے خاصی مہنگی چتا ملی تھی۔ یہ سب شاید دو منٹ میں ہوا تھا لیکن مجھے لگ رہا تھا کہ میں نہ جانے کب سے جان بچانے کی کوشش میں تھا فرشتہ اجل میرے دائیں بائیں سے کئی بار گزرا اور کم سے کم دو مواقع پر میں اس کے ساتھ جاتے جاتے رہ گیا تھا۔ میں نے اوپر کی طرف دیکھا۔ مجھے گھاٹی کا دوسرا کنارا دکھائی دے رہا تھا اور اس سے بے شمار سر جھانک رہے تھے۔

"اے، کوئی ہے میری فریاد سننے والا۔" میں نے لاؤڈ اسپیکر جیسی آواز نکالی۔ کمار نہ جانے کہاں تھا اور میری زبان سمجھنے والے چند ایک ہی تھے مگر اصل مقصد تو ان کو یہ بتانا تھا کہ میں بدستور زندہ ہوں۔ میری پکار کا خاطر خواہ ردِعمل ہوا اور جھانکنے والوں میں کھلبلی مچ گئی تھی اور وہ سب چلا چلا کر ایک ساتھ بولنے لگے تھے۔ میں سکون سے اس غار کے فرش پر بیٹھ گیا۔ یہ تین فٹ گہرا، سات فٹ اونچا اور کوئی دو فٹ چوڑا خلا تھا۔ نہ جانے کب یہ چٹانیں اور یہ گھاٹی وجود میں آئی تھی اور تب سے یہ خلا تھا۔ جو صرف اس لئے تھا کہ ایک روز میں اس میں گھس کر اپنی جان بچا سکوں گا۔ اس کے وجود میں آنے کے بعد میں شاید اولین انسان تھا جس نے یہاں قدم رکھا تھا۔

سوچتے سوچتے میرا دھیان اپنے محسن کی طرف گیا تھا، جس نے اوپر سے ایک من کا پتھر گرا کر گن شپ کو تباہ کر دیا تھا حالانکہ اس گن شپ کے مقابلے میں پتھر ایسا ہی تھا جیسا کہ ہاتھی کے مقابلے میں ابابیل کا پھینکا کنکر۔ مگر جس طرح خدا کے حکم سے ابابیل جیسی کمزور مخلوق نے ہاتھی فنا کر دیئے تھے اسی طرح ایک معمولی سے پتھر نے گن شپ کے بدمست ہاتھی کو فنا کر دیا تھا۔ میں حیران تھا، شہروں سے دوران قبائلیوں کے خلاف بھارت سرکار کس قسم کے جنگی ہتھیار استعمال کر رہی تھی، ان کو فنا کرنے کے لئے فوجی قوت کا اندھا دھند استعمال کر رہی تھی حالانکہ انہوں نے نہ تو ملک کے خلاف بغاوت کی تھی اور نہ ہی سرکار کے خلاف ہتھیار اٹھائے تھے۔ اگر جلد ان قبائلیوں کو قلعے میں داخل ہونے کی اجازت نہ ملی تو کوئی اور فضائی حملہ ان کو نیست و نابود کر دے گا۔

میں کمار کی آواز سن کر چونکا۔ ''شہباز! تم کہاں ہو؟''

''میں یہاں ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ وہ قلعے والی سمت میں تھا اور ظاہر ہے کہ مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا مگر دوسرے کنارے پر موجود افراد میری نشان دہی کر رہے تھے اس لیے جلد غار کے سامنے رسا گرا۔ میں نے اسے ہاتھ بڑھا کر پکڑ لیا۔ جان بچانے کی کوشش میں رائفل بھی گھاٹی میں گر گئی تھی اور اب میرے پاس صرف پستول تھا، میں نے رسا کمر سے باندھا اور چلایا۔ ''میں اوپر آ رہا ہوں۔''

''ہم رسا کھینچ رہے ہیں۔'' کمار نے کہا۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے، میں خود آ رہا ہوں۔''

رسے کی مدد سے چٹانوں پر چڑھنا بہت آسان ہوتا ہے، مجھے تو خالی ہاتھ بھی چٹانوں پر چڑھنے کا تجربہ تھا۔ میں پانچ منٹ میں اوپر تھا۔ جیسے ہی میں اوپر پہنچا، کمار مجھ سے لپٹ گیا۔ ''تھینکس گاڈ! ورنہ میں تو سمجھا تھا......''

''کہ گزر گیا۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''نہیں یار! خاصی ڈھیٹ شے ہوں میں۔ یہ بتاؤ کہ اندر کا کیا حال ہے؟''

''میرے آدمی ٹیک اوور کر چکے ہیں۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔ ''کچھ دیر میں باقی افراد بھی اندر ہوں گے۔''

''جتندر کا کیا ردِعمل ہے؟''

''میں نے اسے نہیں چھیڑا ہے۔ وہ اپنے محل میں ہے اور باقی جگہوں پر میرے آدمی قابض ہیں البتہ راج بہت اچھل رہا ہے۔''

''وہ خطرناک آدمی ہے اس سے ہوشیار رہنا۔'' میں نے کہا اور ایک قبائلی سے اس کی چمڑے کی بوتل لے کر پانی پیا۔ اسی اثنا میں اندر چند افراد ایک تیار پل لے کر نمودار ہوئے، انہوں نے ستونوں سے بندھے پرانے پل کے رسوں سے اس نئے پل کو جوڑا اور پھر اسے دوسرے کنارے کی طرف اچھال دیئے تھے۔ انہیں ان کاموں کا خوب تجربہ تھا۔ دوسری طرف والوں نے رسوں سے بندھا پل کھینچا اور رسے دوسری طرف موجود ستونوں سے باندھ دیئے گئے۔ پل قائم ہوتے ہی دوسری طرف موجود قبائلی تیزی سے گھاٹی عبور کر کے قلعے میں داخل ہونے لگے تھے۔ کمار نے پہلی بار ایک سیاست دان کی طرح اپنی عقل استعمال کی تھی اسے شاید پہلے سے

خطرہ تھا کہ اسے اور اس کے مسلح آدمیوں کو اتنی آسانی سے اندر داخل ہونے نہیں دیا جائے گا اس لیے اس نے پہلے ہی کمزور اور زخمیوں کی آڑ میں اپنے مسلح آدمیوں کو اندر بھیج دیا تھا تا کہ اگر اندر والوں کی طرف سے کوئی شرارت ہو تو وہ قلعے پر قبضہ کرلیں۔

''فوج کے کوئی آثار ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''قلعے کی بلندیوں پر میرے آدمی دوربینوں سمیت ہیں۔ جیسے ہی ان کو کوئی نظر آیا، وہ ہمیں خبردار کر دیں گے۔'' کمار نے بتایا۔

مجھے خیال آیا۔ ''یار! وہ آدمی کون ہے جس نے اوپر سے پتھر مار کر ہیلی کاپٹر گرایا تھا؟ یقین کرو وہ صرف چند لمحے کی دیر کرتا تو گن شپ کی مشین گن میرے ٹکڑے کر چکی ہوتی۔''

''میں نہیں جانتا وہ قلعے کا ہی کوئی آدمی ہے۔ مجھے تو پتا بھی نہیں تھا، اندر جاتے ہی میرے ساتھی حالات کو اپنے قابو میں کرنے لگ گئے تھے۔'' کمار نے نفی میں سر ہلایا۔

''اسے تلاش کرو، وہ میرا محسن ہے۔''

''مل جائے گا، قلعے میں ہی ہوگا۔''

سارے ہی جوان مرد تھے اس لئے وہ تیزی سے پل عبور کر کے قلعے میں داخل ہو رہے تھے۔ عورتیں، بچے اور بوڑھے پہلے ہی اندر جا چکے تھے۔ میں اور کمار پل کے پاس کھڑے ان لوگوں کو جاتا دیکھ رہے تھے۔

''کمار، اب تمہیں دو محاذوں پر لڑنا ہوگا۔''

''میں سمجھتا ہوں۔ اندر والے بھی میرے دوست نہیں ہیں۔''

''بھارتی سرکار کو بھی اپنا دشمن سمجھو۔ وہ اتنا نقصان برداشت کرنے والے نہیں ہیں۔''

''ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔'' کمار نے گہری سانس لی۔ ''لیکن بن موت مرنے کے لئے بھی تیار نہیں ہیں۔''

''کمار، تم لوگوں کا بیرونی دنیا سے رابطہ بہت ضروری ہو گیا ہے، تم انسانی حقوق کی تنظیموں اور این جی اوز سے بات کرو، غیر ملکی سفارت خانوں، اقوام متحدہ اور یورپی یونین کو خطوط لکھو۔''

''میں یہی کروں گا بس مجھے چند دن سکون کے مل جائیں۔ میں اپنے آدمیوں کے نقصان کا اندازہ کروں گا۔ ابھی تو مجھے یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ کتنے لوگ بچ کر آئے ہیں۔''

میرا اندازہ تھا، ان کے کم سے کم چار ہزار افراد مارے جا چکے تھے اور یہ نقصان ایسے قبیلے کے لئے بہت بڑا تھا جس میں کل دس گیارہ ہزار نفوس ہوں۔ کمار نے بقیہ افراد کی منتقلی کا کام بیتو کی نگرانی میں چھوڑا اور مجھے لے کر اندر آیا۔ قلعے کی قدرتی دیوار تقریباً دس گز چوڑی تھی۔ اتنی پختہ سنگی دیوار کو توڑنا ناممکن تو نہیں لیکن بے حد مشکل ضرور تھا۔ قلعے کے اندر ایک حیران کن حد تک وسیع وادی تھی، پہلے یہ نشیب کی طرف گئی تھی۔ اس کے وسط میں جھیل یا پانی کا چشمہ تھا جس سے بخارات اٹھ رہے تھے۔ چاندنی میں برف پوش جنگل اور ان کے اوپر سایہ فگن برفانی چوٹیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ چشمے یا جھیل کے آس پاس سیڑھی نما کھیت تھے جن پر فی الحال برف پڑی تھی۔ ''یہ وادی سطح سمندر سے کم سے کم آٹھ ہزار فٹ بلند ہے۔'' کمار نے مجھے بتایا۔ ''اس کے بعض حصے نو

ہزار فٹ سے بھی زیادہ بلند ہیں۔"

"یہاں تو لگ رہا ہے کہ سال میں چھ مہینے برف رہتی ہے۔"

"تقریباً۔" اس نے تصحیح کی۔ "نومبر کے آغاز میں برف پڑتی ہے اور مارچ کے آخر میں پگھلنا شروع ہو جاتی ہے۔ اس مہینے وادی کے باشندے کاشت کاری کرتے ہیں اور اپنے مویشی لے کر نیچے وادیوں کی طرف چلے جاتے ہیں۔ جہاں گھاس پودے افراط سے ہوتے ہے پھر جیسے جیسے اوپر کی برف پگھلتی ہے یہ اوپر آتے رہتے ہیں۔ بہار میں جو مادہ جانور بچہ دینے والا ہوا سے وادی میں واپس بھیج دیا جاتا ہے۔"

"وہ ان جنگلوں میں چرتی ہے؟" میں نے برف پوش جنگلوں کی طرف دیکھا۔ "مگر اس وادی کی آبادی کہاں ہے، مجھے تو کوئی مکان نظر نہیں آ رہا ہے۔"

"اب یہاں کوئی مکان نہیں ہے۔ سب غاروں میں آباد ہیں۔ جتندر اور دوسرے حاکم بھی غار میں ہی رہتے ہیں۔ سردیوں میں یہ غار اندر سے قدرتی طور پر گرم رہتے ہیں۔"

"حیرت انگیز، آخر یہ غار کیسے گرم رہتے ہیں؟"

"پتا نہیں۔" اس نے شانے اچکائے۔ "مجھے اس بارے میں زیادہ نہیں معلوم ہے۔"

ہم وادی کے دائیں طرف گھنے درختوں تلے موجود ڈھلان کے ایک حصے سے غار میں داخل ہوئے۔ میں نے محسوس کیا کہ وادی کے لوگوں نے وادی کو سرسبز رکھنے اور درخت لگانے کی شعوری کوشش کی تھی۔ ہر وہ جگہ جہاں درخت لگائے جا سکتے تھے، وہاں درخت لگے تھے سوائے کھیتوں کے۔ یہی وجہ تھی انہوں نے زمین کو گھر بنانے یا جانور رکھنے کے لئے استعمال نہیں کیا تھا۔ جانور بھی زیر زمین دنیا میں رہتے تھے۔

"کیا یہ قدرتی غار ہیں؟" میں نے اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

"پہلے قدرتی تھے، اب ان میں بہت سارے حصے انسانی ہاتھوں کے تراشے ہیں۔"

"یعنی جیسے جیسے آبادی بڑھتی گئی، ان لوگوں نے غار کی توسیع جاری رکھی اور اس طرح یہ زیر زمین بستی وجود میں آ گئی۔"

کمار نے سر ہلایا۔ "نوجوان افراد بارہ تیرہ برس کی عمر میں روزانہ کچھ وقت اپنے لئے غار بنانے میں صرف کرتے ہیں اور جب وہ جوانی کی عمر کو یا شادی کرنے لائق ہو جاتے ہیں، تو ان کا حصہ تیار ہو جاتا ہے مگر غار بنانے کی اجازت سردار دیتا ہے۔"

"جسے تم نے قید کر رکھا ہے، اس کا مطلب ہوا کہ کوئی غار میں اپنی مرضی سے توسیع نہیں کر سکتا؟"

"ظاہر ہے، اگر ہر شخص اپنی مرضی سے غار میں توسیع کرنے لگے تو یہ غار ہی بیٹھ جائے گا۔ بڑے بوڑھے اور تجربے کار لوگ دیکھ بھال کر غار میں توسیع کی اجازت دیتے ہیں تاکہ راستے درست رہیں اور غار اندر سے ایک حد سے زیادہ کھوکھلا نہ ہو۔"

"تم نے بتایا تھا کہ وادی کی آبادی تین ہزار نفوس پر مشتمل ہے اور تقریباً اس سے دوگنے لوگ یہاں آ گئے ہیں، گزارہ کیسے ہوگا؟"

"یہی تو جتندر بھی کہہ رہا تھا۔"

''وہ تو عیاری دکھا رہا تھا۔ اصل میں اسے خوف تھا کہ باہر سے آنے والے تعداد میں زیادہ ہیں، وہ اقتدار قابض ہو سکتے ہیں۔''

کمار مسکرایا۔ ''اس کا خوف غلط نہیں تھا۔ اس وقت وادی اور زیر زمین بستی کی تمام اہم جگہوں پر میرے ادمیوں کا قبضہ ہو چکا ہے۔''

''سوال یہ ہے کہ اندر خوراک کی کیا صورتِ حال ہے اور اتنے سارے لوگ کہاں رہیں گے۔ ان کے لئے صفائی ستھرائی کے کیا انتظامات ہوں گے۔ اس بند جگہ ہیضے یا پیچش کی وبا پھوٹ پڑنے کے پورے امکانات ہیں۔''

''میں نے ابھی اس معاملے پر نہیں سوچا۔'' کمار نے اعتراف کیا۔

''تو سوچو...... ورنہ معاملہ قابو سے باہر ہو گیا تو سوچنا بے کار ہو گا۔ فوری طور پر جتندر اور اس کی کابینہ کا اجلاس طلب کرو اور ان کے سامنے یہ مسائل رکھو۔ وہ اس وادی کے رہنے والے ہیں، ان مسائل کو بہتر طور پر حل کر سکتے ہیں۔''

ہم ایک طویل راہداری سے گزر رہے تھے جس کے دائیں بائیں بے شمار گلیاں تھیں اور ان گلیوں میں ادی کے مکین غاروں میں آباد تھے۔ راہداری میں ہر چند گز کے بعد ایک مشعل لگی تھی۔ ایسی ہی مشعلیں اندر لیوں میں تھیں اور حیرت انگیز بات تھی کہ اندر گھٹن کا ذرہ برابر بھی احساس نہیں تھا۔ اندر یقیناً تازہ ہوا کی آمدورفت کا انتظام تھا۔ کمار کے ساتھ آنے والے قبائلیوں کی عورتیں، بچے اور بوڑھے ایک بڑے سے ہال میں لع تھے۔ البتہ جوان مرد اور جنگجو وادی میں پھیل کر اپنا قبضہ مستحکم کر رہے تھے۔ مقامی افراد سے ان کے ہتھیار لے لئے گئے تھے اور اہم شخصیات کو نظر بند کر دیا گیا تھا۔ یہ انتظامی اور ہنگامی حالات کے لئے مخصوص ہال تھا اور اس کے ارد گرد موجود غار در اصل وادی کی حکومت کے دفاتر تھے، یہاں سے وادی کا انتظام چلایا جاتا تھا۔

کمار نے جتندر اور اس کے وزیروں، مشیروں کو طلب کر لیا تھا۔ اس نے ایک ذیلی ہال کا انتخاب کیا تھا جو ایداس کام کے لئے مخصوص تھا۔ کمار بچپن سے یہاں آتا رہا تھا اس لئے چپے چپے سے واقف تھا ورنہ چند گھنٹے یا ایک ہفتے میں بھی یہاں کے راستوں اور مقامات کو ذہن نشین کرنا ناممکن ہی تھا۔ کچھ دیر بعد راجا جتندر اور اس کے ساتھی آئے۔ وہ سب غصے میں تھے۔ تبتی نقوش اور کسی قدر صاف رنگ والے ان قبائلیوں کا راجا جتندر عمر یدہ ہونے کے باوجود اچھا خاصا وجیہہ اور تنومند شخص تھا۔ اس کے ساتھ اس کے پانچ عدد مشیر اور وزیر بھی تھے۔ ں میں راج کی حیثیت وزیر اعظم کی سی تھی۔

میٹنگ کا آغاز گرما گرم ماحول میں ہوا تھا، ایسا لگ رہا تھا کہ ابھی کمار اور اس کے ساتھی راجا اور اس کے یروں پر ٹوٹ پڑیں گے یا وہ ان پر حملہ کر دیں گے مگر کمار نے بار بار مصالحانہ لہجہ اختیار کر کے ماحول کو ٹھنڈا کیا۔ ں لگانے کی کوشش میں راج پیش پیش تھا اور اس کی چھوٹی آنکھوں میں کمار اور اس کے ساتھیوں کے لئے ت دہک رہی تھی۔ مجھے لگا اگر معاملہ خرابی کی حد تک پہنچا تو اس کا ذمے دار یہی شخص ہو گا۔ کمار ان کو قائل کر رہا کہ اب وہ عرب کے اونٹ کی طرح خیمے میں آ گئے تھے اس لئے ان کو برداشت کرنا تھا اور وادی کے نظام میں ی سے بچنے کے لئے ضروری تھا کہ وہ ان سے تعاون کرتے۔ ظاہر ہے کمار نے دھمکی بھی دی ہوگی کہ دوسری

صورت میں ان سب کو مع راجا جتندر کے ان کے عہدوں سے معزول کر دیا جائے گا۔ اور ان سب کو جیل میں ڈال کر کمار خود وادی کی حکومت سنبھال لے گا۔ اس طرح اسے ذرا دشواری تو ہو گی مگر وہ جلد مسائل پر قابو پا لے گا، آخر اسے سرداری کا تجربہ بھی تو تھا۔ کاش کہ اس وقت کمار نے یہی کیا ہوتا۔ بہر حال اس دھمکی نے راجا اور اس کے مشیروں کے حواس درست کر دیئے تھے اور ان کے رعونت سے اکڑے سر جھک گئے تھے۔ کمار ایسا کر سکتا تھا

کمار اور اس کے ساتھی غیر قبیلے کے حملہ آور نہیں تھے۔ وہ اس وادی کے لوگ تھے۔ نسلی طور پر پورا قبیلہ ایک تھا چاہے وہ اس قلعے میں آباد ہوں یا نیچے برباد ہو جانے والی بستیوں میں۔ ان کے آپس میں رشتے ناطے تھے۔ ان کی زبان اور رسم و رواج ایک تھا۔ اس لئے کمار اقتدار پر قبضہ کر لیتا تب بھی ان کے لئے قابل قبول تھا وہ خود سردار کا بیٹا تھا اور ان کی نسل سے تھا، اس لئے معمولی مزاحمت کے بعد وہ اسے سردار تسلیم کر لیتے۔ راجا جتندر اور اس کے مشیروں نے ایک کونے میں جا کر آپس میں ایک مختصر سی میٹنگ شروع کی اور میں نے کمار کے کان میں کہا۔ "تم جلدی کرو، ورنہ میں بھوک سے فوت ہو جاؤں گا۔"

"بس دوست، میں نے کھانے کا کہہ دیا ہے۔" اس نے مجھے تسلی دی۔ "یہاں سے فارغ ہوتے ہی کھانا کھاتے ہیں۔"

اندر واقعی سردی کا اثر بہت کم تھا۔ یہاں آدمی آرام سے رہ سکتا تھا۔ اگر آگ نہ بھی جل رہی ہو تو گزارہ ہو جاتا۔ راجا جتندر اور مشیر میٹنگ کر کے آئے اور راجا جتندر نے کمار کو حکومت کے اختیارات سونپ دیئے اس کے مطابق جب تک ہنگامی حالات تھے، دوسرے لفظوں میں جب تک کمار اور اس کے ساتھی وادی میں تھے، جتندر صرف نمائشی حکمران ہوتا۔ اصل اختیارات کمار کے پاس ہوتے البتہ راج بھی اس کی وزارتی ٹیم میں شامل تھا۔ سارے امور خوش اسلوبی سے طے پا جانے کے بعد اس خوشی میں دعوت کا اہتمام ہوا تھا۔ وہیں دسترخوان بچھا دیا گیا اور انواع و اقسام کے کھانے آنا شروع ہو گئے تھے۔ مگر مجھے لگ رہا تھا کہ راج کی شمولیت کسی بڑے فتنے کا خیمہ پیش ثابت ہو سکتی تھی۔

☆======☆======☆

ایک ہفتے میں صورتِ حال خاصی حد تک معمول پر آ چکی تھی۔ نئے لوگوں کو کسی نہ کسی طرح زیر زمین محل میں بسا دیا گیا تھا۔ خوراک کے ذخائر تسلی بخش تھے اور اگلی فصل آنے سے پہلے تک کے لئے کافی تھے۔ یہ لوگ گوشت بھی کھاتے تھے اور ان کے پاس جانوروں کی کمی نہیں تھی بھیڑ، بکری، گائے اور یاک پالتے تھے بار برداری کے لئے خچر اور گدھے تھے۔ گھوڑے البتہ کم تھے۔ کمار نے انتظامی امور میں وادی کے باشندوں کو شامل رکھا تھا لیکن حفاظتی انتظامات اپنے آدمیوں کے سپرد ہی رکھے تھے۔ اس نے سارا اسلحہ اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔

حیرت انگیز طور پر فوج کی جانب سے مکمل خاموشی تھی حتیٰ کہ انہوں نے گھاٹی میں پڑے گن شپ کے ملبے سے اپنے آدمیوں کی لاشیں نکالنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی اور مجھے لگ رہا تھا کہ یہ خاموشی کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ میں نے کمار پر زور دیا کہ وہ اپنے آدمیوں کا ایک وفد دہلی بھیجے تا کہ ان کا مسئلہ مقامی اور عالمی میڈیا میں اجاگر ہو مگر نہ جانے کیوں وہ ٹال رہا تھا۔ تنگ آ کر میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑا اور اس شخص کی کھوج میں

لگ گیا جس نے اوپر فصیل سے پتھر مار کر گن شپ تباہ کیا تھا مگر اس کا بھی سراغ نہیں لگا۔ جیتو کی مدد سے میں نے سیکڑوں مقامی افراد سے پوچھا اور کسی ایک نے بھی اقرار نہیں کیا تھا کہ اس نے پتھر پھینکنے والے کو دیکھا ہے، اس واقعے کا علم سب کو تھا۔ میں حیران تھا، وہ شخص سامنے کیوں نہیں آرہا تھا اور نہ کسی نے اسے دیکھا تھا۔

نئے آنے والوں کے لئے غار کے اندرونی حصے میں توسیع کی جانے لگی تھی اور کمار نے بیشتر افراد کو اس کام پر لگا دیا تھا۔ اس نے مقامی افراد کی مدد سے صفائی ستھرائی اور فضلے کو ٹھکانے لگانے کے بھی مؤثر انتظامات کئے تھے۔ ہمارے آنے کے ایک ہفتے بعد برف باری کا نیا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ بادل گھر گھر کر آنے لگے تھے اور برف باری کا سلسلہ وقفے وقفے سے جاری تھا۔ مقامی لوگ بے حد خوش تھے کیونکہ جتنی زیادہ برف باری ہوتی تھی، گرمیوں میں کھیتوں کے لئے اتنا ہی پانی ملتا تھا اور اتنی ہی زیادہ فصل حاصل ہوتی تھی۔ یہاں چند قدرتی چشمے تھے لیکن ان کا پانی کھیتوں کے لیے ناکافی تھا دوسرے وہ پانی نیچے تھا اسے اوپر لانا ممکن نہیں تھا۔ یہاں ندیاں اور دریا نہیں تھے۔ اس لیے برف ہی پانی کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔

کمار نے دفاتر والے حصے میں ایک حجرہ اپنے لئے مخصوص کر لیا تھا، وہ اس کا دفتر بھی تھا اور خواب گاہ بھی میرے مشورے سے اس نے چند چاق چوبند مسلح جوانوں کو بطور محافظ رکھ لیا تھا۔ مجھے خطرہ تھا، اسے قتل کرنے کی کوشش کی جا سکتی تھی۔ مقامی افراد اور خاص طور پر راجا جتندر اور اس کے ساتھی کمار کے خلاف تھے۔ میں کمار کے دفتر پہنچا تو وہاں ایک مقامی لڑکی موجود تھی اور اس نے دیوداسیوں کا سا مخصوص لباس پہن رکھا تھا یعنی پیروں پر کسی ہوئی دھوتی۔ یہ ایک مخصوص انداز میں باندھی جاتی ہے اور دیکھنے میں بظاہر پاجامے نما شے لگتی ہے۔ یہ ناف سے بھی نیچے تھی۔ اس کی پتلی کمر کے گرد بھاری ابھار نمایاں ہو رہے تھے اور اوپر اس نے خاصی سردی میں ایک مختصر بلاؤز پہنا ہوا تھا۔ جس میں پشت کی جانب سوائے ڈوریوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ حسین نقوش اور سولہ سنگھار سے لگ رہا تھا کہ وہ اونچے طبقے سے تعلق رکھتی ہے جلد ہی اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔

''آؤ شہباز! اس سے ملو...... یہ راج کی بہن سومترا ہے۔''

سومترا نے ہاتھ جوڑے۔ ''پرنام شہباز جی!''

میں نے سر ہلایا۔ ''تم اردو جانتی ہو؟''

''اردو؟'' اس نے سوالیہ انداز میں کہا۔

''شہباز کا مطلب ہے ہندی!'' کمار نے مداخلت کی۔ ''شہباز، یہ مقامی لحاظ سے بہت پڑھی لکھی ہے، اسے نہ صرف ہندی بلکہ کسی حد تک انگریزی اور تبتی زبان بھی آتی ہے۔''

میں نے اسے پُرستائش نظروں سے دیکھا۔ ''یعنی جتنی حسین ہے، اتنی ہی ذہین بھی ہے؟''

''آپ بنا رہے ہیں شہباز جی۔'' اس نے شوخی سے کہا۔

''میں کیا بناؤں گا جو تم کو خدا نے بنایا ہے۔'' میں نے سرد آہ بھری اور نظروں میں کمار سے دریافت کیا کہ راج لاما کی اس ہمشیرہ کو مجھ سے متعارف ہونے کی کیا ضرورت پیش آئی تھی؟

''شہباز، یہ تم سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔''

''مجھ سے؟'' میں چونکا۔ ''خیر کہو۔''

''یہاں نہیں۔'' وہ بے تکلفی سے بولی اور میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''ہمارے ساتھ آیئے۔''

''آپ کے ساتھ، مگر کہاں؟''

''چلئے نا، ہم آپ کو کھا تو نہیں جائیں گے۔'' اس کے لہجے میں چیلنج آ گیا تھا۔

''چلو، اور تم مجھے کھا بھی نہیں سکتیں۔ سخت روکھا اور نا قابلِ ہضم ہوں۔''

اس کے ساتھ دروازے تک جا کر میں رکا۔ ''ایک منٹ، کمار سے ایک بات کہہ کر آتا ہوں۔'' میں کمار کے پاس آیا۔ ''یہ کیا چکر ہے برخوردار!''

''مجھے نہیں معلوم۔ میں نے خود اسے ابھی دیکھا ہے۔ اس نے تم سے ملنا چاہا تو میں نے تم کو بلوا لیا۔''

''مجھے اس کے انداز سے خطرے کی بو آ رہی ہے۔''

''مرد ہو کر عورت سے ڈرتے ہو؟'' کمار نے ملامت کی۔

''عورت ہے تبھی تو ڈرتا ہوں۔''

سومترا خاموشی سے میرا انتظار کر رہی تھی، جب ہم نے چلنا شروع کیا تو اس نے آہستہ سے کہا۔ ''لگتا ہے آپ ہم پر اعتماد نہیں کر رہے ہیں؟''

''یہ تم نے کیوں سوچا؟''

''آپ کمار جی سے ہمارے بارے میں پوچھنے کے لئے گئے تھے۔'' اس نے یقین سے کہا۔

''کیا مجھے نہیں پوچھنا چاہئے تھا؟'' میں لاجواب ہو گیا تھا۔

''نہیں، اتنے بہادر آدمی کو جو دنیا سے لڑ سکتا ہے، کم سے کم ایک عورت سے نہیں ڈرنا چاہئے۔''

''بی بی...... میں نے جو تجربہ خود حاصل کیا ہے اور جو دنیا کا تجربہ دیکھا ہے...... فوج کو شکست دینے والے کو عام طور سے کسی عورت کے ہاتھ سے شکست نصیب ہوتی ہے۔''

''پر آپ کو مجھ سے ڈرنے کی ضرورت......''

''میں ڈر نہیں رہا۔ تم نے اعتبار کی بات کی تھی میں نے اس کا جواب دیا ہے۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔ وہ رک کر میری طرف مڑی اور اپنی سحر انگیز آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ ''آپ تو ناراض ہو گئے۔''

''تم کہاں لے جا رہی ہو مجھے؟'' میں نے اردگرد موجود افراد پر غور کیا جو ہمیں غور سے دیکھ رہے تھے۔

''آیئے۔'' اس نے پھر چلنا شروع کر دیا۔ وہ مجھ سے ایک قدم آگے تھی اور اس کی چال میں نسوانیت کی ساری کیفیتیں تھیں۔ لچکنا، ڈولنا اور بل کھانا۔ اسے کیٹ واک نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ ماڈلز کیٹ واک کے نام پر اپنی جو نمائش کرتی ہیں اسے صرف عورت کی توہین کہا جا سکتا ہے۔ اس کے بدن کا بانکپن اور بے حد متناسب جسامت بتا رہی تھی کہ وہ کنواری ہے کسی مرد نے اسے نہیں چھوا تھا۔ اس کے پیچھے چلنا ایک صبر آزما کام تھا اس لئے میں قدم بڑھا کر اس کے برابر میں آ گیا۔

''میں تمہارے لئے اجنبی ہوں اور تمہارا بھائی راج یہاں کے بڑوں میں سے ایک ہے، اسے اعتراض نہیں ہوگا؟''

''کس بات پر؟'' اس نے اتنی معصومیت سے انجان بن کر کہا۔

"ہماری ملاقات پر؟" میں بھنا گیا تھا۔

"نہیں، بھیا کو کیوں اعتراض ہونے لگا؟" اس نے ویسی ہی معصومیت سے کہا۔

اب ہم جس حصے سے گزر رہے تھے، یہ خواص کے لئے مخصوص تھا۔ کیونکہ یہاں عوامی بھیڑ بھاڑ نہیں تھی۔ راستے بھی کشادہ تھے اور رہائشی حصوں پر چمڑے کے پردوں کے بجائے لکڑی کے منقش دروازے لگے تھے۔ سوترا ایسے ہی ایک دروازے میں مجھے لے کر داخل ہوئی۔ اندر آتے ہی میں دم بخود رہ گیا تھا۔ یہ ایک آراستہ و پیراستہ نشست گاہ تھی۔ فرش پر دبیز سفید رنگ کا قالین تھا اور نفیس قسم کا فرنیچر بھی تھا۔ دیواروں پر ریک لگا کر سجاوٹ اور آرائش کی اشیاء رکھی گئی تھیں۔ اس زیرزمین بستی میں ایسی جگہ کا تصور بھی محال تھا۔

"کیسی لگی یہ جگہ؟" سوترا نے پوچھا۔

"ایسا لگ رہا ہے جیسے میں شہر کی کسی آراستہ پیراستہ کوٹھی میں کھڑا ہوں۔"

"آؤ، میرے ساتھ۔" وہ مسکرائی اور مجھے لے کر اندر کی طرف بڑھی۔ یکے بعد دیگرے دو کمروں سے گزر کر ہم ایک گیلری میں آئے جس کے دائیں بائیں کمرے تھے۔ اس نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا۔ اندر سجا ہوا بیڈروم تھا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ "تم مجھے یہاں کیوں لائی ہو؟"

"ڈرومت شہباز جی!" وہ اندر داخل ہوئی، مجبوراً میں بھی اندر آیا۔

ایک عدد ڈبل بیڈ تھا جس پر فوم کا میٹرس تھا۔ یہاں بھی فرش پر دبیز قالین بچھا تھا۔ ایک طرف اخروٹ کی لکڑی کا صوفہ سیٹ تھا اور اس کے سامنے منقش سطح والی میز رکھی تھی۔ "اب آپ یہاں رہیں گے شہباز جی!"

"یہاں..... کیوں؟"

"کیونکہ جہاں آپ رہ رہے تھے، وہ جگہ آپ کے قابل نہیں تھی، آپ ہیرو ہیں۔"

"بی بی! میں ہیرو نہیں ہوں۔ دوسرے آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ میں صرف آپ کی مرضی سے کسی جگہ رہ لوں گا۔" میرا لہجہ ذرا سخت ہو گیا تھا۔

اس کا چہرہ یک دم بجھ گیا۔ اس نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ "ہمیں افسوس ہے۔ پر آپ غلط سمجھ رہے ہیں، ہم نے خلوص سے یہ کام کیا ہے۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو لرزتے دیکھ کر میں خود نرم پڑ گیا تھا۔ "سوری، میرا یہ مطلب نہیں تھا مگر تمہیں میرے لئے ایسا کوئی بندوبست کرنا تھا تو مجھے پہلے بتا دیتیں۔"

"اب بتا دیا!" اس نے گلابی ہتھیلیوں سے آنسو صاف کئے۔ "بھگوان کے لئے انکار مت کیجئے گا۔"

"مگر مجھ پر یہ عنایت کیوں؟"

"ہم نے کہا نا..... آپ ہمارے ہیرو ہیں۔ ہم نے باہر سے آنے والوں سے آپ کی تعریفیں سنی تھیں، ہمارا من مچل گیا کہ آپ سے ملیں..... آپ کی سیوا کریں۔"

میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا اس سیوا کے پیچھے چھپے مقاصد۔ کسی حسین نوجوان لڑکی کا من یونہی کسی کی سیوا کے لئے نہیں مچلتا ہے۔ اگر صرف سوترا کی بات ہوتی تو میں شاید اس کی میزبانی قبول کر لیتا مگر وہ راج کی بہن تھی اور میں نے جب اسے دیکھا تھا، اس کی آنکھوں میں اپنے لئے نفرت ہی دیکھی تھی۔ میں ایسے شخص کے گھر

میں مہمان بن کر کیسے رہ سکتا تھا۔ "سوترا! تم جانتی ہو راج لاما تمہارا بھائی، مجھے پسند نہیں کرتا؟"

"یہ آپ سے کس نے کہا اور اگر بھیا آپ کو ناپسند بھی کرتے ہیں تو اس سے میرا کیا تعلق ہے، میں تو آپ کو پسند کرتی ہوں۔"

"یہ راج کا گھر نہیں ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ میرا گھر ہے۔ بھیا کا اس سے تعلق نہیں ہے۔"

"تم اپنے بھائی سے الگ رہتی ہو؟"

"ہاں...... وہ میرے پتا جی نے اپنی زندگی میں ہی اپنی دولت اور یہ مکان ہم دونوں میں تقسیم کر دیا تھا۔"

"تب تو میرا یہاں رہنا اور بھی نامناسب ہے۔"

"کیوں؟" وہ میرے قریب آ گئی تھی۔

"سوترا، سمجھنے کی کوشش کرو۔ تم لڑکی ہو اور تمہارے گھر میں کوئی غیر مرد آ کر رہے تو لوگ باتیں نہیں بنائیں گے؟"

"ہمیں لوگوں کی پروا نہیں ہے۔"

"لوگوں کی پروا کرنی پڑتی ہے اور میں اس جگہ اجنبی ہوں۔ میں کسی مشکل میں نہیں پڑنا چاہتا۔"

"تو آپ ہمارے ساتھ رہنے سے انکار کر رہے ہیں؟" اس کا لہجہ بھرا گیا تھا۔

"مجبوری ہے سوترا!"

اس نے رخ دوسری طرف کر لیا۔ اس کا جسم لرزا تو میں جان گیا وہ رو رہی تھی۔

"خدا کے لئے سوترا!" میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "میری مجبوری سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"آپ راج بھیا کی وجہ سے مجھ سے بھی نفرت کرتے ہیں۔"

"ایسی بات نہیں ہے۔" میں نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

"سچ کہہ رہے ہیں؟" اس نے مڑ کر اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا تھا۔

میں مشکل میں پڑ گیا تھا۔ "مجھے تم سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"تب یہاں رہ جایئے، ہمارے پاس!" اس نے بھیگی آنکھیں اٹھا کر کہا۔

سچ یہ تھا کہ اس نے مجھ پر اثر ڈالا تھا، اس کے حسن اور ادائے دلبری کی معصومیت نے میرے دل کے تار چھیڑ دیئے تھے ورنہ اس کی جگہ کوئی حسینہ عالم، مس یونیورس ہوتی تب بھی میں خود کو اس کے سامنے اتنا مجبور نہ کرتا۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میں اس پر عاشق ہو گیا تھا۔ یہ ایک دل کو چھو لینے والی پسند تھی جو ہر انسان کے اندر پائی جاتی ہے۔ اس نازک سی لڑکی نے دیکھتے ہی دیکھتے مجھ پر قبضہ کر لیا تھا۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "سوترا، یہ ممکن نہیں ہے، لوگ باتیں بنائیں گے۔"

"ہمیں لوگوں کی پروا نہیں ہے۔ ہم سورج ہنس کی بیٹی ہیں، کسی کی مجال ہے جو ہمارے بارے میں غلط سوچے۔"

وہ سچ مچ بھولی تھی۔

"سوہترا! میں ابھی تمہاری یہ پیشکش قبول نہیں کر سکتا۔" میں نے دل پر جبر کر کے کہا۔ "میں کمار سے مشورہ کروں گا۔"

"اچھا، کچھ دیر تو رک سکتے ہیں؟" اس نے پیچھے ہو کر کہا۔

"ہاں، کچھ دیر رک سکتا ہوں۔" میں نے اس کا دل رکھنے کے لئے کہا۔ اس نے فوراً تالی بجائی اور ایک نوجوان خادمہ اندر آئی۔

"پوربی، جا کر کچھ کھانے اور پینے کو لا۔"

"میں مسلمان ہوں اور ہم ہر شے کھا پی نہیں سکتے۔" میں نے اسے ٹوکا۔

"میں جانتی ہوں اور مجھے پتا ہے مسلمان نشہ نہیں کرتے اور نہ ہی ایک خاص طریقے کے بغیر کٹا جانور کھاتے ہیں۔" سوہترا بولی اور پوربی کو ہدایت دینے لگی۔

پوربی بھی اچھی دلکش لڑکی تھی مگر اس کے حسن میں بے باکی نمایاں تھی جبکہ سوہترا کے حسن میں ایک طرح کی معصومیت تھی۔ اس کے باوجود وہ ایسے لباس میں تھی کہ میں اس سے نظریں چرانے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ پوربی کے جانے کے بعد میں نے اس سے کہا۔ "مانا کہ یہاں خاص سردی نہیں ہے مگر پھر بھی تمہیں کچھ پہن لینا چاہئے۔"

"کیوں ــــ پہنا ہوا تو ہے؟"

"ہاں مگر یہ یہاں کا عام لباس تو نہیں ہے۔"

"ہمیں اچھا لگتا ہے اور ہمیں معلوم ہے کہ آپ کو بھی ہم پر اچھا لگ رہا ہے۔" اس نے بات ہی ختم کر دی۔ میں اخروٹ کی لکڑی کے صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ یہ خواب گاہ کمار کے دفتر اور خواب گاہ سے ہزار گنا بہتر تھی، جہاں میں رات کو ایک معمولی سے کمبل میں خود کو لپیٹ کر کھردرے قالین پر سو جاتا تھا۔ ایک وزیر باتدبیر کی ہمشیرہ کا مہمان خانہ جب اتنا سجا ہوا تھا تو خود ہمشیرہ یا وزیر باتدبیر اور راجا کی عالی شان رہائش گاہوں کا صرف تصور کیا جا سکتا تھا۔ یعنی اس وادی میں حکمران طبقہ عوام کے مقابلے میں ویسی ہی زندگی بسر کر رہا تھا جیسی کہ پاک و ہند کے حکمران بسر کرتے تھے۔ پورے عیش و عشرت سے اور پورے کروفر کے ساتھ۔ پوربی ایک تھالی میں بہت ساری چیزیں سجا کر لے آئی تھی۔ اس طرح شیشے کے ایک جگ میں اناناس کے جوس جیسی کوئی شے تھی۔ کھانے کی تمام چیزیں سبزی یا اناج سے بنی تھیں اس لئے میں نے بے خطر ہو کر کھائیں۔ سوہترا خود اٹھا اٹھا کر چیزیں پیش کر رہی تھی۔ مجھے رغبت سے کھاتا دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ پھر اس نے جگ سے وہ شربت نکال کر پیش کیا۔ "یہ وادی کا خاص مشروب ہے اور صرف اسی جگہ بنتا ہے۔" اس نے کہا۔

میں نے پی کر دیکھا، ذائقہ منفرد اور فرحت بخش تھا۔ "ہاں، اچھا ہے۔"

"اسے خاص جڑی بوٹیوں سے بنایا جاتا ہے۔" اس نے بتایا۔ "جسم کو طاقت دیتا ہے اور سردی سے بچاتا ہے۔"

میں نے اسے دیکھا۔ "لگتا ہے تم بھی مشروب استعمال کرتی ہو تبھی سردی نہیں لگتی؟"

وہ ہنسی۔ "نہیں، میں عادی ہوں۔ بچپن سے یہاں رہی ہوں۔ ایسے کپڑوں میں باہر بھی جا سکتی ہوں،

مجھے سردی نہیں لگتی۔"

"فرض کرو، تمہارے بھیا نے مجھے یہاں دیکھ لیا تو؟"

"بھیا یہاں نہیں آتے اور ان کو کیا پتا کہ تم یہاں ہو؟"

میں نے افسوس سے اسے دیکھا۔ "تم اتنے لوگوں کے درمیان سے مجھے یہاں لائی ہو، یہ کیسے ممکن ہے کہ اس تک خبر نہ پہنچے۔"

اس نے منہ پر ہاتھ رکھا۔ "یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔"

"اور ممکن ہے راج کو اتنی دیر میری یہاں موجودگی سے کوئی شبہ ہو جائے۔ اس لئے اب مجھے جانے دو میں پھر آؤں گا۔" میں کھڑا ہو گیا۔

"ایسے نہیں۔" اس نے اچانک بانہیں میرے گلے میں ڈال دی تھیں۔

"سوترا، یہ کیا حرکت ہے؟" میں نے اسے الگ کرنے کی کوشش کی مگر وہ ناگن کی طرح مجھ سے لپٹ گئی تھی اور پھر اس نے ایسی حرکت کی کہ میں بوکھلا کر اور لاحول پڑھ کر رہ گیا۔ "یہ کیا حرکت کی ہے؟" میں نے ہونٹ رگڑے۔ اس کے لبوں کی لالی اتر آئی تھی۔ وہ ہنسی تو سکے کھنک گئے۔

"اے...... پیارے ڈرتے ہو؟"

"اب میں نہیں آؤں گا۔" میں نے خفگی سے کہا۔

"مت آنا۔ تم جہاں ہو گے وہاں آجاؤں گی اور سب کے سامنے......"

"میں تمہیں مار بیٹھوں گا۔"

"بے شک مار ڈالنا...... لیکن دن میں ایک بار تم پیار ضرور دو گے۔"

"زبردستی ہے کوئی؟"

"ہاں زبردستی ہے۔" وہ شوخی سے بولی۔ "انکار کر کے دیکھو...... ابھی چلتی ہوں تمہارے ساتھ۔"

"خدا کے لئے سوترا!" میں پریشان ہو گیا تھا۔ "کمار اور اس کے ساتھی میری بہت عزت کرتے ہیں، میں ان سب کی نظروں میں نہیں گرنا چاہتا۔"

"تو دن میں ایک بار یہاں آؤ گے۔" اس نے شرط رکھ دی۔

"ٹھیک ہے بابا!" میں نے جان چھڑانے کے لئے کہا۔

"اور اگر نہیں آئے تو میں خود آجاؤں گی۔" اس نے دھمکی دی۔

"سوترا! تم آگ سے کھیل رہی ہو۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"میں نہیں جانتی۔" اس نے معصومیت سے کہا۔ "اگر یہ آگ ہے تو مجھے دل و جان سے قبول ہے۔"

میں بوجھل دل کے ساتھ اس کے کمرے سے نکل آیا تھا۔ یہ لڑکی پاگل تھی۔ میں اس کے جذبے کی شدت نہیں جانتا تھا مگر مجھے لگ رہا تھا وہ پسند کے راستے پر حد سے آگے جا چکی تھی۔ نہ جانے یہ لڑکیاں اتنی نادان کیوں ہوتی ہیں۔ بے اختیار میرے تصور میں دو سیاہ آنکھیں آ گئیں۔ سویرا نے بھی ایسے ہی دل لگایا تھا مگر وہ میرے نصیب میں نہیں تھی۔ وہ کسی اور کے مقدر کا ستارہ تھی تبھی تو میں اب تک بے چین اور آوارہ پھر رہا ہوں۔

میں بے خیالی میں غار کے مختلف حصوں میں بھٹکتا ہوا ایک تاریک گوشے کی طرف جا نکلا تھا۔ میں چونکا، اردگرد دیکھا۔ یہ ویران جگہ تھی اور اس جگہ سے چاروں طرف راستے نکل رہے تھے اور میں قطعی بے خبر تھا کہ ان میں سے کون سا راستہ کس طرف کو جاتا ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ کون سا راستہ اختیار کروں کہ سامنے سے ایک سایہ نمودار ہوا اس کے ہاتھ میں لمبا سا ڈنڈا دیکھ کر میں پہلے ہی چوکنا ہو گیا تھا۔ اس نے آتے ہی لپک کر مجھ پر وار کیا اور میں نے جھکائی دے کر وار بچایا۔ اسی لمحے عقب سے آہٹ محسوس ہوئی، کوئی اور بھی تھا جو عقب سے آیا تھا۔ خطرہ محسوس کر کے میں جھکے جھکے اس شخص میں گھس گیا جس نے لاٹھی سے میرا سر توڑنے کی کوشش کی تھی۔

اس فائدہ یہ ہوا کہ عقب سے ماری جانے والی لاٹھی میرے سر کے بجائے شانے سے ذرا نیچے کمر پر لگی تھی۔ درد کی شدت نے ایک لمحے کو میرا جسم مفلوج کر دیا تھا اور میں زور میں سامنے والے کو لیتا فرش پر جا گرا۔ اس کا سر پختہ فرش سے ٹکرایا تو اسے یقیناً وہ تمام ستارے اور سیارے نظر آ گئے ہوں جو اس غار سے دیکھنا ممکن تھے۔ اس نے اپنی مادری زبان میں کچھ کہا تھا۔ ظاہر ہے اس نے میری تعریف ہی کی ہو گی مگر مجھے عقب والے کی زیادہ فکر تھی۔ درد برداشت کرتے ہوئے میں نے قلابازی کھائی اور مضروب پر سے رول کرتا آگے جا گرا۔ مگر عقب سے آنے والا اب محتاط تھا۔ میں کھڑا ہوا تو اس نے لاٹھی سے مارنے کا اشارہ دیا پر وار نہیں کیا تھا۔

''کون ہو تم؟'' میں نے کمر میں ہونے والا درد دباتے ہوئے کہا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے اچانک زمین پر پڑے شخص کے سر پر ٹھوکر ماری تاکہ وہ مزید کچھ دیر آسمان کی سیر کرتا رہے اور مجھے اس شخص سے نمٹنے کا موقع ملے۔ اس نے اچانک لاٹھی کو اتنی تیزی سے دائیں بائیں حرکت دی کہ مجھے لاٹھی نظر ہی نہیں آئی۔ صرف اس کی شائیں شائیں سنائی دی تھی۔ اس نے دھوکا دے کر اچانک سامنے سے لاٹھی کا سرا میرے پیٹ میں نیزے کی طرح مارنے کی کوشش کی اور اس کا لوہا چڑھا نوکیلا سرا نیزے کی طرح میرے پیٹ میں گھس جاتا اگر میں بروقت نہ سرک جاتا۔ سرا دیوار سے ٹکرایا تو چنگاریاں اڑی تھیں۔ اس نے پوری قوت سے وار کیا تھا اور ناکامی پر ایک لمحے کا توقف کئے بغیر دوسری بار وار کیا۔ میں اندازہ کر چکا تھا اس لئے فوری طور پر بچا گیا پھر میں نے لاٹھی پر ہاتھ ڈال دیا اور اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑتے ہوئے اسے لات ماری۔ اس کی گرفت لاٹھی پر مضبوط تھی اس لئے وہ گرنے سے بچ گیا اور یہی اس کے دوسری لات کھانے کی وجہ بنی۔ وہ اپنا پیٹ پکڑ کر پیچھے جا گرا۔ لاٹھی میرے ہاتھ میں تھی اور نہتا ہوتے ہی اس کی ہمت جواب دے گئی تھی، گرتے ہی وہ حیرت انگیز پھرتی سے اٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ یا کلائی میں کسی شے کی چمک نظر آئی۔ میں اس کے پیچھے بھاگا مگر وہ راستوں کی بھول بھلیوں میں غائب ہو چکا تھا۔ مجھ سے حماقت ہوئی جو میں نے زمین پر پڑے شخص پر توجہ نہیں دی۔ حالانکہ حقیقت جاننے کے لئے وہ بھی کافی تھا۔ جب میں واپس آیا تو وہ بھی غائب تھا۔ میں نے اپنی حماقت پر سر پیٹ لینے کا ارادہ ملتوی کیا اور بھاگتے بھوت کی لنگوٹی کی طرح ہاتھ آنے والی لاٹھیاں لے کر راستہ تلاش کرنے لگا۔ بالآخر مجھے راستہ مل گیا اور آگے رہائشی علاقہ شروع ہوا تو میرے تنے ہوئے اعصاب بھی ڈھیلے پڑ گئے تھے۔

میری پشت میں درد بڑھ گیا تھا۔ ضرب زوردار تھی۔ اس نے میرا سر توڑنے کی نیت سے وار کیا تھا اور نشانہ چوک گیا تھا ورنہ میرا سر پھٹ گیا ہوتا۔ مجھے ذرا بھی شبہ نہیں تھا، وہ دونوں موت کے ہرکارے تھے اور میرا

بوریا بستر اس دنیا سے گول کرنے آئے تھے۔ خدا خدا کر کے میں کمار کے پاس پہنچا۔ رات کا وقت تھا اور وہ اپنے دو مشیروں کے ہمراہ کسی انتظامی مسئلے پر بات کر رہا تھا۔ مجھے لاٹھی بلکہ لاٹھیاں بدست دیکھ کر وہ چونک گیا۔

''خیریت...... یہ دو عدد لاٹھیاں؟''

''جن کی تھیں وہ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ویسے ان کا مقصد مجھے قتل کرنا تھا، تم ان کو آلہ قتل سمجھ سکتے ہو۔''

میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھا تو میری آہ نکل گئی تھی۔ کمار دوبارہ چونکا تھا۔ ''قاتلانہ حملہ! تم ٹھیک ہو نا؟''

''کمر پر ایک ضرب لگی تھی۔ وہ دونوں بھی کہیں پڑے اپنی چوٹیں سہلا رہے ہوں گے۔'' میں نے لاٹھیاں اس کے سامنے رکھ دیں۔ ''ان سے معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ وہ کون ہیں؟''

''وہ میں معلوم کر لوں گا۔ پہلے تم مجھے چوٹ دکھاؤ۔'' اس نے اصرار کیا تو میں نے قمیص اتار دی۔ میں ابھی تک بھارتی فوج کی وردی میں تھا۔ ضرب کا نشان دیکھ کر کمار تشویش زدہ ہو گیا تھا۔ ''اندر کا گوشت پھٹ گیا ہے، ایک منٹ رکو، میں وید کو بلاتا ہوں۔''

وید دس منٹ میں آ گیا تھا۔ یہ جھاڑ جھنکاڑ بالوں اور داڑھی والا شخص تھا جس کی چمکتی آنکھوں سے پتا چلتا تھا کہ اس کا منہ کس طرف ہے۔ اس نے ضرب کے نشان کا معائنہ کیا، اپنے تھیلے سے ایک عدد ڈبا نکالا اور اس سے کوئی مرہم نکال کر میری پشت پر لگانے لگا۔ مجھے بے اختیار حکیم قادس یاد آ گیا اس کے پاس زخموں کو ٹھیک کرنے والے حیرت انگیز نسخے تھے۔ ممکن ہے یہ وید بھی اسی قبیل کی شے ہو۔

''یہ بتا رہا ہے کہ ضرب شدید ہے۔ ممکن ہے ہڈی بھی متاثر ہوئی ہو۔'' کمار نے اس سے بات کر کے بتایا۔ ''تم کو دو دن آرام کرنا ہو گا۔ یہ تین بار آ کر تمہاری کمر پر مرہم لگائے گا۔''

وید کے جانے کے بعد کمار نے میرے لئے قہوہ منگوایا اور میں نے اسے تفصیل سے بتایا کہ حملہ آوروں نے میرے ساتھ کیا سلوک کرنے کی کوشش کی تھی اور میں نے ان کے ساتھ کیا، کیا۔ کمار سوچ میں پڑ گیا تھا۔

''تم اس جگہ کی نشاندہی کر سکتے ہو؟''

''میں کوشش کروں گا، مجھے یہاں کے سارے راستے ایک جیسے لگتے ہیں۔''

''فی الحال تو تم آرام کرو اور آئندہ اکیلے پھرنے سے پرہیز کرنا۔ کل سے میں تمہارے ساتھ کوئی آدمی لگا دوں گا۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے تمہارے خیال میں یہ کون ہو سکتے ہیں؟''

''وہی جو ہمارے یہاں آنے پر چراغ پا ہیں۔ مجھے کچھ ایسی اطلاعات ملی ہیں جن سے پتا چلتا ہے، اندرون خانہ کوئی چکر چل رہا ہے۔''

''کمار، تم اپنی حفاظت پر بہت توجہ دو، سب سے زیادہ خطرہ تمہیں ہی ہے۔''

''میں نے اپنی حفاظت پر بہترین آدمی لگائے ہیں۔'' کمار نے کہا۔ ''یہ بتاؤ، تم سومترا کے پاس سے کیوں نکلے، تم کو تو اب اس کے پاس رہنا تھا۔''

میں دنگ رہ گیا۔ ''تم جانتے ہو؟''

''جانتا کیا، میں نے ہی تو سومترا سے کہا تھا تمہیں اپنے پاس لے جائے۔ اطلاعات کا تعلق تمہاری ذات

سے بھی ہے میرے دشمن پہلے تمہیں اپنے راستے سے ہٹانا چاہتے ہیں۔ وہ تمہیں اپنے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے ہیں۔ تم نے جس طرح سے فوج سے مقابلہ کیا اور میرے لوگوں کو بچایا ہے اس کے بعد تم ان کے لئے مافوق الفطرت بن گئے ہو۔''

''اور تم نے مجھے سومترا کے حوالے کر دیا جو راج کی بہن ہے۔'' میں نے کسی قدر طنزیہ لہجے میں کہا۔

''سومترا! رشتے میں میری کزن لگتی ہے اور وہ سو فی صد میری حامی ہے۔ میں اس پر پورا بھروسا کرتا ہوں۔'' کمار نے سنجیدگی سے کہا۔

''معاف کرنا یار! وہ تو میرے چکر میں پڑ گئی ہے۔'' میں نے جھینپ کر کہا اور کمار کو بتایا کہ اس نے میرے ساتھ کیا کیا تھا اور آئندہ کے لئے مجھے کیا دھمکیاں دی ہیں۔'' کمار ہنس دیا تھا۔

''وہ ایسی ہی سر پھری ہے۔ تمہاری پرستار ہے۔''

''کیا مجھے معافی نہیں مل سکتی؟'' میں نے عاجزی سے کہا۔

''مشکل ہے۔ وہ جو کہتی ہے کان دبا کر مانتے رہو۔ میں اسے جانتا ہوں، وہ تمہیں پسند کرتی ہے مگر آوارہ مزاج نہیں ہے۔''

''میں نے یہ کب کہا۔'' میں بوکھلا گیا تھا۔

''میرا خیال ہے تم اس کے پاس چلے جاؤ۔ تمہیں آرام کی ضرورت بھی ہے۔ رکو، میں دو آدمی ساتھ کرتا ہوں۔ وہ تمہیں سومترا کے گھر چھوڑ آئیں گے۔''

''اس وقت......؟ میں صبح چلا جاؤں گا۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''یار، ڈرو مت، وہ کچھ نہیں کہے گی تمہیں۔''

''میں اس سے نہیں، اپنے انسان ہونے سے ڈرتا ہوں۔''

کمار نے مجھے نظر جما کر دیکھا۔ ''شہباز! جو اپنے انسان ہونے سے ڈرتے ہیں، اصل میں وہی انسان ہوتے ہیں۔ مجھے تم پر پورا اعتماد ہے۔''

''صبح نہیں جا سکتا؟'' میں نے آخری کوشش کی۔ ''وہ کیا کہے گی، انکار کر کے خود آ گئے۔''

''نہیں ابھی جاؤ، سومترا خوش ہو گی۔''

''کمار کے دو آدمی مجھے زیرِ حراست ملزم کی طرح سومترا کے گھر میں چھوڑ گئے۔ وہ ہنس رہی تھی اور اس نے جو کہا اس کا مفہوم یہی تھا کہ لوٹ کے بدھو گھر کو آئے۔ میں نے خفت سے کہا۔ ''مجھے کیا معلوم تھا کہ کمار نے مجھے تمہاری تحویل میں دیا ہے۔''

''اب معلوم ہو گیا۔'' وہ بولی۔ ''چلو، اب اندر آؤ۔''

وہ مجھے بیڈ روم میں لے آئی۔ اس نے اپنا ہوش ربا لباس بدل لیا تھا اور ایک میکسی نما لباس پہن رکھا تھا۔ جو اس کے گھٹنوں سے ذرا نیچے تھا۔ لہٰذا اس کی شفاف گلابی پنڈلیاں نمایاں تھیں۔ میکسی کا گریبان بھی نظر نواز حد تک فراخ تھا جس کی کسی قدر پردہ پوشی اس کی گھنی اور لمبی زلفیں کر رہی تھیں۔

''کمار نے تمہیں بتایا ہے۔ یہاں تمہاری جان کو خطرہ ہے۔''

''اس کا ثبوت تو تمہارے ہاں سے نکلتے ہی مل گیا تھا۔'' میں نے کہا اور اسے خود پر ہونے والے حملے کے بارے میں بتایا، وہ پریشان نظر آنے لگی۔

''زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟'' اس نے کہا۔ ''دکھاؤ مجھے۔''

اس نے اصرار کر کے میری چوٹ دیکھی۔ ''یہ تو بہت سوج گیا ہے۔'' وہ بولی۔ ''ایک منٹ، میں اس کی سکائی کرتی ہوں۔'' اس نے کہا اور پوربی کو آواز دی۔ وہ کھٹ سے حاضر ہو گئی اور مجھے بغیر قمیص کے دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ سومترا نے اسے ربڑ کی بوتل میں پانی گرم کر کے لانے کا حکم دیا۔

''تمہارے پاس پین کلر گولیاں ہیں؟''

''ہاں، میں ابھی لاتی ہوں۔'' وہ بولی اور جا کر درد کش گولیاں لے آئی۔ ''یہ غیر ملکی تھیں اور بے حد موثر ہوتی ہیں۔ ساتھ میں ایک گلاس دودھ تھا، میں نے گولیاں دودھ سے لے لیں۔ کچھ دیر میں پوربی بوتل میں گرم پانی لے آئی۔ ''اوندھے منہ لیٹ جاؤ۔'' سومترا نے کہا۔

''میں اوندھے منہ لیٹا تھا، وہ اب آپ جناب اور ہم کے بغیر سادہ انداز میں گفتگو کر رہی تھی۔ ''تم میرے لیے بہت زیادہ زحمت کر رہی ہو۔''

''یہ تو میری خوشی ہے۔'' اس نے بوتل میری چوٹ پر رکھی تو اس کی گرمائش سے میری آہ نکل گئی تھی۔ مگر پھر اچھا لگنے لگا۔ ''ہم نے سنا ہے تم کہیں دور سے آئے ہو اور چلے جاؤ گے۔''

''یہ درست ہے میں پہلے چلا جاتا لیکن مجبوری کی وجہ سے یہاں آ گیا۔''

''اب تم یہیں رہو گے۔ باہر تمہاری جان کو خطرہ ہے۔''

''میری جان اکثر خطرے میں ہی ہوتی ہے۔''

''تمہیں جانے نہیں دوں گی۔''

''میں قید میں بیٹھنے والا شخص نہیں ہوں۔''

''تب تم جہاں جاؤ گے میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔''

''فائدہ۔ اگر میرا وقت آ گیا ہو تو کیا تم موت کو روک سکو گی؟''

''میں آنے والی موت کو نہیں روک سکتی لیکن تمہارے ساتھ جان تو دے سکتی ہوں۔''

''سومترا! تم کس پاگل پن میں پڑ گئی ہو۔ میں آج یہاں ہوں، کل یہاں سے چلا جاؤں گا۔ میرا تعلق اس ملک سے نہیں ہے۔''

''تمہارا تعلق جس ملک سے بھی ہو، میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔'' اس نے ضدی لہجے میں کہا۔

اس سے بحث کرنا بے کار تھا۔ کمار نے اس کے بارے میں درست کہا تھا، وہ سر پھری لڑکی ہے۔ ''مجھے نیند آ رہی ہے۔'' میں نے اس سے جان چھڑانے کے لئے کہا حالانکہ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس نے مجھے ایک ہلکا کمبل اوڑھا دیا مگر جانے کے بجائے میرے پاس بیٹھ کر میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ اس کے بدن سے سحر انگیز سی خوشبو اٹھ رہی تھی جو میرے حواس پر چھانے لگی۔ میں نے گھبرا کر کہا۔ ''تم جاؤ، میں سو جاؤں گا۔''

''شش!'' اس نے میرے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔ ''میں چلی جاؤں گی، تم سو جاؤ۔''

اس کی انگلیوں سے جیسے سرور نکل کر میرے ذہن پر طاری ہو رہا تھا۔ میں نے مزاحمت ترک کر کے خود کو اس کے حوالے کر دیا۔ ذرا سی دیر میں میری آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں اور میں نیند کی وادیوں میں اتر گیا۔

☆======☆======☆

یہ انوکھی سی جگہ تھی۔ دھواں دھواں سی، مگر یہ دھواں آنکھوں میں چبھ نہیں رہا تھا۔ نرمی اور خوش رنگ تاثر دے رہا تھا، کسی دھنک رنگ بادل کی طرح۔ میرے پیروں تلے بھی بادل تھے۔ پھر ان بادلوں سے کوئی نکلا تھا۔ ایک تراشیدہ پیکر۔ میں اسے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ میری طرف پشت کئے کھڑی تھی۔ میں نے اسے میکسی سے پہچانا، وہ سومترا تھی۔ میں بے ساختہ اس کی طرف بڑھا، اسے عقب سے آغوش میں لے لیا اور اس کے گھنے معطر بالوں میں اپنا منہ چھپا لیا۔ "سومترا! میں بہت تھک گیا ہوں۔"

وہ ہنسی۔ "میں سومترا نہیں ہوں۔"

مجھے شاک لگا تھا۔ وہ...... وہ سویرا تھی۔ میں نے جلدی سے اسے چھوڑ دیا۔ "تم...... تم سویرا...... میرے خدا! اب تم میرے بھائی کی امانت ہو۔"

"اچھا...... تمہیں میں اچھی نہیں لگتی؟" اس نے کہا اور اچانک وہ ایمن بن گئی۔ ایمن میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ "اب ٹھیک ہے نا؟"

اس نے میری طرف ہاتھ بڑھائے۔ میں نے اس کے ہاتھ تھام لئے تھے۔ "ایمن! تم کہاں چلی گئی تھی؟"

"کہیں نہیں، میں تمہارے پاس ہوں، مجھے چھو کر دیکھو۔"

اس نے خود کو اس طرح پیش کیا کہ میرے پاس کوئی راہِ فرار باقی نہیں رہی تھی۔ میں اس کی نرمی، اس کی خوشبو اور اس کی محبت محسوس کر رہا تھا۔ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میرا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور حلق بالکل خشک ہو رہا تھا۔ میں کروٹ لئے لیٹا تھا، سامنے تپائی پر شیشے کا جگ اور گلاس رکھا تھا۔ میں نے گلاس کا تکلف نہیں کیا اور جگ منہ سے لگا کر ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ خالی جگ تپائی پر رکھ کر میں سیدھا ہو کر لیٹنے لگا تھا کہ مجھے دوسری بار جھٹکا لگا۔ سومترا...... میرے برابر میں بے سُدھ سو رہی تھی۔ وہ رات والے لباس میں تھی اور جامے سے باہر ہوئی جا رہی تھی۔ میکسی نیچے سے گھٹنوں سے خاصی اوپر چلی گئی تھی اور اوپر سے بھی بے ترتیب ہو رہی تھی۔ میں نے لاحول پڑھی اور اسے ہلایا۔ "سومترا! یہ کیا حرکت ہے؟"

اس نے بمشکل پُر خمار آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا۔ "ہونہہ...... کیا ہے؟"

"تم رات کو یہاں سوئی تھیں؟"

"ہاں، تو کیا ہوا؟"

"ہوا تو کچھ نہیں۔" میں نے بھنا کر کہا۔ "لیکن ہو سکتا تھا، میرا امتحان مت لو۔"

وہ اٹھ بیٹھی اور اپنا سر میرے شانے پر رکھ دیا۔ "میں نے کب امتحان لیا ہے تمہارا؟"

میں نے اسے پیچھے دھکیل دیا۔ "یہ امتحان نہیں تو اور کیا ہے۔ سومترا، تم بھول رہی ہو، میں ایک مرد ہوں اور کبھی بھی بہک سکتا ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے تم ایسا نہیں کر سکتے۔" اس نے برا مانے بغیر کہا اور اپنے آبشار کی طرح بکھرے بال سمیٹنے لگی۔ اس کا یہ انداز اتنا ہوش رُبا تھا کہ میں بے ساختہ نظریں چرانے پر مجبور ہو گیا تھا۔ وہ سادگی اور سحر کاری کا مکمل، مکمل رہی تھی۔ بیک وقت معصوم بھی بنتی تھی اور جذبات کو بھڑکانے والی آتش فشاں عورت بھی۔ میں بھی لگ کر میں ساری رات یہ جانے بغیر سوتا رہا تھا کہ وہ میرے پہلو میں موجود ہے۔ اپنی سحر کاری اور ادائیں بھی آزما کر وہ اتنی ہوشیاری سے انجان بن جاتی تھی کہ میں اس سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔

"تمہارے کپڑے میلے ہو رہے ہیں اور تم کتنے دن سے نہیں نہائے ہو۔" اس نے ناک سکیڑ کر کہا۔ "بال نہیں بنوائے اور نہ شیو بنائی ہے۔"

"کیونکہ مجھے اس کا موقع ہی نہیں ملا۔" میں نے جواب دیا۔

"میں ابھی سارا انتظام کرتی ہوں۔" وہ بستر سے اٹھی اور کمرے سے نکل گئی۔ میری پیٹھ کی تکلیف نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ میں نے اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنی پشت دیکھی۔ سوجن ختم ہو گئی تھی اور نیلاہٹ بھی معمولی سی رہ گئی تھی۔ یہ نہ جانے اس وید کے زود اثر مرہم کا کمال تھا یا حکیم قادس کی دواؤں کا اثر۔ میں نے دیکھا تھا، ابھی بھی میرے زخم اور چوٹیں حیرت انگیز طور پر بہت کم وقت میں ٹھیک ہو جاتی تھیں۔ میں نے بازو گھما کر دیکھے مگر درد نہیں ہوا اور نہ رگ پٹھے کھنچے، سوترا اندر آئی۔

"اٹھ گئے!" اس نے کہا۔ "میرے ساتھ آؤ نائی آ گیا ہے۔"

نائی ایک خالی کمرے میں میرا منتظر تھا۔ وہاں صرف ایک کرسی رکھی تھی، اس نے مجھے کرسی پر بٹھا کر پہلے میرے بال تراشے۔ مجھے حجامت بنوائے خاصا عرصہ ہو گیا تھا اس لئے بال دراز ہو کر بے ہنگم صورت اختیار کر گئے تھے اور چہرے پر اچھی خاصی داڑھی بڑھ آئی تھی۔ اس نے بال تراش کر سیٹ کئے، اس کے بعد شیو بنائی۔ ایک گھنٹے بعد اس نے آئینہ دکھایا تو میں خود کو شناخت نہیں کر سکا تھا۔ اپنا اصل چہرہ دیکھے ہوئے طویل عرصہ گزر گیا تھا اس لئے خدوخال اجنبی اجنبی سے لگ رہے تھے۔

"کمال کر دیا تم نے۔" میں نے اس کی تعریف کی تو وہ دانت نکالتا ہوا رخصت ہو گیا۔

غسل خانے تک پوربی نے میری رہنمائی ہی نہیں کی تھی بلکہ وہ مجھے غسل کرانے پر آمادہ نظر آتی تھی۔

"اب تم جاؤ۔" میں نے کہا۔

"صاحب، آپ کو ہماری مدد کی ضرورت ہو گی۔" اس نے مسکرا کر معنی خیز انداز میں کہا۔ "ہم مالکن کی خاص خادمہ ہیں۔"

"مجھے کسی خاص خادمہ کی ضرورت نہیں ہے۔ مہربانی کر کے تم جاؤ اور ہاں، مجھے دوسرے کپڑے چاہئیں۔"

"برابر والے کمرے میں ہیں۔" اس نے کہا۔ "میں جاؤں؟"

"تو اور کیا کہہ رہا ہوں۔" میں نے کہا تو وہ بادل ناخواستہ رخصت ہو گئی۔ یہاں تو جسے دیکھو، مکمل ہو رہا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے اس آراستہ پیراستہ غسل خانے کا معائنہ کیا۔ یہاں باتھ ٹب سے لے کر گرم پانی تک ہر سہولت تھی۔ صابن، شیو، باڈی لوشن اور باتھ نیٹ تک سب دستیاب تھا۔ میں کپڑے اتار کر باتھ ٹب

میں گھس گیا۔ ایسا لگا جیسے صدیوں بعد نہانے کا موقع ملا تھا، جب سے پیروں میں چکر آیا تھا اور دربدری نے پیچھا پکڑا تھا، معمولاتِ زندگی خواب بنتے جا رہے تھے۔ گرمیوں میں، مَیں اور سفیر اسلام آباد اور آس پاس کی کسی ایسی جگہ کو نہیں چھوڑتے تھے جہاں سوئمنگ کی جا سکے۔ راول ڈیم سے لے کر نالہ کورنگ تک۔ اور اب یہ حال تھا کہ باتھ روم میں بھی نہائے ہفتوں گزر جاتے تھے۔

نہا کر میں تولیا باندھ کر دوسرے کمرے میں آیا اور احتیاطاً اس کا دروازہ اندر سے بند کر لیا کہ پوربی یا اس کی مالکن اچانک اندر تشریف نہ لے آئیں۔ وہاں پر ایک عدد سفید اونی پاجامہ جو پتلون کے انداز کا تھا اور ایک رومونی سوت کی کرتہ نما قمیص تھی۔ اور دونوں میرے ناپ کی تھیں۔ میں نے لباس پہنا اور دروازہ کھول کر تالی بجائی۔ پوربی چراغ کے جن کی طرح حاضر ہو گئی۔ میں نے اسے وردی دی۔ "یہ مجھے دھو کر دینا۔"

"جو حکم مالک!" اس نے کہا۔ "مالکن کھانے پر انتظار کر رہی ہیں۔"

سوترا اور اس کی نوکرانی پوربی دونوں کی ہندی خاصی خوفناک تھی خاص طور سے پوربی کی۔ اس میں سنسکرت کے بھیانک الفاظ کی بھرمار تھی۔ اس لئے میں نے ان کی گفتگو کو عام فہم بنا کر پیش کیا ہے۔ گرم پانی سے غسل کر کے میری کمر کا رہا سہا درد بھی ختم ہو گیا تھا اور دوسرے میری بھوک چمک گئی تھی۔ سوترا خود بھی تیار ہو کر کھانے کی میز پر میری منتظر تھیں اس نے سفید ریشمی ساڑھی پہن رکھی تھی اور اس کے گلے میں نیلم کی مالا تھی۔ اگر یہ اصلی نیلم تھا تو مالا بہت ہی قیمتی تھی۔ مگر وہ حسن سنہری گلابی گردن میں تھی اس کے مقابلے میں مالا کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو سوترا نے نظر اٹھا کر مجھے دیکھا اور پھر خود بھی کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ بے ساختہ میری طرف آئی۔ "ہے بھگوان! کتنے سندر ہو تم!"

"اچھا!" میں نے سر ہلایا۔ "لیکن اس وقت میں بھوکا ہوں۔"

اس نے بے تکلفی سے بانہیں میرے گلے میں ڈال دیں اور چہرہ اوپر کر کے بولی۔ "ہمارے من کی پیاس بھی بجھا دو۔"

"میں کوکا کولا ہوں؟" میں نے جز بز ہو کر کہا اور اس کی بانہیں الگ کر دیں۔ "سوترا! میں تمہیں پسند کرتا ہوں مگر مجھے تمہاری یہ حرکتیں بالکل پسند نہیں ہیں، تم عورت کے وقار کو گرا رہی ہو۔"

"ہم عورت کہاں ہیں، ہم تو تمہاری داسی ہیں۔"

"مجھے داسی کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر تم نے مجھے ایک دوست کی حیثیت سے اپنے پاس رکھنا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

"اچھا اگر ہم تم سے پیار نہ لیں تب تو ہمارے پاس رہو گے۔" وہ پھر آپ جناب اور ہم پر آ گئی تھی۔

"پکا وعدہ" میں نے کہا۔

ناشتا پُرتکلف تھا اور میز پر وہ سب تھا جو اس طبقے میں ہوتا ہے سوائے گوشت کے۔ مگر گوشت تھا، یہ ٹراؤٹ مچھلی کے قتلے تھے۔ سوترا نے بتایا کہ مچھلی وادی کی جھیل میں پائی جاتی ہے۔ اسے بہت صفائی سے بنایا گیا تھا۔ ناشتا کر کے میں نے اس سے کہا۔ "اب میں باہر جانا چاہوں گا۔"

"کیوں؟"

''بس ایسے ہی......اب میں یہاں بند ہو کر تو نہیں بیٹھ سکتا۔'' میں جھنجلا گیا تھا۔

''دیکھو، اگر کوئی خاص بات نہیں ہے تو مت جاؤ۔'' اس نے نرمی سے میرا ہاتھ تھاما۔ ''مجھ سے کہو، میں یہاں سب کروا سکتی ہوں۔''

''اس لئے کہ راج کی بہن ہو؟''

''میں نے کبھی اپنے بھائی کا سہارا نہیں لیا۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میری اپنی ایک حیثیت ہے۔''

''اگر میں کسی کو تلاش کروانا چاہوں تو؟'' میں نے اس کی بات پر غور کیا۔

''میں کر سکتی ہوں، اس وادی میں تلاش کروانا ہے؟''

''ہاں، میرا ایک محسن ہے۔ اس نے قلعے کے اوپر سے پتھر مار کر ہیلی کاپٹر کو تباہ کر دیا تھا، جب اس کی مشین گن مجھ پر فائر کرنے والی تھی۔''

''ہاں، یہ تو میں نے بھی سنا ہے اور میں نے لوگوں سے اس شخص کے بارے میں معلوم بھی کیا تھا مگر حیرت کی بات ہے، کوئی سامنے نہیں آیا۔''

''مجھے اپنے محسن کی تلاش ہے۔''

''میں ابھی اپنے آدمیوں سے کہتی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''شام تک وہ اسے تلاش کر لیں گے۔''

''دوسرے میں یہاں قید ہو کر نہیں بیٹھ سکتا۔ میں کمار کے پاس جاؤں گا۔''

''اچھا!'' اس نے بجھے لہجے میں کہا۔ ''میں اپنے آدمی کو ساتھ کر دیتی ہوں۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے پاس پستول ہے۔'' میں نے اسے کرتہ اوپر کر کے نیفے میں اڑا پستول دکھایا۔ ''اس کے ہوتے کسی کی مجال نہیں ہے کہ میرے قریب آئے۔''

''تم راستوں سے ناواقف ہو پھر بھٹک گئے تو؟''

''ہاں، رہنمائی کے لئے کسی کو ساتھ کر دو۔ میں دوپہر تک آجاؤں گا۔''

اب اس کے پاس مجھے روکنے کا جواز نہیں تھا۔ اس نے مجھے پوربی کے ساتھ بھیجا تھا۔ کمار نہیں تھا۔ مجھے بیتو مل گیا۔ ''کمار کہاں ہے؟''

''کمار جی باہر گئے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''ان سے ملنا ضروری ہے تو میرے ساتھ چلیں۔''

کمار وادی کے دورے پر تھا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ اوپر گلیشیرز جنگل تک آ گئے تھے اور خطرہ تھا کہ وہ سرک کر جنگل کو تباہ کرنا نہ شروع کر دیں۔ میں اور بیتو اس کے اوپر سے آنے کا انتظار کرتے رہے۔ عورتیں جھیل سے پانی بھر کر لے جا رہی تھیں۔ پینے اور دوسری ضروریات کے لئے پانی حاصل کرنے کا یہی ایک طریقہ تھا، اس کی وجہ سے ان عورتوں کو مشقت برداشت کرنا پڑتی تھی۔ عورتوں نے پیتل کے گاگرے سروں پر اٹھا رکھے تھے اور وہ تقریباً بیس لیٹر پانی آرام سے اٹھا کر ان دشوار گزار راستوں پر چل رہی تھی۔ مجھے افسوس ہوا اس وادی کے حکمرانوں نے اپنے گھروں میں دنیا جہان کی سہولتیں جمع کر لی تھیں مگر لوگوں کے لئے کچھ نہیں کیا تھا۔ میرے خیال میں گلیشرز سے زیر زمین بستی تک پانی کی لائن بچھائی جا سکتی تھی اور کم سے کم گرمیوں میں ان کو پانی کا مسئلہ نہیں ہونا چاہئے تھا۔

عورتوں کی پانی لے جانے والی ایک ٹولی میرے پاس سے گزری تو میں ایک چہرہ دیکھ کر چونکا۔ ''آشا''
بیتو محویت سے عورتوں کو دیکھ رہا تھا، وہ چونکا۔ ''کیا کہا آپ نے جی!''
''بیتو! اس عورت کو دیکھ رہے ہو، نیلے لباس والی؟''
''جی جناب، اچھی ہے۔''
''اچھی کے بچے! اس کے پیچھے جاؤ اور دیکھو یہ کہاں رہتی ہے۔ اگر ساتھ آنے پر رضامند ہو تو اسے لے آنا۔''
''یہ میرے ساتھ کیوں آئے گی؟''
''اسے کہنا شہباز نے بلایا ہے، تب ضرور آئے گی۔'' میں نے کہا۔ ''مگر جبر مت کرنا۔''
''میں کوشش کرتا ہوں۔ ویسے تو آپ کا حکم ہی کافی ہے۔''
''جتنا کہا ہے، بس اتنا کرو اور اب جاؤ۔'' میں نے حکم دیا۔
میں راج کنور اور بڑے کنور کی اس بہن کو تو بھول ہی گیا تھا۔ یہ ہمارے پاس تھی اور ان لوگوں نے اس کی پروا بھی نہیں کی تھی۔ شاید ان کو علم نہیں تھا کہ آشا زندہ ہے۔ ورنہ وہ اسے چھڑانے کی کوشش ضرور کرتے۔ ان کی ناز و نعم میں پلی بہن یہاں عام عورتوں کی طرح پانی بھر کر لا رہی تھی۔ آشا نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اندر گئی اور بیتو اس کے پیچھے تھا۔ آسمان پر بادل تھے مگر کبھی کبھی دھوپ نکل آتی تھی۔ ہوا میں سکوت تھا اور دور شمال میں سیاہ گھٹا نظر آ رہی تھی شاید بادلوں کا ایک نیا پرا اس طرف آ رہا تھا اور یہ وادی کے لوگوں کے لئے خوش آئند تھا۔ بیتو پندرہ منٹ بعد نمودار ہوا تھا۔ اس کے ساتھ آشا تھی اور وہ بہت ڈری ہوئی تھی۔ اس نے کامیابی سے خود کو چھپایا تھا ورنہ اس کی شناخت منظرِ عام پر آ جاتی تو یہ پوری بستی اس کے خون کی پیاسی ہو جاتی۔ بیتو نے میری طرف اشارہ کیا اور خود وہیں رک گیا۔ میں ان درختوں کے پیچھے آ گیا جن کے آگے کھڑا تھا، میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی مجھے آشا سے بات کرتا دیکھے۔
''شہباز!'' آشا نے سامنے آتے ہی کہا۔ ''تم کہاں چلے گئے تھے۔ میں تمہیں تلاش کرتی رہی تھی۔''
''میں یہیں تھا تم کسی سے پوچھ لیتیں۔''
''مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ یہ کنور خاندان سے بے انتہا نفرت کرتے ہیں، اگر ان کو پتا چل جاتا تو......'' وہ چپ ہو گئی پھر التجا آمیز لہجے میں بولی۔ ''مجھے واپس بھجوا دو۔ یہاں تو میں ڈر ڈر کر مر جاؤں گی۔''
''تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ یہ بتاؤ محل سے آنے والے خادموں اور خادماؤں میں سے کسی نے تمہیں شناخت نہیں کیا؟''
''نہیں، ان میں سے اکثر تو راستے ہی میں مارے گئے، مجھے یہاں صرف دو نظر آئے تھے۔ مگر انہوں نے کسی کو میرے بارے میں نہیں بتایا، پھر بھی مجھے ڈر لگتا ہے۔''
''افسوس کہ میں مسائل میں الجھ گیا تھا اس لئے تمہارا خیال نہیں آیا۔ فکر مت کرو، تم اب محفوظ رہو گی۔ یہ بتاؤ تم کہاں رہتی ہو؟''
''بے سہارا عورتوں کا ایک گروپ ہے جن کا کوئی نہیں ہے، میں ان کے ساتھ ہوں۔''

''کسی نے تمہیں تنگ یا پریشان تو نہیں کیا؟''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''پر...... کل ایک آدمی آیا تھا، وہ مجھ سے میرے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ میں نے اسے یہی بتایا کہ میرے سارے گھر والے مارے جا چکے ہیں۔''

''کون ہے وہ، اسے جانتی ہو؟''

''نہیں...... لیکن میری ایک ساتھی بتا رہی تھی، وہ یہاں کا اہم شخص ہے، اس کا نام راج ہنس ہے۔''

''راج۔'' میں چونکا۔ ''آشا، اس سے بچو، وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔''

اس نے بے بسی سے مجھے دیکھا۔ ''کیسے بچوں؟''

''تم میرے ساتھ چلو۔'' میں نے سوچ کر کہا۔ ''میں تمہیں ایک جگہ لے جا کر رکھوں گا مگر تم وہاں بھی کسی کو اپنی اصلیت نہیں بتاؤ گی۔''

''میں تمہارے پاس رہوں گی۔'' اس نے ہچکچا کر کہا۔

''سمجھ لو تم میرے پاس ہی رہو گی۔''

کمار بلندی کی طرف سے آ رہا تھا، میں نے آشا سے کہا۔ ''تم جاؤ اور جب بیتو...... یہ لڑکا تمہیں بلانے آئے تو بلا کھٹکے اس کے ساتھ چلی آنا۔ یہ میرے اعتماد کا شخص ہے۔''

آشا چلی گئی۔ وہ جتنی شوخ، چلبلی اور بچگانہ طبیعت رکھتی تھی، اس وقت اتنی ہی سنجیدہ اور ہراساں نظر آ رہی تھی۔ زندگی کا خوف تو دیوانے کو فرزانہ بنا دیتا ہے، میں خود کمار کی طرف آیا۔

''تم غالباً اوپر گلیشیر کا معائنہ کرنے گئے تھے؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''گلیشیر جنگل کے کنارے تک آ گیا ہے۔ یہ درختوں کو گرانا شروع کر دے گا اور کسی بھی لینڈ سلائیڈنگ کی صورت میں سارا جنگل تباہ ہو جائے گا۔ اس سے وادی کی زراعت کا سسٹم تباہ ہو جائے گا۔ یہ جنگل ہی ہمارے کھیتوں کو بچاتا ہے۔''

''تمہارے خیال میں یہ بہت سنجیدہ مسئلہ ہے۔''

''بہت سے بھی زیادہ، جنگل تباہ ہونے سے ہمیں یہاں سے کہیں اور جانا پڑے گا۔ ہماری بقا خطرے میں پڑ جائے گی۔''

''وہ تو اب بھی ہے تم بھول رہے ہو۔ بھارتی سرکار تمہاری دشمن ہے اور تمہارے قبیلے کے ہزاروں افراد بمباری میں مارے جا چکے ہیں۔''

''مجھے امید ہے یہ مسئلہ سلجھ جائے گا۔'' کمار نے سوچ کر کہا۔ ''میرے آدمی باہر موجود ہیں اور خبریں لا رہے ہیں۔ اصل مسئلہ ہم سے بستیاں خالی کروانا تھا تاکہ علاقے کے جنگلوں پر ان کا تسلط قائم ہو جائے۔''

''تم ان کو ایسا کرنے دو گے؟''

اس نے شانے ہلائے۔ ''فی الحال میں ان سے محاذ آرائی نہیں کر سکتا جب تک ہمارا مسئلہ ملکی سطح پر اجاگر نہ ہو۔ میں ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ میں مقدمہ کرنے کے بارے میں غور کر رہا ہوں۔''

''یہ ٹھیک رہے گا۔'' میں نے خوش ہو کر کہا۔ ''میڈیا اور این جی اوز کی توجہ حاصل کرنے کا اس سے بہتر

طریقہ اور کوئی ہے ہی نہیں۔"

"اس سے زیادہ خطرات ہیں یہاں۔ وادی کی بقا کا خطرہ لاحق ہے اور اس سے زیادہ خطرہ سابق حکمرانوں سے ہے، انہوں نے سازشیں شروع کر دی ہیں۔"

"اس کا اندازہ کیسے ہوا؟"

"میرے دو آدمی صبح سے غائب ہیں۔ پوری بستی میں ان کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ وہ لڑاکے ہیں اور جی دار بندے ہیں۔"

"تمہارا کیا خیال ہے۔"

"میرا خیال ہے ان کو مار کر خاموشی سے کہیں دفنا دیا گیا ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "میرے آدمی سخت مشتعل ہیں۔ میں نے بمشکل ان کو ٹھنڈا کیا۔"

"یہ چالاکی سے کام لے رہے ہیں۔" میں نے سوچ کر کہا۔ "انہوں نے سوچا ہے کہ اوپر والوں کو خاموشی سے ختم کر دو تو نیچے والوں کو قابو کرنا زیادہ دشوار نہیں ہوگا۔"

"تم نے درست اندازہ لگایا ہے۔"

"میرا مشورہ ہے، ان تمام افراد کو ان کی رہائش گاہوں پر نظر بند کر دو اور ان لوگوں کے لئے کوئی کام نکالو جو بے کار ہیں اور ان سازشیوں کے آلہ کار بن رہے ہیں۔"

"میرے آدمی ان پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ میں نے سب کے پیچھے اپنے آدمی لگا دیے ہیں۔"

"عورتوں کو بھی استعمال کرو، ملازمہ بن کر وہ بہترین جاسوسی کر سکتی ہیں۔"

اس نے سر ہلایا۔ "مگر فی الحال ان کو نظر بند کرنا مناسب نہیں ہوگا۔"

"تمہاری مرضی۔" میں نے کہا۔ "محل پر حملے کے دوران آزاد ہونے والوں میں ایک لڑکی ہے، اسے بھی کنور کے آدمی کہیں سے اغوا کر کے لائے تھے۔ وہ یہاں خوف زدہ ہے، میں اسے اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔"

"لڑکی نے تم سے کہا ہے؟"

"ہاں، اس نے مجھ سے درخواست کی ہے، دوسرے راج ہنس بھی اس میں دلچسپی لے رہا ہے، اس سے پہلے کہ وہ کوئی غلط حرکت کرے اور میں اسے قتل کر دوں، لڑکی میرے حوالے کر دو۔"

"میں اسے بلوا لیتا ہوں۔ کہاں ہوتی ہے وہ، کیا نام ہے؟"

"آشا، بیتو جانتا ہے۔"

کمار نے بیتو کو ہدایت دی کہ وہ شام کو اسے لے کر آئے۔ کمار کے غائب ہونے والے دونوں آدمی بہت اہم تھے۔ اس حکومت میں اس کے دست راست تھے۔ وہ صبح کے وقت رفع حاجت کے لئے باہر نکلے تھے اور پھر واپس نہیں آئے تھے۔ کمار کے آدمیوں نے پورا جنگل چھان مارا تھا۔ جھیل بھی دیکھ لی تھی۔ اس کی پوری سطح منجمد تھی، سوائے ان حصوں کے جہاں سے پانی حاصل کیا جاتا تھا۔ اب بستی کے اندر گھروں کی تلاشی لی جا رہی تھی۔ کمار کے جانے کے بعد بھی میں باہر رہا تھا۔ بیتو میرے ساتھ تھا اس نے شانے پر رائفل لٹکا رکھی تھی۔

"سردار نے مجھے حکم دیا ہے، اب میں ہر وقت آپ کے ساتھ رہوں گا اور آپ کی حفاظت کروں گا۔"

"یہ تمہاری محبت ہے بیتو، ورنہ مجھے کسی محافظ کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے ساتھ آؤ، ہم ذرا قلعے کے دروازے تک ہو کر آتے ہیں۔"

"بیتو میرے ساتھ چل پڑا۔ سورج سر پر تھا اور میں نے قلعے سے نکل کر جھولتے پل کے نیچے گھاٹی کی تہہ میں پڑے ہوئے گن شپ ہیلی کاپٹر کے ملبے کو دیکھا۔ قلعے کے دروازے کے حفاظتی دستے کا انچارج اب سانو نامی شخص تھا۔ وہ بھی کمار کا آدمی تھا۔ میں نے اس سے بیتو کے توسط سے بات کی۔ "اس گھاٹی میں اترنے کا کوئی راستہ ہے؟"

اس نے انکار کیا۔ "کوئی راستہ نہیں ہے۔"

"رسے کی مدد سے اترا جا سکتا ہے؟" میں نے پھر پوچھا۔

اس نے جائزہ لیا۔ "ہاں، رسے سے اترا جا سکتا ہے لیکن یہ بہت گہرا ہے۔"

میں نے بیتو سے کہا۔ "معلوم کرو، کوئی چرخی ہے، جس کی مدد سے ایک یا دو بندے نیچے جا سکیں اور ان کو واپس کھینچا جا سکے۔"

بیتو ایک گھنٹے میں چرخی سمیت آ گیا۔ یہ درخت کا بھاری تنا تھا۔ جس کے دونوں جانب لکڑی کے پہیے لگائے گئے تھے، اس کے ایک سرے پر گھومنے والی چرخی تھی اور دوسرے سرے پر پہیہ بنا تھا جس سے گھوم کر رسا نیچے جاتا تھا۔ ایک مناسب زاویے سے چرخی کا منہ آگے کھائی میں نکال دیا گیا۔ اس کے پہیوں کے سامنے بڑے پتھر رکھ دیے گئے تھے، بیتو پریشان تھا۔

"نیچے جا کر کیا کرنا ہے جناب!"

"یہ میں نیچے پہنچ کر بتاؤں گا، تم میرے ساتھ چلو گے۔"

"پہلے بیتو نے رسے کے جھولے میں پاؤں پھنسائے اور نیچے اتر گیا۔ چرخی چلانے پر دو افراد مامور تھے جو سانو کی ہدایت کے مطابق چرخی چلا رہے تھے۔ سانو پل کے وسط میں کھڑا ان کو ہدایات دے رہا تھا۔ میں بھی اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ بیتو دس منٹ میں کوئی دو سو فٹ کی گہرائی میں بحفاظت اتر گیا تھا، اب میری باری تھی۔ رسا برق رفتاری سے اوپر آیا اور میں اس میں پھنس کر گھاٹی میں لٹک گیا۔ چرخی نے رسی چھوڑنا شروع کر اور میں آہستہ آہستہ نیچے جانے لگا تھا۔ مجھے اچانک ہی خیال آیا، نیچے گن شپ میں ایک کام کی چیز تھی، یہ چھ نالی والی مشین گن تھی، اگر وہ تباہ ہونے سے بچ گئی تھی تو ہمارے ہاتھ ایک خطرناک ہتھیار آ جاتا۔

بیتو گن شپ کے ملبے کا معائنہ کر رہا تھا۔ میں چٹانوں اور باہر نکلے کناروں سے بچتا ہوا نیچے جا رہا تھا۔ چرخی کا سرا آگے نکلا ہوا تھا، اس وجہ سے مجھے نیچے جانے میں مشکل نہیں ہو رہی تھی۔ میں بھی کچھ دیر میں نیچے پہنچ گیا تھا۔ میں نے بیتو کو منع کیا تھا، میرے نیچے آنے تک کسی چیز کو نہ چھیڑے۔ ممکن ہے وہ کسی بم یا راکٹ کو چھیڑ دیتا۔ میں نے رسے کے جھولے سے پاؤں نکالے۔ گن شپ کا ڈھانچا تڑ مڑ گیا تھا اور اس کے بہت سارے حصے الگ ہو گئے تھے۔ مجھے چھ نالی مشین گن کی تلاش تھی۔ گن شپ کے چاروں طرف گھوم کر دیکھنے کے باوجود مجھے مشین گن نظر نہیں آئی تھی۔ شاید وہ ملبے تلے تھی۔ میں نے بیتو کو مشین گن کی ساخت سمجھائی۔

اس نے سر ہلایا۔ "مجھے تو لگ رہا ہے وہ بھی تباہ ہو گئی ہو گی۔"

''مشین گن خاص قسم کے فولاد سے ڈھالی جاتی ہے، وہ بہت مضبوط ہوتی ہے۔'' میں نے اسے سمجھایا۔

''اوپر سے چھ سات مضبوط بندے اور لکڑی کے مضبوط ڈنڈے منگواؤ۔''

بیتو نے میرا پیغام اوپر تک پہنچایا، اگلے ایک گھنٹے میں دونوں چیزیں آ گئیں۔ مجھے یاد تھا، مشین گن کاک پٹ کے عین نچلے والے حصے میں تھی۔ وہ اس کے نیچے ہو سکتی تھی۔ میں نے مزدوروں کو سمجھایا کہ ان کو کس طرح ہیلی کاپٹر کا یہ حصہ اٹھانا ہے۔ انہوں نے اردگرد سے پتھر جمع کئے پھر انہوں نے لکڑی کے ڈنڈے پھنسا کر کاک پٹ کو اوپر اٹھایا اور اس کے اٹھ جانے والے حصے کے نیچے پتھر رکھنے لگے۔ آخر کار مشین گن نظر آ گئی۔ بظاہر وہ ٹھیک لگ رہی تھی۔

''اسے باہر نکالنا ہے۔'' میں نے بیتو سے کہا۔ وہ چھریرے جسم کا لڑکا تھا۔ آرام سے خلا میں گھس گیا، اس نے مشین گن کا معائنہ کیا اور باہر آ کر بولا۔

''وہ ٹھیک لگ رہی ہے مگر وہ ڈھانچے میں پیچوں سے جڑی ہے۔''

''یہاں پر اوزار ہیں؟'' میں نے پوچھا۔ ''اگر ہیں تو فوری طور پر لاؤ۔''

بیتو اوزاروں کی تلاش میں روانہ ہوا۔ میں مزدوروں سے گن شپ کے نیچے مزید پتھر رکھوانے لگا تھا۔ پھر میں نے کسی نہ کسی طرح سر اگھما کر مشین گن کا معائنہ کیا۔ اس کی ساخت درست تھی اور اس کے ساتھ ہی نیچے لگا ایمونیشن کا ڈبا بھی ٹھیک لگ رہا تھا۔ ان دونوں چیزوں کو چند پیچ کھول کر نکالا جا سکتا تھا۔ بیتو کچھ دیر میں اوزاروں کا ایک بکس لے آیا۔ یہ ٹول کٹ تھی جو نہ جانے اس وادی میں کون لایا تھا۔ میں نے اسکروز کے کھانچے کے حساب سے اسکریو ڈرائیور بنا کر بیتو کو دیا اور وہ نیچے گھس کر پیچ کھولنے لگا۔ گن شپ کی دونوں سائیڈوں پر راکٹ لگے تھے اور وہ سب تباہ ہو چکے تھے۔ ان کے اڑنے سے گن شپ کا ڈھانچا دونوں جانب سے تباہ ہو گیا تھا۔ بیتو نے کچھ دیر میں سارے پیچ کھول کر مشین گن اور اس کے ایمونیشن بکس کو گن شپ کے ڈھانچے سے الگ کر دیا تھا۔

ہم نے احتیاط سے وزنی مشین گن اور ایمونیشن بکس باہر نکالا۔ ان کا وزن تقریباً ایک من تھا۔ یہ پانچ سو گولیوں والا بکس تھا۔ اس میں ابھی نصف سے زیادہ گولیاں موجود تھیں۔ پہلے ان دونوں چیزوں کو بغیر الگ کئے اوپر بھیجا گیا۔ اس دوران میں، میں گن شپ کے ڈھانچے کا جائزہ لیتا رہا تھا کہ شاید اس میں سے کوئی اور کام کا ہتھیار نکل آئے مگر اس میں اور کچھ نہیں بچا تھا۔ میں اوپر آیا تو مشین گن کی نمائش لگی تھی۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' میں نے بیتو کو ڈانٹا۔ ''ابھی کسی نے غلطی سے اس کا ٹریگر دبا دیا تو سامنے موجود سب مارے جائیں گے۔''

بیتو نے سب کو پیچھے کیا۔ میں نے معائنہ کر کے اس کا گولیوں والے بکس سے رابطہ ختم کیا اور بیتو کو اسے اندر لے جانے کا حکم دیا۔ شام قریب تھی اور میرا بھوک سے برا حال تھا۔ اندر جاتے ہی میں نے سومترا کی رہائش گاہ کا رخ کیا۔ وہ چشم براہ تھی اور جاننے کے لئے بے چین تھی کہ میں کہاں تھا اور کیا کرتا رہا تھا؟ میں نے صوفے پر گرتے ہوئے کہا۔ ''سب سے پہلے طعام...... اس کے بعد کلام۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب ہے کھانا اور وہ بھی فوراً!''

''میں ابھی لگواتی ہوں۔'' وہ باہر چلی گئی۔ میرا حلیہ خراب ہو رہا تھا۔ لباس جگہ جگہ سے خراب تھا۔ کھائی میں اترنے کے دوران خراب ہوا تھا۔ ایک جگہ سے کرتہ پھٹ بھی گیا تھا۔ پوربی میرا سوٹ یعنی بھارتی فوج کی وردی دھو کر خشک کر کے اور رفو کر کے لے آئی تھی۔ اس میں گولیوں کے نشانات تھے۔ سومترا کچھ دیر میں واپس آئی۔ ''تم لباس بدل لو۔''

''اگر مل جائے تو ضرور بدل لوں گا۔''

''آؤ میرے ساتھ۔'' وہ مجھے اس کمرے میں لائی جس کے ساتھ غسل خانہ تھا۔ اس نے الماری کھولی، یہ اس کے کپڑوں کی الماری تھی اور اس میں مخصوص نسوانی کپڑے بھی موجود تھے۔ سومترا نے ایک عدد پتلون اور جرسی نکالی۔ ''یہ کیسا ہے؟ تم کہاں دیکھ رہے ہو، اِدھر دیکھو۔''

میں نے اس کی طرف دیکھا اور جان چھڑانے کے لئے کہا۔ ''ہاں، ٹھیک ہے لاؤ دو۔''

وہ سمجھ گئی تھی اس نے ہنس کر الماری بند کر دی۔ میں نے کپڑے باتھ روم میں جا کر بدلے کیونکہ وہ اس کمرے سے جانے پر آمادہ نہیں تھی۔ واپس آیا تو مجھے دیکھ کر اس نے پُرستائش لہجے میں کہا۔ ''یہ لباس بھی تم پر جچ گیا ہے۔''

''بابا! میں کوئی عورت ہوں......؟ مردان چیزوں کی پروا کہاں کرتے ہیں۔''

وہ مجھے ساتھ کے کمرے میں لائی۔ آلو کی بھاجی، ترکاری کے ساتھ گرما گرم پوریاں تھیں اور ساتھ میں کئی طرح کی چٹنیاں اور اچار تھے۔ گوشت سے محرومی نے ہندوؤں کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنے کھانوں کو لذیذ بنانے کے لئے اچار اور چٹنیوں کا سہارا لیں۔ یہ لوگ گوشت کھاتے تھے کیونکہ اعلیٰ ذات کے ہندو نہیں تھے مگر ان کا جھٹکے کا گوشت میں نہیں کھا سکتا تھا۔ میں نے کھانا کھایا اور چائے کی فرمائش کر رہا تھا کہ مجھے آشا کا خیال آیا۔

''چھوڑو میں آ کر پی لوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''سومترا! اگر میں کسی کو یہاں لا کر رکھنا چاہوں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہو گا؟''

''یہ تمہارا گھر ہے۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟''

''سوچ لو، بعد میں اپنے الفاظ سے پھر مت جانا۔''

''سومترا تم سے وچن کر کے مر تو سکتی ہے پر وچن توڑ نہیں سکتی۔'' اس نے یقین سے کہا۔

میں کمار کے پاس آیا۔ وہ حسبِ معمول سرکاری معاملات میں الجھا ہوا تھا۔ میں نے اس سے آشا کے بارے میں پوچھا۔ ''اسے بلایا؟''

''معاف کرنا میرے ذہن سے نکل گیا تھا۔'' اس نے کہا اور اپنے ایک آدمی کو آشا کو لانے کا حکم دیا۔

''اس لڑکی میں ایسی کیا خاص بات ہے؟'' کمار نے مجھ سے پوچھا۔

''بس وہ ایک مظلوم لڑکی ہے، تمہارے قبیلے سے تعلق نہیں ہے اس لئے ڈرتی ہے۔ مجھے جانتی ہے اور میری محسن بھی ہے۔ اس نے مجھے کنوروں کے مذموم عزائم سے بچانے کی کوشش بھی کی تھی۔ اب میں اس کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔''

''اوہ، تو یہ بات ہے، لیکن تم اسے کہاں رکھو گے، سومترا کے پاس؟''

''تم نے درست اندازہ لگایا ہے۔''

کمار نے میرے لئے چائے منگوائی۔ ''میں نے آج ہی ایک خاص گودام دریافت کیا ہے، اس میں دنیا جہان کی چیزیں اور کھانے پینے کا اسٹاک ہونے والا سامان بھرا پڑا ہے۔''

''یہ سب وادی کے حکمران طبقے کے لئے ہوگا؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''اس میں رچ برو چائے اور اعلیٰ ترین کافی کے ڈبے تک دستیاب ہیں۔ کپڑے، جوتے، کمبل، الیکٹرانکس کا سامان۔''

''الیکٹرانکس......؟ یہاں تو بجلی ہی نہیں ہے۔''

''سامان میں ڈیزل اور پیٹرول سے چلنے والے جنریٹرز بھی ہیں۔''

''یہ عیش ہیں اس وادی کی ایلیٹ کلاس کے پھر ہمارے حکمران تو جو نہ کرتے ہوں گے وہ بھی کم ہوگا۔''

میں نے ٹھنڈی سانس لی اور گرم چائے کا سپ لیا۔ ''تمہارا آدمی نہیں آیا، اور ہاں، بیتو مشین گن لے آیا تھا؟''

''ہاں اسے برابر والے کمرے میں رکھ کر اس کی صفائی کر رہا ہے۔''

''تمہارے آدمیوں میں مجھے سب سے باصلاحیت بیتو ہی لگا ہے۔ تین چار سال بعد جب اسے کچھ تجربہ بھی ہو جائے گا تو تم اسے اپنا وزیراعظم بنا سکتے ہو۔''

''میں نے بھی یہی سوچا ہے۔'' کمار بولا، اس لمحے وہ آدمی اندر آیا جو آشا کو لینے گیا تھا، وہ اکیلا تھا۔ کمار نے اسے گھورا۔ ''لڑکی کہاں ہے؟'' میں نے اندازہ لگایا کہ اس نے یہی سوال کیا ہوگا۔

اس نے جواب میں کچھ کہا۔ کچھ دیر تک اس کے اور کمار کے درمیان الفاظ کا تبادلہ ہوتا رہا تھا۔ پھر کمار نے مجھ سے کہا۔ ''یہ کہہ رہا ہے وہاں سے آشا نامی لڑکی دوپہر سے غائب ہے۔''

''غائب ہے، کیسے؟ وہ خود کہیں گئی ہے یا اسے کوئی لے گیا ہے؟''

''اس کے ساتھ کی دوسری عورتیں نہیں جانتیں۔ ایک عورت نے آشا کو کسی اجنبی عورت سے بات کرتے دیکھا تھا۔ اسے نہیں معلوم کہ وہ اس عورت کے ساتھ گئی تھی یا نہیں مگر اس کے بعد آشا نظر نہیں آئی۔''

''یہ اچھا نہیں ہوا ہے۔'' میں نے فکرمندی سے کہا۔ ''کمار اپنے آدمیوں سے کہو کہ اس کا سراغ لگائیں، اس عورت کا جو آشا سے بات کر رہی تھی۔ میرا خیال ہے وہی اسے کہیں لے گئی ہے۔ ممکن ہے آشا کو میرے نام سے دھوکا دیا گیا ہو۔''

''میں معلوم کرواتا ہوں، لیکن اسے کوئی کیوں لے جائے گا؟''

''ایک تو وہ خوبصورت اور نوجوان لڑکی ہے، دوسرے اس کی ایک حیثیت اور بھی ہے۔ اگر وہ نہ مل سکی تو میں تمہیں بتا دوں گا۔''

''اور مل گئی تو......؟''

''تو میری طرف سے معذرت ہوگی۔'' میں نے صاف کہا۔

''میں اسے تلاش کرواتا ہوں۔''

"کمار اسے یہ سوچ کر تلاش کروانا کہ اس کا ملنا تم لوگوں کی بقا کے لئے لازمی ہے۔"

کمار سنجیدہ ہو گیا تھا۔ "اتنی ضروری ہے وہ؟"

میں آشا کے غائب ہونے سے پریشان ہو گیا تھا، مجھے خاص حد تک یقین تھا کہ اسے راج ہنس نے غائب کیا ہے۔ "تم راج سے پوچھو...... اور اسے وارننگ دو اگر اس نے آشا کو غائب کیا ہے تو اس کی عافیت اسی میں ہے کہ اسے فوری طور پر واپس کر دے۔"

"میں اس سے اس طرح بات نہیں کر سکتا۔" کمار نے نفی میں سر ہلایا۔ "لیکن بات ضرور کروں گا۔"

میں نے بیتو کو بلایا۔ "اس نے آشا کو دیکھا ہے، یہ اس کی تلاش میں مدد کرے گا۔"

کمار نے بیتو اور اپنے دوسرے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ آشا کو تلاش کریں۔ پھر مجھے سومترا کا خیال آیا وہ بھی اس معاملے میں میری مدد کر سکتی تھی۔ میں سومترا کے گھر جا رہا ہوں۔ جیسے ہی آشا کے بارے میں کوئی خبر آئے تو مجھے بتانا۔"

☆======☆======☆

سومترا گھر میں نہیں تھی۔ پوربی موجود تھی۔ اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "مالکن تو موجود نہیں ہیں، مالک ہمیں بتا دیں، ہم بھی آپ کے سارے کام کر سکتے ہیں، داسی ہیں آپ کی۔"

"الو کی پٹھی!" میں نے دل میں جز بز ہوتے ہوئے کہا۔ "کہاں گئی ہے تمہاری مالکن!"

"مرضی کی مالک ہیں۔" اس نے سنسنی خیز انداز میں اپنی کرتی کے گلے سے جھانکتے شانے ہلائے۔ "بتا کر نہیں گئی ہیں۔"

میں نشست گاہ میں انتظار کرنے لگا۔ میرا خیال تھا سومترا اپنے بھائی سے بات کر سکتی تھی اور اسے راضی کر سکتی تھی کہ وہ آشا کو چھوڑ دے مگر وہ خود غائب تھی۔ کچھ دیر بعد میری سوچوں میں ٹھہراؤ آیا تو مجھے اپنی جذباتی کیفیت پر ہنسی آنے لگی۔ سومترا مجھے جواب دہ نہیں تھی، وہ اپنی مرضی کی مالک تھی۔ اس کے لئے مجھ سے پوچھ کر کہیں آنا جانا ضروری نہیں تھا۔ میں نے تالی بجا کر پوربی کو طلب کیا۔ "میرے لئے کافی لے کر آؤ۔"

"ابھی لائی مالک!" اس نے کہا اور اپنا شرارہ یا لہنگا لہراتی ہوئی چلی گئی۔

میں کمار اور اس کے آدمیوں کے مسائل میں اتنا الجھ گیا تھا کہ مجھے اپنے معاملات پر غور کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ میں کمار کا ساتھ دے رہا تھا مگر اس کی بھی ایک حد تھی۔ میں اجنبی ملک میں تھا اور اس کی فوج سے لڑ رہا تھا۔ اگر میں پکڑا جاتا تو میری گلو خلاصی ناممکن ہو جاتی۔ مجھے جلد از جلد یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنا چاہئے تھی۔ پوربی کافی لے کر آئی۔ اس نے مجھ سے پوچھ کر چینی ڈالی۔ کریم میں نے منع کر دی تھی۔ پوربی میرے سر پر سوار رہنا چاہتی تھی لیکن میں نے اسے ڈانٹ کر بھگا دیا۔ "میرا دماغ نہ کھا، میں پہلے ہی پریشان ہوں۔"

ابھی میں نے کافی ختم کی تھی کہ سومترا آ گئی۔ اس نے ساڑھی کے اوپر شال لے رکھی تھی، اندر آ کر اس نے شال اتار دی۔ "خیریت، پوربی کہہ رہی ہے تم پریشان ہو؟"

"تم کہاں گئی تھیں؟"

"راج بھیا کو دیکھنے، اس کی طبیعت خراب ہے۔"

''طبیعت خراب ہے؟'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''کہیں اس کا سبب کوئی نیا طبیب تو نہیں ہے؟''

''نیا طبیب؟''

''سومترا! میں نے تم سے جس کے لئے بات کی تھی، جسے میں یہاں رکھنا چاہتا تھا وہ لڑکی غائب ہے۔'' میں نے اچانک سنجیدگی سے کہا۔ ''اور مجھے شبہ ہے اس کے غائب ہونے میں تمہارے راج بھیا کا ہاتھ ہے۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟'' اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ ''یہ لڑکی کون ہے؟''

میں نے اسے آشا کے بارے میں وہی بتایا جو میں کمار کو بتا چکا تھا۔ ''تمہارا بھائی اس میں دلچسپی لے رہا ہے۔ تم اس سے بات کرو، اسے کہو، بات بگڑنے سے پہلے آشا کو واپس کردے۔''

''تم ایک معمولی سی لڑکی کے لئے اتنی فکر کیوں کر رہے ہو؟''

''وہ معمولی سی لڑکی نہیں، میری محسن ہے۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''میں اسے ہر قیمت پر محفوظ دیکھنا چاہتا ہوں اور اسے ذرا بھی نقصان ہوا تو میں ایک ایک سے نمٹ لوں گا۔'' میرا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

''تم تو غصے میں آ گئے ہو۔'' اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر خود پر قابو پایا۔ سومترا نے جگ سے پانی گلاس میں ڈال کر دیا۔ ''تم پریشان مت ہو۔ میں ابھی دیکھتی ہوں، آشا اگر راج بھیا کے پاس ہے تو تم بے فکر رہو اسے ذرا بھی نقصان نہیں ہوگا۔''

''راج اتنی آسانی سے تمہاری بات مان لے گا؟'' میں نے طنز کیا۔

''ہاں، بھیا کو میری بات ماننا ہوگی۔ وہ مجھے انکار نہیں کر سکتا۔''

سومترا کے لہجے میں اعتماد تھا۔ مجھے ذرا سکون محسوس ہوا تھا۔ ''میں نے ایک اور کام کہا تھا تم سے؟''

''میرے آدمی اس کا کھوج لگا رہے ہیں۔'' وہ کھڑی ہو گئی۔ ''میں راج بھیا سے بات کر کے آتی ہوں۔''

اس نے اپنی شال لپیٹی اور باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں بھی کمار کی طرف چلا گیا۔ ابھی تک آشا کا یا اسے لے جانے والی عورت کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔

''کمار، باہر کی کیا صورتِ حال ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے وادی سے باہر۔ تم لوگوں کی بستیوں اور جنگلوں میں کیا ہو رہا ہے؟''

''پولیس اور بی ایس ایف کے دوستوں نے ناکہ بندی کر دی ہے تاکہ ہماری طرف سے کوئی نکل کر باہر نہ جا سکے۔'' اس نے کہا۔ ''میں بے خبر ہوں، میرے جو آدمی باہر گئے تھے، وہ نہ جانے شہر تک پہنچے بھی ہیں یا نہیں۔''

''اس کا مطلب ہے یہ کوئی منصوبہ بنا چکے ہیں۔ ممکن ہے وادی پر حملہ کر دیں۔''

''مجھے بھی یہ خدشہ ہے مگر میں باہر کے حملہ آوروں سے نمٹوں یا اندر کے دشمنوں سے؟''

''کمار، ایک بار ہمت کرو۔ ان لوگوں کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دو اور ان کا سب کچھ ضبط کر کے وادی کے لوگوں کے حوالے کر دو۔ تم دیکھنا یہی لوگ حقیقت جاننے کے بعد ان کو گالیاں دیں گے اور ان پر تھوکیں گے۔ اس کے بعد تم یکسوئی سے دوسرے معاملات پر توجہ دے سکو گے۔''

اس نے ہچکچا کر کہا۔ ''سوچتا تو میں بھی یہی ہوں لیکن مجھے ڈر لگتا ہے۔ اگر بغاوت ہو گئی تو دونوں طرف

سے میرے لوگوں کا خون بہے گا۔ ہم اور کمزور ہو جائیں گے۔"

"یہ تو تمہاری سوچ ہے نا، اگر وادی کے سابق حکمرانوں کو اپنا اقتدار بحال کرنے کے لئے باہر سے آنے والے ایک ایک فرد کو موت کے گھاٹ اتارنا پڑا تو وہ اس سے دریغ نہیں کریں گے۔"

"میں سمجھتا ہوں لیکن میرے لئے یہ سب میرے لوگ ہیں۔"

"تمہارے آدمی وادی میں ہر جگہ موجود ہیں، کیا تمہارے غائب ہونے والے مشیروں کا سراغ ملا؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "ابھی تک نہیں معلوم ہوا۔"

"بس اس سے اندازہ لگا لو کہ یہ لوگ اب بھی طاقتور ہیں۔"

"کمار پریشان نظر آنے لگا تھا، مجھے محسوس ہوا کہ اس کی قوتِ فیصلہ متاثر ہو رہی ہے۔ عام طور سے حکمرانوں کے بروقت فیصلے نہ کرنے کی حرکت ان کے اقتدار کے خاتمے کا باعث بن جاتی ہے۔ میں نے اس پر زور دیا۔

"کمار، سوچو مت، فیصلہ کرلو۔ اس کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس نے بے بسی سے مجھے دیکھا۔ "مجھے جن شرائط پر اقتدار ملا ہے، اب میں اکیلا اس قسم کے فیصلے کرنے کا مجاز نہیں ہوں۔"

"یعنی تم کسی نہ کسی طرح راجا جتندر کے دباؤ میں ہو؟"

"تم کہہ سکتے ہو۔"

"بھارتی حکومت کی مداخلت پر راجا جتندر اور اس کے ساتھیوں کا کیا مؤقف ہے؟"

"ان کا کہنا ہے کہ فوج سے تصادم درست پالیسی نہیں ہے۔"

"حالانکہ فوج تم لوگوں پر بلا اشتعال حملے کر رہی تھی۔" میں نے سوچ کر کہا۔ "کمار، اگر انہوں نے تمہارے خلاف حکومت سے ساز باز کرلی تو؟"

"حکومت سے ساز باز کیسے کر سکتے ہیں۔" اس نے کہا۔ "یہ بھی ہماری طرح وادی میں محصور ہیں۔"

"ایسا نہیں ہے، ان کے آدمی چپکے سے جا کر مذاکرات کر سکتے ہیں۔ ان کے پاس وائرلیس بھی ہو سکتا ہے۔ یہ چپکے سے رابطہ کرلیں اور تمہیں پتا بھی نہ چلے۔"

کمار متفکر نظر آنے لگا۔ "میرے آدمی نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔" اس کا لہجہ اعتماد سے محروم تھا۔

میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔ میں نے اچانک پوچھا۔ "کمار، سچ سچ بتاؤ، حکومت تم لوگوں کے پیچھے کیوں پڑی ہے۔ کوئی بھی حکومت بلاوجہ اپنے شہریوں کا قتل عام نہیں کرتی۔"

"جو بھی ہے تمہارے سامنے ہے۔" اس نے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا۔

"تمہاری مرضی اگر نہیں بتانا چاہتے۔" میں نے گہری سانس لی۔ "لیکن میں نے اڑتے اڑتے سنا ہے، جن پہاڑوں پر تم لوگوں کا دعویٰ ہے اور جہاں کنور خاندان اپنا تسلط چاہتا ہے اس میں قیمتی پتھروں کی کانیں ہیں۔"

"میرا خیال ہے ایسی بات نہیں ہے۔" اس نے پہلے کے سے انداز میں کہا۔

"کمار، اگر ایسی کوئی بات ہے تو تم لوگوں کی عافیت اسی میں ہے کہ ان سے دستبردار ہو جاؤ۔ تم لوگ

حکومت سے نہیں لڑ سکتے اور اسی بستی کو تباہ کرنے کے لئے چند گائیڈڈ میزائل کافی ہوں گے جو طیارے بلندی سے فائر کریں گے اور تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا کہ موت کب نازل ہوئی۔"

"یہ سب فضول کی باتیں ہیں جس نے بھی کی ہیں۔" وہ بگڑ کر بولا۔

"کمار!" میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "انسان کے لئے بے جان پتھر نہیں انسان قیمتی ہوتے ہیں کیونکہ ضرورت پڑنے پر وہی انسان کے کام آتے ہیں۔"

"بھگوان کے لئے میرا دماغ مت خراب کرو۔" اس نے جھنجلا کر میری طرف دیکھا۔

"مرضی تمہاری۔" میں نے شانے اچکائے۔

"تم بتا رہے تھے کہ آشا کی کوئی خاص حیثیت ہے؟"

"ہاں مگر فی الحال میں اس بارے میں نہیں بتا سکتا۔" میں نے بھی خشک لہجہ اختیار کیا۔ "میں سومترا کے پاس جا رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ اگر اس کے بارے میں پتا چلا تو میں اطلاع دے دوں گا۔"

سومترا کی طرف جاتے ہوئے میں کمار کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کا رویہ بدلا ہوا تھا اور راجا جتندر کے مسئلے پر بات کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ کسی دباؤ میں نظر آتا تھا اور پہلے کی طرح مجھ سے کھل کر بات کرنے سے گریز کر رہا تھا۔ سومترا کے گھر کی طرف جاتے ہوئے مجھے ایک خیال آیا اور میں اس طرف مڑ گیا جہاں کمار کے لوگ رہائش پذیر تھے۔ ان میں وہ بے سہارا عورتیں بھی تھیں جن کے خاندان والے مارے جا چکے تھے۔ آشا ان کے ساتھ مقیم تھی، وہاں مجھے بیتو نظر آیا۔ وہ اس عورت سے بات کر رہا تھا جس نے آشا کو غائب ہونے سے پہلے ایک اجنبی عورت سے بات کرتے دیکھا تھا۔ بیتو نے مجھے تفتیش کا احوال سنایا۔ "اس کا کہنا ہے وہ عورت دوپہر میں کسی وقت آئی تھی۔"

"اس کا حلیہ پوچھا۔ کوئی نشانی، کیسی تھی وہ؟"

"جوان عورت تھی۔ حلیہ عام مقامی عورتوں جیسا تھا۔" بیتو نے بتایا۔ "چلتے ہوئے تھوڑا سا لنگڑاتی تھی۔"

"آشا اس کے ساتھ گئی تھی، اس نے جاتے ہوئے دیکھا تھا؟"

"نہیں، اس نے جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ پر اس کا خیال ہے آشا اس وقت سے غائب ہے۔"

"اسے لے کر بستی کی تمام عورتیں دکھاؤ، اسے کہیں نہ کہیں تو ملے گی۔"

"ساری بستی کی عورتیں۔" اس نے پریشان ہو کر کہا۔ "آپ کو پتا ہے اتنی عورتیں دیکھنے میں کتنا وقت لگے گا۔ ان کی تعداد چار ہزار کے قریب ہے۔"

"اچھا، کل بستی کی ساری جوان عورتوں کو باہر بلا لو اور اسے دکھا دو۔" میں نے متبادل تجویز دی۔

"اس کے لئے سردار کا حکم ہونا چاہئے۔"

"تم کمار سے کہو، وہ حکم جاری کر دے گا۔ یہ کام کل لازمی ہونا چاہئے۔ بیس سال سے لے کر چالیس برس تک کی ہر عورت کو بلا لو اور اس سے شناخت کراؤ۔"

"جو حکم سرکار!" بیتو نے سر ہلایا۔

''مشین گن کہاں ہے؟''

''اسے میں نے سردار کے برابر والے کمرے میں رکھ دیا ہے۔''

''ایسے ہی، کوئی اسے لے گیا تو؟''

''کوئی نہیں لے جا سکتا، میں نے دو آدمی پہرے پر لگا دیئے ہیں۔''

''یہ تم نے اچھا کیا ہے۔'' میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

''سومترا میری منتظر تھی۔'' کہاں چلے گئے تھے۔'' اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔ ''میں کتنی دیر سے انتظار کر رہی ہوں۔''

''میں کمار کے پاس تھا۔ تم سناؤ، کوئی سراغ ملا۔''

''راج بھیا نے انکار کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے کسی لڑکی کو دیکھا تھا اور اسے اپنے گھر میں کام کرنے کو کہا تھا مگر اس نے انکار کر دیا۔''

''راج کو ملازماؤں کی کمی ہے؟'' میں نے طنز کیا۔ ''جو وہ بے سہارا عورتوں میں نئی ملازمہ تلاش کرتا پھر رہا ہے۔''

''وہ آشا کے پاس ہونے سے انکار کر رہے ہیں۔''

''آشا مل جائے گی۔'' میں نے یقین سے کہا۔ ''کل پوری بستی کی مکمل تلاشی لی جائے گی، کوئی جگہ اور کوئی گھر نہیں چھوڑا جائے گا۔''

''وہ کیسے؟'' اس نے غور سے مجھے دیکھا۔

''یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔ مگر کمار کچھ نہ کچھ کرے گا۔'' میں نے مبہم انداز میں کہا اور میں نے نوٹ کیا اس کے چہرے پر تشویش نظر آنے لگی تھی۔ اب میں نے اسے غور سے دیکھا۔

''کیا بات ہے، تم کچھ پریشان لگ رہی ہو؟''

''نہیں تو۔'' وہ زبردستی مسکرائی۔ ''کھانا منگواؤں۔''

''ہاں، بھوک لگ رہی ہے۔'' میں نے جواب دیا، وہ اٹھ کر جانے لگی تو میں نے روک دیا۔ ''پوربی کو کہہ دو۔ تمہارا جانا ضروری نہیں ہے۔''

''اوہ، ہاں۔'' اس نے سر ہلایا اور تالی بجائی، پوربی آ گئی۔ ''کھانا لگاؤ۔'' سومترا نے اسے حکم دیا۔

''جی مالکن۔'' اس نے سر جھکا کر کہا اور وہاں سے چلی گئی۔

میں نے نشست گاہ کا بغور معائنہ کیا۔ ''سومترا! تم لوگ بہت ٹھاٹ سے رہ رہے ہو۔'' میں نے کہا۔

''ہاں، کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔'' اس نے فخر سے کہا۔

''لیکن اس بستی کے عام لوگوں کو یہ سب میسر نہیں ہے۔ وہ بے چارے بس جیسے تیسے گزارہ کر لیتے ہیں۔''

اس نے شانے اچکائے۔ ''وہ عام لوگ ہیں۔''

''حالانکہ محنت وہ کرتے ہیں، تم لوگ کیا کرتے ہو؟''

''ہم...... ہم حاکم ہیں، حکومت کرتے ہیں۔ ہمیں کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ ''سومترا! تم، تمہارا بھائی اور اس کا آقا جتندر، سب ان عام لوگوں کی محنت

عیش کر رہے ہو جبکہ ان کو دو وقت کا کھانا بھی مشکل سے ملتا ہے۔ تم لوگ وسیع و عریض کمروں میں رہتے ہو جبکہ دوسروں کو محض ایک کوٹھڑی ملتی ہے جس میں پورا خاندان رہتا ہے۔ سوچو، کبھی تم لوگوں کو اس طرح رہنا پڑ جائے، تمہیں دو وقت محض سوکھی روٹی ملے۔''

اس نے جھرجھری لی۔ ''بھگوان نہ کرے، میں مر جاؤں گی۔''

''تم نہیں مرو گی، تم جینا سیکھ لو گی، انسان بہت سخت جان ہوتا ہے۔''

اس نے مجھے گھورا۔ ''تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟''

''آشا کوئی عام لڑکی نہیں ہے۔ اگر اس کے ساتھ زیادتی ہوئی یا اسے نقصان پہنچا تو ممکن ہے یہ وادی تباہ ہو جائے اور تم لوگ عرش سے فرش پر آ جاؤ۔ اسے جتنی جلد میرے پاس پہنچا دو، تمہارے حق میں اتنا ہی بہتر ہوگا۔''

''میں تمہیں کیسے یقین......''

''مجھے یقین مت دلاؤ۔ اپنے بھائی کو سمجھاؤ۔ آشا کو واپس کر دینے میں ہی تم سب کی عافیت ہے۔ اس میں دیر نہ کرے۔ جاؤ تم اسے خبردار کرنے کے لئے بے تاب ہو نا کہ وہ آشا کو کل صبح سے پہلے کہیں چھپا دے جہاں اس تک کسی کا خیال بھی نہ جائے۔''

چند لمحے کے لئے احساسِ جرم اس کے چہرے پر جھلکا تھا پھر اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ ''شہباز، تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے؟''

''چلو، ایسا ہی سہی۔ میں نے اپنا فرض پورا کر دیا ہے اور پوری نیک نیتی سے تم کو ایک مشورہ دیا ہے، تم نے بہرحال میرے دل میں کچھ جگہ بنا لی ہے۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''تاکہ تم بعد میں یہ نہ کہو کہ میں نے جانتے بوجھتے تمہیں بے خبر رکھا۔''

''آشا کون ہے؟''

''یہ جاننا فی الحال تمہارے لئے بہتر نہیں ہوگا۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اور تمہیں بتانے کا فائدہ؟ تم پہلے ہی انکار کر چکی ہو آشا راج کے پاس نہیں ہے۔''

''میں اس سے بات تو کر سکتی ہوں۔'' اس نے ہچکچا کر کہا۔

''یعنی تم تسلیم کرتی ہو، راج آشا کے بارے میں جانتا ہے؟''

''میں اس سے پھر بات کرتی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''میں بس چند منٹ میں آئی۔''

اس بار میں نے اسے نہیں روکا۔ اندر ہی اندر کچھ ہو رہا تھا، کوئی بہت ہی گہری کھچڑی پک رہی تھی۔ کمار بھی کسی دباؤ میں آ گیا تھا۔ پوربی نے کچھ دیر بعد آ کر کہا۔ ''مالک کھانا لگ گیا ہے، آپ کہیں تو لگا دوں؟''

''سومترا نے تمہیں اس بارے میں کوئی ہدایت نہیں دی تھی؟''

''وہ صرف اتنا کہہ کر گئی ہیں کہ مجھے دیر ہو تو تم مالک سے کھانے کا پوچھ لینا۔''

''نہیں، میں سومترا کا انتظار کروں گا۔'' میں نے انکار کر دیا۔

سومترا خاصی دیر بعد آئی اور وہ سخت فکرمند لگ رہی تھی۔ ''کیا ہوا ہے؟'' میں نے غور سے اسے دیکھا۔

''ابھی نہیں کھانے کے بعد بتاؤں گی۔ پوربی نے بتایا ہے کہ تم نے اب تک کھانا نہیں کھایا؟''

''میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔''

میرے جملے پر وہ کھل اٹھی تھی۔ ''سچ، میرا اتنا خیال ہے؟''

''میزبان کے بغیر مہمان کیسے کھانا کھا سکتا ہے۔''

''تم مہمان نہیں، اس گھر کے مالک ہو۔''

''براہِ کرم...... مجھے میری حیثیت میں رہنے دو۔'' میں نے کہا اور اس کے ساتھ ڈائننگ روم میں آیا۔

کھانے میں تکلف تھا۔ کئی طرح کی ڈشز تھیں۔ میں نے پوربی کی طرف دیکھا۔ ''اتنا اہتمام، کیا آخری بار کھلا رہی ہو۔''

''فضول مت بولو۔'' سومترا نے جلدی سے کہا اور پھر پوربی کو ڈانٹا۔ ''تو کھڑی منہ کیا دیکھ رہی ہے، روٹی لے کر آ۔''

اس وقت میں سمجھا تھا کہ سومترا میرے جملے کو بدشگونی کے طور پر لے رہی ہے مگر چند منٹ بعد پتا چلا اس کے دل میں چور تھا۔ میں نے سبزیوں کا سوپ لیا۔ یہ مجھے پہلے بھی اچھا لگا تھا، اس میں انڈے کے قتلے اور مکھن ڈالا ہوا تھا۔ ابھی میں نے نصف پیالہ لیا تھا کہ یک لخت میری نظر دھندلانے لگی۔ میں نے گھبرا کر اٹھنے کی کوشش کی تو منہ کے بل قالین پر جا گرا۔ دھندلاہٹ اتنی بڑھی کہ مجھے کچھ نظر آنا ہی بند ہو گیا اور پھر مجھے ہوش نہیں رہا تھا۔ سبزیوں کے شوربے میں شامل بے ہوشی کی دوا جتنی زود اثر تھی، اعصاب کے لئے اتنی ہی بے ضرر بھی ثابت ہوئی کیونکہ میں یوں جاگ گیا تھا جیسے گہری، بھرپور اور میٹھی نیند کے بعد انسان جاگتا ہے، نہ میرے سر میں درد تھا نہ چکر آ رہے تھے اور نہ ہی متلی کا احساس ہو رہا تھا۔ میں ذہنی طور پر پوری طرح چاق چوبند تھا اور میرے ہاتھ پاؤں مکمل طور پر میرے قابو میں تھے، ان مراحل سے میں بارہا گزر چکا تھا لیکن اتنے اچھے انداز میں ہوش پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔

میں فرش پر ایک کھال پر پڑا تھا اور یہ بالوں والی دبیز کھال کسی پہاڑی بھینسے کی تھی۔ یہ چھوٹا سا کمرا تھا جس میں چاروں طرف دیواریں تھیں اور ایک دیوار میں چھوٹا سا دروازہ لگا تھا۔ اوپر خاصی بلندی پر ایک مختصر سا روشن دان تھا۔ یہ اتنا چھوٹا تھا کہ اس سے بلی کا بچہ بھی بمشکل گزر سکتا تھا۔ روشن دان بتا رہا تھا کہ میں زیرِ زمین بستی میں ہوں۔ اندر موجود کمروں کو گھٹن سے بچانے کے لئے ایسے روشن دان ہر کمرے میں تھے۔ میں نے دروازہ چیک کیا، حسبِ توقع وہ باہر سے بند نکلا تھا۔

''تو راج کی ہمشیرہ نے اپنا اصل روپ دکھا دیا۔'' میں نے تلخی سے سوچا۔ میری میزبانی حاصل کرنا دراصل ایک سازش تھی جس کا مقصد مجھے کمار سے الگ کر کے قابو کرنا تھا کیونکہ سازشیوں کو سب سے زیادہ خطرہ میری ذات سے تھا۔ ممکن ہے مجھے اتنی جلدی غائب کرنے کا ارادہ نہ ہو مگر آشا والے معاملے کی وجہ سے یہ لوگ جلدی پر مجبور ہو گئے ہوں۔ میں کھال پر بیٹھ گیا۔ اب میرے پاس صبر سے بیٹھ کر سوائے انتظار کرنے کے اور کوئی چارہ نہیں تھا، اوّل تو یہی تعجب کی بات تھی، انہوں نے مجھے زندہ کیوں رکھا تھا، بے ہوشی میں ایک گولی مار کر یا گلا دبا کر بھی میرا کام تمام کر سکتے تھے۔ اگر اس کا کوئی مقصد تھا تو وہ جلد سامنے آ جاتا۔

دیوار کے ساتھ ایک طاق میں تیل سے جلنے والا دیا روشن تھا اور اس کی روشنی خاصی تھی۔ دیواروں پر سفید

رنگ کی وجہ سے یہ روشنی اور بھی تیز لگ رہی تھی۔ میں نے کمار کے بارے میں سوچا۔ سازشی بڑی تیزی سے اس کے اردگرد کے افراد کو غائب کر رہے تھے اور جب وہ اکیلا رہ جاتا تو اس کا بھی کام تمام کر دیتے یا کسی قید خانے میں پہنچا دیتے۔ اچانک دروازہ ہلکی سی آہٹ کے ساتھ کھلا اور سومترا اندر آئی۔ اس کے پیچھے ایک مسلح قبائلی تھا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی۔ ''کیسے ہو سومترا کی جان!'' اس نے مسکرا کر پوچھا۔

''تمہاری جان ہونے سے بہتر ہے میں کسی تھرڈ کلاس طوائف کا محبوب ہوتا، وہ بھی میرے ساتھ ایسا سلوک نہ کرتی۔''

''میں نے تمہاری بات کا برا نہیں مانا۔ تم غصے میں ہو اور ٹھیک غصہ کر رہے ہو لیکن تم کو اس طرح قید میں ڈالنا میری مجبوری ہے۔ تم جلد حقیقت جان جاؤ گے۔''

''جب مجھے گولی ماری جائے گی یا پھانسی دی جائے گی۔'' میں نے طنز کیا۔ ''تمہاری حقیقت تو میں ابھی جان گیا ہوں۔ یہ بتاؤ، مجھے زندہ کیوں رکھا ہے؟''

''شہباز، میری بات کا یقین کرو، تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔''

''تم لوگ وادی میں بغاوت کرنے والے ہو؟''

''اپنی حکومت حاصل کرنا بغاوت نہیں ہوتی۔'' اس نے میرے سوال کا دوسری طرح جواب دیا۔

''آشا تمہارے قبضے میں ہے؟''

''وہ خیریت سے ہے۔'' اس نے واضح جواب دینے سے گریز کیا مگر اقرار کر لیا کہ آشا ان کے پاس تھی ورنہ وہ اس کی خیریت کے بارے میں کہاں سے بتاتی۔

''سومترا! مجھے تم لوگوں کا انجام افسوس ناک نظر آ رہا ہے۔ کمار اچھا آدمی ہے، اسے اقتدار کی ہوس نہیں ہے۔ وہ تو تمہیں بچانے کی کوشش کر رہا ہے۔''

''وہ غاصب ہے۔ اس نے وادی کے اقتدار پر قبضہ کیا ہے۔'' سومترا سپاٹ لہجے میں بولی۔

میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ ''ابھی تم نے غاصب دیکھے نہیں ہیں۔ غالباً تم باہر والوں کی شہ پر کمار کے خلاف بغاوت کرنے جا رہے ہو لیکن تمہیں معلوم ہے اس کے بعد کیا ہوگا۔ ان کی فوج یہاں اتر آئے گی اور تم سب کو چن چن کر مارے گی، نچلی ذات کے ہندوؤں کا ایک قبیلہ صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گا، نہ تو کسی کو پتا چلے گا اور نہ ہی کسی کو دکھ ہوگا۔ جس ملک میں روزانہ پچیس ہزار افراد بھوک اور غربت کے نتیجے میں مر جاتے ہیں، وہاں تم لوگوں کی پروا کون کرے گا۔ یہ وادی اور نیچے کا سارا علاقہ ان لوگوں کے قبضے میں چلا جائے گا۔''

''تم مجھے ڈرا رہے ہو؟'' اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

''سومترا، تم نے ابھی دنیا نہیں دیکھی ہے۔ ہر ملک میں یہی ہوتا ہے۔ غیر ملکی طاقتوں کے اشارے پر کٹھ پتلی کی طرح ناچنے والے حکمران جب اپنا کام کر لیتے ہیں یا غیر ملکی آقاؤں کو ان سے بہتر غلام مل جاتا ہے تو ان کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ کوئی شے جب تمہارے لئے بے کار ہو جاتی ہے تو تم کیا کرتی ہو؟''

''اسے کوڑے میں پھینک دیتے ہیں۔'' اس نے غیر ارادی طور پر کہا۔

''یہی تم لوگوں کے ساتھ ہونے والا ہے۔'' میں نے سرد آہ بھری۔ ''سومترا، اب بھی وقت ہے، کمار کا

ساتھ دو ورنہ تمہاری لاشیں بھی غائب کر دی جائیں گی۔ وہی تمہیں کسی حد تک بچا سکتا ہے۔ وہ اس کے لئے کوشش کر رہا ہے۔"

سومترا نے نفی میں سر ہلایا۔" یہ تمہاری اور کمار کی خوش فہمی ہے، اس نے بیرونی دنیا سے رابطے کے لئے جتنے بھی آدمی بھیجے تھے، وہ پکڑے جا چکے ہیں۔"

"وہ بھی تم لوگوں کی مخبری پر پکڑے گئے ہوں گے۔" میں نے تلخی سے کہا۔" آج میں نے دیکھ لیا، انسان کس طرح اپنے پیر پر کلہاڑی مارتا ہے؟"

"مجھے یقین ہے کچھ نہیں ہوگا، راجا جتندر کے آتے ہی سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"یہ بتاؤ، ہمارا کیا ہوگا، کمار اور اس کے خاص آدمیوں کا؟"

"ان کو بھارت سرکار کے حوالے کر دیا جائے گا۔ وہ کنور محل پر حملے کے مجرم ہیں۔ ان پر مقدمہ چلا کر ان کو سزا دی جائے گی۔"

"میں بھی ان میں شامل ہوں۔"

"تم مر جاؤ گے۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"یعنی مجھے تم سزائے موت دو گی؟"

"سرکار کو دکھانے کے لئے۔ بغاوت کے دوران تم مقابلہ کرتے ہوئے مارے جاؤ گے۔ ایک ناقابلِ شناخت لاش دکھا دی جائے گی۔ تم اس وقت سب سے زیادہ مطلوبہ شخص ہو۔ تم نے سرکاری فوج کو وہ نقصان پہنچائے ہیں جو آج تک کوئی فردِ واحد نہیں کر سکا ہے۔"

"اس مہربانی کی وجہ؟"

"میں نے اس شرط پر راج بھیا کا ساتھ دیا ہے، کہ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔"

"تمہیں اپنے راج بھیا پر اعتماد ہے۔ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ کام ہو جانے کے بعد وہ مجھے زندہ چھوڑ دے گا۔"

"ہم کسی کو نہیں ماریں گے۔ بھارتی حکومت کے حوالے کریں گے۔ بس تمہیں بچا لیں گے۔ راج بھیا کو تمہیں حکومت کے حوالے کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"

"یہ تو راج بھیا ہی جانتے ہیں کہ فائدہ ہوگا یا نہیں۔ یہ بتاؤ، سرکار نے تم لوگوں کو کیا دم دلاسے دیئے ہیں؟ کیا جھوٹے وعدے کئے ہیں؟"

"ہمارا قبیلہ نچلے جنگلوں سے دستبردار ہو جائے گا۔ اس کے بدلے ہمیں وادی میں رہنے کی اجازت ہو گی۔ حکومت یہاں سے ہمیں بے دخل نہیں کرے گی۔"

"وہ تمہیں وادی سے نہیں دنیا سے بے دخل کر دے گی۔ چار ہزار افراد کو موت کے گھاٹ اتارنے والوں کے لئے سات آٹھ ہزار افراد کو اور قتل کرنا کیا مسئلہ ہو سکتا ہے جبکہ ان کے پاس اس کام کے لئے وسائل بھی ہیں۔"

سومترا کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ میری بات سے متفق ہے لیکن وہ مجبور تھی جو ہونے جا رہا تھا اسے نہیں روک سکتی تھی۔ اس نے عقب میں دیکھا اور مقامی زبان میں کچھ بولی۔ پوربی ایک تھال لے کر اندر آئی جس

میں کھانے کے لوازمات کے ساتھ پانی کا جگ بھی تھا۔ ''مجھے شاکرنا، ابھی میں تمہارے لئے اتنا ہی کر سکتی ہوں۔''

''سوال یہ ہے کہ تم بعد میں بھی مجھے کب تک چھپا سکو گی؟''

''جب تک تمہیں یہاں سے نکالنے کا بندوبست نہیں کر دیتی۔'' اس نے کہا اور پلٹ کر چلی گئی۔ پوربی نے تھال فرش پر رکھ دیا تھا۔ میرا خیال تھا میں دس بارہ گھنٹے بعد جاگا تھا اور رات بھی پوراڈز کرنے سے پہلے بے ہوش ہو گیا تھا اس لئے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ میں نے بھوک کے باوجود احتیاط سے کھایا پیا کہ اخراج کا مسئلہ نہ ہو کیونکہ اس بند جگہ رفع حاجت ممکن نہیں تھی۔ سومترا بڑی خوفناک تصویر سامنے رکھ کر گئی تھی۔ سابق حکمرانوں نے بھارتی حکومت سے ساز باز کر لی تھی۔ ویسے تو وہ بھارت کے شہری تھے اور ان کو اس ملک سے وفادار ہونا چاہئے تھا اور مجھے ان میں غداری والی کوئی بات بھی نظر نہیں آتی تھی، وہ بجا طور پر مطالبہ کر رہے تھے کہ ان کی زمین پر قبضہ نہ کیا جائے جس پر وہ صدیوں سے رہتے آئے تھے مگر بھارت کی مذہبی جنونی حکومت (ان دنوں بی جے پی اقتدار میں تھی) مسلمانوں، عیسائیوں اور دوسری غیر ہندو قوموں کے پیچھے تو تھی ہی، اس نے اپنی ہی ہندو برادری کی نچلی ذاتوں کا جینا بھی حرام کر رکھا تھا۔ اس کی ایک مثال یہ قبیلہ تھا۔

نہ جانے ان لوگوں نے کیا ساز باز کر رکھی تھی، عین ممکن تھا کہ بغاوت کو کامیاب بنانے کے لئے فوج کو بھی قلعے تک آنے کا راستہ دیا جاتا۔ اس کے بعد دونوں گروپ یکساں طور پر مارے جاتے اور حکومت نہ صرف جنگل بلکہ اس وادی پر بھی قابض ہو جاتی۔ یہ اسے فوج کے لئے ایک اچھا مقام مل جاتا۔ یہاں چھاؤنی بھی بنائی جا سکتی تھی اور سائنسی تجربہ گاہ بھی جہاں جدید ہتھیاروں کو ٹیسٹ کیا جاتا۔ جنگل میں موجود جواہرات کی کانیں بھی ان لوگوں کے قبضے میں آ جاتیں جو حکومت کے دست و بازو تھے، اسے قوت مہیا کرتے تھے۔ کنور خاندان کے ساتھ مقامی حکومت اور سیاست دانوں کی شمولیت بھی عین ممکن تھی جو اپنے مفاد کے لئے دس گیارہ ہزار افراد کی قربانی دینا معمول کی بات سمجھتے تھے۔ مجھے سومترا کے بھائی راج اور راجا جتندر پر حیرت تھی جو ان لوگوں پر اعتماد کر رہے تھے جو ان کے سائے سے بھی بچتے تھے، ان کے چھونے سے دھرم برشٹ ہو جاتا تھا۔

کمار جو قلعی تھا مارا جاتا، اسے زندہ چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے یہ لوگ۔ بہر حال یہ وہ جھگڑے تھے جو ازل سے ہوتے آئے ہیں اور ہمیشہ جاری رہیں گے۔ اس میں ناچیز کی جان بلاوجہ پھنس گئی تھی۔ اگر وادی میں فوج آنے والی تھی تو ان کا مطلوبہ ترین فرد میں تھا۔ جس کی وجہ سے ان کو نہ صرف شدید جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا تھا بلکہ میری وجہ سے وہ اپنے کئی عدد قیمتی گن شپ ہیلی کاپٹروں سے محروم ہوئے تھے۔ یہ سومترا کی نا سمجھی تھی کہ وہ ایک ناقابلِ شناخت لاش پیش کر کے مجھے بچا لیں گے۔ کنور میرے بارے میں ان کو تفصیل سے آگاہ کر چکے تھے اور لاش کے سرسری سے معائنے سے پول کھل جاتا، اس کے بعد مجھے تلاش کرنا زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔ میں اس زیر زمین بستی میں ہوتا جو جلد بھارتی فوج کے قبضے میں جانے والی تھی۔

اس خیال نے مجھے مضطرب کر دیا تھا۔ مجھے جو کرنا تھا، خود کرنا تھا اور جلد از جلد کرنا تھا۔ ممکن ہے آج رات کسی وقت بھارتی فوج وادی میں داخل ہو جاتی۔ میں نے تھال ایک طرف رکھا اور یہاں سے نکلنے کے بارے میں غور و فکر کرنے لگا۔ دروازہ باہر سے بند تھا اور بہت ضروری تھا کہ کوئی اسے کھولے اور اندر آئے۔ میں اس پر قابو پا لوں، لازمی بات تھی اندر آنے والا مسلح ہوتا، مجھے اس سے ہتھیار بھی مل جاتے۔ ایک بار میں یہاں سے نکل

جاتا تو کمار تک رسائی حاصل کرسکتا تھا۔ اس کے بعد حالات کو اپنے قابو میں لینا مشکل تو تھا، ناممکن نہیں تھا۔ کمار حقیقت حال سے واقف ہونے کے بعد تمام سازشیوں کو گرفتار کرسکتا تھا اور حملہ کرنے والی بھارتی فوج سے مقابلے کے انتظامات بھی کرسکتا تھا۔ یہ سب سوچتے ہوئے میں نے دروازہ بجایا۔ چند لمحے بعد کسی نے مقامی زبان میں کچھ کہا۔ میں نے شور مچایا۔
""دروازہ کھولو۔ مجھے پیشاب آرہا ہے۔

ظاہر ہے اس کی سمجھ میں کیا آتا۔ میرا اصل مقصد تو اسے متوجہ کرنا تھا۔ شور و غل کے ساتھ میں دروازہ بجانا بھی جاری رکھا۔ اسے مزید مؤثر بنانے کے لئے پیتل کے گلاس سے بجانا شروع کردیا۔ تنگ آکر نگران نے دروازہ کھول دیا اور مجھ پر رائفل تان لی۔ یہ ری پیٹر تھا امریکی ساخت کا اور بے حد مہلک، اس کا بلٹ چار فٹ کے فاصلے سے میرے دو ٹکڑے نہ بھی کرتا تو اتنا بڑا سوراخ ضرور کردیتا جس میں دل گردے، پھیپھڑے اور جگر سب غائب ہوجاتے۔ اس کا انداز بھی بے حد خوفناک تھا۔ اس نے گرج کر کچھ کہا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ لبلبی نصف دب چکی ہے۔ ذرا سا زور اور ڈالتا تو گولی چل جاتی۔

میں مسکرایا اور شیریں لہجے میں اپنی ضرورت بیان کرنے کے ساتھ ہاتھ کے اشاروں سے بھی واضح کرنے لگا۔ وہ سمجھ گیا، اس نے نفی میں سرہلایا اور مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ میں نے مشتعل ہو کر جوابی اشاہ کیا کہ کیا مجھے جو آرہا ہے وہ میں کمرے میں ہی کردوں؟ اس نے نفی میں سر ہلایا مجھے انتظار کرنے کو کہا اور دروازہ باہر سے بند کرلیا۔ دروازہ باہر کی طرف ہی کھلتا تھا۔ جب تک دروازہ کھلا رہا وہ میر طرف سے پوری طرح چوکنا رہا تھا اور رائفل کی نال ایک لمحے کے لئے بھی مجھ پر سے نہیں ہٹی تھی۔ اس لئے خطرہ مول لینے کی گنجائش نہیں تھی اس کے اشارے سے مجھے امید بندھی تھی کہ ابھی مجھے رفع حاجت کے لئے کہیں لے جایا جائے گا اور تب میں راستے میں چانس لے سکتا تھا۔



اس دلچسپ داستان کے بقیہ واقعات
پانچویں حصے میں ملاحظہ کریں

کاشف زبیر کے قلم سے ایک تیز رفتار ایکشن سے بھرپور ناول



ایک الگ رنگ، ایک بہتر تکنیک، زنجیر آہنگ سلسلہ

- کوئی نہیں جانتا کہ کائنات میں وقوع پذیر ہونے والا کون سا واقعہ مستقبل میں کیا اہمیت رکھتا ہے۔
- انسانی عقل و فہم محدود ہے۔ وہ صرف محدود دائرے میں مخصوص زاویہ نظر رکھتی ہے۔
- خیر و شر کی اس ازلی جنگ کا قصہ اس کے بغیر فلسفہ حیات کے اسرار و رموز سے آگاہی ممکن نہیں۔
- اس نوجوان کی کہانی جس نے دنیا میں آنکھ کھولی تو قتل و غارت گری، تباہی و بربادی اس کی منتظر تھی۔
- اس کی زندگی کے لیے بھی کوئی جائے پناہ نہ تھی لیکن قدرت کو شاید اس سے کوئی اہم کام لینا مقصود تھا۔
- چنانچہ وہ زندہ رہا اور اپنے دشمنوں کے لیے ایک چیلنج ثابت ہوا۔

علی میاں پبلیکیشنز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ اردو بازار، لاہور

فون: 37247414

E-mail:alimian_publications@yahoo.com